رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی

معروف صحافی ادیب اور مفسر مشتاق احمد قریشی ایک اور معرکۃ الآرا تالیف

امام الآئمہ حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ اہل سنت اور فقہ حنفی کے بانی ہیں
حنفی فقہ کے بانی: امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ
کی سیرت حیات اور ان کی فقہی زندگی اور کام کے بارے میں ایک مختصر جائزہ

امام اعظم ابو حنیفہؒ

حیات و فقہی کارنامے

تلخیص و تالیف: مشتاق احمد قریشی ◆ ہدیہ: ایک سو پچاس روپے

منگوانے کا پتہ
نئے افق گروپ آف پبلیکشنز 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی 74400 فون: 021-35620771/2
اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ لاہور۔ فون: 042-37116257

ماہنامہ

نئے اُفق کراچی

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
مزین
نورالدین

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEY UFAQ PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)	50 روپے
پاکستان (سالانہ)	600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	41
شمارہ	01
دسمبر	2016

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ''نئے افق'' پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے......!

گزشتہ دنوں سے ایک نئی بحث کا آغاز ہو چکا ہے انگریزی کے ایک موقر اخبار کے رپورٹر کے ذریعے ایک ایسی خبر جو ملکی سالمیت اور حفاظت سے متعلق تھی شائع کرا کے ملکی حفاظت اور سالمیت کو بیچ چوراہے پر لا کر رکھ دیا ہے۔ دراصل یہ کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے کسی ایسے گھر کے بھیدی نے جو موجودہ حکمرانوں سے بغض رکھتا ہے ان کے اپنے قریبی ساتھیوں میں سے کوئی نادان دوست یا کوئی آستین کا سانپ ہے جو نہیں چاہتا کہ میاں صاحب اب مزید مسند اقتدار پر براجمان رہیں اس نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے ساتھ ایک راز کو جو ملکی سالمیت اور حفاظت سے متعلق تھا افشا کیا تاکہ افواج پاکستان کو برہم کر کے حکمرانوں کے سامنے لا کھڑا کرے اور ایسا ہی ہوا افواج پاکستان اس خبر کی اشاعت سے ہکا بکا رہ گئی اور جنرل راحیل شریف کو فوری رد عمل کے طور پر کور کمیٹی کا اہم اجلاس طلب کرنا پڑا اور ایک سخت بیان اہل سیاست کو اور عوام کو سننا پڑا خبر لیک کرنے والوں یا والے کا اندازہ ایسا ہی ہوگا اسے امید ہوگی کہ جنرل راحیل شریف اس خبر کے لیک ہونے سے ایک دم بھڑک کر وہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے جس سے میاں صاحب کا تختہ پہلے کی طرح الٹ جائے گا میاں صاحب آسمان سے ایک دم پہلے کی طرح زمین پر آ جائیں گے اور انہیں دن میں تارے نظر آنے لگیں گے پہلے تو جنرل مشرف نے جو اور جیسا سلوک ان کے ساتھ کیا اس کے باوجود وہ عالمی دباؤ برداشت نہ کر سکا اور میاں صاحب کو سعودی عرب جانے کی اجازت مجبوراً دینا پڑی تھی لیکن جنرل راحیل عالمی سطح پر پہلے ہی بہت مقبول اور پسندیدہ ہیں یورپ، امریکا اور اسلامی ممالک سب کے سب جنرل راحیل شریف کی حمایت اور انہیں پسند کرتے ہیں یہ بات غالباً میاں صاحب کو پسند نہیں۔

جس ذریعے نے بھی وہ خبر رپورٹر تک پہنچائی اس نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں موقر انگریزی اخبار سے کوئی پرخاش ہو اس طرح انہوں نے اخبار سے اپنا بدلہ لیا ہو دوسرے میاں صاحب کو افواج پاکستان کے خلاف بھڑکانے کی مذموم کوشش ان کا مقصد ہو اور تیسرے افواج پاکستان کو میاں صاحب کے سامنے لا کھڑا کرنا ہو۔ میاں نواز شریف اور ان کی حکومت میں شامل تمام ہی ارکان کے خلاف حزب اختلاف کی جماعتوں میں جو لاوا پک رہا ہے وہ بھی سامنے کی بات ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تحریک انصاف جو دھرنے کی سیاست کر رہی ہے اس کے علاوہ پیپلز پارٹی بھی میدان میں اتر رہی ہے پہلا قدم اتوار کی ریلی کے ذریعے سامنے آ چکا ہے اور دھرنا جو کہ اپنے شہداء کی برسی کے موقع پر کیا ہے جبکہ پیپلز پارٹی مخالفین اب تک فرینڈلی اپوزیشن کا طعنہ دیتے رہے ہیں۔ برقی ذرائع ابلاغ کے اینکرز کا اپنا انداز گفتگو ہے کئی اینکرز نے تو اس خبر کے حوالے سے بڑی بڑی پیش گوئیاں کرنا شروع کر دی ہیں جنرل راحیل نے کبھی بھی آئین اور قانون کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا اور انہوں نے کئی بار واضح الفاظ میں ایسے خیالات کی مذمت کی ہے۔ ایک چینل کے اینکر محترم کا کہنا تھا کہ کور کمانڈر کمیٹی کی میٹنگ میں بہت سخت فیصلے کیے گئے ہیں وہاں شریک جرنلز کے چہروں کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصہ اور جذبات پر قابو پا رہے ہیں یقیناً کوئی مشکل فیصلہ کر لیا گیا ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمام ہی برقی ذرائع ابلاغ نے پیش گوئیاں کرنے کی فیکٹریاں لگا رکھی ہیں وہ پر سے کوا بنانے کی ماہر ہیں۔ سب سے پہلے خبر نشر کر کے نمبر بنانا اب ٹیلی ویژن نشریات کا معمول بن گیا ہے اور تجزیے تبصرے کی آڑ میں وہ کچھ کہہ دیا جاتا ہے جس کا دیکھنے والے سننے والوں کو گمان تک نہیں ہوتا بال کی کھال نکالنا ٹی وی والوں کا فن ہے وہ اس میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں تمام ہی ٹی وی چینلو طرح طرح کے پروگرام تجزیوں، تبصروں کے نام پر طوفان برپا کرتے ہیں حالانکہ وہ خبر جس کے رد عمل کے طور پر حکومت کو اور افواج پاکستان کو خفت اٹھانا پڑی ہے وہ کسی

ایسے ہی گھر کے بھیدی نے باہر نکالی ہے جو میاں صاحب کی لنکا ڈھانا چاہتا ہے اور فوج کو اکسا کر اس سے اچھا بننا چاہتا ہے لیکن فی الحال تو الٹی آنتیں گلے پڑتی نظر آ رہی ہیں افواج پاکستان کا غصہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ ملکی اور قومی سلامتی چاہے وہ ملکی سرحدوں کی حفاظت سے متعلق ہو یا نظریاتی سرحدوں سے متعلق وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ایسا ہے بھی جس کا ثبوت ضرب عضب کے نام سے ملک کے اندر نظریاتی مخالفین کا مقابلہ کر کے ان کا صفایا کرنا اور پڑوسی ممالک کی ملکی سرحدوں پر دراندازی کو ہر قیمت پر روکنا اور انہیں منہ توڑ جواب دینا جس میں بلاشبہ اب تک کوئی کسی طرح کی کمی نہیں دیکھی گئی ملک کے اندر دہشت گردی پر قابو پانے اور بڑے شہروں کے امن و امان کو بحال کرنا یہ سیاست دانوں کا نہیں افواج کا ہی کارنامہ ہے حکمرانوں کی بے حسی اور عوام سے لاتعلقی کو دیکھتے محسوس کرتے ہوئے ہی شاید چیف جسٹس آف پاکستان کو یہ کہنا پڑا کہ ملک میں جمہوریت کے نام پر بادشاہت ہو رہی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہے چیف جسٹس آف پاکستان نے غالباً مجبور ہو کر ہی یوں کہا ہے کیونکہ تمام ہی سیاسی جماعتوں کا متفقہ مطالبہ ہے کہ میاں نواز شریف پانامہ لیکس سے متعلق اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کر دیں یا اقتدار چھوڑ دیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے سانپ کے منہ میں چھچھوندر پھنس کر رہ گئی ہے۔ میاں صاحب سے نہ نگلتے بن رہی ہے نہ اگلتے بن رہی ہے۔ وہ اقتدار کے نشے میں ایسے دھت ہیں کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال رہے ہیں۔

عوام بے چارے نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے وہ بے بسی سے افواج کی طرف دیکھ رہے ہیں کیونکہ جمہوریت کے نام پر حکومت کرنے والوں نے عوام کو لوٹ کر اس کا بھرکس نکال دیا ہے عوام میں اب وہ قوت وہ احساس ہی ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی ناانصافی زیادتیوں اور لوٹ مار کے خلاف کسی طرح کے ردعمل کا اظہار کر سکے شاید عوام کی اس بے بسی اور بے حسی کی نمائندگی جناب چیف جسٹس صاحب نے یہ کہہ کر کہ عوام سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کا استعمال کریں ایک عمدہ اور صائب مشورہ دیا ہے۔ عوام کی بے بسی اپنے عروج پر ہے مہنگائی کے طوفان کے باوجود سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہیں عوام کی خاموشی اور برداشت سے حکمران اور اہل سیاست ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں عوامی نمائندے جو عوام کے ووٹ سے ان کے نمائندوں کے طور پر قانون ساز اسمبلیوں میں براجمان ہیں انہیں بھی اس سے قطعی دلچسپی نہیں ہے کہ عوام کا ان کے اپنے ووٹر کا کیا برا حال ہو رہا ہے انہیں بھی اپنا الو سیدھا کرنے سے مطلب ہے عوام جائیں بھاڑ میں جب الیکشن ہوگا تب کی تب دیکھی جائے گی۔

افواج پاکستان کے سربراہ کو چاہیے کہ اس خبر کے اثرات کی تفتیش وہ خود کریں ان کے ساتھ اس خبر سے متعلق میٹنگ میں شریک ان کے چند معتبر ساتھی ہی ہوں گے جنرل صاحب اپنے گھر سے شروع کریں اس طرح اس میٹنگ کا ایک حصہ کلیئر ہو جائے گا باقی رہ گئے میاں صاحب کی بچھائی شطرنج کی بساط کے مہرے تو بھی چند ہی افراد ہوں گے درجن دو درجن یا سیکڑوں میں نہیں ہوں گے پھر انہیں چیک کر لیا جائے ساتھ ہی اس ایوان میں موجود خدمت گاروں کو بھی چیک کر لیا جائے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کر سامنے آ جائے گا اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ غلطی کہاں ہوئی اور کس نے کی۔ رہی اخبار کی یا اس کے نمائندے کی بات تو یہ ان کی مجبوری ہوتی ہے وہ ایسے افراد کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے مددگار ثابت ہو سکیں وہ ان کی خدمت بھی کرتے ہیں اور ان سے کام بھی نکال لیتے ہیں کوئی تو ہے جس نے گھر کا بھید افشاں کیا ہے۔

اللہ اہل وطن کی وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور عقل سلیم عطا فرمائے، آمین

اقبال بھٹی

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب میری امت میں گناہوں کی کثرت ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ خواص وعوام سب پر اپنا عذاب اتارے گا۔'' (احمد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

دسمبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے کوشش ہے کہ سیاسی، معاشی، نفسانفسی کے دور میں کسی حد تک نئے افق کے ذریعے آپ کو چند گھڑیاں سکون کی فراہم کرسکیں، ملک میں اک افراتفری سی مچی ہوئی ہے، کہیں قومی سلامتی کا مسئلہ ہے تو کہیں پانامہ لیکس کا شور ہے۔ کبھی بھارتی جارحیت کا خطرہ نظر آتا ہے تو کہیں دہشت گردی کا عفریت بے گناہ جانیں لے رہا ہے۔ اس سے ذہن ہٹاؤ تو مہنگائی کا اژدھام عام آدمی کو نگلنے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ ہر شے کے دام آسمان پر نظر آتے ہیں ایسے میں ہماری کوشش ہے کہ عوام کو اب بھی پچاس روپے میں سستی اور اچھی تفریح فراہم کی جائے ہم اب تک تو اس میں کامیاب ہیں، کوشش ہے کہ آئندہ بھی اس میں کامیاب رہیں ہر پرچے کی کامیابی کے لیے اشتہارات اہم ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے نئے افق اس معاملے میں کامیاب نہیں، اشتہارات کی کمی کے باعث ہم منافع تو دور کی بات خرچہ پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پارہے، دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے۔

اس ماہ ہم پاک بھارت اختلافات کے پس منظر میں امین بھایانی کا ایک خوب صورت افسانہ دے رہے ہیں جو وقت کی ضرورت ہے امید ہے دونوں طرف کے ادیب اور دانشور اس پہلو پر ضرور سوچیں گے۔ عوام ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے بس ایک طبقہ ہے دونوں طرف جو جنگ کے شعلے بھڑکا رہا ہے جن کی سیاست اور زندگی کا مقصد ہی یہی ہے کہ عوام میں نفرتوں کو ہوا دو اور خوب کماؤ، ہمیں مل کر اس سوچ کو ختم کرنا ہے۔ ان شاء اللہ آپ بہت جلد معروف مصنف، شاعر اور ڈرامہ نگار امجد بخاری کی پر اسرار سلسلے وار کہانی گورکھ دھندا نئے افق کے صفحات پر ملاحظہ کریں گے جو یقیناً آپ کے مزاج پر پورا اترے گی۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف پہلا خط ہے ایم اے راحیل کا لکھتے ہیں۔ سلام مسنون! اُمید کرتا ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ شرپسندوں کے شر سے محفوظ رکھے اور دین اسلام کے اُصولوں پر زندگی بسر کرنے کی توفیق دیتا رہے آمین ثم آمین۔ نئے اُفق نومبر کا میرے ہاتھوں میں ہے اور آج یکم نومبر کی شام ہے صفر المظفر کا چاند نظر آگیا ہے اور اپنے لئے، دوستوں کے لئے اور اہل اسلام کی کامیابی اور کامرانی کے لئے دُعائیں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری دُعاؤں میں اثر رکھ دے آمین! دستک میں جناب مشاق احمد قریشی صاحب خوبصورت الفاظ میں پاکستان اور پاکستان دُشمنوں کا نقشہ کھینچا ہے، میں آپ کے ساتھ مکمل اتفاق کرتا ہوں، پاکستان کا چراغ دُشمنوں کی پھونکوں سے نہیں بجھے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی آستین کے سانپوں سے بھی بچائے رکھے۔ ملک میں افراتفری کا عالم ہے۔ سیاستدانوں

نے پاکستان کو اکھاڑا بنادیا ہے اور روز نئی کشتی ہو رہی ہوتی ہے۔ میں جناب مشتاق احمد قریشی سے درخواست کروں گا کہ اِن اپنوں کو بھی ذرا شرم دِلائیں کہ کرسی کے چکر میں عوام کا کچومر نہ بنائیں اور عوامی لیڈر بن کر ملک و قوم کی خدمت کریں۔ امریکا جو کچھ بھی ہے لیکن وہاں کے الیکشن سب دیکھتے ہیں، کیسے پُرامن ہوتے ہیں اور جیت، ہار کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور یہاں۔۔۔۔۔؟ گفتگو میں عمران احمد قریشی صاحب نے خوبصورت لہجے میں ہمارے سوئے ضمیروں کو جگایا ہے۔ احسن ابرار رضوی سرفہرست تھے۔ خط پیارا تھا، دوسرا نمبر میرا تھا۔ بہت سے دوستوں نے محبت سے بلایا تو ہم رہ نہ سکے۔ سو چلے آئے اور میرے دوبارہ آنے سے کئی میرے عزیز دوست پانی پانی ہوگئے ہوں گے۔ عبدالحمید، مجید احمد جائی، صائمہ نور، ممتاز احمد، ریاض بٹ، عمر فاروق ارشد، عبدالجبار رومی انصاری، شجاعت حسین شجاع، ریاض حسین قمر، حسین جاوید کے خطوط تبصرے سے بھرپور تھے۔ مسکان بھٹی اصل میں مسکا بھٹی ہیں، موصوف چہرے پہ نقاب لگائے آن وارد ہوئے ہیں۔ چہرے پہ چہرہ سجا لینے سے اصلیت نہیں چھپتی اور آپ کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ صرف ایک ہی شخص کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ آپ پہ یہ مثل صادق آتی ہے، منہ مومنا اور کرتوت کافراں۔ اقراء ضمیروں کو جگانے کے لئے کافی ہے۔ انٹرویو میں اچھے اچھے سوالات اور جوابات تھے۔ مرگ قبل از مرگ، اچھی تحریر تھی، ایسا ہمارے ملک میں نہیں ہوتا ورنہ کئی مرنے والے زندہ ہو جاتے۔ حسن دو آتشہ تاریخی کہانی اعلیٰ رہی مگر تاریخی کہانیاں لکھتے ہوئے لکھاری تاریخوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں، جیسے قلوپطرہ کی موت، شوکت افضل کے مطابق اِس کو اُس کی باندی نے کوڑے مار مار کر تہہ خانے میں مار دیا تھا اور یہاں کچھ اور کہا جا رہا ہے۔ سزا، راستہ، خمیازہ بھی خوب تھیں۔ پس پردہ اور عذاب مسلسل، سنہرے دن، انتقام نے متاثر کیا، قسط وار کہانی اچھی جا رہی ہے اور ڈیول، خدا گواہ بہت اعلیٰ تحریریں ہیں۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن خوب تر ہیں۔

احسن ابرار رضوی......ساہیوال السلام علیکم! اِس دُعا کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرتا ہوں جہاں کہیں بھی ہوں گے خوشیاں بانٹنے میں مصروف ہوں گے۔ جدید دور میں کسی کے چہرے پہ خوشی کے آثار پیدا کرنا بھی تو نیکی ہے۔ ہر طرف اُداسی، مایوسی کے سخت پہرے ہیں، خوف پھیلا ہوا ہے۔ ماہ نومبر کا نئے اُفق ملا، سرورق زبردست ہے، اُڑتے بالوں کے ساتھ دوشیزہ حیرت میں ڈوبی ہوئی ہے اور آج کل لڑکیاں کچھ زیادہ ڈائٹنگ کرنے لگی ہیں، تبھی تو سمارٹ اور جسم پہ گوشت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی حال سرورق کی دوشیزہ کا بھی ہے۔ نئے اُفق میں گفتگو میں عمران احمد قریشی کی باتیں پڑھ رہا تھا کہ کوئٹہ میں دھماکا کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ اُف میرے اللہ! ہمیشہ کوئٹہ ہی کیوں جلتا ہے، کبھی ایئربیس پہ حملہ، کبھی پولیس ٹریننگ سنٹر پہ حملہ، کبھی پشاور اسکول کے بچوں پہ حملہ۔۔ کتنے بزدل ہیں یہ دہشت گرد۔ پیٹھ پہ وار کرتے ہیں، سینہ پہ وار کیوں نہیں کرتے، شاید یہ خود ڈرتے ہیں۔ بچوں، عورتوں، بوڑھوں پہ حملہ کرتے ہیں، کبھی مردوں کے سامنے آکر لڑیں تو ان کی جرات مانیں۔ بزدل کہیں کے۔ حکومت کو شاباش کہ شہید ہونے والوں کو فوراً رقم دینے کا اعلان کرتے، کمیٹی تشکیل دیتے ہیں، دہشت گردوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور پھر لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ ان کو مگرمچھ والے آنسو بھی بہانے نہیں آتے بیچارے۔ منہ بسورتے ہیں اور اپنی اپنی فکر میں لگ جاتے ہیں۔۔۔ دو تین دن بعد پھر یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ بوجھل دل کے ساتھ دستک پڑھی جہاں مشتاق احمد قریشی، وطن دُشمنوں کو چیلنج کر رہے تھے کہ یہ چراغ پھونکوں سے بجھنے والا نہیں ہے۔ سچ ہی تو کہتے ہیں جس چراغ کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرے اُس کو کوئی طوفان نہیں بجھا سکتا۔ گفتگو میں عمران احمد کی باتیں بہت پیاری تھیں اے کاش ہم اِن پہ عمل کر سکتے۔۔ پہلا خط میرا لگایا گیا۔ بہت شکریہ۔۔۔ ایم

اے راحیل بھی کھری کھری باتوں کے ساتھ جلوہ افروز تھے،عبدالحمید،مجید احمد جائی،صائمہ نور،ریحانہ سعید،ممتا زاحمد،ریاض بٹ،عمر فاروق ارشد،عبدالجبار رومی انصاری،شجاعت حسین شجاع بخاری،ریاض حسین قمر،حسین جاوید،ایم حسن نظامی نے محبت بھرے پروانے لکھے۔اقراء میں طاہر احمد قریشی نے اللہ تعالیٰ کے ناموں پہ لکھ کر دل کی کھڑکیاں کھولنے پہ مجبور کر دیا۔انٹرویو میں محمد یاسین صدیق نے فاروق انجم سے ملوایا۔ملاقات کر کے مزہ آ گیا۔کہانیوں انتقام،سنہرے دن،مرگ قبل از مرگ،عذاب مسلسل،خمیازہ،راستہ،حسن دو آتشہ،سزا،کرن بہت پیاری تحریریں تھیں،فن پارے بھی کمال کے تھے اور ڈیول،خدا گواہ میں زریں قمر نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن بھی کمال کے تھے۔

مجید احمد جائی ......ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیر بانٹتے ہوں گے۔۔اللہ تعالیٰ عالم اسلام کا بول بالا اور دُشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔آمین! اللہ تعالیٰ ہماری دُعاؤں کو شرف مقبولیت بخشے اور ہمیں نیک اعمال کرنے اور صراط مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین! اللہ تعالیٰ سے ہر وقت خیر کی دُعا کرنی چاہیے اور دوسروں کی اصلاح کرنے سے پہلے خود کی اصلاح کرنی چاہیے۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی خامیاں بھی دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں اور دوسروں کی خوبیاں اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور دلوں میں کدورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔کیا ہی اچھا ہو ہم دوسروں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے خود کو سیدھے راستے پہ گامزن کر لیں۔۔۔ماہ نومبر کا اعزازی پرچہ ادارہ کی طرف سے موصول ہوا۔۔بہت بہت شکریہ۔۔۔نوازش۔۔سرورق کسی انگریزی فلم کی کہانی سُنا رہا ہے۔بنانے والے نے کیا خوب رنگ بھرے ہیں۔دستک میں جناب محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے خوب پردے فاش کئے ہیں اور یہی حقیقت بھی ہے۔لیکن امریکا،بھارت،افغانستان مل بھی جائیں تب بھی پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔بھارت میں اندرونی توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور بھارت کی فوج خوف میں مبتلا ہو چکی ہے۔مودی کی دہشت گردی کھل کر سامنے آ گئی ہے اور اب وہ گیدڑ کی طرح منہ چھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔پاکستان کو خطرہ ہے تو اپنے ہی حکمرانوں سے،جو خود بھی اپنے آپ سے مخلص نہیں رہے۔۔۔آپ کی بات بالکل سچ ہے کہ" پاکستان تو اللہ کا انعام عظیم ہے اس کی حفاظت اللہ خود کر رہا ہے"گفتگو میں عمران احمد بھائی نے بڑی خوبصورت باتیں کی ہے،میرے بھائی اسلامی اُمہ پیارے آقا ﷺ کے اسوہ حسنہ پہ عمل پیرا ہو جائے تو تمام بُرائیاں،تمام نفرتیں ختم ہو جائیں گی اور امن،اخوت و بھائی چارہ کی فضا قائم ہو جائے گی۔ہم دین اسلام کے احکامات کو پس پردہ ڈال چکے ہیں۔ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے،آپس میں اتحاد قائم کرنا ہو گا۔۔آپس کے جھگڑے فساد ختم کرنا ہوں گے۔۔۔ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا شہری بننا ہو گا۔۔اس بار صدارت کی کرسی جناب محترم احسن ابرار رضوی کے حصے میں آئی۔جناب آپ نے مجھے خطوط کا شہنشاہ کا خطاب دے ڈالا،عرض کروں گا میرے بھائی،میں تو کچھ بھی نہیں،،،میں خاک ہوں۔۔۔میری اوقات کیا۔۔۔طفل مکتب ہوں۔۔۔سیکھ رہا ہوں اور آپ میرے اس عمل کو روکنا چاہتے ہیں۔۔مہربانی کریں۔۔۔ایم اے راحیل،ہماری فرمائش پر لوٹ آئے۔۔گفتگو میں نوک جھوک چلتی رہتی ہے۔۔۔الزام لگتے ہیں۔۔۔لیکن انسان کو اپنا کام کرنا چاہیے اور اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔۔چار دن کی زندگانی ہے،ان خرافات میں گزار کر زندگی کو گرہن نہ لگائیے۔۔۔میری مانیے،محبت بانٹیے پھر دیکھنا۔۔۔زندگی کیسے کیسے رنگ بدلتی ہے۔۔۔عبدالحمید بھائی بہت شکریہ نوازش،آپ کو میرا خط پسند آیا اور میرا انداز۔۔۔یہ سب اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے وگرنہ،میں کیا میری بساط کیا۔آپ

کا خط مدلل اور شاندار رہا۔ ریحانہ سعید کی مختصر حاضری اچھی رہی ۔ممتاز احمد کا خط وضاحت بھرا تھا۔ ریاض بٹ صاحب میں بالکل بافضل رحمان خیریت سے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں ،رحمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ۔عائشہ اے بی ،خوش آمدید۔۔عمر فاروق ارشد بھائی ،لگتا ہے آپ خطوط بغور نہیں پڑھتے ورنہ یہ شکایات نہ ہوتیں۔۔بندہ ناچیز نے واضح طور پر آپ کی غیر حاضری کا حوالہ دیا تھا،لوٹ آنے کی درخواست بھی۔اسی طرح گل مہر صاحبہ،ناز ذشے،صاحبہ،منشی محمد عزیز مئے ،اور بہت سے ساتھی غائب ہیں ،اللہ کرے خیریت سے ہوں ۔عبدالجبار رومی انصاری بھائی ،آپ کی محبتیں ہیں کہ میرے در دولت پہ تشریف لائے ،،میں آپ کی خدمت نہ کر سکا۔۔۔ریاض حسین قمر آپ دل میں بستے ہیں ،آپ کی غیر حاضری ہو تو دِل مچلتا ہے تڑپتا ہے ،دعائیں دیتا ہے ۔۔گفتگو کے سبھی ساتھی عزیز ہیں اور اگر ان میں سے کوئی غیر حاضری ہو دِل پریشان سا ہو جاتا ہے اب دیکھیں ناں احسان سحر میانوالی چند ماہ سے غائب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میرا آخری خط ہو کیونکہ مصروفیات کا سانپ پھن پھیلائے ہوئے ہے ،ایک ناول اور سفر نامہ پہ کام کر رہا ہوں اور اُدھر ایم فل کی تیاری بھی ہو رہی ہے۔۔بحرحال کوشش تو یہی ہو گی کہ شامل گفتگو رہوں۔ حسین جاوید ،ایم حسن نظامی کی انٹری بھی خوب رہی۔ اقراء میں اسم اعظم ،طاہر بھائی نے صفاتی ناموں پہ لکھ کر احسان عظیم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اجر سے نوازے۔ فاروق انجم کا انٹرویو یاسین صدیق بھائی لائے ،معیاری ،معلومات اور بہترین سوالات سے مزین انٹرویو رہا۔ کمی رہی تو صرف اتنی کہ فاروق انجم کی تصویر نہیں تھی۔ محمد یاسین صدیق بھائی کی ''خمیازہ'' پڑھی ۔۔ بظاہر آپ کی تحریر معاشرے کی عکاس ہے ۔آپ نے نازک مسائل پہ قلم اُٹھایا ہے لیکن میں اتفاق نہیں کرتا۔۔۔ کیونکہ اسلامی معاشرے میں کوئی بھی عورت خود کو کسی مرد کے حوالے نہیں کرتی۔ اس میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔۔۔ورنہ آپ راہ چلتی کسی لڑکی اور عورت کو چھ تک نہیں کر سکتے۔ خمیازہ میں صفدر کا بھی قصور تھا۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر گناہ کی طرف مائل ہوا۔ رہا افضل کا سوال تو جس طرح غائب ہوا تھا ،قتل کا الزام اُسی پہ جاتا تھا کیونکہ مقتول بتا کر تو نہیں گیا کہ میں نے خودکشی کی ہے ۔آخری ہچکی کے وقت اُس کے لبوں پہ افضل کا نام تھا۔۔۔ بحرحال اچھی تحریر تھی۔ ''پس پردہ'' ریاض بٹ نے اس بار نازک مسئلے پہ قلم کے نشتر چلائے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ غصے میں انسان ،شیطان بن جاتا ہے اور غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے بعد میں پچھتاتا ہے۔ اسی لئے تو فرمایا گیا ہے کہ غصہ حرام ہے ۔''حسن دو آتشہ'' محمد عرفان رامے صاحب کو پہلی دفعہ نئے اُفق کے پلیٹ فارم پہ دیکھا ہے اور تاریخی کہانی کے حوالے سے خوب شہرت رکھتے ہیں۔ جب سے ایڈیٹری سے ہٹے ہیں خوب لکھ رہے ہیں۔ ''کرن'' مرگ قبل از مرگ'' ،سنہرے دن ۔ خدا گواہ ،زبردست رہی۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں خوب چل رہا ہے مگر اِس میں انگریزی کا ہونا ہضم نہیں ہو رہا کیونکہ نئے اُفق کو بہت سے قاری پڑھتے ہیں جن میں واجبی تعلیم والوں کی اکثریت زیادہ ہے ۔انگریزی کی جگہ ترجمہ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ''عذاب مسلسل'' سچے واقعے پر مبنی ہے جسے میں نے الفاظ کا روپ دے کر کہانی کی صورت میں آپ کو پیش کی تھی۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں ۔۔۔اللہ حافظ!

صائمہ نور......ملتان آداب! دُعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ امن کی زندگی بسر کرنے کی توفیق دے اور اِن خوشگوار لمحوں کی مسرتوں میں قید بھی ہوں کہ آپ حقیقی خوشیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پاک سرزمین کو امن کا گہوارہ بنائے اور دُشمنوں کو نیست و نابود کرے۔ یہ جو فضائیں دھواں دھواں سی ہیں ،مہکی مہکی خوشبوؤں سے معطر ہوں۔ یہ جو سڑکیں خون سے سُرخ ہو رہی ہیں ،اللہ کرے یہ سڑکیں زرمبادلہ کمانے میں کام

آئیں اور خونی بادل چھٹ جائیں۔۔کوئٹہ ایک بار پھر دھواں دھواں ،لہولہو ہے۔پولیس ٹریننگ سنٹر میں دھماکا۔پھر بچے یتیم ہوئے ،سہاگ اُجڑ گئے ،مائیں لٹ گئیں ،جسموں کے اعضاء بکھرے گئے ،ہر طرف خون ہی خون ،خوف ہی خوف۔۔۔شہید ،زخمی ،حکمرانوں کی عیادت۔۔۔آخر یہ کب تک چلے گا۔اُدھر دھماکہ کی خبر نشر ہوئی ،اِدھر شہید ہونے والوں کو دس دس لاکھ کی رقم دینے کا اعلان۔ہمیں حکمت عملی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔۔اب یہ خونی کھیل بند کروانا ہو گا۔۔ہمیں متحد ہو جانا چاہیے اور اپنا تن من دھن وطن پہ قربان کرنے کے لئے میدان میں آنا چاہیے۔اب وعدوں کا وقت نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔دُشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واصل جہنم کرنا ہوگا ،تب ہی امن قائم ہوگا اور خوف و ہراس کی فضائیں ختم ہوں گی۔ماہِ نومبر کا نئے اُفق ملا ،سرورق بہت پیارا اور کشش بھرا تھا۔دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی ''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا'' کے پس منظر میں لکھ رہے تھے اور اب تو یہ چراغ پلکو سے بجھائے جا رہے ہیں ،دُشمن اپنی چالیں چل رہا ہے اور ہم کان تک نہیں دھرتے۔۔۔اِنسان مولی گاجر کی طرح کٹ رہے ہیں اور حکمران کُرسی کُرسی کی گردان میں غرق ہیں۔گفتگو میں عمران احمد قریشی احادیث کے حوالے دے رہے تھے مگر یہ قوم سُوئی ہوئی اور سُہانے دِنوں کے خواب دیکھ رہے ہیں ،اب سوچنے کا وقت نہیں ہے ،عمل کا وقت ہے ،ہمیں ایک دوسرے کے گریبانوں کو چھوڑ کر دُشمن کے گریبان پکڑنے ہوں گے اور اُن کو سزا دلوانی ہوگی۔۔۔ورنہ۔۔۔دُشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور ہم غلامی در غلامی کی زنجیریں اپنے گلے میں ڈال لیں گے۔۔صدارت احسن ابرار رضوی کر رہے تھے ،بھائی قابل تحسین تو آپ خود ہیں ،ایم اے راحیل ناراضگی ختم کر کے لوٹ آئے۔دل خوش ہوا۔عبدالحمید بھیا اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے ،آمین۔بہت شکریہ۔۔مجید احمد جائی کا طویل خط اچھا رہا۔انکل ممتاز احمد کے ایکسڈنٹ کا سُن کر شاک سا لگا۔۔اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے ،آپ پھر سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے کہانیاں لکھیں۔۔۔اب طبیعت کیسی ہے۔۔۔اپنا بہت سا خیال رکھئے گا۔ریاض بٹ آپ کی کہانی ''پس پردہ'' شاندار تھی ،عمر فاروق ارشد کمال کرتے ہیں ،آپ بھلا بھولنے کی شئے ہیں ،بس آپ جلدی سے مزاحیہ کہانی دیں۔مسکان ظفر بھٹی ،آپ دوسروں میں کیڑے نکالنے سے بہتر ہوتا خود کا جائزہ لیتی۔۔کہانیوں پر بغیر پڑھے تبصرے نہیں ہوا کرتے ،اور ''بکرا کہاں ہے'' ''عنبرین اختر کی نہیں تھی ،،کے ایم خالد کی تھی ،،،،اگر آپ بغور مطالعہ کرتیں تو اچھا ہوتا۔۔۔عبدالجبار رومی انصاری آپ ملتان آئے اور نو بہار نہر بھی دیکھ گئے ،،خوشی ہوئی ،دُعا کریں یہ نہریں ہمیشہ چلتی رہیں تاکہ ہمارے کھیت ہرے بھرے سر سبز رہیں اور ہم زیادہ سے زیادہ زر مبادلہ کما سکیں آمین۔شجاعت حسین شجاع بخاری ،بہت شکریہ۔۔۔ریاض حسین قمر بہت شکریہ آپ نے میرے خیالات کے ساتھ اتفاق کیا۔آپ بھی سچ کہتے ہیں۔حسین جاوید اور ایم حسن نظامی نے بھی عمدہ لکھا۔اقراء پڑھ کر دل کو سرور ملا ،انٹرویو بہت اعلیٰ تھا۔محمد یاسین صدیق اور اُس کے پینل نے خوبصورت سوال کئے اور فاروق انجم صاحب نے بھی عمدہ جواب دیئے۔کہانیوں میں پس پردہ جرم وسزا سے لبریز عمدہ اور پیاری کہانی تھی ،ایک تلخ حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔بہت خوب ریاض انکل ،خمیازہ ،محمد یاسین صدیق نے عورت کو قصوروار ٹھہرایا۔حالانکہ مرد حضرات بھی عورت کے بغیر ادھورے ہیں۔مرد ہی عورت کو عزت دیتے ہیں اور ذلیل وخوار کرتے ہیں۔کرن مہتاب خان عمدہ لکھتی ہیں۔حسن دو آتشہ تاریخی کہانی اچھی رہی ،انتقام ،مرگ قبل از مرگ ،سنہرے دن ،خدا گواہ ،ابدی حیات ،سزا ،عذاب مسلسل پیاری کہانیاں تھیں۔اگر نئے اُفق میں سفرنامے شامل کئے جائیں تو سونے پہ سہاگہ ہو جائے گا۔ذوق آگہی ،خوش بوئے سخن بھی زبردست تھے۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، امید ہے کہ آپ اور آپ کی ٹیم بخیریت ہوگی ماہ نومبر کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور تقریباً کافی حد تک پڑھ بھی لیا ہے اس لیے تبصرہ لکھ رہا ہوں اچھی کہانیوں میں خدا گواہ، ابدی حیات، انتقام، سنہرے دن، قافلہ شہیدوں کا، مرگ قبل از مرگ، پس پردہ، عذاب مسلسل، خمیازہ، راستہ اور سزا سب ہی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، میری طرف سے سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک باد قبول رسالہ آج کل دیر سے ملتا ہے اور جس کی وجہ سے خط میں بھی دیر ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک عدد کہانی روپ نام سے ارسال کی تھی کیا وہ کہانی چھپ جائے گی اور میری طرف سے آپ کو اور آپ کی تمام ٹیم کو بہت بہت دعا و سلام قبول ہو۔

مہتاب خان...... کراچی۔ محترم مشتاق قریشی صاحب اقبال بھٹی صاحب اور دیگر اسٹاف کو اسلام علیکم اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت مند اور خوش رکھے اور تمام آفات سے محفوظ رکھے، آمین۔ اس بار پرچے کا ٹائٹل خوب صورت تھا دستک مشتاق قریشی صاحب کی بہترین قلمی کاوش ہے جو ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے اس میں اب کوئی شبہ نہیں کہ بھارت افغانستان کو پاکستان کے خلاف استعمال کر رہا ہے کوئٹہ پولیس ٹریننگ سینٹر پر ہونے والا حالیہ واقعہ اس کا ثبوت ہے اس میں افغانستان اور بھارت کے ملوث ہونے کے ثبوت ملے ہیں۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے اور ایسے سازشی دشمن کو منہ کی کھانی پڑے۔ گفتگو کے سلسلے میں شامل ہونا میری دلی خواہش ہے مگر ہر ماہ خط لکھنے میں تاخیر ہو جاتی ہے بہر حال میں اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں ہم سب ایک فیملی کا حصہ ہیں۔ فاروق انجم صاحب کا انٹرویو ان کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے تھا یاسین صدیق مبارک باد کے مستحق ہیں خدا گواہ لکھ کر زرین قمر نے کشمیر سے محبت کا حق ادا کر دیا، حساس موضوع پر ان کی تحریر لاجواب تھی، ابدی حیات سلیم اختر صاحب کی اچھی کہانی تھی۔ مگر ایک جملہ پسند نہیں آیا سہاگ کا سندور ہندو سہاگن کی نشانی ہوتا ہے مسلمانوں کی نہیں رائٹرز ایسے جملوں کا خیال رکھیں تو بہتر ہے، سنہرے دن میں دستگیر شہزاد صاحب نے ہمارے جاگیر دارانہ معاشرے کی خوب صورت عکاسی کی ہے قافلہ شہیدوں کا مہر پرویز نے ایک اچھے موضوع کو چنا ہے مرگ قبل از مرگ حسیب جواد علی صاحب نے سچے واقعے کو دلچسپ پیرائے میں لکھ کر دل جیت لیا ریاض بٹ صاحب میرے پسندیدہ رائٹر ہیں کہانی پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے پس پردہ سسپنس سے بھرپور لاجواب کہانی ہے بہت پسندی محمد حنیف رامے ایک جانے مانے رائٹر ہیں قلوپطرہ جیسی ہستی کا بیان پھر رامے صاحب کا قلم واقعی حسن دو آتشہ تھا باقی کہانیوں میں انتقام، راستہ، سزا اچھی کہانیاں تھیں ذوق آگہی میں انتخاب اچھا تھا سلسلے وار کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں فن پارے کا سلسلہ اچھا ہے اسے جاری رکھیں اور ایک مشورہ ہے اس میں دیس بدیس کے ایوارڈ یافتہ کہانیاں شائع کریں اب اجازت دیجیے ان شاء اللہ آئندہ بھی تبصرے کے لیے حاضر ہوتی رہوں گی۔

ریاض بٹ ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم ایک سندر اور منفرد سرورق لیے نومبر 2016ء کا شمارہ 26 اکتوبر کو پوسٹ مین کے توسط سے ملا تو انتظار کی جانگسل گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں، اشتہارات پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھے تو لسٹ میں اپنی کہانی دیکھ کر خوشی ہوئی، بہت شکریہ۔ گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب نے جو حدیث نبوی لکھی ہے، وہ عمل کرنے کا تقاضہ کرتی ہے ان کی باقی باتیں جو انہوں نے خطوط سے پہلے لکھی ہیں وہ بھی موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں ہم واقعی ایک دوسرے کو رنگ، نسل اور فرقہ کی بنیادوں پر قتل کر رہے ہیں اب بڑھتا ہوں خطوط کی طرف پہلا خط ہے احسن ابرار رضوی کا بھائی آپ نے واقعی ایک انمول بات کی طرف توجہ دلائی ہے ہم واقعی پہلا

اسلامی مہینہ بھول جاتے ہیں اور ہمیں انگریزی سال کا پہلا مہینہ یاد رہتا ہے۔ میرا خط اور کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ ایم اے راحیل آپ نے اچھا کیا کہ لوٹ آئے بھلا اپنوں سے بھی کوئی مستقل خفا ہوتا ہے، باقی گلے شکوے تو ساتھ ساتھ ہیں آپ کو بھی میری تحریر کردہ کہانی احمقوں کا ٹولہ پسند آئی جس کے لیے آپ کے اعلیٰ ذوق کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی عبدالحمید صاحب آپ نے جن الفاظ میں میرے خط کی تعریف کی ہے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بہر حال شکریہ اور میری کہانی کو بہت زیادہ پذیرائی دینے پر مہربانی، آپ نئے افق کے سالانہ خریدار بن جائیں تو ٹینشن سے بچ جائیں گے مجید احمد جائی بھائی ہمیشہ کی طرح آپ کا خط منفرد اور اپنے اندر سمندر کی گہرائی لیے ہوئے ہے آپ کیا خوب لکھتے ہیں اور آپ کو اپنا مدعا بیان کرنا خوب آتا ہے میرا خط اور کہانی پسند کرنے پر یہ بندہ ناچیز تہہ دل سے مشکور وممنون ہے، صائمہ نور بہن کیسی ہو، بھائی کی طرف سے دعائیں قبول کرو، آپ نے بھارت کا اصلی چہرہ لفظوں کے آئینے سے دکھانے کی کوشش کی ہے جو قابل غور اور قابل تحسین ہے آپ کو بھی میرا خط اور کہانی اچھی لگی آپ کی عنایتوں کا بھی مقروض ہوں ریحانہ سعیدہ بہن لکھاری کو قابل تقلید کرداروں پر ہی لکھنا چاہیے روشنی دکھانی چاہیے بہر حال اچھے لوگ ہر دور میں رہے ہیں تبھی تو یہ دنیا چل رہی ہے۔ عائشہ خواجہ، عائشہ اے بی (بہن پورا نام لکھو) خوش آمدید، آپ کے لیے محفل کے دروازے کھلے ہیں مختیار احمد صاحب آپ کا تعلق شاہینوں کے شہر سے ہے اس لیے تبصرہ بھی بہت بلند اور اعلیٰ کرتے ہیں جو چیز تعریف کے قابل ہو اسے اچھا نہ کہنا حسد کرنے کے مترادف ہے آپ نے بھی میری کہانی اور خط پسند کیا بہت نوازش آپ لکھتے رہے تو ان شاء اللہ بہت جلد چھا جائیں گے عمر فاروق ارشد بھائی آپ کا تبصرہ بھی تعریف کے قابل ہے، مسکان ظفر بھٹی صاحب میری کہانی کی تعریف کرنا آپ کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ عبدالجبار رومی انصاری میرا تبصرہ آپ کو بھی اچھا لگا جس کے لیے مہربانی، شجاعت حسین بخاری، میری تفتیشی کہانیاں آپ کے معیار پر پوری اترتی ہیں یہ حوصلہ افزائی میرے لیے تقویت کا باعث ہے اللہ آپ کو خوش رکھے ریاض حسین قمر بھائی شکر ہے اس پاک ذات کا کہ اب آپ مکمل روبصحت ہیں میری دعا ہے آپ ہمیشہ پھولوں کی طرح خوش وخرم رہیں، یعنی مہکتے رہیں بھارت کا اصل چہرہ آپ نے بھی دکھایا اور بڑے اچھے طریقے سے دکھایا لیکن آج کل کی جوان نسل کو کون سمجھائے جو بھارت کے ڈرامے اور فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں میری تفتیشی کہانیاں پسند کرنے کا بے حد شکریہ، حسین جاوید اور ایم حسن نظامی بھائی آپ کے تبصرے بھی خوب ہیں۔ میری تحریر کردہ کہانی احمقوں کا ٹولہ اور خط پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف مجید احمد جائی کی کہانی عذاب مسلسل ایک سبق آموز اور عبرت اثر تحریر ہے جب انسان حیوان بن جاتا ہے تو ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتا ہے اور پھر کیے کی سزا تو دنیا میں بھی ملتی ہے ویل ڈن، مرگ قبل از مرگ حسیب جواد علی کی ایک منفرد کہانی ہے دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے پھر جب تک انسان کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوتے وہ یہ دنیا چھوڑ نہیں سکتا جاوید احمد صدیقی نے انگریزی ادب سے ایک اچھی کہانی کا انتخاب کیا اور بڑے اچھے طریقے سے اسے احاطہ تحریر میں لائے انتقام ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو پاگل بنا دیتا ہے، صداقت حسین ساجد کی کہانی راستہ کا کیا کہنے بہت اچھی اور موثر تحریر ہے واقعی نیت اچھی ہو تو راستے خود بخود گلزار بن جاتے ہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر دور میں اچھے لوگ رہے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے عارف شیخ کی سزا بھی دل کو بھا گئی، غلط کاموں کی سزا تو ضرور ملتی ہے اور قدرت انسان سے اس کی پیاری چیز چھین لیتی ہے مہتاب خان نے کہانی کرن لکھ کر یہ ثابت کیا کہ وہ ایک اچھی لکھاری ہیں، انسان کی مجبوریوں کو بڑے اچھے طریقے سے

اجاگر کیا اور مثبت کرداروں سے روشناس کرایا قافلہ شہیدوں کا (مہر پرویز احمد دولو) اور خدا گواہ (زرین قمر) کی لا زوال داستانیں ہیں، بہت خوب، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ذوق آ گہی اور خوش بوئے سخن کا سارا انتخاب بے مثال ہے اور پرچے میں موجود کترنیں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب سلام مسنون رب ذوالجلال آپ کو اور آپ کے رفقا کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے، ماہ نومبر کا نئے افق ہاتھوں میں ہے ٹائٹل اس بار سادہ سا تھا لیکن اتنا بھی سادہ نہیں دوشیزہ اپنے بالوں میں سجائے ٹائٹل پر براجمان ہیں اس دفعہ فہرست کا انداز بہت اچھا لگا لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ہر ماہ ہی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے حسب سابق اس بار بھی دستک میں انہوں نے اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ہمارے لیے چشم کشا ہیں امریکا ہمیشہ ہی اپنے قریبی دوستوں سے بے وفائی کرتا ہے یہ چیز اس کی گھٹی میں پڑی ہے بلکہ کسی نے فرمایا تھا کہ امریکا کی دوستی اس کی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہے رب العزت ہمیں امریکا کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ گفتگو میں اس بار خطوط کو جناب اقبال بھٹی صاحب نے ترتیب دیا بھٹی صاحب آپ کے مزاج کیسے ہیں گفتگو کے شروع میں آپ نے بھی بڑی پیاری حدیث بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے آمین۔ گفتگو کے آغاز میں جن پیارے جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ نا قابل تردید حقائق کی ترجمانی کر رہے ہیں خداوند قدوس آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے آمین، کرسی صدارت پر اس بار محترم احسن ابرار رضوی صاحب متمکن ہوئے رضوی بھائی مبارک ہو، آپ نے خوب صورت خیالات کا اظہار فرمایا تبصرہ بھی جاندار تھا آپ نے میرے خط کی پذیرائی فرمائی بے حد شکر گزار ہوں، ایم اے راحیل صاحب آپ محفل میں لوٹ آئے اس سے آپ نے ہم سب کا مان بڑھایا رب کریم آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے بھائی میاں کرامت حسین کے بارے میں آپ نے جو لکھا اس سے دل دکھی ہوا آپ کو ان کے بارے میں ایسے الفاظ نہیں لکھنے چاہیں تھے ہمیشہ باادب بانصیب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے محترم عبدالحمید صاحب ایک خوب صورت خط کے ساتھ شریک محفل ہوئے حمید بھائی کسی اچھی چیز کو نہ سراہنا بھی ایک اخلاقی جرم ہے بہر حال میرے تبصرے کو پسند فرمانے کا شکر گزار ہوں اس بار بھی آپ کا خط بڑا مدلل اور خوب صورت ہے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ پیارے مجید احمد جائی بھائی آپ ایک خوب صورت بھرپور اور طویل تبصرے کے ساتھ تشریف لائے آپ نے اپنے خط میں بڑے اچھے اور خوب صورت خیالات کا اظہار فرمایا آپ کے خیالات کی سو فیصد تائید کرتا ہوں، کاش ہم کچھ سمجھ سکیں، تبصرہ پسند فرمانے کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، محترمہ صائمہ نور صاحبہ کا خط حسب سابق بہت ہی خوب صورت تھا پہلے کی طرح انہوں نے بہت خوب صورت خیالات کا اظہار فرمایا رب ذوالجلال انہیں حفظ وامان میں رکھے، آمین۔ آپ نے میرے خط کو اتنی پذیرائی بخشی میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، ریحانہ سعیدہ صاحبہ کا خط اور تبصرہ قابل تعریف ہے عائشہ خواجہ کا خط پڑھ کر تو لگا کہ خط لکھتے لکھتے انہیں ہانڈی جلنے کی خوش بو آ گئی تو وہ اللہ حافظ کہتی ہوئی بھاگ گئیں، جناب ممتاز احمد صاحب کا خط بہت خوب صورت تھا انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال صاحب کے انٹرویوز کے بارے خوب وضاحت فرمائی امید ہے محترم کرامت حسین کی تشفی ہو گئی ہو گی، ممتاز بھائی آپ کو میرا خط اور تبصرہ پسند آئے شکریہ قبول فرمائیے۔ پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب خط حسب سابق بہت خوب صورت ہے اور اس شمارے میں ان کی کہانی پس پردہ ان کے خط سے بھی زیادہ حسین ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے قلم میں اور روانی عطا فرمائے آمین آپ نے جس طرح گفتگو میں چھپے میرے خط کو سراہا اور خوش بوئے سخن میں چھپی میری

غزل کو پسندیدگی کی سند عطا فرمائی اور میرے لیے رب العزت سے جس طرح دعا فرمائی اس سب کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں، عائشہ اے بی پہلی بار گفتگو میں حاضر ہوئی ہیں موسٹ ویلکم اب با قاعدگی سے آتی رہیے گا، اس بار میرے بہت ہی عزیز دوست اور بھائی عمر فاروق ارشد صاحب کچھ نالاں نالاں سے نظر آئے بھائی آپ بھی کوئی بھولنے والی چیز ہیں یہ ہو جاتا ہے جیسے آپ اپنے خط میں اپنے قریبی دوست ریاض حسین قمر کے بارے میں ایک لفظ بھی لکھنا بھول گئے باقی بھائی محترم مشتاق احمد قریشی صاحب ہمیشہ دستک میں اس ملک کی غلیظ سیاست پر ہی تبصرہ فرماتے ہیں اور ان کے خیالات کی تائید میں قارئین کو کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے وہ بھی یقیناً سیاسی ہوگا اور لکھنے والا جب من حیث القوم لکھتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس میں شامل کرتا ہے اگر کوئی اس قوم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کو فرشتہ تصور کرتا ہے تو اس سے بڑا کوئی خوش فہم نہیں ہو سکتا، محترمہ مسکان ظفر بھٹی کا مختصر تبصرہ پسند آیا، عبد الجبار رومی انصاری بھائی نے بہت اچھا تبصرہ کیا بھائی تبصرہ پسند فرمانے پر میری طرف سے دلی مبارک اور شکریہ قبول فرمایئے، شجاعت حسین شجاعت بخاری صاحب وعلیکم السلام آپ کیسے ہیں آپ نے میرے خط اور تبصرے کو پسند فرمایا تھینک یو سوچ حسین جاوید صاحب مختصر مگر اچھے تبصرے ساتھ تشریف لائے اور کلام پسند فرمانے پر شکریہ قبول فرمایئے محترم ایم حسن نظامی صاحب آپ کے خط میں قارئین کیلئے محبت کی خوشبو رچی ہوئی تھی اللہ آپ کو خوش رکھے، محترم طاہر قریشی صاحب اقرا میں آپ نے جس طرح رب العزت کی سب سے عظیم ہستی کو پیش کیا ہے وہ آپ ہی کو زیبا ہے محترمہ زرین قمر صاحبہ اپنی قسط وار کہانی ڈیول کے علاوہ آزادی کشمیر کے پس منظر میں ایک بہت ہی اچھی کہانی خدا گواہ لائی ہیں انہوں نے اپنے قلم سے لکھنے کا حق ادا کر دیا، ریاض بٹ صاحب کی تفتیشی کہانی پس پردہ بہت خوب صورت رہی باقی کہانیوں میں بھی لکھاریوں نے کہانی لکھنے کا حق ادا کر دیا فن پارے میں سب آرٹیکل فردوس حزیں، دکھ کی فصیل، آنسو کی طاقت، دیرآید اور یقین کامل اپنی اپنی جگہ خوب رہیں فاروق انجم کا طویل انٹرویو بہت پسند آیا ذوق آگہی میں ہر آئٹم ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ خوش بوئے سخن میں نوشین اقبال نوشی نے اچھے کلام کا انتخاب کیا ہے مجموعی طور پر اس ماہ کا جریدہ بہت ہی قابل ستائش ہے۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار سرورق پر حسینہ اپنے بالوں پر پھول سجائے ہوئے تھی اس پر میں تو یہ کہوں گا

ہو میرا رفیق سفر مگر اتنا تو معتبر ہو
میں پھول مانگوں تو یہ نہ کہے کہ موسم گزر گیا

دستک میں آپ بھارت اور اس کے دم چھلے افغانستان کو لتاڑ رہے تھے یہ وہی افغانستان ہے جس کے ہم پاکستانیوں نے لاکھوں پناہ گزینوں کو جگہ دی پاک چین دوستی کے شاہ کار مشترکہ منصوبے سی پیک نے دشمن ملکوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں یہ منصوبہ ان شاء اللہ دشمن کے سینے پر مونگ دلتا رہے گا اور اس منصوبے کے مکمل ہونے پر پاکستان کی معیشت ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کرے گی۔ گفتگو میں پہنچے تو آپ فرقہ پرستوں کو کھری کھری سنا رہے تھے انسانیت کے ناتے ہمیں رنگ و نسل اور فرقہ پرستی میں نہیں پڑنا چاہیے ان ہی چیزوں سے بہت بڑی تباہی آتی ہے اور یہ تباہی ہمارے دشمن ملک مل کر ہم پاکستانیوں میں سے میر صادق میر جعفر کا چناؤ کر کے ان کے ذریعے ہی لاتے ہیں میں اپنے خط کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا تھا کہ میری اکلوتی بیگم نے مجھے کہا کسی چڑیل کی تصویر دیکھ کر آنکھیں پھٹی پھٹی ہوگئی ہیں کیا میں نے جواب دیا تمہاری تصویر تھوڑی دیکھ

لی ہے اس نے کہا کیا کہا آپ نے میں نے جواب دیا کچھ نہیں میں تمہاری شان میں گستاخی نہیں کر سکتا۔ احسن ابرار رضوی سب سے پہلے گفتگو میں شریک تھے میرے خط کو پسند فرمانے کا شکریہ، ایم اے راحیل میرے کہنے پر اپنا ایڈریس بھیجنے کا شکریہ امید ہے، اب آپ کو آپ کا حق آپ کا انعام مل چکا ہوگا، اب آپ نئے افق سے کبھی بھی نہ روٹھنا، عبدالحمید ہم تو ایسے ہی دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، مجید احمد جائی ایم حسن نظامی، شجاعت حسین، میرا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ صائمہ نور میرے خط کو پسند کرنے کا شکریہ، آئی ڈی بھیجنے اور نکاح نامہ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے، ہم آپ کی زبان پر اعتبار کرتے ہیں عائشہ خواجہ پہلی انٹری دینے کا شکریہ ممتاز احمد خط پسند کرنے کا شکریہ اور پل صراط عشق واقعی زبردست کہانی تھی میں نے اپنے پچھلے خط میں اس پر بھرپور تبصرہ کیا تھا مگر وہ خط شائع نہیں ہوا ریاض حسین شاہد میرے بھی استادوں کی طرح ہیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے ریاض بٹ، ریاض حسین قمر آپ لوگوں کو میرے خطوط میں اشعار کا تڑکا پسند آتا ہے، بہت شکریہ، عائشہ اے بی آپ تو مجھے ہی کیا میری اکلوتی بیگم کو بھی جانتی ہیں ظاہر ہے جو آنچل پڑھتی ہو وہ میری بیگم کو ضرور جانتی ہے عمر فاروق ارشد آپ نے حسینہ کے سیاہ دراز بالوں کو ساہیوال نسل کی بھینس کے بال قرار دے دیا کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے، مسکان ظفر آپ درست کہہ رہی ہیں کہ ایک رائٹر کو ایک ہی رسالے میں اپنی کہانی بھیجنی چاہیے عبدالجبار رومی آپ جب چاہیں بہاولنگر آئیں ہم آپ کو ویلکم کہیں گے۔ کہانیوں میں ابدی حیات، خدا گواہ، قافلہ شہیدوں کا، عذاب تسلسل، پس پردہ، حسن دو آتشہ، ڈیول پسند آئیں ذوق آگہی میں گل مہر، شازیہ اختر، عائشہ اے بی، ایم حسن نظامی، ریاض بٹ، عائشہ نور آشا، ریحانہ سعیدہ، عمر فاروق، عنبرین اختر، سباس گل، عائشہ اعوان اور عبدالجبار رومی چھائے رہے، میں اپنے پیارے استاد ریاض حسین شاہد سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ پل صراط عشق جیسی شاہکار کہانی ہمارے سب کے اپنے نئے افق میں دوبارہ بھیجیں ہماری دعا ہے نئے افق ترقی پر ترقی کرے۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ماہ نومبر کا شمارہ کافی دیر سے موصول ہوا دعا ہے کہ تبصرہ بروقت پہنچ جائے ورنہ آدھی رات کو لکھنے کی محنت کھوہ کھاتے چلی جائے گی ٹائٹل پر شاید نیپال سے درآمد شدہ حسینہ کو آویزاں کیا گیا تھا، اچھی بھلی سوہنی لڑکیاں بناتے بناتے مصور صاحب کو نا جانے یہ کہاں کی سوجھی ہے یار۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ریگستان میں تنہا کھڑا کوئی ٹنڈ منڈ سا درخت ہی سرورق پر دے مارتے مولا خوش رکھے اپنے بڑے قریشی صاحب مایوسیوں میں امیدوں کے چراغ روشن کررہے ہیں اللہ صحت و ہمت عطا فرمائے، بھارت امریکا اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ بے نقاب کرنا، آج وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، گفتگو کی طرف بڑھے تو حیرت کا جھٹکا لگا اقبال بھٹی صاحب براجمان تھے ارے عمران بھیا کو کدھر بھیج دیا ہے۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ایم اے راحیل تمہاری مہربانی میرے بھائی پنگے لینا بند کردو، تم نے اس بار بھی گھما پھرا کر اپنے انعام کا ذکر ہی دیا۔ پیارے بھائی مجھے اپنا ایڈریس بتادو، میں کوشش کروں گا کہ خود کچھ دن روکھی سوکھی کھا کر تمہارا انعام ارسال کردوں باقی عمدہ لکھتے ہو خوش رہو، مجید جائی صاحب آپ سوشل میڈیا پر خاصے ایکٹو رہتے ہو ویسے ہی نئے افق میں بھی تند و تیز تبصرے کے ساتھ حاضر تھے بہت خوب مسکان ظفر بہنا میں پچھلے دنوں آپ کے گاؤں شاہ کے بھٹیاں آیا تھا آپ کو بہت مس کیا وہاں کے ایک ڈاکٹر میرے دوست تھے ان کے ہاں میرا قیام تھا ڈبل سڑکوں پر صبح سویرے چہل قدمی بھی کی بس وہاں کتے کافی زیادہ ہیں اور غصے کے تیز ہیں ان کا کچھ بندوبست کردیں ریاض قمر بھائی مجھے بھول جانے کے لیے بہت شکریہ، آپ بھی یار بے وفا ہو، اب صحت کیسی ہے نئے افق کا مطلوبہ شمارہ میں آپ کو ارسال کردوں گا۔ ان شاء اللہ حسین جاوید

نامی ایک صاحب ہر بار انتہائی بچکانہ باتیں کرتے ہیں ہر دفعہ اپنے خط کو آخری خط قرار دے کر بیچارے مدیر صاحب کے سر پر بم پھوڑنے میں شاید ان کو لطف آتا ہے۔ میرے بھائی ادب کی دنیا بہت وسیع ہے یہاں کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہاں اپنی انا کو ختم کر کے آنا پڑتا ہے آپ ابھی نئے ہو اس لیے سمجھ جاؤ تو بہتر ہے انجم فاروق صاحب کا انٹرویو عمدہ رہا، یقیناً انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر ادب کے میدان میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ سب سوالوں کے جوابات انہوں نے نہایت واضح انداز میں دیے ویسے میں یاسین صدیق بھائی سے کہنا چاہوں گا کہ وہ ہر انٹرویو میں سوالات کچھ بدل دیا کریں یکسانیت خود ایک قاتل ہے۔ بہر حال یہ ایک عمدہ کاوش ہے اسے جاری رہنا چاہیے بلکہ مزید ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے دوسرے رسائل میں لکھنے والے بڑے نام بھی اس سلسلے کی زینت بن جائیں تو کیا ہی بات ہو، اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی ابتدائی صفحات پر میرے ہیرو برہان وانی کے بارے میں ناول شامل تھا زرین قمر نے جس کشمیری لڑکی کے ساتھ وانی کے تعلقات بیان کیے یہ سب بھارت کا ایک ناکام پروپیگنڈہ تھا جسے ہماری قابل مصنفہ نے بڑے دھڑلے سے کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے میں حلفاً کہتا ہوں کہ میرے کشمیر میں ذاتی تعلقات ہیں میں حزب المجاہدین کے سربراہ سید صلاح الدین سے رابطے میں رہتا ہوں میرے خاندان میں دس سے زیادہ نوجوان شہید ہیں میں مقبوضہ وادی میں وقت گزار کر بھی آیا ہوں برہان وانی کے اس نام کی یا کسی بھی لڑکی سے کسی قسم کے تعلقات نہیں تھے شخصیات پر ناول لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہوتا ہے اور شخصیت بھی ایسی کہ تحریک آزادی جس کے خون سے نیا ولولہ لے کر بیدار ہوئی ہے۔ کیا ضروری تھا کہ ناول میں گلیمر شامل کیا جاتا محترمہ اس کا جو بھی جواز پیش کریں گی وہ اس کردار کشی کا مداوا نہیں کر سکے گا جو ان کے قلم سے سرزد ہو چکی ہے ابھی پچھلے دنوں بھارتی آرمی نے مقبوضہ وادی میں ایک کشمیری صحافی کو اس بات پر شہید کر دیا کہ اس نے برہان وانی کی کسی لڑکی کے ساتھ تعلقات کی جھوٹی خبر بنانے سے انکار کیا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس طرح کی باتوں سے بچنا بہت ضروری ہے، دیگر تمام کہانیاں عمدہ تھیں، اگلے ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... جھنگ۔

حسیں بیضوی سا چہرہ لیے
عیاں ہے زلفوں کے جال سے
نازک اندام سی صنف نازک میں
عیاں ہے سادگی بھی حسن و جمال سے
نئے افق کے سرورق کی زینت رومی
شاہکار ہے کسی مصور کے ہاتھوں کمال سے

خوب صورت ٹائٹل کو دیکھ کر فہرست پر نظر ڈالی اور پھر دستک پہ آن رکے، جہاں بھارت، افغانستان اور امریکا کی سازشیں ہی نظر آئیں اور پھر کوئٹہ کا سانحہ بھی انہی سازشوں کا شکار ہوا جس نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا مگر دشمن یاد رکھے یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا، گفتگو میں احسن ابرار کا خط خوب صورت باتوں کے ساتھ پہلے نمبر پر رہا اور بھائی میں تو عبدالجبار رومی ہوں عبدالغفار نہیں۔ ایم اے راحیل نے بھی غصہ ختم کر دیا بہت خوشی ہوئی مل جل کر ہی محفل سجتی ہے، عبدالحمید کا بھرپور تبصرہ عمدہ رہا، مجید احمد جائی کا خط سوچ و افکار کی جدت سے بھرپور ہوتا ہے آپ کی میزبانی بھی بہت عمدہ رہی بہت خوشی ہوتی تھی مل کر صائمہ نور، ریحانہ سعیدہ اور عائشہ خواجہ نے بھی خوب لکھا۔ ممتاز احمد بھی اور ریاض بٹ خوب چھائے رہے، خیر مبارک عائشہ اے بی اللہ آپ کو خوش رکھے۔ باقی عمر فاروق ارشد مسکان ظفر بھٹی، شجاعت حسین، ریاض

حسین قمر، شکریہ حوصلہ افزائی سے دل خوش ہوگیا حسین جاوید اور ایم حسن نظامی کے تبصرے بھی بہت اچھے رہے، اللہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے بے شک اقرا پر تحریر سے دل میں سکون آ جاتا ہے خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہوں، مزاج پڑھنا اور لکھنا پسند ہے فاروق انجم کا انٹرویو زبردست رہا اور بہت پسند آیا اور یاسین صدیق کے انٹرویو کرنے کا انداز بھی بہت اچھا لگا ایسے "محبت کو ہم نے اپنی مٹھی میں ڈھونڈ لیا ہے۔" تیمور نے عین کے دل کی گھنٹی بجادی اب دیکھتے ہیں عین کیا جواب دے گی باقی عشنا کوثر سردار تو چاند کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں کو خوب گرما رہی ہیں۔ مجید احمد جائی کی عذاب مسلسل نے دہلا دیا انسان ہوس ناک ہو کر ایسا درندہ بھی بن جاتا ہے تو یہ...... مشکل وقت میں زندہ رہنا اور محبت کر کے منزل پاتا کامیابی کی ضمانت ہے اور یہ سب صداقت حسین ساجد کی کہانی راستہ بتا رہی ہے کہ تمہیں کیسے کامیاب ہونا ہے، تعلیم سب کے لیے اور جب اس کے لیے لگن اور شوق پیدا ہو جاتا ہے تو روشنی کی کرن جگمگا اٹھتی ہے مہتاب خان کی کہانی بھی اچھی رہی، زرین قمر کے ڈیول کی پہلی قسط زبردست رہی اور ٹیلی پیتھی کے کمالات کی وجہ سے دلچسپ بھی رہی ایک دماغ سے نکل کر دوسرے میں جانا ٹیلی پیتھی کے زیر اثر سمیر کا کردار عمدہ رہا۔ یا اللہ میں وعدہ کرتی ہوں کسی مجاہد سے شادی کروں گی خدا گواہ وقت قریب کی پراثر اور سچی کہانی بہت اچھی لگی برہان وانی تو شہادت کے مرتبے پر فائض ہوگیا اور اپنے پیچھے آزادی کشمیر میں ایک نئی روح پھونک گیا اب انڈیا کی شکست اس کا مقدر بن چکی ہے اور کشمیر آزاد ہو کر رہے گا ان شاء اللہ حسین و جمیل اور پاکباز عذرا نے دوسرے شوہر کی مجبوری کو بھی سر آنکھوں پر لیا اور اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور صبر کا دامن تھام کر اللہ سے رجوع کر لیا جسے موت کے بعد بھی ابدی حیات ملی اور قبر بھی خوش بوؤں سے بس گئی سلیم اختر کی کہانی بھی بہت عمدہ رہی۔ زندگی کا حسن موت ہے اور ایک دن سب کو مرنا ہے فن پارے سے محمد ہاشم کی تحریر فردوس حزیں اچھی لگی روشن راہیں منتظر ہوتی ہیں کہ کب کو ہدایت لے کر ان کی طرف لوٹتا ہے سو ہادی بھی لڑکیوں کے چکر سے باز آیا اور ثانیہ کا معترف ہوگیا دریاد بھی بہت عمدہ ہیں ذوق آگہی میں گل مہر، عائشہ اے بی اور آبروئے نبیلہ اقبال جبکہ خوش بو سخن سے شکیل احمد فریدہ جاوید فری جمیرا قریشی اور غلام مجتبیٰ بہترین رہے، والسلام۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبو سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ "گفتگو" کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہییں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

(اسمِ ذات ۔ اسمِ اعظم)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہستی کو قرآن کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ الاخلاص آیت ا تا ۴۔ اللہ ایک ہی تو ہے وہ بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں ہے سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ نہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ (الاخلاص: ا تا ۴) واحد اور لاشریک ہے۔ (الانعام ۔۱۹) بے نظر وعدیل ہے (الشوریٰ ۔۱۱) ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔ (الزمر ۔۴) جس کے لئے نہ اونگھ ہے نہ نیند۔ (البقرۃ ۔۲۵۵) نہ تھکن ہے۔ (ق ۔۳۸) نہ زوال ہے نہ فنا۔ (الرحمٰن ۔۲۷) نہ موت (الفرقان ۔۵۸) نہ ہلاکت (القصص ۔۸۸) قادرِ مطلق ہے۔ (الانعام ۔۶۵) صاحبِ اقتدار (الحجر ۔۵۵) صاحب حکمت (الانعام ۔۱۳۹) ہر شے کا رب (الانعام ۔۱۶۴) ہر شے کا پیدا کرنے والا ۔ (الانعام ۔۱۰۱) جو چاہے پیدا کرے۔ (آل عمران ۔۴۷) اور جس کا چاہے اضافہ کرے۔ (الفاطر ۔۱) (اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کے حوالے سے پورا قرآنِ کریم بھرا ہوا ہے شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے ہی ذکر پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نشانیاں ہیں جن سے اظہارِ حق اور تفہیمِ الٰہی ہوتی ہے یہ ساری نشانیاں انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جو ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی ازلی حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔

جس طرح اللہ کی صفات بے پناہ ہیں اسی طرح اس عالی شان نام کے فضائل بھی بے حد بے حساب ہیں۔

(۱)۔ جو شخص روزانہ ایک ہزار مرتبہ ''یا اللہ'' پڑھے وہ صاحبِ یقین ہو جائے گا اس کے دل سے تمام شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے اور عزم ویقین کی قوت نصیب ہو جائے گی۔

(۲)۔ لاعلاج مریض بکثرت ''یا اللہ'' کا ورد کرے اور اس کے بعد شفاء کی دعا مانگے تو اسے شفاء کامل نصیب ہو گی۔ ان شاء اللہ

(۳)۔ اسم ''اللہ'' کے مسلسل ورد سے بندے کو عشق الٰہی کا حصول آسان ہو جاتا ہے اور اگر عارضہ قلب ہو تو اس سے نجات مل جاتی ہے۔

(۴)۔ اگر کسی کی کمر، سینے یا پسلیوں میں درد ہو تو کوئی دوسرا شخص انگلی سے درد والی جگہ پر سات بار ''یا اللہ'' لکھے تو درد میں ضرور افاقہ ہو گا۔

(۵)۔ کند ذہن لوگوں کو اگر لفظ ''اللہ'' سات بار کاغذ پر لکھ کر اس تعویذ کو پانی میں گھول کر یا کسی اور چیز میں کھلایا پلایا جائے تو وہ ذہین ہو جائے گا۔

(۶)۔ ہر نماز کے بعد اگر ایک تسبیح اسمِ ذاتِ الٰہی ''اللہ'' کی پڑھ لی جائے تو ایسا شخص غربت کا کبھی شکار نہیں ہو گا۔

(۷)۔ اگر لفظ ''اللہ'' خوش خط لکھا ہوا ایسی جگہ رکھے کہ ہر روز اس پر نظر پڑے یا کم از کم دن میں تین بار دیکھ لے تو ایسے شخص کی یادداشت ہمیشہ بحال رہے گی اور وہ کبھی گمراہ نہیں ہو گا۔

صباء عیشل

اشفاق احمد خان

ننکانہ صاحب میں پیدا ہونے والے اشفاق احمد خان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جانباز' ہادی اور سرفروش جیسے ناولوں کے خالق جن کی تحریروں نے ایک نسل کی نظریاتی تربیت کی ہے۔

نامور ادیب پروفیسر محمد یونس حسرت کے بیٹے ہیں۔ جنہوں نے سو سے زائد کتابیں لکھیں اور اپنی نوعیت کا منفرد ڈرامہ "بھوت بنگلہ" لکھا یہ وہ واحد ڈرامہ ہے جس کے کرداروں میں کوئی عورت شامل نہ تھی۔ تیرہ اقساط پر مشتمل یہ ڈرامہ سیریل تین مرتبہ نشر کیا گیا۔ اشفاق احمد خان 1989 میں معروف ڈائجسٹ پیغام کے لئے لکھنا شروع کیا۔

1991 میں معروف ادارے فیروز سنز کے رسالے تعلیم و تربیت سے بطور ایڈیٹر وابستہ ہوئے۔

1992 میں پیغام ڈائجسٹ کو بطور مدیر جوائن کیا۔ اشفاق احمد خان کی ادارت کے دوران پیغام ڈائجسٹ نے ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا اور چار مرتبہ بچوں کے بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کیا۔

بچوں کے لئے ان کی لکھی گئی کتابوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ان کی کتابوں میں سے "خادم خاص" کو بہترین کتاب کا ایوارڈ مل چکا ہے۔

بیسٹ رائٹر ایوارڈ جیت چکے ہیں۔

معروف رسالے آنکھ مچولی سے بطور ایڈیٹر وابستہ رہے۔
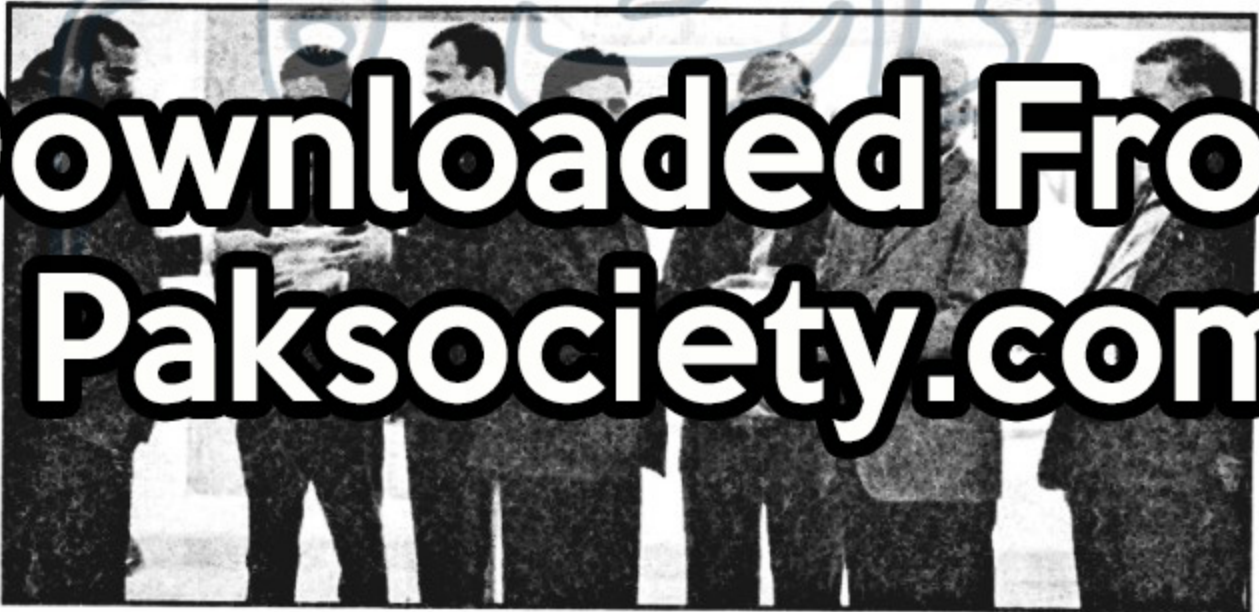
نمل (numl) سے ایم۔ اے اردو اور اسلامیات یونیورسٹی بہاولپور سے ایم۔ اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری حاصل کی۔

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (Lums) سے کی اسٹڈی میتھڈ کورس کیا۔

بہت سے سمعی اور بصری ڈراموں کے اسکرپٹ لکھ چکے ہیں۔

آج کل آفاق کے پروجیکٹ آفاق انسائیکلوپیڈیا کے مدیر کی ذمہ داری انجام دے رہے ہیں۔(یہ انسائیکلوپیڈیا بیک وقت چار زبانوں میں پبلش ہوتا ہے)

اشفاق احمد خان کے چاہنے والوں نے ان سے کچھ سوالات کیے جو قارئین کیلئے من وعن پیش کئے جا رہے ہیں۔

افشاں شاہد (لکھاری)

بچوں کے لیے لکھتے وقت کن چیزوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اشفاق احمد خان: بچوں کے لیے لکھنا آسان نہیں کافی مشکل ہے، اسی لیے بڑوں کے لکھنے والے بچوں کے لیے لکھنے کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ بچوں کے لیے لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی قوت مشاہدہ اچھی ہو، آپ بچے کی نفسیات سے آگاہ ہوں، بچوں کے مسائل اور ان کے علاج پر آپ کی نگاہ ہو، دور جدید میں بچوں پر ہونے والی تحقیق سے بے بہرہ نہ ہوں۔ آپ وسیع المطالعہ ہوں، زبان و بیان پر عبور ہو، بچوں کے قومی اور بین الاقوامی ادب پر آپ کی نگاہ ہو۔ تب آپ اچھا ادب تخلیق کر پائیں گے۔

شہباز اکبر الفت (لکھاری و شاعر)

آپ کی تحریروں میں اسلاف کے کارناموں کی جھلک، اصلاحی واخلاقی تربیت کے پہلو اور ہلکے پھلکے مزاح کا جو واضح رنگ نظر آتا ہے وہ آپ کا فطری انداز تحریر ہے یا اپنے عظیم والد بزرگوار کے ادبی ذخیرہ سے مستعار ہے؟

اشفاق احمد خان: اس رنگ کی کئی وجوہات ہیں۔ والد صاحب کی تربیت کا تو جو اثر ہے وہ تو مسلمہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادب کی کچھ نابغہ روزگار ہستیوں کا بھی اہم کردار ہے۔ ان میں تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر جناب سعید لخت مرحوم جناب اسحاق جلال پوری (جن کی تدریسی کتب ہر ٹیکسٹ بک بورڈ میں شامل رہی ہیں) جناب حفیظ الرحمٰن احسن ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ارشاد صدیقی اور جناب سید سلیم شامل ہیں۔ اتنے باکمال لوگوں کا فیض ہے کہ میرے قلم سے بھلائی، اچھائی اور تربیت کے سوا اور کچھ نکلتا ہی نہیں اور میری زندگی کا مقصد بھی یہی ہے، میں بچوں کے لکھاری کے طور پر پہچانے جانے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔

بلاشبہ آپ نے ادب اور ادارت کے شعبہ میں کڑی محنت اور ریاضت کے بعد اپنی ایک منفرد اور الگ تھلگ پہچان بنائی، دو عشروں سے زائد عرصہ پر محیط یہ سفر کیسا رہا؟

اشفاق احمد خان: یہ سفر بہت کٹھن رہا، ادارتی امور کی انجام دہی میں لوگوں کی، خاص طور پر نامور ادیبوں کی تحریروں کی ایڈیٹنگ ایک چیلنج ہوتا تھا، اور ان کی ناراضی کا اندیشہ بھی۔ لیکن الحمد للہ ایک وقت آیا کہ ان کا اعتماد حاصل ہو گیا انہیں میری ادارت اور میرے کام کی کاملیت پر یقین آ گیا اس کے بعد پھر مڑ کے نہیں دیکھا۔

سنبل بلد

سر آپ کے نزدیک ایک اچھا رائٹر کیسا ہوتا ہے؟

اشفاق احمد خان: اچھا رائٹر وہ ہے جو کہانی لکھتے ہوئے زمینی حقائق سامنے رکھے، حالات کو معروضی انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتا ہو۔ اس کے اندر الفاظ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی علمیت کے اظہار کے بجائے اپنے قارئین کی ذہنی سطح کو سامنے رکھے، سادہ، آسان اور دلکش لہجے میں لکھے اور رہوار قلم پر اپنی گرفت قائم رکھے،

اسے بیمار نہ ہونے دے۔ بیجا تکرار سے گریز کرے، اسے جامع اور مختصر لکھنے کا فن آتا ہو اور جو بھی لکھے، اس کا کچھ نہ کچھ مقصد بھی ہو۔ بڑے بڑے ادیبوں کی تحریریں اٹھا کے دیکھ لیں، آپ کو ان میں یہ خوبیاں جا بجا نظر آئیں گی۔

آپ کی کوئی فیورٹ کتاب اور آپ رات کو مطالعہ کر کے سوتے ہیں؟

اشفاق احمد خان: پسندیدہ کتاب ایک نہیں بہت ہیں۔ لیکن مختار مسعود کی آواز دوست، قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ، ممتاز مفتی کی لبیک، کرنل محمد خان کی بزم آرائیاں، مشتاق یوسفی کی چراغ تلے اور سب کے پڑھنے کے لیے ایک اہم کتاب: مولانا وحید الدین کی کتاب: رازِ حیات رات کو پڑھ کر سونے کی عادت نہیں، اب کبھی کبھار پڑھ پاتا ہوں رات کو۔ دن میں پڑھتا رہتا ہوں۔

راؤ رفاقت علی

سر جی آپ کا تعلق کس کاسٹ سے ہے؟

اشفاق احمد خان: راؤ صاحب آپ کی ہی برادری سے تعلق ہے۔

سب سے پہلے آپ کو کس ادارے میں جاب کرنے کا موقعہ ملا؟

اشفاق احمد خان: سب سے پہلے میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اسکول بنایا تھا راولپنڈی میں۔ وہ تین سال تک چلایا۔ پھر واپس لاہور آ گیا۔ اس کے بعد حرا اسکول سسٹم کے ایجوکیشنل پراجیکٹ میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کیا۔ وہاں سے تعلیم و تربیت میں گیا۔ پھر اس کے بعد ایک طویل سلسلہ ہے۔

بچوں کا ادب جو اب تخلیق ہو رہا ہے اس میں اور آج کے تخلیقی ادب میں آپ کیا سمجھتے ہیں کیا فرق ہے؟ کیا آپ آج کے ادب سے مطمئن ہیں یا اس میں مزید بہتری کی گنجائش ہے؟

اشفاق احمد خان: بچوں کا ادب جو اب تخلیق ہو رہا ہے، اس میں اور پہلے کے ادب میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پہلے تخلیق ادب کا مقصد بچے کی کردار سازی تھی اس کے لکھنے والے بڑے منجھے ہوئے معروف مصنفین تھے۔ وہ لوگ اپنے اندر لائبریریاں ہضم کیے ہوئے تھے۔ ہر موضوع پر ہر فن مولا تھے وہ لوگ۔ ابھی زیادہ تر روایتی ادب لکھا جا رہا ہے۔ ایسا ادب جس میں اثر آفرینی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ابھی ہمارے لکھنے والے کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں، پڑھے بغیر، دنیا میں شائع ہونے والے ادب کو جانے بغیر، اچھی کہانی کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ مصنف کو خود کو زرخیز بنانے کے لیے، اپنے اندر مطالعے کی کھاد ڈالتے رہنا چاہیے۔ آج کے ادب میں بہتری کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ موضوعات کا تنوع، بلند تخیل پرواز، زبان و بیان میں بہتری، تحریر بلحاظ عمر، یہ چیزیں درکار ہیں آج کے مصنفین میں بہت کم لوگ ان چیزوں

کا خیال رکھ پا رہے ہیں۔

آپ کی تحریروں کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ لیکن آپ کی وہ کون سی ایسی تحریر ہے جو آپ کے دل کے سب سے زیادہ قریب ہے؟

اشفاق احمد خان: تعلیم و تربیت میں ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ ایسا مت کرنا۔ وہ مجھے وہ بہت پسند ہے، کیونکہ اسے لکھتے ہوئے ایک مرحلے پر خود میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

سر ایک پرسنل سوال غصہ کم آتا ہے زیادہ؟ غصہ آجائے تو کیسے کنٹرول کرتے ہیں؟

اشفاق احمد خان: غصہ کم آتا ہے۔ اگر آتا ہے تو توجہ، مقام، یا بات تبدیل کر کے اسے کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ویسے لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم سے بھی مدد ملتی ہے۔

کہکشاں صابر (لکھاری)

سر آپ جو لکھتے ہیں اس میں آپ کے جذبات بھی شامل ہوتے ہی ہوں گے۔ مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کتنا فیصد آپ

کی تحریر میں آپ کی دیکھی ہوئی حقیقت ہوتی ہیں اور کتنا فیصد آپ اپنے جذبات، اپنی سوچ اپنی تحریر میں قلمبند کرتے ہیں؟

اشفاق احمد خان: محترمہ کہکشاں، لکھنے کا کمال یہ ہے کہ آپ کہانی لکھتے ہوئے اس میں ڈوب جائیں، اس کہانی کا ایک کردار بن جائیں، لکھتے ہوئے ایسا لگے جیسے وہ واردات، وہ واقعہ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ مشکلات، وہ کٹھنائیاں آپ کے اوپر وارد ہو رہی ہیں۔ کہانی آتی کہاں سے ہے؟ ہمارے اردگرد کے ماحول سے، خبروں سے،

واقعات سے۔ سینہ گزٹ سے بہت سے واقعات حقیقی ہوتے ہیں بس نیت خود اپنی ہوتی ہے۔

صباء عیشل

اپنے ناولز جانباز، ہادی اور سرفروش کے بارے میں کچھ بتائیں۔ ان کو لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور ان کو لکھنے کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

اشفاق احمد خان: مدیر کے طور پر میری خواہش تھی کہ رسالے میں کوئی ایسا ناول شائع ہو جو ہمارے بچوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرے۔ اس خواہش کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ملت اسلامیہ کا سرخیل ہے، اس کی بنیاد جس کلمے پر پڑی، اس کلمے کے ماننے والے دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور ان سب کی امیدیں پاکستان کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ پاکستان اس وقت اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر بری طرح سے گھرا ہوا ہے۔ اپنوں اور غیروں کی کوشش ہے کہ اسے کمزور تر بنا دیا جائے یہاں تک کہ اس کا وجود مٹ جائے۔ اس تکلیف دہ امر کی اذیت نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔

میرے ناول اسی احساس کے تحت لکھے گئے اور ان کا مقصد نوجوانوں کو ان قومی و بین الاقوامی سازشوں کی تصویر دکھانا ہے۔ خود لکھنے سے قبل، میں نے مختلف مصنفین سے ناول لکھنے کے لیے رابطہ کیا کچھ اقساط موصول ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ میرے وہ معاصر دوست بہت منجھے ہوئے قلمکار ہیں۔ لیکن جو ہماری خواہش ہے، شاید وہ اس کے تقاضے سمجھ نہیں پائے۔ تین صاحب طرز دوستوں سے مایوس ہو کر خود ہی قدم اور قلم اٹھا لیا۔ یہاں میں ایک چیز پوری یکسوئی کے ساتھ کہنا چاہوں گا۔ ملک کے حالات جیسے بھی ہوں، تکلیفیں ہوں، سیلاب، زلزلے ہوں یا مہنگائی کا طوفان۔

یہ سب اس ملک میں رہنے والوں کی وطن سے محبت میں ذرہ برابر کمی نہیں لا سکتے۔ میری تقریباً سب کہانیوں اور ناولوں کا خمیر اسلام اور وطن کی مٹی سے اٹھا ہے۔

اسکول کالج میں کیسے طالب علم رہے؟ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے؟

اشفاق احمد خان: اسکول اور کالج میں میں، اوسط درجے کا طالب علم تھا، کچھ خاص کارہائے نمایاں نہیں کیے۔ شاید اس کی وجہ اوائل عمری میں اس شعبے میں قدم رکھنا تھا۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل رہا تھا سو اسی جانب توجہ رہی۔ بی اے کے بعد تعلیم و تربیت سے بحیثیت مدیر وابستہ ہوا۔ اردو اور پولیٹکل سائنس میں ایم اے بعد میں کیے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا، کالج کی فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا۔ اسکاؤٹ بھی رہا، کالج کی اسکاؤٹ ٹیم کا انچارج تھا۔ اس کے علاوہ یوم اقبال پر مصوری کے مقابلے میں پہلا انعام جیتا، خطاطی میں بھی پہلا انعام لیا۔ کالج کی سائنٹیفک سوسائٹی کا بھی صدر رہا۔

آپ کیا سمجھتے ہیں ایک طالب علم کے لئے غیر نصابی سرگرمیاں کتنا ضروری ہیں؟

اشفاق احمد خان: غیر نصابی سرگرمیوں کی مثال تازہ ہوا کی طرح ہے، جیسے صحت کے لیے تازہ ہوا اور آکسیجن ضروری ہے۔ ایسے ہی غیر نصابی سرگرمیاں ضروری ہیں۔ یہ سرگرمیاں آدمی کے دل و دماغ کو تر و تازہ رکھتی ہیں۔ ہمیں بچوں کو غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف مائل کرنا چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

پہلی کہانی کس عمر میں تخلیق کی؟ اور کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟

اشفاق احمد خان: جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میری پہلی کہانی پیغام ڈائجسٹ میں 1986ء میں شائع ہوئی تھی۔
اس کی اشاعت کے پیچھے بھی ایک دل چسپ کہانی ہے۔
آپ اپنے احباب میں انتہائی تحمل مزاج مشہور ہیں۔آپ کیا سمجھتے ہیں یہ خوبی فطرتاً ہے یا اس کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے؟

اشفاق احمد خان: تحمل اور بردباری کے اوصاف فطری بھی ہوتے ہیں اور کسبی بھی۔فطرت مہربان ہوجائے تو یہ کمال زندگی کو ستاروں کی بلندی تک پہنچا دیتا ہے۔اس کے علاوہ زمانے کی تلاطم خیز موجیں، حوادث زمانہ و حوادث فسانہ دونوں ہی آدمی میں یہ ہنر پیدا کر دیتے ہیں۔اس ہنر کو پیدا کرنے میں آنکھوں اور جذبوں کی تپش کو راکھ کرنا پڑتا ہے خون جگر برفاب کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر یہ عکس بنتا ہے۔

لکھنا ایک فن ہے۔جو لوگ یہ فن سیکھنا چاہتے ہیں یا اپنے اس فن میں مزید بہتری لانا چاہتے ہیں ان کیلئے آپ کا پیغام؟

اشفاق احمد خان: ان لوگوں کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جو وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس سے ان مومنٹس اور کوئی نہیں، اس کی قیمت کو پہچانیے اور خود کو اس کی مدد سے مزید قیمتی بنائیے۔
فن کوئی بھی سیکھا جا سکتا ہے۔لیکن اس فن کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں تب ہی کاملیت کا درجہ ملتا ہے۔
ڈاکٹر، وکیل یا انجینئر پورا نصاب پڑھ کے کامیاب ہوتے ہیں، درزی، لوہار یا جفت ساز اس شعبے کے سارے اسرار و رموز سیکھ کر کام کا آغاز کرتے ہیں، تو لکھنے کا شعبہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ ہم لکھنے کا فن سیکھیں پھر لکھنے کا آغاز کریں۔ لکھنے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے، خوب پڑھیے بہترین نثر نگاروں کی شاہکار تحریریں، ناول، شعرا کی کلیات، سب پڑھ ڈالیں اور پڑھنا بھی ایک خاص طریقے سے ہے۔جو لفظ یا جملہ دل کو اچھا لگے، ندرت خیال کا مظہر ہو، اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیں۔

اس کے بعد بار بار ان کو پڑھتے، دہراتے اپنے اندر جذب کر لیں۔صرف ایک سال یہ عمل کر کے دیکھ لیں۔ان پٹ ایسی ہوگی تو آؤٹ پٹ کتنی ہوگی آپ کی تحریر منہ سے بولے گی کہ وہ کسی منجھے ہوئے قلم کار کے قلم سے نکلی ہے۔بین الاقوامی ادب کا مطالعہ کریں۔ترجمہ کرنے کا فن سیکھیں۔زبان و بیان پر عبور حاصل کریں۔ان شاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔
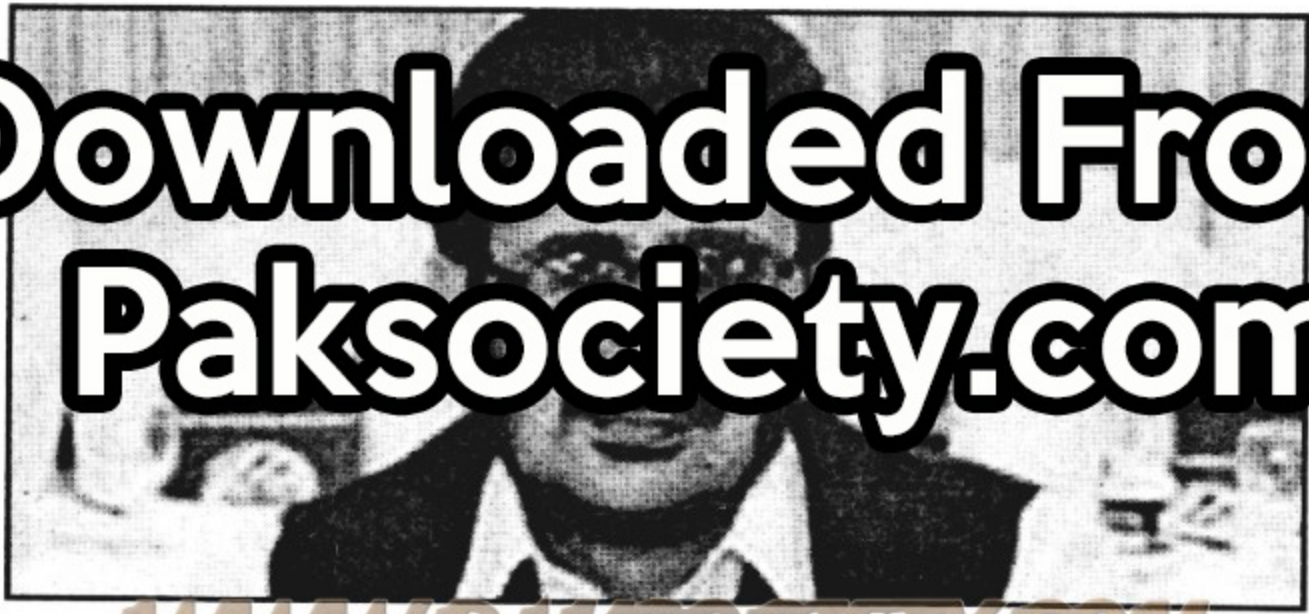
امین صدر الدین بھایانی

ادیب کا کام صرف تفریح مہیا کرنا یا اداس ذہنوں، ہونٹوں کو مسکراہٹ سے آشنا کرنا ہی نہیں ہوتا، ادیب امن کا سفیر، سائنس دان اور معاشرہ کا معمار بھی ہوتا ہے۔ وہ نفرتوں کی کوکھ سے پیار اور محبت کے گیت و نغمے تلاش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ دنیا پیار کرنے کا مقام ہے۔ یہاں نفرتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

پاک بھارت کشیدگی کے بیچ جنم لینے والی ایک اچھوتی تحریر

ہوائی جہاز کے پبلک ایڈریس سسٹم پر ہلکی سی گھنٹی کے ساتھ ایک مترنم آواز گونجی۔

''خواتین و حضرات توجہ فرمائیں۔۔۔۔۔۔۔! ہم پی آئی اے کی پرواز ''پی کے-786، میں انتہائی مسرت کے ساتھ آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ جہاز کراچی کے جناح بین اقوامی ہوائی مستقر سے ممبئی کے چتراپتی شیواجی بین اقوامی ہوائی مستقر کی جانب پرواز کا آغاز کر چکا ہے۔ تیس سے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے تقریباً آٹھ سو تیراسی کلومیٹر کا سفر تیس منٹ میں طے کر کے ان شاء اللہ، یکم جنوری 2025ء کو ٹھیک بارہ بجے سالِ نو کے آغاز پر ممبئی لینڈ کرے گا۔ پاک و ہند کی اٹھتر سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ دونوں ممالک نے باہمی آمدورفت پر ویزا کی پابندی ختم کرتے ہوئے انٹری ویزا سروس کا آغاز کر دیا ہے۔ پرواز پاکستان کے اُن چنیدہ ادباء اور صحافیوں پر مشتمل ہے جو بھارت کی دعوت پر اس سہولت کا ممبئی میں باقاعدہ آغاز کریں گے۔ پاکستان کی دعوت پر انڈین ائیر لائنز کا جہاز ''آئی اے-1125، سوا گتم'' ممبئی سے اہم ترین بھارتی ادباء اور صحافیوں جبکہ اسلام آباد اور نئی دہلی کے مابین دو جہاز اعلیٰ سطحی سرکاری عہدیداران کو لے کر پرواز کر چکے ہیں۔ ان شاء اللہ، اب سے کوئی تیس منٹ بعد دونوں ممالک کے درمیان خوشگوار باہمی تعلقات کے ایک نئے تاریخی باب کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ اب آپ اپنے حفاظتی بندھ کھول سکتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں جہاز کا عملہ مشروبات سے معزز مہمانوں کی تواضع کرے گا، شکریہ''۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنا سر نشست سے ٹکا دیا۔ مجھے محض تیس منٹوں پر محیط یہ سفر بھی کھل رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے ممبئی پہنچ جاؤں۔ ایک خوشگوار بے چینی میرے قلب و ذہن کو کچھ یوں گھیرے ہوئے تھی جیسے کوئی بچہ اپنے پسندیدہ تفریحی مقام کی طرف محوِ سفر ہو اور راستہ کٹ کے نہ دے رہا ہو۔ بھلا ایسا کیوں نہ ہوتا۔۔۔! اِس دن کو دیکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے گئے، تب کہیں جا کر یہ یادگار دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔۔۔!!!

اِس کہانی کا آغاز آج سے ٹھیک پچیس برس قبل سال 2010ء میں ہوا۔

اُس روز میں اخبار کے دفتر اپنی ڈیوٹی پر پہنچا ہی تھا کہ متعلقہ ایڈیٹر نے طلب کرلیا۔ فوری طور پر سندھ سے ملحقہ بھارتی سرحد پر بچھائی گئی بارودی سرنگ کی زد میں آ کر ہلاک ہونے والے بھارتی فوج کے سپاہی کے بارے میں مزید معلومات اکٹھا کرنے کے لیے روانہ ہونے کی ہدایت جاری کی۔ میں جائے وقوع سے کچھ فاصلے پر مامور یونٹ پہنچا تو میری ملاقات وہاں متعین افسر سے ہوئی۔ اُس نے بھی مجھے وہی معلومات فراہم کیں جو کہ آئی ایس پی آر کی جاری کردہ پریس ریلیز کے توسط سے خود اخبار کے دفتر میں موصول ہوئی تھیں۔ افسرانِ بالا کی جانب سے آنے والے صحافیوں سے تعاون کی ہدایت کے موجب میری درخواست پر مجھے وقوع پر لے جایا گیا۔

عموماً سرحد پر آہنی خاردار حفاظتی باڑ لگا دی جاتی ہے۔ سرحد کے اُس مخصوص حصہ پر دونوں اطراف کوئی باڑ موجود نہ تھی۔ ویسے بھی وہ جگہ اونچی نیچی، آڑی ترچھی اور کئی چھٹی پیچیدہ پہاڑیوں پر مشتمل تھی جہاں باڑ کا لگایا جانا کم وبیش ناممکن تھا۔ اِسی سبب بارودی سرنگیں نصب کردی گئی تھیں۔ وہ بدنصیب سپاہی یا جو بھی اُس کا عہدہ رہا ہوگا نہ معلوم کیوں اور کیسے وہاں تک آن پہنچا اور بدنصیبی سے بارودی سرنگ کا شکار ہو گیا۔ دھماکا اس قدر شدید تھا کہ اُس کا جسم چھوٹے

چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں بہت دور دور تک بکھر گیا۔ اُس کے نام، عہدے سمیت کسی بھی نوعیت کی کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ میں کافی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑیوں کے جھنڈ کے اندر مٹیالی رنگت کا چھوٹا سا گتے کا جلد پوش نظر آیا۔ جو گھنی جھاڑیوں کے اندر مٹی میں پڑے ہونے کے سبب غالباً کسی کو نظر نہ آ سکا تھا۔ عین جھاڑیوں کے ساتھ نیچے بیٹھ کر اپنے جوتے کے تسمے درست کرنے کے بہانے اُسے اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں منتقل کر دیا۔ کچھ دیر یہاں وہاں، اِدھر اُدھر گھوم پھر کر خوامخواہ اپنی ڈائری میں نوٹس لیتا رہا۔

وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے اُس کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی کہ وہ محض پھٹا ہوا موٹے گتے کا جلد پوش تھا جو دھماکے کے سبب ڈائری سے علیحدہ ہو گیا ہو گا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو محض خون کے چند دھبوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آ سکا۔ سونگھنے پر اس میں سے بارود کی بو آ رہی تھی۔ اُسے سفر کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ کر لیپ ٹاپ سے ایک مفصل رپورٹ ای میل کر کے واپس کراچی روانہ ہو گیا۔ کچھ دن تو مجھ پر اُس واقعے کا اثر رہا۔ مگر جلد ہی صحافتی زندگی کے معمولات میں ایسا اُلجھا کہ وہ واقعہ میرے ذہن سے یکسر محو ہو کر رہ گیا۔

یہ سال 2016ء کے اواخر کی بات ہے۔

بھارتی مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھارتی فوجیوں کی جانب سے کشمیری شہریوں پر تواتر کے ساتھ ہونے والے اندھا دھند مظالم کے واقعات کے سبب کشمیر میں حالات بے حد مخدوش ہو چکے تھے۔ اِسی دوران ایک بھارتی سرحدی چوکی پر متعدد فوجیوں کی بظاہر دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاکت ہو گئی۔ بھارت نے اِس کا الزام پاکستان پر عائد کیا۔ چند دنوں بعد بھارت نے پاکستانی علاقے میں بھارتی فوج کی جانب سے جوابی حملے کا دعویٰ کر دیا جسے "سرجیکل اسٹرائیک" کا نام دیا گیا۔ مگر کوئی بھی ٹھوس ثبوت سامنے نہ آیا۔ پاکستان نے اِسے بین الاقوامی برادری کی توجہ کشمیر میں ہونے والی انگنت بے گناہ ہلاکتوں اور غیر انسانی مظالم سے ہٹانے کے ساتھ بھارتی عوام اور بین الاقوامی میڈیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کارروائی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ان تمام تر واقعات کے سبب شدید کشیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ممکنہ جنگ کے نتیجے میں پاک و ہند کے بیگناہ و معصوم عوام کی جان و مال داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ دو ایٹمی طاقتوں کے آپسی ٹکراؤ سے کیا صورت حال پیدا ہو سکتی تھی اُس کا اندازہ کوئی بھی باشعور انسان بخوبی لگا سکتا ہے۔ اُسی سبب سرحد کے دونوں اطراف ادبا، دانشور، صحافی اور دیگر صاحب الرائے افراد معاملے کو اس حد تک جانے سے پہلے ہی باہمی گفت و شنید سے طے کرنے پر زور دے رہے تھے۔ دونوں جانب ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو جنگ اور ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال ہی کو حتمی چارہ کار کے طور پر پیش کر رہے تھے۔

گذشتہ چھے سال کے دوران میں اخباری رپورٹر سے کہیں آگے بڑھ کر ایک نامور کالم نویس کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ میرے کالم نہ صرف ملک بھر میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے تھے بلکہ دنیا بھر کے اہم ترین اخبارات میں بھی شائع ہو رہے تھے۔ کم و بیش روزانہ ہی کی بنیاد پر شائع ہونے والے بلاگ میں موجود کشیدہ صورت حال پر اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کر رہا تھا جسے پڑھنے والوں کی تعداد سرحد کے دونوں اطراف بلا مبالغہ لاکھوں میں پہنچ چکی تھی۔ نئی دہلی کا اہم ترین اخبار روزنامہ "نئی صبح" ہندوستان بھر میں پاک بھارت جنگ مخالف حلقوں کی ایک موثر ترین آواز سمجھا جاتا تھا۔ اُس باہمی کشیدہ صورت حال پر پاکستانی صحافت اور سول سوسائٹی کے جنگ مخالف

حلقوں کی آواز خبروں اور کالموں کے ذریعہ بھارت بھر میں پہنچا رہا تھا۔ مذکورہ اخبار میرا کالم ہفتے میں دو سے تین بار بڑے ہی اہتمام کے ساتھ شائع کر رہا تھا۔ میں تواتر کے ساتھ دو ایٹمی طاقتوں کے آپسی ٹکراؤ سے خطے میں ہونے والی متوقع تباہی کے انتہائی خطرناک اثرات سے عام عوام کو آگاہ کر کے انہیں اپنی اپنی حکومتوں کو ہر صورت اس خوفناک صورت حال سے بچنے پر مجبور کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی بن پڑی کوشش کر رہا تھا۔ کسی متوقع ایٹمی تصادم کو روکنے کے لیے روزنامہ ''نئی صبح''، نئی دہلی میں ایک عدد امن کانفرنس کا بھی اہتمام کر رہا تھا اور مجھے اُس کا باضابطہ دعوت نامہ موصول ہو چکا تھا۔

اِسی دوران خبر آئی کہ مظفر آباد پر لائن آف کنٹرول پر 37 راشٹریہ رائفلز کے بابو لال چوہان نامی بھارتی فوجی کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھارتی فوجی حکام کا دعویٰ تھا کہ وہ غلطی سے سرحد پار گیا اور گرفتار ہو گیا۔ اِس واقعے سے مجھے چھے برس قبل سندھ کی سرحد پر بارودی سرنگ سے ہلاک ہونے والا نامعلوم بھارتی فوجی یاد آ گیا۔

اُس روز میں رات بہت دیر گئے گھر پہنچا اور اُس دراز کو کھول کر بیٹھ گیا جہاں میں اپنی اہم ترین چیزیں سنبھال کر رکھتا ہوں۔ وہاں پڑے گتے کے جلد پوش کو نکالا اور اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سواء چار انچ کی لمبائی اور پونے تین انچ چوڑائی والی گتے کی جلد اُن چھے سالوں میں کراچی کی سمندری ہوا سے پھول سی گئی تھی۔ اُس کی پشت پر چسپاں موٹے کاغذ کا ایک سرا گتے سے اُکھڑ رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں سرے کو دو انگلیوں میں پکڑ کر ذرا سا کھینچا تو وہ پورا ہی اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ کاغذ کے اُکھڑتے ہی ایک چھوٹی سی چار چھے تہوں میں لپٹی چھٹی جو کاغذ اور گتے کے درمیان پھنسی ہوئی تھی، نیچے گر پڑی۔ میں نے جھک کر فرش سے چھٹی اُٹھائی۔ وہ ڈاک کے مخصوص لفافے سے کاٹا گیا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جہاں نامہ نویس اپنا پتہ درج کرتا ہے۔ ٹکڑے پر ہندی میں نیلے بال پوائنٹ سے کچھ الفاظ اور ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے موبائل فون سے تصویر بنا کر ایک صحافی دوست کو بذریعہ ٹیکسٹ روانہ کر دیا۔ چند ہی منٹوں بعد جوابی ٹیکسٹ موصول ہوا جو کہ اُس ہندی عبارت کا اُردو ترجمہ تھا۔

رنبیر کمار چاولہ
فلیٹ نمبر 75، سروجنی اپارٹمنٹس
بلاک 6، گیتا کالونی، لنک روڈ،
نئی دہلی پن کوڈ - 110031۔

کیا اُس بھارتی فوجی کا نام رنبیر کمار چاولہ تھا اور یہ اُس کے گھر کا پتہ ہے؟۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فوجی اپنا نام اور پتہ ڈائری کی جلد میں چھپا کر رکھے۔

اب اس راز پر سے پردہ صرف ایک ہی شخص اُٹھا سکتا تھا اور وہ تھا روزنامہ ''نئی صبح'' کا کرائم رپورٹر انعام الدین افلاکی۔ پچیس چھبیس سالہ اِس نوجوان کو اپنے کام سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ چونکہ میرے کالم مستقل طور پر اخبار میں شائع ہو رہے تھے، وہ نہ صرف مجھ سے بخوبی واقف تھا بلکہ فیس بک کے توسط سے گذشتہ دو تین برس سے ہماری اچھی خاصی دوستی بھی تھی۔ ہم واٹس ایپ سے بھی باہمی طور پر منسلک تھے۔ میں نے اُسے واٹس ایپ پر پیغام بھیجا اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کی کال موصول ہوئی۔ ''جی جمیل بھائی، خیر تو ہے نا، اتنی رات گئے یاد کیا؟''۔

''ہاں یار افلاکی۔۔۔۔۔۔، ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے''۔

''جی حکم کریں؟''۔

''یار افلاکی۔۔۔۔۔۔، نئی دہلی میں لنک روڈ پر کسی گیتا کالونی سے واقف ہو؟''۔

''گیتا کالونی۔۔۔۔؟ ہاں جمیل بھائی، یہ تو بڑی مشہور جگہ ہے''۔

''ویری گڈ۔۔۔۔!''۔ میری آواز میں جوش تھا۔ ''وہاں بلاک نمبر 6 میں سروجنی اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر 75 میں کوئی رنبیر کمار چاولہ نامی شخص رہتا تھا یا شاید اب بھی رہتا ہو، کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی ہیں''۔

''کس نوعیت کی معلومات۔۔۔۔؟''۔ افلا کی کی آواز میں قدرے حیرت نمایاں تھی۔ ''اگر وہ وہاں رہتا ہے تو کیا کرتا ہے اور اگر پہلے بھی رہا کرتا تھا تو اب کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟''۔

''مگر یہ شخص آخر ہے کون؟ اور آپ کیوں اُس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''۔ اب کی بار افلا کی کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی مترشح تھی۔

''یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ سر دست جیسے ہی ساری باتیں معلوم ہو جائیں تو بناء کسی توقف کے فوری طور پر فون پر اطلاع دو''۔

اگلے روز کوئی شام سات بجے کے قریب افلا کی کی کال موصول ہوئی اُس نے مجھے جو کچھ بتایا اس بناء پر میں نے نئی دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کشیدگی کے سبب ویزا کا اجراء کم و بیش بند ہی تھا۔ مگر میرے مصدقہ ذرائع کی اطلاعات کے مطابق بہت ہی کم تعداد میں ویزا جاری کیے جا رہے تھے۔ بحرحال میں نے پاکستان بھر میں موجود اپنے حکومتی اور صحافتی ذرائع کو فون کرنا شروع کر دیئے۔ میرے پاس امن کانفرنس کا دعوت نامہ بھی تھا۔ میری کوششیں رنگ لائیں اور بھرپور تگ ودو کے بعد مجھے پندرہ روز کے لیے نئی دہلی تک محدود آمد و رفت کا ویزا جاری کر دیا گیا۔ میرے لیے پندرہ روز بھی بہت تھے۔ ویزا ملتے ہی روز نامہ ''نئی صبح'' کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ افلا کی کو بھی اپنے دورے کے حوالے سے چند ضروری انتظامات اور سارے معاملے کو محض خود تک ہی محدود رکھنے کی درخواست کی۔

جس روز میں کراچی سے براستہ دبئی، نئی دہلی کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی مستقر پہنچا، وہاں شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ائرپورٹ پر افلا کی میرا منتظر تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کی گاڑی لے آیا تھا۔ سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھ کر گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے میں نے افلا کی سے کہا۔ ''ہاں بھیاء افلا کی۔۔۔۔ بس اب پروگرام کے مطابق فوری طور پر گیتا کالونی چلو''۔ افلا کی کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ آ گئی۔ کوئی بائیس تیئس کلومیٹر کا سفر کر کے جھیل پارک، نہرو پلینیٹیریم، تین مورتی، انڈیا گیٹ، کرانتی میدان، سپریم کورٹ آف انڈیا، یمنا دریا کے پل اور بالا آخر گیتا کالونی روڈ سے ہوتے ہوئے لگ بھگ پینتالیس منٹ میں گیتا کالونی پہنچ گئے۔ دو چار گلیوں سے گزر کر افلا کی نے مطلوبہ مقام پر گاڑی کھڑی کر دی۔

چند ہی لمحات کے اندر ہم فلیٹ نمبر 75 کے سامنے کھڑے تھے۔ افلا کی نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا چالیس بیالیس سال کی عمر کا اچھی صحت، مناسب قد و کاٹھ اور صاف رنگت کا حامل شخص تھا۔ اُسے دیکھتے ہی افلا کی نے نمشکار کہا۔ اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نظر آئی۔ ''افلا کی جی۔۔۔۔ آ گئے آپ لوگ۔۔۔۔ پدھاریئے''۔ اُس نے مدھم سی مسکراہٹ اپنے سنجیدہ چہرے پر سجاتے ہوئے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دھنیواد رنبیر جی۔۔۔۔ ہمیں آنے میں کچھ دیر تو نہیں ہوئی۔ یہی ہیں وہ پاکستانی پترکار جمیل احمد خان صاحب، جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا''۔ افلا کی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگ ٹھیک سمے پر پہنچ گئے ہیں۔ بس وہ ماتا جی بہت بیاکل ہو کر آپ کی باٹ نہار رہی

تھیں"۔ اتنا کہہ کر وہ ہمیں اندر سادگی سے سجائے گئے بیٹھک نما کمرے میں لے جا کر صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ یہاں براجمان ہوئیے۔ میں آپ کے لیے جل پان کا کہہ کر ابھی آیا"۔

کمرے کی دیوار پر بڑی عمر کے شخص جس کا چہرہ رنبیر کمار چاولہ سے کافی مشابہت رکھتا تھا کی تصویر پھولوں کی مالا ٹنگی فریم میں لگی ہوئی تھی۔ غالباً رنبیر کمار کے سورگباشی پتاجی کی تصویر تھی۔ دوسری دیوار پر ایک بائیس پچیس سال کے نوجوان کی تصویر آویزاں تھی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر پھیلی بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا کہ میں بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے سامنے مختصر سی کافی ٹیبل پر گرما گرم چائے کی بھاپ اُڑاتی پیالیاں دھری تھیں۔ کافی ٹیبل کی دوسری جانب رنبیر کمار چاولہ، اُن کی ماتا جی اور بیگم بھی اپنی اپنی نشستیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جسے ہر کوئی اِس انتظار میں ہے کہ فریقِ مخالف گفتگو کا آغاز کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں۔ مجھے کچھ بولتے نہ دیکھ آخر رنبیر کمار چاولہ ہی نے پہل کر دی۔

"افلاکی جی نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس میرے چھوٹے بھائی سُکھبیر کمار چاولہ جو کہ کوئی چھے برس پہلے پاکستانی سیما پر لاپتہ ہو گیا تھا کے بارے میں کچھ خاص جانکاری ہے"۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے بتاؤں کہ وہ اب اِس دنیا میں نہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی نظریں کچھ لمحے فرش پر لگی خوبصورت ٹائلوں اور اُن پر بنی آڑی ترچھی لکیروں پر مرکوز کیں۔

"دیکھیے۔۔۔! میں جو کہنے جا رہا ہوں وہ سُننے کے لیے آپ سب کو بہت ہمت جٹانا ہوگی"۔ یہ بات سُن کر رنبیر کی ماتا جی کے چہرے کا تو جیسے رنگ ہی اُڑ گیا۔ وہ لاٹھی کی مدد سے لڑکھڑاتے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہیں لڑکھراتے دیکھ میں اُٹھ کر اُن کی طرف بڑھا۔ مگر انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر نفی میں ہلایا جیسے کہہ رہی ہوں کہ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں۔ پھر روہانسی آواز میں بولیں۔ "کرپا کر کے مجھے صرف یہ بتا دو کہ میرا سُکھبیر کہاں اور کیسا ہے؟"۔

پائے رفتن نہ جائے ماندن کا عالم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اُسی وقت وہاں سے دوڑ جاؤں اور کسی ویرانے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ مگر نہ تو میں وہاں سے دوڑ ہی سکتا تھا اور نہ ہی رو سکتا تھا۔ میں نے اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے پتلون کی عقبی جیب سے بٹوا نکل کر اُس میں سے وہی ٹکڑا نکالا۔ اُس کی تہیں کھول کر رنبیر کمار چاولہ کی طرف بڑھا دیا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتا ہوا بولا۔ "یہ تو۔۔۔۔۔۔۔، مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب سُکھبیر کو یہاں دہلی سے پتر لکھتا تھا تو چٹھی پر اپنا نام اور سرنامہ بھی ضرور لکھتا۔ شاید سُکھبیر نشانی کے طور پر کاٹ کر اپنے پاس رکھ۔۔۔۔۔! مگر۔۔۔۔۔ یہ آپ کو کہاں سے ملا؟۔۔۔۔۔!!!"۔

"سُکھبیر کے بارے میں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ لاپتہ یا مسنگ ان ایکشن ہو گیا تھا۔۔۔! سچ نہیں۔۔۔۔۔!!!"۔

"تو۔۔۔! تو پھر۔۔۔۔! ستیہ کیا ہے؟۔۔۔۔!!!"۔ ماتا جی کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ جیسے ہی میرے منہ سے سچ نکلا، ماتا جی جواب تک اپنی لاٹھی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کھڑی تھیں، لڑکھڑانے لگیں۔ میں تیزی کے ساتھ انہیں تھامنے آگے بڑھا مگر اُس وقت تک وہ سنبھل چکی تھیں۔

میرے نزدیک آتے ہی انھوں نے اپنے ایک ہاتھ سے لاٹھی کے دستے کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت کے ساتھ ایک زناٹے دار تھپڑ میرے چہرے پر جڑ دیا۔ ''تم پاکستانی راکششوں نے میرے سکھبیر کو مارڈالا''۔

ماتا جی کے گوشت پوست سے عاری بوڑھے استخوانی ہاتھ کی بھرپور چوٹ سے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ رنبیر تیزی سے آگے آیا اور مجھے تھام کر زور سے بولا۔ ''ماتا جی یہ کیا کیا آپ نے؟۔۔۔!!!''۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا کہ وہ انہیں کچھ نہ کہے۔ پھر میں ماتا جی کی جانب بڑھا۔ اُن کی نیر بہاتی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "ماتا جی۔۔۔، سکھبیر کو ہم پاکستانیوں نے نہیں پاکستان اور بھارت کے بیچ آزادی سے لے کر اب تک جاری اِس بن کارن یودھ نے مارڈالا۔ نہ جانے بناء کارن کا یہ یودھ کب تک پاکستان اور بھارت کی انگنت ماتاؤں کے معصوم اور نردوش سکھبیروں کی بلی لیتا رہے گا۔ وہ ماتائیں یونہی ایک دوجے کو راکشش کہتیں اپنے جوان بیٹوں کی رودالیاں بن کر سدا بین کرتی رہیں گی''۔

ماتا جی اپنی نیر بہاتی آنکھوں پر تو ضبط کا بند باندھنے میں قاصر رہیں۔ البتہ اپنے ہونٹوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ جس کی شدت سے اُن کے جھریوں بھرے بوڑھے چہرے پر اُتنی زیادہ جھریوں نے اپنا جال بن دیا تھا کہ اب وہاں مزید کسی ایک اور جھری کی بھی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ نہ معلوم میرے منہ سے نکلے لفظوں نے ماتا جی پر کیا اثر کیا ہونٹوں پر باندھا ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ شدتِ جذبات سے وہ آگے بڑھیں اور میرے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ افلا کی سمیت کمرے میں موجود دیگر تمام نفوس کا چہرہ کورے لٹھے کی مانند سفید پڑ چکا تھا۔ مانو جیسے کاٹو تو قطرہ بھر لہو نہ نکلے۔ میں نے دھیرے دھیرے ماتا جی کو دلاسہ دیتے ہوئے صوفے پر بیٹھا کر خود اُن کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک سب خاموش گم صم بیٹھے رہے۔ اچانک ماتا جی نے خموشی کا حصار توڑا۔ ''مجھے معاف کردینا بیٹا۔۔۔، میں مانسیک تناؤ میں تھی اور میرا ہاتھ تم پر اُٹھ گیا''۔

''نہیں نہیں ماتا جی، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھی تو آپ کے سکھبیر ہی کی طرح ہوں۔ اگر آپ سکھبیر کی کسی بات سے ناراض ہو کر اُس پر ہاتھ اُٹھاتیں تو کیا اُس سے بھی معافی مانگتیں''۔ یہ کہہ کر میں نے اُن کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ کچھ دیر مزید گہرا سناٹا چھایا رہا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے ہمت مجتمع کی اور رنبیر اور ماتا جی کی جانب باری باری دیکھتا ہوا بولا۔ ''دیکھیں میں یہاں پاکستان سے آپ کو یہ بُری خبر سنانے کے لیے ہرگز نہیں آیا۔ یہ کام تو میں وہاں سے فون پر بھی کرسکتا تھا یا افلاکی ہی آپ کو بتا دیتا۔ میں یہ کہانی اپنے اخباری کالم اور بلاگ میں شائع کردیتا تب بھی کسی نہ کسی طرح سے آپ تک اِسے پہنچ ہی جانا تھا۔ مگر میں یہاں ایک بہت خاص مدعا لے کر آیا ہوں''۔

''خاص مدعا؟۔۔۔۔۔!!!''۔ رنبیر کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں۔۔۔۔۔! ایک بہت ہی اہم ترین مدعا۔۔۔۔۔!!!''۔ اتنا کہہ کر میں ایک بار رُکا اور اُن سب کی آنکھوں میں غور سے جھانک کر دیکھتا ہوا بولا۔ ''میں یہاں اس ہمیشہ کی یودھ کو کسی نہ کسی طور ختم کرنے کی ایک مہم کا آغاز کرنے کی نیت لے کر آیا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کام کسی طور بھی ان نیتاؤں کے بس کی بات نہیں۔ نہ ہی یہ اُن کے مفاد میں ہے کہ یہ جنگ ختم ہو۔ یہ کام اب ہم جیسے

سادھارن ناگریکوں ہی کو کرنا ہوگا۔ کیوں کہ یہ یودھ ہمارے ہی کے لیے ادھیک ہانی کارک ہے''۔

''بات تو جمیل بھائی آپ کی بالکل درست ہے مگر ایک عام شہری کر بھی کیا سکتا ہے؟''۔ افلا کی جو اتنی دیر سے خاموش تھا اچانک بول پڑا۔

''بھائی افلا کی۔۔۔۔، ایک عام شہری بھلے کچھ اور نہ کر سکے مگر اپنی اپنی حکومتوں کے غلط اقدامات کے خلاف آواز اُٹھا کر اسے غلط کام سے روک تو سکتا ہے''۔

''کونسا غلط کام؟''۔ اب کی بار رنبیر بولا۔ ''سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اس ویوادھ کا اصل کارن کیا ہے؟''۔ میں نے وہاں موجود تمام لوگوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''کشمیر۔۔۔۔ !!!''۔ سب کے سب ایک ساتھ بول اُٹھے۔ ''مگر کشمیر تو بھارت کا اٹوٹ انگ ہے''۔ فوراً ہی رنبیر کی بیوی بولی۔

وہ سب میری جانب گھورنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ اپنی بھوؤں کے درمیان انگشتِ شہادت سے کھجاتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر خلاء میں گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی یہاں آ رہا تھا تو راستے میں میری نظر جواہر لال نہرو کے نام سے وابستہ نہرو پلینٹیریم پر پڑی۔ آج سے کوئی ستر سال قبل پنڈت نہرو جی کا وہ ٹیلی گرام یاد آ گیا جو کہ انہوں 1947ء میں ہمارے پردھان منتری شہیدِ ملت ان لیاقت علی خان کو روانہ کیا تھا۔ جس میں انہوں نے یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ کشمیر سے بھارتی افواج کو نکال لیں گے۔ وہاں کے عوام کو اُن کی مرضی کے مطابق مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل حق بھی دیا جائے گا۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ میرا یہ وعدہ نہ صرف آپ سے بلکہ کشمیری عوام اور دنیا بھر سے ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہوتا تو نہرو جی کبھی وہ کچھ نہ کہتے۔ یہی وعدہ بھارت کی جانب سے اقوامِ متحدہ کی متعدد قراردادوں میں بھی موجود ہے''۔

''جمیل جی آپ بھارت میں براجمان ہو کر ہمارے ہی دیش کے وروددھ کی بات کر رہے ہیں''۔ اب کی بار رنبیر کا لہجہ قدرے تلخ تھا۔

''دیکھیں رنبیر جی، ایسی بات نہیں۔ میں تو وہ بات دہرا رہا ہوں جو سچ ہے اور خود پنڈت نہرو جی نے کہی تھی۔ یہی وہ بات ہے جس کے سبب پاکستان و بھارت میں پچھلے ستر برس کے بعد بھی حالات ویسے کے ویسے ہی ہیں جیسے تقسیم کے وقت تھے۔ اگر اس مسئلے کو حل نہ کیا گیا تو یہ حالات آنے والے ستر سال بعد بھی ویسے ہی رہیں گے''۔

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ بھارت کشمیر پلیٹ میں رکھ کر پاکستان کو پیش کر دے''۔ اب کی بار بولنے والا کوئی اور نہیں افلا کی تھا۔

''نہیں بھائی افلا کی، میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ بھارت نے کشمیری عوام اور اقوامِ عالم سے جو وعدہ کیا تھا اُسے وفا کرے۔ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق فراہم کرے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں بھارت اور پاکستان کو اُس کا احترام کرنا چاہیے۔ دیکھیں اگر کوئی ہمارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتا تو ہم اُسے زبردستی، گولیوں، چھروں، غیر انسانی مظالم اور طاقت کے بے دریغ استعمال سے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ اُنہیں اُن کا حق دے دیا جائے تاکہ وہ جیسے چاہیں اپنی مرضی کے ساتھ خوشی سے رہیں''۔

''تو کیا پاکستان بھی بلوچستان کو اپنی مرضی سے الگ ہونے کا حق دینے کو تیار ہے؟''۔ اب کی بار

رنبیر کی آواز میں بھرپور طنز کی کاٹ تھی۔
''نہ تو بلوچستان میں کشمیر جیسے حالات ہیں اور نہ ہی کشمیر جیسی خونی تحریک چل رہی ہے۔ بلوچستان میں گوادر کی بندرگاہ کا منصوبہ جس کی مکمل تکمیل پاکستان کی معاشی صورت حال کے لیے بہت ہی سودمند ثابت ہوگی کو برباد کرنے کے لیے وہاں چند مٹھی بھر لوگوں کو خرید کر استعمال کیا جارہا ہے۔ کون استعمال کررہا ہے آپ سب بخوبی اُس سے واقف ہیں۔ بلوچستان کشمیر کی طرح سے نوگوایریا نہیں۔ وہاں خون میں ڈوبی وادیِ کشمیر کی طرح سے گذشتہ دو دھائیوں میں ڈھائی لاکھ بے گناہوں کو مارا نہیں گیا۔ نہ ہی یہ معاملہ اقوامِ متحدہ میں مسئلہِ کشمیر کی طرح سے گذشتہ ستر سال سے تصفیہ طلب ہے''۔ میں کچھ دیر سانس لینے کو رُکا اور سب کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔ ''جب تک بھارت کشمیریوں کو خود اپنے کیے وعدے کے مطابق اُن کا حق نہیں دے گا، کشمیر سمیت سرحد کی دونوں اطراف انگنت ماؤں کے نردوش شھکبیر یونہی مرتے رہیں گے''۔
''مگر ہم کیا کرسکتے ہیں؟''۔ ماتا جی جو کہ اتنی دیر سے خاموش تھیں بول پڑیں۔
''ماتا جی۔۔۔۔۔، اگر کوئی کچھ کرسکتا ہے تو وہ آپ ہی ہیں''۔ میں نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ''جو وسائل عوام کی فلاح و بہبود میں استعمال ہونے چاہیں غیر ضروری جنگ اور اُس غیر ضروری جنگ میں جھونکنے کے لیے اربوں روپوں کے اسلحہ کی خریداری میں پھونک دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو دونوں دیشوں کی غربت ختم اور جنتا خوشحال ہوسکتی ہے''۔
''ستیہ وچن''۔ ماتا جی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''اب تو کالج کے یووان شیکشک بھی کشمیریوں کے حق میں بولتے نظر آتے ہیں۔ آپ کو یاد نہیں ماتا جی ایک بار ہم ائیر پورٹ پر فلائیٹ کا انتظار کر رہے تھے ایک بڑے نیتا کو دیکھ کر وہاں موجود چند کشمیریوں نے پولیس اور سیکورٹی کی پروا کیے بناء ہی نعرے لگانا شروع کردیئے تھے، ہم کیا چاہتے ہیں؟ آزادی......!'' ماتا جی کی دیکھا دیکھی رنبیر بھی بول پڑا۔
''میرے ذہن میں اِس حوالے سے ایک پلان ہے''۔ میں نے ہمت کر کے وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں کہنا چاہ رہا تھا۔ گو کہ کام اتنا مشکل بھی نہ تھا مگر آسان بھی نہ تھا۔ اِس سارے کھیل میں اصل کردار ماتا جی کا تھا اور مجھے توقع تھی کہ ماتا جی یہ سب سُن کر شاید گھبرا جائیں اور انکار کردیں۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے میرے بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہونے کی ہامی بھرلی۔
ہم وہاں سے نکلے تو میں ذہنی و جسمانی طور بہت تھک چکا تھا۔ فلائیٹ کی تکان بھی عود آئی تھی۔ افلا کی نے مجھے ہوٹل چھوڑا اور میں اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سو گیا۔
اگلا روز امن کانفرنس کی تیاریوں ہی میں گزر گیا۔
دوسرے دن صبح نو بجے ایک مقامی آڈیٹوریم میں اُس تین روزہ امن کانفرنس کا افتتاحی دن تھا۔ مجھے پاکستان و بھارت کے درمیان روزافزوں بگڑتی صورت حال کی وجوہات اور اُس کے تدارک کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرنا تھا۔ کانفرنس کا دن تو مکمل طور پر میرے پلان کے عین مطابق خیر وخوبی سے گزر گیا۔ البتہ رات لگ بھگ آٹھ بجے کے قریب جب میں سارے دن کی طوفانی مصروفیات کے بعد تھکا ہارا ہوٹل پہنچا تو کچھ ہی دیر بعد وزارتِ داخلہ کی جانب سے مجھے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کو فوری طور پر ملک چھوڑنے کا نوٹس سرو کروانے کے لیے مقامی

پولیس آن پہنچی۔ جس کے تحت مجھے فوری طور پر بھارت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ پولیس کو ہدایت تھی وہ مجھے اپنی نگرانی میں اگلی دستیاب فلائیٹ سے ملک بدر کر دیں۔

مجھے کسی حد تک خدشہ تو تھا کہ بھارتی حکومت کی جانب سے ضرور کوئی سخت قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ اس قدر جلد اور سخت قدم کی ہرگز توقع نہ تھی۔ ائیر پورٹ کے سارے راستے مجھے ماتا جی اور انعام الدین افلاکی کا خیال ستاتا رہا۔ یہ تو مجھے ائیر پورٹ پہنچ کر پتہ چلا کہ اسی وقت جب پولیس میرے ہوٹل پہنچی۔ ماتا جی کو دیش کے دشمنوں کا ساتھ دینے اور انعام الدین افلاکی کو ایک بھارتی کو دیش کے خلاف ورغلانے والے غیر ملکی کے سہولت کار بننے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کیا کہ میری وجہ سے وہ دونوں بھی ایک بہت بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ کوئی تین گھنٹے بعد امیگریشن حکام نے پاسپورٹ پر ویزا کی منسوخی کے ساتھ ملک بدری اور آئندہ دس برس تک بھارت میں داخلے کی پابندی کی مہریں ثبت کر کے جہاز میں سوار کروا دیا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر ہول آتا رہا کہ نہ معلوم ماتا جی اور افلاکی کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہوگا۔

ماتا جی نے بھی کمال جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے افلاکی کی ڈیوٹی لگائی تھی وہ ماتا جی کو کانفرنس میں لے آئے۔ میں نے اپنے مقالے کو کم و بیش اُنہی نکات کے گرد رکھا جن کا تذکرہ میں اُس روز سُکھبیر کے گھر کر چکا تھا۔ اختتام پر کاغذات کا پلندہ ایک جانب سرکاتے ہوئے عینک اُتار کر ڈائس پر رکھی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مدعوبین سے کھچا کھچ بھرے ہال پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''بفضلِ خدا! پاکستان کو قائم ہوئے ستر سال ہونے کو آرہے ہیں پاکستان ایک حقیقت ہے۔ اب ستر سال بعد اس حقیقت کو کھلے دل سے قبول کر لیا جانا چاہیے۔''

پھر میں نے سُکھبیر اور اُس سے اپنے تعلق کا مختصراً ذکر کیا۔ میرے اعلان پر افلاکی ہاتھ تھام کر ماتا جی کو ڈائس پر لے آیا۔ ماتا جی نے اپنے تھیلے میں سے سُکھبیر کی تصویر نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لی اور گلوگیر انداز میں یوں سُکھبیر کا ذکر کیا اُس نے وہاں موجود لوگوں کی آنکھیں نم کر دیں۔ پھر بڑے ہی جوشیلے انداز میں اس آپسی دشمنی کو ختم کرنے اور کشمیریوں کو اُن کا حق خود ارادیت دیئے جانے کے حق میں بھرپور بھاشن دے ڈالا۔ یہ سُن کر وہاں موجود لوگوں کو کچھ دیر کے لیے تو سانپ سونگھ گیا۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد جب سب کو ہوش آیا تو افلاکی اور میں نے بڑی مشکلوں سے ماتا جی کو وہاں سے بخیریت نکال کر گھر روانہ کیا۔

کراچی پہنچتے ہی تمام تر صورت حال کو اخباری کالم اور بلاگ پر اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا اور ماتا جی کے جراتمندانہ کردار کی بھرپور تعریف کی۔ اس دوران امن کانفرنس میں جو کچھ ہوا، دونوں ممالک کے ٹی وی چینلوں نے اُسے پہلے ہی بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ ماتا جی اور افلاکی کی گرفتاری کے علاوہ میری ہندوستان بدری کو بھی خبروں میں نمایاں طور پر شامل کیا گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ متعدد بھارتی نیوز چینلوں نے مجھ پر پاکستانی جاسوس اور بھارتی شہریوں کو ورغلانے کے الزامات عائد کرتے ہوئے نیوز ٹاک شوز کے اینکروں نے حسب عادت نہایت ہی گھن گھرج کے ساتھ پاکستان اور میری ذات کو نشانہ بنایا۔

البتہ اِس دوران اچھی بات یہ ہوئی کہ ''نئی روشنی'' اور اس جیسے دیگر روشن خیال اخبارات و نیوز چینلز کی

درست رپورٹنگ کے سبب بھارت بھر میں بلعموم اور نئی دہلی میں بلخصوص سول سوسائٹی نے ماتا جی کی باتوں کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اُنہیں فوری طور پر رہا کرنے کے لیے مظاہروں کا آغاز کر دیا۔ چند ہی دنوں بعد حکومت کو نہ چاہتے ہوئے بھی ماتا جی اور افلاکی کو رہا کرنے پڑا۔

ماتا جی جیل سے رہا ہو کر کیا آئیں۔ اُنہیں بھارت بھر کی اُن تمام ماؤں نے جن کے جوان سپوت جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اپنا لیڈر تسلیم کر کے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے ''ماتا موومنٹ'' کا نام دے دیا گیا۔ بھارت بھر کی مائیں اس تحریک کے جھنڈے تلے متحد ہونا شروع ہو گئیں۔ کشمیریوں پر جاری جبر و مظالم کے خاتمے کے ساتھ اُنہیں اپنے حق کا فیصلے کرنے کا اختیار دیئے جانے کا مطالبہ اس زور و شور سے کرنا شروع کیا حکومت کو اُسے روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ کئی بار تحریک کے جلسوں اور ریلیوں پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے گولوں کی برسات بھی ہوئی۔

میرا رابطہ ماتا جی اور افلاکی سے شوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے توسط سے جاری تھا۔ بھارت میں شائع ہونے والے میرے کالم پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ البتہ میرا انٹرنیٹ بلاگ دونوں جانب بہت بڑی تعداد میں پڑھا جا رہا تھا۔ بھارت پر بین الاقوامی طور پر کشمیر کے حوالے سے دباؤ دن بدن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ سرکار کسی طور پر جھکنے کو تیار نہ تھی۔ سو لاٹھی، گولی اور آنسو گیس کی سیاست پورے زور و شور سے جاری رہی۔ کشمیر کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر میں مسلمانوں پر بھی کبھی گئو ماتا کی بے حرمتی کے نام پر ظلم و ستم توڑتے جاتے۔ تو کبھی مسلم پرسنل لاء کے ذریعہ اُنہیں نشانہ بنایا جاتا رہا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جب گائے کے حوالے سے کسی مسلمان پر تشدد کی خبر نہ آتی ہو۔ بات صرف تشدد تک ہی محدود نہ رہ گئی تھی۔ دن دھاڑے گائے ذبح کرنے کے الزام میں بے گناہ مسلمانوں کو قتل تک کر دیا جاتا۔

اگلے تین برس تک یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔

یہ جنوری 2019ء کی بات ہے۔

''ماتا موومنٹ'' کے ایک جلسے میں گولی چلی اور ماتا جی کے سورگباشی ہونے کا سبب ٹھہری۔ یہ ایک بہت ہی افسوسناک واقعہ تھا۔ سارے بھارت میں کھلبلی مچ گئی۔ بلاتخصیص ہر کسی کی جانب سے اسے سرکاری جماعت کی کارستانی قراد دیا جانے لگا۔ ماتا جی کی شخصیت اس دوران بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی تھی۔ کشمیر میں امن اور کشمیریوں کو اُن کا حق خود ارادیت دلوانے کی اُن کی جدوجہد میں بلا آخر اپنی جان کا بلیدان دے کر اُنہوں نے تحریک کو ایک اہم ترین موڑ دے دیا تھا۔ دنیا بھر کے اخباری و برقی میڈیا نے اس خبر کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ بین الاقوامی امن تنظیموں کی جانب سے اُن کے لیے بعد از مرگ امن ایوارڈ کے اعلانات آنے شروع ہو گئے۔ وہ لوک سبھا کے انتخابات کا سال تھا۔ ماتا جی کا بلیدان رنگ لایا اور لوک سبھا کے انتخابات میں برسرِ اقتدار جماعت کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک بھر میں لوگوں نے "عام آدمی پارٹی" پر اپنے ووٹوں کی بارش کر دی اور حکومت میں لے آئے۔ بین الاقوامی طور پر بھارت پر کشمیر کے معاملے میں بہت زیادہ دباؤ بڑھ چکا تھا۔ نو منتخب جماعت نے اگلے سال کے وسط میں اقوامِ متحدہ کے زیرِ نگرانی اور عالمی مبصرین کی موجودگی میں کشمیر میں استصوابِ رائے کروانے کا اعلان کر دیا۔ پچپن فیصد کشمیری عوام نے ایک خود مختار ریاست بن کر رہنے کے حق میں ووٹ دیا۔ صرف پانچ فیصد ووٹ ہندوستان کے ساتھ اور چالیس فیصد ووٹ پاکستان کے حق میں پڑے۔

جیسے ہی اقوام متحدہ کے متعین کردہ نگران کمیشن نے نتائج کا اعلان کیا۔ پاکستان نے سب سے پہلے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے نتائج کو تسلیم کرنے کا باضابطہ اعلان کردیا۔ ہندوستان کی جانب سے بھی اُسے کھلے دل سے تسلیم کرنے کا عندیہ دے دیا گیا۔

اگلے تین چار برس میں ہی اس اہم ترین واقعے کے مثبت نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ آزاد ریاستِ جموں و کشمیر میں قائم کشمیریوں کی نمائندہ حکومت کے اقدامات کے سبب خطۂ کشمیر جو کہ پہلے ہی جنت نظیر کہلاتا تھا اب دنیا بھر کے سیاحوں کی جنت قرار پایا۔ اس قلیل عرصے کے اندر سیاحت کا شعبہ کشمیر کی اہم ترین صنعت بن گیا۔ دنیا بھر اور بطورِ خاص امریکا، کینیڈا اور یورپ سے کثیر تعداد میں آنے والے سیاحوں کو کشمیر اپنے بے پناہ قدرتی حسن کے سبب بے حد پُرکشش دکھائی دیا۔ دنیا کے دیگر مقامات کے مقابلے میں قیمتوں کے حساب سے بھی بے حد ارزاں محسوس ہوا۔ ساتھ ہی کشمیری قالین بافی اور دیگر گھریلو نوعیت کی صنعتوں نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنا شروع کردی۔ روزگار کی فراوانی کے سبب کشمیری عوام کا معیارِ زندگی بلند ہوا اور تیزی کے ساتھ خوشحالی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی بھی جھاگ کی طرح سے بیٹھتی چلی گئی۔ جنگی کشیدگی سے فراغت ملی تو دونوں ممالک نے اپنے فوجی بجٹ کو پچھتر فیصد تک گھٹا کر وہ رقم اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا شروع کردی۔ صرف تین برسوں ہی میں دونوں ممالک نے ترقی کے وہ ثمرات ملاحظہ کیے جو کہ گذشتہ تیس برسوں کے دوران بھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔ تعلیم کے شعبے کے لیے بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ مختص ہو چکا تھا۔ صحت کے شعبے میں بھی کماحقہ طور پر کام ہونا شروع ہو گیا۔ سڑکوں، پلوں اور ڈیموں کے منصوبے نہ صرف بنائے گئے بلکہ اُن پر تسلی بخش رفتار کے ساتھ کام شروع ہو چکا تھا۔ دونوں ممالک میں روزگار، تعلیم اور صحت کی سہولیات کی فراوانی ہوئی اور اُس کا ثمر عام آدمی تک پہنچا۔

دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ ادبی، ثقافتی، صحافتی، تجارتی، صنعتی اور دیگر باہمی دلچسپی کے امور پر وفود کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان مشترکہ منصوبوں پر نہ صرف کام شروع ہوا بلکہ کئی اہم ترین پروجیکٹ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب یہ خوش آئند مشترکہ فیصلہ کیا گیا کہ باہمی آمدورفت میں بیجا پابندیوں سے اجتناب برتتے ہوئے دونوں اطراف کے عوام کو متعلقہ سرحدوں پر ہی انٹری ویزا جاری کیا جائے۔ جس کے لیے یکم جنوری 2025ء کی تاریخ کا تعین کیا گیا۔

''خواتین وحضرات توجہ فرمائیں۔ جہاز کچھ ہی دیر میں ممبئی کے چترا پتی ہوائی مستقر پر اُترنے والا ہے۔ تمام مسافروں سے درخواست ہے کہ حفاظتی بند ھ باندھ لیں''۔

فضائی میزبان کی نرم وشائستہ آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں کھڑکی سے نیچے جھانک کر ممبئی شہر کی روشنیوں کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاءاللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آرہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہو گی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

03225494228
abbasnadeem283@gmail.com

سلسلہ انچارج

اردو نبیلہ اقبال، سحر علی نقوی، آمنہ رشید، ملائکہ خان، ندیم عباس ڈھکو، نزہت جبیں ضیاء، نور بخاری، ریحانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاءاللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوبئی، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاءاللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گئیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے اپیل ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ

منجانب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

جال

رزاق شاهد کوہلر

وطنِ عزیز پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے اڑسٹھ برس سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مگر سسٹم میں ابھی تک کوئی مثبت تبدیلی دیکھنے میں نہیں آرہی اور نہ ہی آئندہ ایسے کوئی امکانات نظر آرہے ہیں۔اس کی وجوہات نہایت ہی سادہ ہیں۔ دراصل ہم عملی طور پر ایک ناکام قوم ہیں محض خوابوں اور خوش فہمیوں کے سہارے زندہ رہنے والی قوم۔ ہم ساری زندگی کوشش کرنے کی بجائے کسی معجزے کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ معجزے بھی انسانی کاوشوں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں، یہ آسمان سے نہیں اُترتے بلکہ ہمارے اعمال کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ خدا زمین پر آکر تو ہماری حالت بدلنے سے رہا۔ ہم گذشتہ اڑسٹھ برسوں سے اس ملک کا کرپٹ سسٹم بدلنا چاہتے ہیں لیکن خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم آنگن میں نیم کا پیڑ لگا کر آم کھانا چاہتے ہیں، جو بو کر گندم کاٹنے کے منتظر ہیں۔ ہم بھی کیا خوب قوم ہیں فرقوں میں بٹے اور نفرتوں کے مارے ہوئے۔ جب اڑسٹھ برسوں سے ہم ایک قوم نہ بن سکے تو ملک کا نظام کیا خاک بدلیں گے؟ خدا اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو اپنی حالت خود بدلنے کے لیے تیار نہ ہو۔

جب کسی زندہ انسان کی شناخت کھو جائے تو پھر ایسی ہی دردناک کہانیاں جنم لیتی ہیں

حالات نہایت ہی خراب تھے۔ خاص کر امن و امان کی صورتِ حال تو ناقابلِ بیان تھی۔ دن دیہاڑے اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، بم بلاسٹ، اور خودکش حملوں کی وارداتیں ہو رہی تھیں، جب کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بسی کی زندہ تصویر بنے ہوئے تھے۔ اخبارات کی سُرخیاں چیخ رہی تھیں۔ الیکٹرانک میڈیا پر اینکر پرسن واویلا مچا رہے تھے لیکن حکمران محض بیانات داغ رہے تھے۔ وہ اب بھی اُن آہنی ہاتھوں کے حوالے دے رہے تھے جو آج تک کسی مجرم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے اور نہ آئندہ پہنچنے والے تھے کہ انھیں عوام سے زیادہ اپنی تجوریاں عزیز تھیں۔

ایسے حالات عام پبلک کے لیے بلاشک وشبہ ناموافق ہوتے ہیں۔ اُنھیں جان و مال کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ ڈر ڈر کر جیتے ہیں تو کبھی جیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام اور شام سے لے کر صبح تک وہ اپنے چاروں طرف موت کی آہٹ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ مگر جرائم پیشہ لوگوں کے لیے یہ آئیڈیل صورت حال تھی اور اس آئیڈیل صورت حال سے وہ خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ لوگ جب سہمے ہوئے ہوں تو جُرم کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ جُرم کرتے ہوئے مجرم کو لطف بھی آتا ہے۔ سو اُن دنوں جرائم پیشہ گروہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ شہر کے حالات اس قدر مخدوش ہو چکے تھے کہ شہریوں کا زندگی پر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ رات تو رات لوگوں نے دن کے وقت بھی گھروں سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا لیکن بدن سے سانسوں کا رشتا بحال رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے اور کچھ کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ ہر روز پندرہ بیس جنازے اُٹھنا معمول بن چکا تھا مگر لوگ تھے کہ ہر روز مرنے کے لیے باہر آ جاتے تھے۔ شاید اُنھیں بھوک سے مرنے کی بجائے گولی سے مرنا زیادہ آسان لگتا تھا۔ بھوک سسکا سسکا کر مارتی ہے جب کہ گولی پل بھر میں زندگی کے غموں سے آزاد کر دیتی ہے۔ چنانچہ لوگ زندگی کے غموں سے نجات پانے کے لیے روز مر رہے تھے۔

عامر شفیق عامی نے اپنی مجرمانہ زندگی کا آغاز اسٹریٹ کرائم سے کیا تھا۔ لوگوں سے موبائل فون، نقدی اور موٹر بائیک وغیرہ چھین لینا اُس کا پیشہ تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں اس لیے اُس کے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ ویسے اُس نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اِس کے بعد جونہی والدین کا سایا اُس کے سر سے اُٹھا وہ شترِ بے مہار کی طرح گاؤں سے بھاگا اور سیدھا کراچی جا کر دم لیا۔ کراچی میں پہلے پہل تو اُس نے عام لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر کے رزقِ حلال کمانے کی کوشش کی مگر جلد ہی اُسے یہ احساس ہو گیا کہ ایک میٹرک پاس شخص کے لیے کراچی جیسے شہر میں باعزت طریقے سے کمانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور دوسرا اُس پر یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ یہاں شرافت راس نہیں آتی۔ تب وہ متبادل راستا چُنتے ہوئے جُرم کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ چونکہ بندہ جی دار تھا اس لیے جلد ہی اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ شکل وصورت اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ ہمیشہ کسی ایکشن فلم کے ہیرو کی طرح ایک مخصوص گیٹ اپ میں رہتا تھا۔ دن دیہاڑے کسی بھی شخص کو بیچ چوراہے پر لُوٹ کر اپنی ہیوی موٹر بائیک پر بیٹھ کر منٹوں میں نکل جاتا تھا۔ قانون کے آہنی ہاتھ آج تک اُس کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ کراچی شہر میں اُس جیسے ہزاروں تھے جو اسٹریٹ کرائم میں ملوث تھے اور پولیس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

پانچ چھ ماہ تو وہ اکیلے ہی وارداتیں کرتا رہا، پھر بقول شاعر لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا کے مصداق اُس نے اپنا گینگ بنا لیا۔ چھ افراد پر مشتمل اس گینگ کا لیڈر وہ خود تھا۔ گینگ کے لوگ اُسے باس تو کبھی عامی اُستاد کہتے تھے۔ گینگ بنا تو وہ اسٹریٹ کرائم کے ساتھ ساتھ پٹرول پمپس اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز وغیرہ بھی لوٹنے لگے۔ عامی اُستاد نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے چند پولیس افسروں کو بھی رام کر لیا تھا۔ ان پولیس والوں کو ہر واردات کے بعد باقاعدہ نذرانہ پہنچایا جاتا تھا۔ کراچی کے جس علاقے میں اُن کی رہائش تھی، وہاں کا پولیس اسٹیشن تو اُن کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا۔ تھانہ انچارج انسپکٹر اسلم کرمانی اور عامی اُستاد کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ انسپکٹر اسلم کرمانی اُس پر بے حد مہربان تھا۔ عامی جب کبھی بھی فارغ ہوتا تھا تو گپ شپ لگانے کے لیے

انسپکٹر اسلم کرمانی کے پاس چلا جاتا تھا۔

اُس روز عامی اپنے گینگ سمیت فلیٹ میں موجود تھا۔ وہ سب بے حد خوش تھے اور پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں نہایت ہی فحش گفت گو کر رہے تھے۔ ابھی دو دن قبل ہی اُنھوں نے ایک پٹرول پمپ لوٹا تھا۔ اس ڈکیتی میں کافی تگڑا مال اُن کے ہاتھ لگا تھا۔ لہٰذا اسی خوشی میں وہ پی کر جشن منا رہے تھے۔ عامی اُستاد ایک پیگ چڑھانے کے بعد دوسرا پیگ سامنے لیے بیٹھا تھا کہ ایسے ہی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کال کرنے والے کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے جیب سے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو وہاں انسپکٹر اسلم کرمانی کا نام جھلملا رہا تھا۔ شور مچاتے اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے کال ریسیو کی تو اسلم کرمانی نے بغیر علیک سلیک کے پوچھا۔ ''کہاں ہو یار تم سے ایک ضروری کام آپڑا ہے۔''

''اپنے فلیٹ پر ہوں۔'' وہ قدرے حیران ہوگیا۔ ''کیسا کام؟''

''تم بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ، میں شدت سے تمہارا منتظر ہوں۔'' انسپکٹر نے حکمیہ انداز میں جواب دیا۔

''کچھ پتا تو چلے جناب! آخر بات۔''

''عامی! تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔'' انسپکٹر کرمانی نے جھنجلا کر قطع کلامی کی۔ ''جو میں نے کہا ہے اُس پر عمل کرو، ہر بات فون پر بتانے والی نہیں ہوتی۔ بس فوراً پولیس اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''اوکے میں پہنچتا ہوں۔'' کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ کرمانی حرامی ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے۔ میں ذرا پولیس اسٹیشن تک جا رہا ہوں، تم میں سے کوئی بھی فلیٹ سے باہر نہ نکلے۔''

''باس! کیا میں بھی ساتھ چلوں؟'' صفدر نے سوال کیا، وہ عامی اُستاد کا رائیٹ ہینڈ تھا۔

''نہیں یار! اُس نے صرف مجھے بلایا ہے۔'' عامی اُستاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم لوگ مزے کرو، میری قسمت میں تو شاید بے آرامی ہی لکھی ہے۔''

''اوکے باس جیسے آپ کی مرضی، لیکن ذرا سنبھل کر رہنا پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔'' صفدر نے مخدوش انداز میں جواب دیا۔

عامی اُستاد کمرے سے باہر نکلا اور سیدھا اپنی ہیوی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی موٹر بائیک پولیس اسٹیشن کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی جب کہ وہ انسپکٹر کرمانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نجانے اُس پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ صفدر کا خدشہ بھی اُس کے دماغ میں چکرا رہا تھا کہ پولیس والوں کی دوستی کبھی کسی مجرم کو راس نہیں آتی۔ مگر عامی اُستاد کا دل کہتا تھا کہ انسپکٹر کرمانی ایسا نہیں ہے۔ وہ دوست بن کر دھوکا نہیں دے گا۔

☆☆☆

ظہیر احمد صدیقی نے اپنے سامنے ٹیبل پر بکھری فائلیں سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی تو تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ آفس کا سارا عملہ جا چکا تھا سوائے پیون شکور کے جو ایک چوبی اسٹول پر بیٹھا اُس کے اُٹھنے کا شدت سے منتظر تھا۔ شکور کی بے چینی اُس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی مگر وہ آفس کے ہیڈ کلرک ظہیر صدیقی کو وقت پر چھٹی کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ صدیقی نہایت ہی ایمان دار انسان تھا۔ وہ ہمیشہ آفس کا کام نمٹا کر ہی چھٹی کرتا تھا۔ سو اکثر لیٹ ہوتا رہتا تھا۔ وہ پچپن کے پیٹے میں تھا اور کچھ عرصہ کے بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔

صدیقی صاحب نے وال کلاک سے نظر ہٹا کر شکور کی طرف دیکھا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''بھئی شکور! میں آج پھر تم سے شرمندہ ہوں کہ کوشش کے باوجود وقت پر کام نہ نمٹا سکا۔''

''کوئی بات نہیں سر! ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اب تو میں اس بات کا عادی ہو چکا ہوں۔'' شکور نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے جواب دیا اور پھر دل ہی دل میں بولا۔ ''سالا بڈھا کھوسٹ مرتا بھی نہیں، روزانہ کتنے لوگوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ نصف درجن بوری بند لاشیں بھی ملتی ہیں۔ پتا نہیں اس کا نمبر کب لگے

گا؟''

صدیقی صاحب نے کہا۔''شکور! یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔ ورنہ آج کل کون کسی کی سنتا ہے؟ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ ایمان دار لوگ تو اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ چاروں طرف بے ایمان ہی بے ایمان ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ جائے تو جائے کہاں؟''

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر۔'' شکور نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا البتہ دل میں بولا۔''یا اللہ! تو اپنے اس ایمان دار بندے کو اپنے پاس بُلا لے تو بدلے میں تیرا یہ بے ایمان بندا داتا دربار پر بریانی کی دیگ چڑھائے گا اور وہ بھی بکرے کا گوشت ڈال کر۔''

''نہیں شکور۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''آئندہ اگر مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم نکل جانا، میں خود ہی آفس بند کرلیا کروں گا۔''

شکور نے کہا۔''جیسے آپ کا حکم سر۔'' پھر دل میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوا۔''یا اللہ! مجھے معاف کر دینا میں یہ ڈیل کینسل کر رہا ہوں، تجھے تو معلوم ہی ہے کہ میری تنخواہ نہایت ہی قلیل ہے۔ بریانی کی دیگ میں پوری تنخواہ نکل جائے گی۔''

''اوکے۔'' صدیقی صاحب نے سیٹ چھوڑتے ہوئے کہا۔''میں اب چلوں گا۔ تم تالے وغیرہ سنبھال کر آفس بند کرلو، کھڑکیاں ضرور چیک کر لینا۔''

''بے فکر رہیں سر! پہلے کبھی مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اب ہوگی؟'' شکور نے عجلت میں کھڑکیوں کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

ظہیر صدیقی آفس سے باہر نکلا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا جہاں اُس کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ یہ موٹر سائیکل اُس نے پندرہ برس قبل خریدی تھی جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ اب تک اُس کا ساتھ نبھا رہی تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پارکنگ ایریا سے نکلتا ہوا کھلے روڈ پر پہنچ گیا۔ اُس کا گھر آفس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر شہر کی گنجان آبادی میں واقع تھا۔ راستے میں ایک تندور سے اُس نے چھ گرم گرم روٹیاں خریدیں، اُنھیں موٹر سائیکل کے سیف گارڈ سے لٹکایا اور دوبارہ روانہ ہو گیا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے اُسے چار بج گئے۔ دروازہ اُس کے اکلوتے بیٹے عماد احمد نے کھولا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل برآمدے میں جا کر روک دی اور پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر بولا۔''سوری بیٹے! میں آج پھر لیٹ ہو گیا۔ یقیناً بھوک سے تمہارا بُرا حال ہو گا۔''

عماد بولا۔''بے شک بھوک تو ہے مگر مجھے آپ کے بغیر کھانا کھانے کا لطف نہیں آتا۔''

''ٹھیک ہے تم یہ روٹیاں لے جا کر ٹیبل پر لگاؤ، میں ابھی سالن گرم کر کے لاتا ہوں۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کچن میں ایک درمیانے سائز کا فریج موجود تھا۔ اُس نے فریج کھول کر سالن نکالا اور چولھا جلا کر سالن گرم کرنے لگا۔ جب سالن گرم ہو گیا تو اُس نے دو پلیٹوں میں سالن ڈالا اور عجلت میں کمرے کی طرف چل دیا۔ تب تک عماد ٹیبل پر روٹیاں اور پانی کا جگ لگا چکا تھا۔ دونوں کھانا کھانے میں لگ گئے۔ گذشتہ دس برسوں سے اُن دونوں کا یہی معمول تھا۔ عماد کی امی کو فوت ہوئے دس برس بیت چکے تھے۔ چنانچہ پچھلے دس برسوں سے ظہیر صدیقی نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ عماد نے ایم ایس سی تک تعلیم حاصل کی تھی مگر تا حال بے روزگار تھا۔ وہ روزانہ دفاتر کے چکر کاٹتا رہتا تھا مگر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہمیشہ کی طرح ظہیر صدیقی نے اپنا من پسند ٹاپک چھیڑ دیا۔''عماد! تم اگر شادی کرلو تو میری اس کچن کے عذاب سے جان چھوٹ جائے گی۔ میں اب تھک چکا ہوں بیٹے۔''

عماد بولا۔''ابو مجھے اس کا احساس ہے مگر میں کیا کروں، آپ جانتے ہیں کہ میں فی الحال شادی افورڈ نہیں کرسکتا۔ ابھی تو میں آپ کا محتاج ہوں، بیوی کی ذمہ داری کیسے اور کس طرح سنبھالوں گا؟''

''بیٹے! شادی کو روزگار کے ساتھ نتھی مت کرو، رزق دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کیا وہ بے روزگاروں کو رزق نہیں دیتا۔ کبھی کوئی بے روزگار بھوکا سویا ہے؟''

''نہیں ابو۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''جب تک میں اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو جاتا تب تک میں شادی نہیں کروں گا اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

''میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ پھر تجھے کس بات کی

فکر ہے؟''

''بے شک آپ کا سب کچھ میرا ہی ہے مگر میں پھر بھی شادی نہیں کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اب اس موضوع کو چھیڑا ہی نہ کریں۔''

''کہیں تم کسی کو پسند تو نہیں کرتے؟'' اچانک اُس نے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''نن...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایکدم بوکھلایا مگر پھر فوراً سنبھل گیا۔ ''پسند ناپسند والی بات تو تب ہوگی جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟'' اُس نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

''یہ محض آپ کا وہم ہے۔ میں بھلا کوئی بات آپ سے کس طرح چھپا سکتا ہوں؟ آپ کے علاوہ اور کون ہے میرا اپنا جس پر میں اعتماد کر سکوں؟''

''گڈ مجھے تم سے یہی اُمید تھی بیٹے! کہ تم مجھ سے کبھی کوئی معاملہ مخفی نہیں رکھو گے۔''

''بے فکر رہیں ابو! میں کبھی بھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔''

''او کے تو پھر کیا خیال ہے ایک ایک کپ چائے کا ہو جائے؟'' اُس نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''بالکل...... مگر آج چائے میں بناؤں گا ابو، آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں۔'' وہ اُٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

عماد کے جانے کے بعد وہ اُٹھا اور بک شیلف سے اپنی پسند کی ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ مطالعے کا اُسے اسکول کے زمانے ہی سے شوق تھا جو اَب تک باقاعدگی سے چلا آرہا تھا۔ ہر مہینے تنخواہ لینے کے بعد وہ چند اچھی کتابیں خریدنا نہیں بھولتا تھا۔ تاہم عماد کو کتابیں پڑھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ بھی نوجوان نسل کی طرح انٹرنیٹ کا دیوانہ تھا اور اکثر ٹائم کمپیوٹر کے سامنے گزارتا تھا۔ فیس بک پر اُس کے بے شمار دوست تھے۔ جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے دوستوں سے چیٹنگ کرتا رہتا تھا۔

☆☆☆

عامی اُستاد نے موٹر بائیک تھانے کے احاطے میں روکی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا انسپکٹر کرمانی کے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ کوارٹر اُس کا دیکھا بھالا تھا۔ اکثر وہیں اسلم کرمانی کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بلا جھجک اُس کمرے میں داخل ہو گیا جسے انسپکٹر کرمانی نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کمرے کے اندر انسپکٹر کرمانی اکیلا نہیں تھا۔ وہاں ایک اجنبی شخص بھی موجود تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ عامی اُستاد پر نظر پڑتے ہی اجنبی کے چہرے پر شناسائی کی چمک اُبھر کر معدوم ہو گئی جب کہ انسپکٹر کرمانی بولا۔ ''آؤ یار! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''میں اتنا اہم کب سے ہو گیا ہوں کرمانی! کہ آپ جیسے افسر لوگ بھی میرا انتظار کرنے لگے ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر اُن دونوں سے باری باری مصافحہ کرنے کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

کرمانی بولا۔ ''پہلے ان سے ملیے، یہ سلیمان پاشا صاحب ہیں اس شہر کے مشہور و معروف بزنس مین اور سیاست دان۔ تم نے یقیناً ان کا نام سُن رکھا ہوگا؟''

وہ بولا۔ ''نام تو سنا ہے لیکن ملاقات کا شرف پہلی بار حاصل ہو رہا ہے۔''

کرمانی نے کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ پاشا صاحب نے تمہیں نہ صرف ملاقات کا شرف بخشا ہے بلکہ تمہارے لیے ایک ایسا کام لے کر آئے ہیں کہ تم دنوں میں کروڑ پتی ہو جاؤ گے۔ تو پھر کیا خیال ہے پاشا صاحب کا کام کرو گے یا نہیں؟''

''کرمانی صاحب! کام کی نوعیت جانے بغیر میں بھلا کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں؟''

کرمانی نے کہا۔ ''ڈونٹ وری کام تمہاری مرضی کا ہے اور کام کا معاوضہ تمہاری توقع سے بہت زیادہ ہے۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ کس طرح کا کام ہے؟'' اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' کرمانی نے اثبات میں سر ہلایا اور سنٹرل ٹیبل پر پڑا ہوا بریف کیس کھول کر پانچ پانچ ہزار روپے والے نوٹوں کی دو عدد گڈیاں نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پورے دس لاکھ روپے ہیں اور یہ اُس کام کا معاوضہ ہے جو تمہیں پاشا صاحب کے لیے کرنا ہے۔''

''لیکن کام تو آپ نے ابھی تک......''

''میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔'' کرمانی نے قطع کلامی کی اور بریف کیس سے ایک تصویر نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس شخص کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا ہے۔ یہ شخص پاشا صاحب کا جانی دشمن ہے اور کبھی بھی موقع پا کر پاشا صاحب پر جان لیوا حملہ کر سکتا ہے اس کا مکمل ایڈریس تصویر کے پیچھے درج ہے۔''

عامی اُستاد نے اُس کے ہاتھ سے تصویر لے کر بغور اُس کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔ ''شکل سے تو یہ ایک عام سا شریف انسان لگتا ہے۔ آپ شاید مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہیں؟''

''کرمانی ٹھیک کہتا ہے۔'' سلیمان پاشا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''شکل سے یہ بے شک شریف لگتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک غنڈا ہے اور مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔ ایک بار یہ مجھ پر وار کر چکا ہے، وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بال بال بچ گیا ورنہ اس نے تو مجھے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

وہ بولا۔ ''پاشا صاحب! یقیناً آپ سچ کہہ رہے ہوں گے لیکن میں نے آج تک کسی انسان کی جان نہیں لی۔ میں مانتا ہوں کہ میں ایک بُرا انسان ہوں لیکن کسی انسان کو قتل کرنے کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا۔''

''نہیں سوچا تو اب سوچ لو۔'' پاشا کی بجائے کرمانی نے کہا۔ ''تمہیں اس شخص کو جلد از جلد ٹھکانے لگانا ہے۔''

''نہیں کرمانی! مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔'' کرمانی سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''کب تک یہ چھوٹی موٹی ڈکیتیاں کرتے رہو گے؟ کسی دن کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بننے سے بہتر ہے کوئی مردوں والا کام کرو۔ دس لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہے ورنہ اس شہر میں تو بیس بیس ہزار روپے پر بھی کلرز دستیاب ہیں۔ پاشا صاحب تو کسی کو بھی ہائر کر سکتے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی غیر متعلق شخص کی بجائے میرے دوست کو فائدہ پہنچے۔''

''کرمانی! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں لیکن قتل جیسی واردات کرنے سے میں قاصر ہوں۔'' اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''لیکن میں جو پاشا صاحب کو زبان دے چکا ہوں، اُس کا کیا ہوگا؟ ان کے بہت احسان ہیں مجھ پر۔'' کرمانی نے پہلی بار قدرے سختی کا مظاہرہ کیا۔

''میں مجبور ہوں کرمانی صاحب۔'' اُس نے کمزور سا احتجاج کیا۔ ''ورنہ پہلے کبھی آپ کو انکار کیا ہے؟''

''تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں۔ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اگر تم انکار کرو گے تو بات بگڑ جائے گی اور بہت نقصان ہوگا۔'' کرمانی نے ڈھکے چھپے انداز میں دھمکی دی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کرمانی کی ذات اُس کے لیے ناگزیر تھی۔ وہ کرمانی سے تعلقات بگاڑ کر اپنا دھندا جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ کرمانی چاہتا تو اُسے اُس کے گینگ سمیت باآسانی گرفتار کرسکتا تھا۔ گینگ سمیت اُس کا ان کاؤنٹر کرسکتا تھا۔ شہر میں غنڈا گردی کے ساتھ ساتھ پولیس گردی بھی عروج پر تھی۔ عامی اُستاد تو اُس وقت ایک عام سا غنڈا تھا سو کوشش کے باوجود کرمانی کو انکار نہ کرسکا۔

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ نیم رضامندی سے بولا۔ ''کہ پاشا صاحب کے دشمن کو......''

''کوشش نہیں۔'' کرمانی نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔ ''بلکہ کام کر کے دکھانا ہے۔ مجھے لفظ کوشش سے نفرت ہے کیونکہ یہ لفظ اکثر جھوٹے لوگ استعمال کرتے ہیں۔''

''اوکے ہوجائے گا۔'' اُس نے پہلی بار پُرعزم لہجے میں جواب دیا اور نوٹوں کی گڈیاں اور تصویر اُٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔

''ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔'' کرمانی نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''میں بعد میں تم سے فون پر رابطہ کرلوں گا۔''

اُس نے دونوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''کرمانی! یہ تم نے کیا کیا؟'' عامی اُستاد کے نکلتے ہی پاشا نے سوال کیا۔ ''میں نے تو اس کام کے بدلے میں بیس لاکھ روپے دیے ہیں۔''

''اُس کی جتنی اوقات تھی میں نے دے دیے۔'' کرمانی نے قہقہہ لگایا۔ ''بقیہ دس لاکھ روپیا میں نے بطور نذرانہ رکھ لیا ہے۔''

پاشا نے ہنس کر کہا۔ ”تمہارا نذرانہ تو میں نے ویسے بھی دینا ہی تھا۔ پھر اس جلد بازی کی کیا ضرورت تھی؟“

”بہت اشد ضرورت تھی پاشا صاحب! دراصل سی سائٹ پر میں نے دو کمروں کا ایک بہت ہی عمدہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے اور مالک پہلی فرصت میں ہی اُسے ٹھکانے لگانے کی سوچ رہا ہے۔ فکر نہ کریں آپ کے نذرانے کی بھی ضرورت پڑے گی۔ سی سائٹ پر آج کل بہت ہائی ریٹ چل رہا ہے۔“ کرمانی نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

”ڈونٹ وری وہ فلیٹ سمجھو آپ کا ہو گیا۔“ پاشا نے اُٹھتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا تو کرمانی بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”او کے تو اب اجازت دیجیے۔“ پاشا نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

کرمانی نے اُس کا ہاتھ تھام کر خدا حافظ کہا اور پاشا لبوں پر مسکراہٹ سجائے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

زارا احمد سے اُس کی دوستی بذریعہ نیٹ ہوئی تھی۔ دو ماہ قبل جب اُس نے فیس بک پر اپنی آئی ڈی بنائی تو اُسے پہلی فرینڈ ریکوئسٹ زارا احمد ہی کی موصول ہوئی تھی۔ جسے اُس نے بلا سوچے سمجھے ہی کنفرم کر دیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فیس بک کی یہ دوستی بالمشافہ ملاقاتوں میں بدل گئی۔ زارا احمد اُس کے تصور سے کہیں بڑھ کر حسین و جمیل نکلی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں نہایت ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ دوستی محبت میں بدلی تو ملاقاتوں کا دورانیہ بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ کبھی کسی پارک میں تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں۔ گذشتہ ایک ماہ سے اُن کی یہ ملاقاتیں جاری تھیں۔ کبھی دو دن بعد تو کبھی تین دن بعد اُن کی ملاقات ضروری تھی۔

زارا نے اپنے متعلق اُسے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق اُس کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا اور اُس کے والد ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب کہ اُن کا خاندان پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ماں باپ، ایک بھائی اور دو بہنیں، بہن زارا سے بڑی تھی جب کہ بھائی اُس سے چھوٹا تھا اور وہ کالج میں تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ عماد نے بھی اپنے متعلق اُسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا کہ سوائے ایک باپ کے اُس کا بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ عماد نے اب تک یہ بات باپ سے چھپا رکھی تھی تاہم وہ زارا سے شادی کرنے کے لیے پوری طرح سنجیدہ تھا اور باپ سے بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔

اُس دن بھی وہ زارا کے ساتھ سی سائٹ پر گھوم رہا تھا جب اچانک اُسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اُن دونوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اُس نے زارا سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بے پروا سے انداز میں بولی۔ ”عمو یار! تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔ یہاں کتنے ہی لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا پتا کہ وہ کون ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہمیں نقصان پہنچانے والا ہے۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ محض تمہارا وہم ہے۔“ زارا نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تم میرے خدشے کو مذاق میں مت ٹالو۔“ وہ پُرزور انداز میں بولا۔ ”مجھے اس سے قبل بھی اس طرح کا وہم نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“

”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ زارا نے سر جھٹکا۔ ”ہمیں اپنی تفریح برباد نہیں کرنا چاہیے۔“

زارا کے تسلی دینے پر وہ وقتی طور پر مطمئن ہو کر چپ ہو گیا۔ تب زارا نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ”تمہارے انٹرویو کا کیا بنا، کوئی اُمید ہے کہ نہیں؟“

”اُمید تو تب ہو گی جب میرے پاس کسی تگڑی شخصیت کی سفارش یا نذرانے کی صورت میں کرنسی نوٹوں کا بنڈل ہو گا۔ آج کل ذہانت اور ٹیلنٹ کو کون دیکھتا ہے؟ اس ملک میں صرف سکہ رائج الوقت اور سفارش چلتی ہے۔“ اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ ”مجھے تو جاب وغیرہ میں بالکل انٹرسٹ نہیں ہے۔ تم کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتے‘ جاب میں کیا رکھا ہے؟“

”کاروبار کے لیے بھی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارا گھر ابو کی تنخواہ سے چلتا ہے۔ یہ تو ہمارا کنبہ محدود ہے ورنہ ابو کی تنخواہ

تو اس قدر قلیل ہے کہ چند افراد کا پیٹ مشکل سے پلتا۔''
''اگر میں سرمایے کا بندوبست کردوں تو کیا تم کاروبار کروگے؟'' زارا نے سنجیدگی سے پوچھا۔
اُس نے چونک کر زارا کی طرف دیکھا اور پھر ہنس کر کہا۔ ''تمہاری اتنی اوقات کہاں...... کیوں مجھ سے مخول کرتی ہو؟''
وہ بولی۔ ''اوقات ہے یا نہیں اس بات کو چھوڑو تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، کتنے سرمایے سے کام چل جائے گا؟''
''اوہ میڈم!'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے کریانے کی دکان تو نہیں کھولنی، کاروبار کرنے کے لیے اور وہ بھی کراچی جیسے شہر میں جانتی ہو کتنے سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے؟ کروڑوں روپے کی۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ تمہارے پاس تو ڈھنگ کا لباس بھی نہیں ہے، کروڑوں روپیا کہاں سے لاؤ گی؟''
''وہ میرا مسئلہ ہے تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ؟'' وہ بدستور سنجیدہ تھی۔
''بس مذاق بہت ہوگیا، چلو کہیں سے کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔ سرمایہ دینے کی بجائے بل چکا دینا۔''
''تم میری توہین کررہے ہو۔'' اُس نے پہلی بار غصے کا اظہار کیا۔ ''میں چاہوں تو ایک بزنس ایمپائر کھڑی کرسکتی ہوں۔''
شاید یہ کسی نئی فلم کے ڈائیلاگ ہیں؟'' عماد نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ ''بس اب خوابوں کی دنیا سے باہر آجاؤ میڈم، بہت ہوگیا۔''
اسی دوران وہ ایک سنسان مقام کے نزدیک پہنچ گئے۔ قریب ہی ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ معاً اُس جھنڈ سے چار آدمی نکلے اور تیزی سے اُن کی طرف بڑھے۔ وہ دونوں آپس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھیں خبر ہی نہ ہوسکی کہ وہ خطرہ جو تھوڑی دیر قبل عماد نے محسوس کیا تھا اُن کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ وہ چار تھے اور چاروں ہٹے کٹے تھے۔ دو نے عماد کو چھاپ لیا جب کہ بقیہ دو نے زبردستی زارا کو اُٹھالیا اور برق رفتاری سے دوبارہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے۔ اُنھوں نے زارا کو چلانے کا موقع تک نہیں دیا تھا۔ دوسری طرف وہ دو جو عماد کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے پہلے تو عماد کی خوب دھلائی کی اور پھر تقریباً اُسے گھسیٹتے ہوئے جھنڈ کے اندر لے گئے۔ عماد کی بُری حالت تھی اُس کی ناک اور باچھوں سے خون رس رہا تھا جب کہ شرٹ کا گریبان گلے میں جھول رہا تھا۔ جھنڈ میں تقریباً تین سوفٹ کے فاصلے پر ایک وین کھڑی ہوئی تھی۔ جو شاید حملہ آوروں ہی کی تھی۔ پٹنے کے دوران عماد بار بار اُن سے اپنی غلطی پوچھتا رہا تھا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
جھنڈ میں لے جا کر اُنھوں نے عماد کو مزید چند ٹھوکریں رسید کردیں اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔ ''آئندہ اگر تم زارا میم صاحب کے قریب بھی پھٹکے تو کاٹ کر پھینک دیں گے۔''
''وہ...... مم...... میں......'' اُس نے کراہتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ایک اور زوردار ٹھوکر اُس کے پہلو میں پڑی۔ درد کی شدت سے اُس نے چلانا شروع کر دیا۔ تب ٹھوکر مارنے والا دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ''چلانا بند کردو ورنہ ہمیشہ کے لیے زبان بند کردوں گا۔''
وہ فوراً چپ ہوگیا۔ یوں جیسے کھلونے کی چابی ختم ہوجاتی ہے۔ وہ بدحال سا ریتلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گو کہ وہ جسمانی لحاظ سے اُن میں سے کسی سے بھی کم نہیں تھا۔ مگر وہ دونوں مسلح تھے۔ اُس کی مدافعت پر اُسے شوٹ بھی کرسکتے تھے۔ وہ جوانی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو چپ چاپ پڑا رہا۔ پورے بدن میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے بہت ہی بے دردی کے ساتھ اُسے مارا تھا۔ وہ دونوں چند لمحے اُس کی حالت سے محظوظ ہوتے رہے۔ پھر ایک نے جیب سے والٹ نکال کر چند بڑے نوٹ نکالے اور اُس کے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔ ''ان پیسوں سے اپنا علاج کرالینا اور خبردار آج کے بعد زارا بی بی سے ملنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔'' وہ دھمکی دے کر وین کی طرف بڑھ گئے جب کہ عماد وہیں پڑا رہ گیا۔
جب کافی دیر گزر گئی تو وہ کراہتے ہوئے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک طرف چل دیا، زمین پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف اُس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا لیکن پھر اچانک ہی اُس کی ہمت

معروف مصنف و کالم نگار مشتاق احمد قریشی کے قلم سے ایک اور شاہکار

پیہم خیال

مشتاق احمد قریشی

شائع ہو گئی ہے

جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر تن گئی اور وہ لڑکھڑاتا ساحل کی ریت پر گر گیا۔

☆☆☆

سلیمان پاشا نے گھور کر اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر درشت لہجے میں بولا۔ ''میرے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی...... کم از کم باپ کے مرتبے کا ہی خیال کرلیا ہوتا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سلیمان پاشا کی بیٹی ایک تھرڈ کلاس نوجوان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔''

''سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں ڈیڈ۔'' وہ بلا جھجک بولی۔ ''یہ اپر مڈل اور لوئر کلاس تو آپ جیسے لوگوں نے بنائی ہے۔ خدا نے تو تمام انسانوں کو ایک جیسا ہی بنایا ہے۔ سبھی کے دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ میں نے آج تک کسی اپر کلاس والے کے پاس کوئی اضافی عضو نہیں دیکھا۔''

''اپنی یہ گھٹیا فلاسفی اپنے پاس رکھو۔'' پاشا نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم زارا سلیمان احمد پاشا ہو، پہلے اُس کی اور اپنی اوقات دیکھو پھر......''

''میں اُس سے کسی پاشا کی بیٹی بن کر نہیں ملتی ڈیڈ۔'' زارا نے قطع کلامی کی۔ ''وہ میری حیثیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

''وہاٹ نانسنس...... کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں وہ مجھے ایک سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سمجھتا ہے۔ میں نے اُسے یہی بتایا ہے۔''

''تم نے اُسے حقیقت کیوں نہیں بتائی؟ پاشا نے پوچھا۔

''بس ایسے ہی اُسے آزمانے کے لیے۔''

''کیوں اور کس لیے؟'' وہ دوبارہ بھڑ گیا۔ ''کون لگتا ہے وہ تمہارا؟...... کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اُس دو ٹکے کے آدمی کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دینے کے لیے راضی ہو جاؤں گا؟''

''مجھے اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ آپ رکاوٹ بنیں گے تو میں......''

''بکواس بند کرو۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے چلایا۔ ''تم نے اگر اُس حرام زادے سے ملنا نہ چھوڑا تو میں اُسے مٹی میں ملا دوں گا۔''

ایسے ہی وقت بیگم پاشا کمرے میں داخل ہو کر بولی۔ ''جوان بیٹی پر اس طرح چلاؤ گے تو وہ بغاوت پر اُتر آئے گی۔ یہی بات آپ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتے ہیں۔''

''یہ سب تمہارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔'' وہ بیگم پر چڑھ دوڑا۔ ''کہ آج یہ مجھے یعنی اپنے باپ کو آنکھیں دکھانے لگی ہے۔ بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ مجھ سے نظریں جھکا کر بات کرتے ہیں جب کہ یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ اسے سمجھاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

بیگم نے منہ بنا کر کہا۔ ''اپنی غلطیاں مجھ پر کیوں تھوپتے ہو؟ سر پر تو اسے آپ نے چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اپنے بھائی کے بیٹے افضال سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی، آپ ہی نہیں مان رہے تھے۔ اب بھگتو۔''

''دفع کرو افضال کو۔'' پاشا نے چڑ کر کہا۔ ''ایک نمبر کا آوارہ اور حرام خور ہے۔ اُسے تو میں اپنے جوتے بھی صاف کرنے کے لیے نہ دوں، تم بیٹی دینے کی بات کرتی ہو؟''

بیگم نے ہاتھ نچایا۔ ''میرا بھتیجا آوارہ ہے تو اب اس نے کون سا شہزادہ چن لیا ہے؟''

''افضال کی طرح میٹرک فیل نہیں ہے وہ، ایم ایس سی کیا ہے اُس نے۔ بہت جلد اُسے کوئی اچھی جاب مل جائے گی۔'' زارا نے عماد کا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا۔

پاشا بولا۔ ''تم ماں بیٹی فضول میں ایک دوسرے سے مت لڑو، زارا کی شادی جہاں میں چاہوں گا وہیں ہوگی۔''

''میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس کھونٹی سے چاہو گے باندھ دو گے۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

''تم نے دیکھا یہ کس قدر بدتمیز ہوگئی ہے۔'' وہ بیگم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''مجھے کچھ کرنا پڑے گا ورنہ یہ میری عزت کا جنازہ نکال دے گی۔''

بیگم بولی۔ ''اُسے پیار سے سمجھاؤ، سختی کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں بغاوت

دیکھی ہے۔"

"میں یہ نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟"

وہ بولی۔"افضال میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ بھائی صاحب کو ہاں کر دیں۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے محفوظ رہے گی۔ اپنا اپنا ہوتا ہے جب کہ......"

"بس......" پاشا نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔"میں اس وقت افضال کی تعریف سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے سوچنے دو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟"

"تم سوچتے رہو گے اور بیٹی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"میں جو سوچتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں...... جاؤ میرے لیے کافی بھجوا دو۔" پاشا نے حکمیہ انداز میں کہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

عماد کو ایک ہمدرد نوجوان نے ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔ چونکہ اُسے کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی تھی، سو ڈاکٹر نے اُس کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کے بعد اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اُس روز سنڈے کی چھٹی تھی۔ اس لیے عماد جب مرہم پٹی کروا کر گھر پہنچا تو ظہیر احمد اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کس سے جھگڑا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ کون تھا وہ؟ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔" اکلوتے بیٹے کو زخمی حالت میں دیکھ کر اُس نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

"میں ٹھیک ہوں۔ معمولی سی چوٹیں ہیں یہ، آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔" عماد نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

وہ بولا۔"میں تمہارا باپ ہوں مجھ سے بات چھپاؤ گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا، وہ بس ایک غنڈہ......" وہ کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔

"عماد! تم کچھ چھپا رہے ہو...... مجھے بتاؤ کس سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

"ابو! آپ رہنے دیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم میرے بڑھاپے کا واحد سہارا ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ شہر کے حالات تو دیکھو روزانہ بیسیوں لاشیں گر جاتی ہیں مگر قاتلوں کا کوئی پتا نہیں چلتا۔" اُس نے دل میں پنہاں خدشے کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔"میرے زخمی ہونے کا شہر کے حالات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔"

"جب تک تم مجھے سچ نہیں بتاؤ گے میری پریشانی کم نہیں ہوگی۔"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُس نے پورا واقعہ باپ کے سامنے بیان کر دیا۔ ساری بات غور سے سننے کے بعد وہ بیٹے سے بولا۔"یہ لڑکی ذارا تم سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ تم اُس سے مت ملنا ورنہ اگلی بار جان سے جاؤ گے۔"

"مگر ابو! میں اُس سے پیار کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس سے ملنا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" اُس نے احتجاج کیا۔

"زندگی ایک بار ملتی ہے بیٹے! اس کی قدر کرو، کیا پتا وہ بڑے باپ کی بیٹی تجھے اُلو بنا رہی ہو؟ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اُس سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ابو، میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

"اور میں...... میرا کیا ہوگا...... یہ کبھی سوچا ہے تم نے؟" وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔"اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیسے جیوں گا میں......بولو......جواب دو......اب چُپ کیوں ہو؟"

عماد نے سر جھکا لیا۔ تب باپ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔"یہ دیکھ اور باز آجا...... میں تمہاری جدائی سہہ نہیں پاؤں گا...... سمجھنے کی کوشش کر بیٹے! بعض خواہشیں انسان کی جان لے لیتی ہیں مگر پھر بھی تشنہ کام رہتی ہیں۔ ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جن کی تعبیر انگارے ہوں؟"

''ٹھیک ہے ابو جی۔'' وہ غیر متوقع طور پر رضامند ہوگیا۔ ''آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ میں زارا سے نہیں ملوں گا۔''

''جیتے رہو بیٹا۔'' اُس نے خوش ہوکر دعا دی۔ ''تم نے میرا مان رکھ لیا ہے۔''

عماد کے وعدہ کرنے سے اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آرہا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کے لیے ہیں۔ سو عماد بھی اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔

دوسرے دن جب وہ گھر میں اکیلا تھا تو اُسے زارا کا فون آگیا۔ پہلے تو وہ نظرانداز کرتا رہا لیکن جب زارا بار بار کال کرنے لگی تو اُسے فون اٹینڈ کرنا ہی پڑا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے سخت ناراض ہو۔'' رابطہ ہوتے ہی زارا نے ندامت سے کہا۔ ''مگر یقین کرو میں نے تم سے جھوٹ کسی مصلحت کے تحت بولا تھا۔ میں تو اُسی روز تمہیں سچ بتانے والی ہی تھی کہ عین موقع پر ڈیڈی کے بھیجے ہوئے آدمی پہنچ گئے۔''

''آدمی یا غنڈے؟'' اُس نے جل کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ''تم یہ کہنے میں حق بجانب ہو لیکن ڈیڈی ایک بزنس مین ہیں اور بزنس مین غنڈے نہیں پالتے۔''

''مگر اُنھوں نے مجھ سے سلوک تو غنڈوں والا کیا ہے۔'' وہ بدستور ناراضی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''بہت مارا ہے اُن حرامیوں نے مجھے۔''

''مجھے بھی ڈیڈی نے بہت زیادہ بے عزت کیا ہے اور تم سے ملنے پر پابندی عائد کردی ہے۔'' اُس نے اپنا دکھڑا بیان کیا۔

''تو نہ ملو، کون کہتا ہے تم سے ملنے کو۔'' اُس نے جل کر جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں تم سے نہیں ملوں گی۔ ڈیڈی مجھ پر پہرا تو نہیں بٹھا سکتے، میں تم سے ملوں گی اور ضرور ملوں گی۔''

''مگر میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟'' اُس نے طنزاً پوچھا۔ ''ذرا سی مار کھا کر کیا عشق کا بھوت اُتر گیا ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہارے باپ کے غنڈوں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔''

''کیسا وعدہ؟'' اُس نے متحیر ہوکر پوچھا۔

''میرے باپ نے مجھے قسم دی ہے کہ میں آئندہ تم سے نہ ملوں۔''

''تو کیا اب تم مجھ سے نہیں ملوگے؟''

میں باپ سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتا زارا! ہمیں ایک دوسرے کو بھلانا ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''میں مر تو سکتی ہوں مگر تجھے نہیں بھول سکتی۔ یاد رکھنا اگر تم مجھے ملنے کے لیے نہ آئے تو میں زہر کھالوں گی۔ کل دن کے تین بجے میں اُسی پارک میں تمہارا انتظار کروں گی جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ ٹھیک تین بجے پہنچ جانا دیر ہوئی تو تمہیں وہاں میری لاش ملے گی۔''

''یہ .... کیا بکواس کررہی ہو زارا!'' وہ بوکھلا گیا۔ ''بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں مجبور ہوں تم سے ....''

''مجھے کچھ نہیں سننا .... سمجھے تم۔'' اتنا کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

عامی اُستاد کے لیے پہلا قتل ہی مشکل تھا۔ اس کے بعد تو اُس نے پیچھے مڑکر ہی نہ دیکھا بس قتل پر قتل کرتا چلا گیا۔ اُس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ سلیمان پاشا آخر کیوں ایک خاص مکاتبِ فکر کے لوگوں کو ہی قتل کرواتا ہے؟ حالانکہ یہ سوال غور طلب تھا۔ پاشا لسانی اور مسلکی تعصب کو ہوا دے رہا تھا۔ ویسے بھی اُن دنوں شہر کے حالات لسانی اور مسلکی لحاظ سے نہایت ہی ابتر تھے۔ لوگ مساجد میں جاتے ہوئے بھی سو بار سوچتے تھے۔ عامی کا اپنا کوئی مسلک نہیں تھا۔ اُسے بس کرنسی نوٹوں سے پیار تھا اور پاشا نے اُسے دیتے ہوئے کبھی بھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ عامی اب پاشا کے لیے ایک روبوٹ کی مانند تھا۔ پاشا جو حکم دیتا عامی بلاچوں چراں اُس پر عمل کرتا۔ عامی کو انسپکٹر کرمانی کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وہ بیسیوں قتل کرنے کے بعد بھی آزادی سے گھوم رہا تھا۔

عامی کا یہ ٹارگٹ کلنگ والا کام جاری تھا کہ ملک میں

نئے جمہوری دور کا آغاز ہوگیا۔ گزشتہ حکومت نے چونکہ شہر میں جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تھا اس لیے نئے حکم رانوں نے اقتدار سنبھالنے کے چند ماہ بعد ہی شہر میں آپریشن کرنے کے احکامات صادر کردیے تھے۔ جونہی آپریشن شروع ہوا شہر میں سکیورٹی فورسز اور جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان آئے ن فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ لوگ گھروں میں قید ہوکر رہ گئے۔ کچھ علاقوں میں گینگ وار بھی شروع ہوگئی، جو دن میں کئی کئی گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اُنہی دنوں عامی کو انسپکٹر کرمانی کی کال موصول ہوئی۔

''عامی!'' کرمانی نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ''تم کچھ ماہ کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے جاؤ یا پھر اپنے گاؤں بھاگ جاؤ، کیونکہ حالات بہت زیادہ خراب ہونے والے ہیں۔''

''نہیں میں نہیں بھاگوں گا۔'' اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کرمانی کو انکار کیا۔ ''میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' کرمانی کو غصہ آگیا۔ ''آپریشن پولیس کی بجائے ایف سی فورس کر رہی ہے۔''

''ایف سی فورس کرے یا آرمی کرے میں نہیں بھاگوں گا۔''

''مطلب تم کتے کی موت مرنے کا ارادہ کر چکے ہو؟'' کرمانی نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

وہ سارا احترام بالائے طاق رکھتے ہوئے بولا۔ ''کرمانی! کتے کی موت میں اکیلا نہیں مروں گا، میرے ساتھ تم اور پاشا صاحب بھی ایسی ہی موت مرو گے۔''

''اوہ........ تو اب چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔'' کرمانی کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ ''تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ تم کس کو دھمکی دے رہے ہو؟''

''ہا ہا ہا........'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''کرمانی! میں کوئی معمولی چور اچکا نہیں ہوں کہ تمہاری دھونس میں آجاؤں گا۔ سنو! میرا اگر بال بھی بیکا ہوا تو تم اور پاشا زندہ نہیں بچو گے۔ تم دونوں کے خلاف میرے پاس ایسے ایسے ثبوت موجود ہیں کہ دونوں عمر بھر جیل میں چکی پیستے رہو گے۔''

عامی کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور کرمانی کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ ''یار! میں تو تمہیں آزما رہا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم تو خواہ مخواہ سیریس ہوگئے ہو۔''

''بس اسی طرح میں بھی تمہیں آزما رہا تھا۔ چلو حساب برابر ہوگیا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''مگر ثبوتوں کی بات کرکے تم نے مجھے ڈرا دیا ہے........ کیا سچ مچ تم نے میرے اور پاشا کے خلاف........''

''ڈونٹ وری کرمانی۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔ ''ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کو دھوکا دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہمارا اتحاد ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' کرمانی اُس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''بہرکیف تم محتاط رہنا سکیورٹی فورسز کا کوئی پتا نہیں ہے کسی وقت بھی دھاوا بول سکتی ہیں۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فی الفور تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم کوئی بھی الزام لگا کر مجھے گرفتار کرلینا۔''

''گڈ یہ پلان ٹھیک رہے گا۔'' کرمانی نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔

دوسرے روز شام ڈھلنے کے بعد سکیورٹی فورس کے ایک دستے نے اُن کے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ عامی نے اپنے گینگ کے ساتھ مل کر چند لمحے تو سکیورٹی فورس کا مقابلہ کیا مگر پھر موقع ملتے ہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔ اُس کے فرار ہونے کے فوراً بعد ہی اُس کے تمام ساتھی سکیورٹی فورس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کے وقت انسپکٹر کرمانی آفس کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اچانک اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے سستی کے عالم میں ٹیبل سے سیل فون اُٹھایا اسکرین پر ایک خمار آلود نگاہ ڈالی تو اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی نیند اُڑ گئی۔ سیل فون کی اسکرین پر پاشا

کا نام جھلملا رہا تھا۔ اُس نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''ہیلو سر! انسپکٹر کرمانی بات کر رہا ہوں۔ خیریت تو ہے جناب! اس وقت کیوں زحمت کی؟''

دوسری جانب سے پاشا بولا۔ ''خیریت ہوتی تو تجھے فون کیوں کرتا؟''

''حکم کریں جناب۔'' کرمانی نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔

پاشا نے شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''تم چند کانسٹیبل لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤ، میرا ایک آدمی وہاں موجود ہے جو تمہیں بتائے گا کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ اور ہاں اُس کی کسی بات سے انکار مت کرنا۔''

''مگر جناب! کچھ پتا تو چلے کہ میں نے کرنا کیا ہے؟''

پاشا بولا۔ ''ایک نوجوان کو گرفتار کرنا ہے، مگر خیال رکھنا وہ عامی اُستاد کا ہم شکل ہے کہیں دھوکا نہ کھا بیٹھنا۔ دونوں کی شکل وصورت میں معمولی سا فرق بھی نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوگی، جسے تم نے ہاتھ بھی نہیں لگانا۔ سمجھ گئے؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا لیکن وہ لڑکی کون............''

''وہ لڑکی میری بیٹی ہے۔'' اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پاشا بول پڑا۔ ''وہ ضرور ہنگامہ کرے گی مگر تم لوگوں نے اُس کی بات سننی ہے اور نہ ہی اُسے کچھ کہنا ہے۔ یاد رکھنا اگر میری بیٹی کو خراش بھی آئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

''پاشا صاحب! بے فکر رہیں بے بی کی طرف کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔ آپ کی بیٹی تو کرمانی کی بھی بیٹی۔''

''گڈ۔'' پاشا نے خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے تم سے یہی اُمید تھی اور ہاں اُس نوجوان کا نام عماد ہے اور اُس کا باپ ظہیر احمد صدیقی ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک ہے۔''

''میں ابھی نکلتا ہوں جناب! ایک گھنٹے کے اندر آپ کو خوش خبری مل جائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ سرعت سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

پاشا نے کہا۔ ''او کے خدا حافظ۔'' اور پھر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

دس منٹ کے بعد انسپکٹر کرمانی کی جیپ پولیس اسٹیشن سے نکلی اور مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ جیپ میں چار ہٹے کٹے کانسٹیبل بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں شکل سے ہی خون خوار نظر آ رہے تھے۔ وہ پولیس مین کم اور غنڈے زیادہ لگتے تھے البتہ یونی فارم نے اُن کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد جیپ شہر کے ایک مشہور و معروف پارک کے مین گیٹ سے گزرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پارک میں بہت سے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ جوڑے سنگی بنچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انسپکٹر کرمانی نے پارک کے عین وسط میں جیپ روک دی۔ جیپ کے رکتے ہی چاروں کانسٹیبل تیزی سے نیچے اُترے اور رائفلوں کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑتے ہوئے انسپکٹر کرمانی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ کرمانی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ جیپ سے نیچے اُترا اور عقابی نگاہوں سے پارک کا جائزہ لینے لگا۔ اُسے اُس بندے کی تلاش تھی جس کے بارے میں پاشا نے بتایا تھا۔

''سر جی! حکم کریں؟'' ایک تیز و طرار کانسٹیبل نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔

''صبر کرو صبر.........اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔'' کرمانی نے جواب دیا اور پھر ایک نوجوان کی طرف متوجہ ہوگیا، جو تیزی سے اُن کی طرف آ رہا تھا۔

''سر جی! میں آپ ہی کا منتظر تھا۔'' نوجوان نے قریب پہنچتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا شکار وہ سامنے والے بنچ پر بیٹھا ہے۔''

''ہوں۔'' کرمانی نے اُس سے ہاتھ ملانے کے بعد ذو معنی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو یہ ہے وہ حرام زادہ جو پاشا صاحب کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے؟''

''یہی ہے جناب۔'' نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی ہوئی ہے وہ پاشا صاحب کی اکلوتی بیٹی زارا بی بی ہے۔''

''تم کسی طرح زارا بی بی کو یہاں سے ہٹا سکتے ہو؟'' کرمانی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''بہت مشکل ہے جناب وہ مجھے نہیں پہچانتی......میری بات کبھی نہیں مانے گی۔''

''ہوں۔'' کرمانی نے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا ورنہ یہ تو شور مچائے گی۔ اپنے

عاشق کو آسانی سے گرفتار نہیں ہونے دے گی۔"

"جناب! پاشا صاحب نے حکم دیا ہے کہ زارا بی بی کو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔ اگر........"

"مجھے پتا ہے۔" کرمانی نے اُس کی بات کاٹی۔ "چلو اب تم بھاگ جاؤ۔"

نوجوان سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس ہوگیا۔

نوجوان کے جانے کے بعد کرمانی نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوکر بولا۔ "اسے پُرامن طریقے سے گرفتار کرنے کا پلان میں نے سوچ لیا ہے۔ تم میں سے کسی نے بھی کوئی مداخلت نہیں کرنی، بس میری تائید کرنی ہے۔ اب چلو۔"

وہ سب کرمانی کی پیروی کرتے ہوئے اُس بنچ تک پہنچ گئے، جہاں عماد اور زارا بیٹھے مستقبل کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔ پولیس کو اپنے سر پر دیکھ کر وہ دونوں ایک دم گھبرا گئے۔ خاص کر عماد کے چہرے پر تو ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دوسری طرف اُسے دیکھ کر کرمانی کو بھی حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ عماد نامی وہ نوجوان بالکل عامی اُستاد کا ہم شکل تھا۔ دونوں کی شکل میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں تھا۔ اگر پاشا اُسے اس بات سے آگاہ نہ کرچکا ہوتا تو یقیناً وہ عماد کو عامی اُستاد ہی سمجھتا۔

"عماد! تمہارا ہی نام ہے ناں؟" کرمانی نے خلافِ توقع ملائم لہجے میں سوال کیا۔

"ج .... جی .... جناب .... میرا ہی نام ہے۔" عماد نے گھبراہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

"اور باپ کا نام ظہیر احمد صدیقی ہے؟" کرمانی نے دوسرا سوال کیا۔

"جی .... ہاں۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر .... آپ یہ سب .... کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"عماد! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے پاس کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ دراصل تمہارے باپ کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور اس وقت وہ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہاسپٹل میں پڑے ہوئے ہیں۔"

یہ دردناک خبر سن کر عماد کا رنگ یک دم فق ہوگیا۔ زارا بھی گھبرا گئی تھی۔ تاہم عماد نے انتہائی کرب کے عالم میں پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! ابو کی حالت کیسی ہے؟"

"یہ بات تو تمہیں ڈاکٹر ہی بتا سکتے ہیں۔ اب چلو ہمیں دیر ہورہی ہے۔" کرمانی نے عجلت میں جواب دیا۔

عماد خاموشی سے اُن کے ساتھ چل دیا۔ اس دردناک خبر نے اُسے اتنا بھی سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ پولیس والوں سے یہ پوچھتا کہ اُنھیں عماد کی یہاں موجودگی کا پتا کس طرح اور کیسے چلا؟ بڑی آسانی سے وہ کرمانی کے جال میں پھنس گیا تھا۔

وہ جیپ تک پہنچے ہی تھے کہ زارا بھی بھاگ کر وہاں پہنچ گئی اور بولی۔ "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"سوری۔" کرمانی نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ "ہم تمہیں ایک پولیس وین میں نہیں لے جاسکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔"

"زارا! تم جاؤ اللہ بہتر کرے گا۔" عماد اُس سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "میں تجھے کال کرکے سب کچھ بتادوں گا۔" زارا کو وہاں چھوڑ کر عماد انسپکٹر کرمانی کے ساتھ چل دیا۔

☆☆☆

کرمانی ورغلا کر عماد کو سیدھا تھانے لے آیا۔ اُسے جیپ سے اُتارا اور سپاہیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ "اسے اچھی طرح سبق سکھا کر حوالات میں بند کردو۔"

"مم .... مگر .... جناب! میرا قصور کیا ہے؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے سلیمان پاشا جیسے بڑے آدمی سے دشمنی مول لی ہے۔" کرمانی نے جواب دیا اور پھر سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

چاروں سپاہی آگے بڑھے اور بھوکوں گِدھوں کی طرح عماد پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چیختا رہا، چلاتا رہا، اُن کی منتیں کرتا رہا اور حتی المقدور خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن حکم کے وہ غلام سنی ان سنی کرتے ہوئے اُس کی پٹائی میں لگے رہے۔ وہ انسان تھا کوئی پتھر تو تھا نہیں آخرکار مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا۔ تب سپاہیوں نے اُسے اُٹھا کر حوالات میں پھینک دیا۔ اس دوران آفس کے

اندر انسپکٹر کرمانی فون پر پاشا کو اپنی کامیابی کی خبر سنا رہا تھا۔ "پاشا صاحب!" وہ خوشامدی انداز میں بولا۔ "ہم نے اُس کی خوب مرمت کی ہے اور اب حوالات میں پڑا ہے......... حکم کریں جناب! اُس کا کیا کرنا ہے؟"

پاشا بولا۔ "کرمانی! اُسے ایک بار میرے آدمی سمجھا چکے ہیں لیکن وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو اپنا بُرا بھلا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ایک ہی علاج ہوتا ہے کہ انھیں اللہ میاں کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

کرمانی نے کہا۔ "پاشا صاحب! یہ کام تو آپ عامی اُستاد سے بھی کرا سکتے تھے۔ پھر مجھے......"

"شہر کے حالات دیکھ رہے ہو کرمانی۔" اُس نے قطع کلامی کی۔ "تمام جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف آپریشن شروع ہو چکا ہے۔ عامی جیسے غنڈے کسی بھی وقت ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔ تمہیں عماد کے ساتھ ساتھ عامی سے بھی دائمی چھٹکارا حاصل کرنا پڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ کام ہے بہت مشکل، میں اُوپر والوں کو کیا جواب دوں گا؟" اُس نے مکارانہ انداز میں جواب دیا۔

"تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے اس لیے بہانے مت بناؤ اور ہاں تمہارے اکاؤنٹ میں آج ہی ایک کروڑ روپیا ٹرانسفر ہو جائے گا۔" پاشا نے اُس کی چال سمجھتے ہوئے پتا پھینکا۔

"بہت بہت شکریہ پاشا صاحب! میں اس معاملے کو جلد ہی نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اوکے میں خوش خبری سننے کا منتظر ہوں۔" پاشا نے جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

کرمانی کی نگاہوں کے سامنے ایک کروڑ روپے کے کرنسی نوٹ ناچنے لگے۔ چنانچہ اُس کا عیار دماغ تیزی سے پلان ترتیب دینے لگا مگر اُسے کوئی مناسب حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس دوران مغرب کی اذان ہونے لگی۔ وہ آفس سے نکلا اور اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔ نماز اُس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ چنانچہ یونی فارم اُتار کر اُس نے عام لباس پہنا اور آرام کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔ اُس کا دماغ اب بھی عامی اُستاد اور عماد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے میں اُلجھا ہوا تھا۔ عماد سے تو وہ با آسانی نمٹ سکتا مگر عامی اُستاد جرم کی دنیا کا بندہ تھا وہ آسانی سے اُس کے ہاتھ لگنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی دو دن قبل عامی اُستاد نے اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ اُس کے پاس کرمانی کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ کرمانی نہیں جانتا تھا کہ وہ ثبوت عامی اُستاد نے کہاں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں؟ ان ثبوتوں کی موجودگی میں وہ عامی اُستاد پر کسی طرح بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ انھیں سوچوں میں غرق تھا کہ معاً اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ اُس نے سیل فون اُٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر عامی کا نام جھلملا رہا تھا۔

"یس۔" اُس نے کال ریسیو کی۔ "بولو کیا بات ہے؟"

"کرمانی! میرے سب ساتھی اب تک سکیورٹی فورس کے ریڈ میں مارے جا چکے ہوں گے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ پلیز یار! مجھے بچالو۔" اُسے عامی اُستاد کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

"تم فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔" کرمانی نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

"تم نے وہاں اپنے فلیٹ پر کوئی ثبوت وغیرہ تو نہیں چھوڑے ناں؟" کرمانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"نہیں میں سب کچھ نکال لایا ہوں۔"

"گڈ...... یہ تم نے اچھا کیا۔ بس اب فوراً پہنچنے کی کرو۔"

"اوکے میں آدھے گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔" اُس نے جواب دیا تو کرمانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"اب تم سے نمٹوں گا حرام زادے۔" کرمانی نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عامی اُستاد ایک کرسی پر مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ جب کہ کرمانی اور دو خون خوار قسم کے کانسٹیبل اُس کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ کرمانی کے ہاتھ میں سروس ریوالور بھی موجود تھا جس کا رخ عامی کی طرف تھا۔

"شاباش اچھے بچوں کی طرح وہ ثبوت میرے حوالے کردو ورنہ مارے جاؤ گے۔" کرمانی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ریوالور لہرایا۔

"کبھی نہیں۔" اُس نے بمشکل سر ہلایا۔ "جب تک وہ ثبوت میرے پاس ہیں تم مجھے نہیں مار سکتے، البتہ چاہو تو جیل میں ڈال سکتے ہو۔"

"مارو اسے۔" کرمانی نے چلا کر کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔

کرمانی کا حکم سن کر دونوں کانسٹیبل عامی پر ٹوٹ پڑے۔ اُنھوں نے اُس کے چہرے پر گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کردی۔ عامی کی ناک اور باچھوں سے لہو رسنے لگا مگر وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دانت بھینچے بیٹھا رہا۔ جب کہ کرمانی اُس کی چیخیں سننے کا منتظر تھا۔ چنانچہ کانسٹیبلوں پر چلانے لگا۔ "تم حرام خور ہو تمہارے ہاتھوں میں جان ہی نہیں ہے ورنہ یہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہوتا.........مارو اسے اور مارو میں اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔"

عامی کے لبوں پر ایک خون آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "کرمانی! تم میری چیخیں سننے کے لیے ترستے رہو گے۔ جتنا مار سکتے ہو مار لو مگر میں نہیں چیخوں گا۔"

"تمہارا تو باپ بھی چیخے گا۔" یہ کہہ کر کرمانی خود اُس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کس کس کر اُس کے چہرے پر گھونسے مار رہا تھا اور ایسی ایسی نادر و نایاب گالیاں دے رہا تھا جو عامی نے ایک غنڈہ ہوتے ہوئے بھی اس سے قبل نہیں سنی تھیں۔

دس منٹ کے بعد کرمانی کسی کتے کی مانند ہانپ رہا تھا جب کہ عامی پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ پٹتے ہوئے اُس کے منہ سے چند سسکیاں ضرور برآمد ہوئی تھیں لیکن وہ چلایا نہیں تھا۔

"پانی لاؤ۔" کرمانی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے چلایا۔

ایک کانسٹیبل بھاگ کر پانی سے بھرا ہوا جگ لے آیا۔ ٹیبل سے گلاس اُٹھا کر اُس نے گلاس میں پانی ڈالا اور کرمانی کو پیش کرتے ہوئے بولا۔ "لیجیے جناب۔"

کرمانی نے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ "اور ڈالو۔" اُس نے گلاس آگے بڑھایا۔ یکے بعد دیگرے تین گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد جب قدرے اُس کی حالت سنبھل گئی تو وہ کرسی سے اُٹھ کر ایک بار پھر عامی کے سامنے پہنچ گیا۔ عامی بدستور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

"پانی ڈالو اس کے چہرے پر۔" وہ پلٹ کر کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔ "اسے ہوش میں لاؤ.......فوراً۔"

کانسٹیبل نے اُس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عامی کے چہرے پر پانی کے چند چھینٹے مارے تو اُس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ کرمانی نے طنزیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور نخوت بھرے انداز میں بولا۔ "انسپکٹر کرمانی سے دشمنی کرو گے تو جان سے جاؤ گے.........تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ میری بات مان کر اپنی جان بچالو۔"

وہ بولا۔ "کرمانی! میرے ساتھ ایک سودا کرلو فائدے میں رہو گے۔"

"کیسا سودا؟" کرمانی نے چونک کر پوچھا۔

"ان کے سامنے نہیں بتا سکتا۔" اُس نے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا۔ "یہ سودا تیرے اور میرے بیچ ہوگا۔"

کرمانی نے ہاتھ کے اشارے سے کانسٹیبلوں کو باہر بھیج دیا۔ "ہاں اب بولو کیسا سودا؟" وہ عامی سے مخاطب ہوا۔

"میرے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود ہے۔ میرے ایک سائن سے وہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوسکتی ہے اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو۔"

پانچ کروڑ روپے کا سن کر کرمانی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، تاہم وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میرے لیے رقم سے زیادہ وہ ثبوت اہم ہیں۔"

عامی نے کہا۔ "وہ ثبوت تم سے زیادہ میرے لیے اہم ہیں۔ یوں سمجھو کہ وہ میری زندگی کی گارنٹی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے وفادار رہے تو وہ ثبوت کبھی بھی منظر عام پر نہیں آئیں گے۔"

"میں تم پر کیسے اعتبار کرلوں؟" کرمانی نے سوال کیا۔ "تم کسی بھی وقت اُن ثبوتوں کو بنیاد بنا کر مجھے بلیک میل کرسکتے ہو؟"

"اس کا میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا۔"

"او کے مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔" کرمانی نے جواب دیا۔

''کتنا وقت؟'' اُس نے استفسار کیا۔
''صرف پندرہ بیس منٹ۔'' اُس نے جواب دیا اور پھر کانسٹیبلوں کو آواز دے کر دوبارہ اندر بلا لیا۔ ''میں ابھی چند لمحوں کے اندر واپس آتا ہوں۔ تم لوگ اس کا خیال رکھنا۔ بہت تیز اور عیار آدمی ہے۔'' کانسٹیبلوں کو ہدایت دیتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر اُس نے پاشا کا سیل فون نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''پاشا صاحب! عماد کے بعد وہ غنڈہ عامی بھی اس وقت میرے نرغے میں ہے مگر میں دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے نہیں لگا سکتا۔ اُن میں سے ایک کو جیل بھیجنا پڑے گا۔ لیکن..... میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کس کو ٹھکانے لگایا جائے اور کس کو جیل بھیجا جائے؟''

پاشا نے کہا۔ ''کرمانی! تم بہت ہی کند ذہن انسان ہو۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں کس اُلو کے پٹھے نے پولیس فورس میں بھرتی کرلیا؟''

''اسی لیے تو جناب آپ سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔'' اُس نے بُرا مانے بغیر جواب دیا۔

''بالکل گدھے ہو تم...... احمق انسان! عماد کو پولیس مقابلے میں ہلاک کر دو اور عامی کو جیل بھیج دو لیکن یہ خیال رہے کہ عماد کو تم نے مارنے کے بعد عامی ظاہر کرنا ہے جب کہ عامی کو عماد بنا کر جیل بھیج دو۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

وہ بولا۔ ''جناب! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن عامی کے پاس ہم دونوں کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ وہ جیل سے باہر آ کر ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ ہمیں خوب سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہوگا۔''

''تو پھر اُسے ہی ٹھکانے لگا دو، عماد کا میں خود ہی کوئی بندوبست کرلوں گا۔''

''مسئلہ تو یہی ہے جناب! کہ میں اُسے ٹھکانے بھی نہیں لگا سکتا۔'' کرمانی نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' پاشا جھنجلا گیا۔ ''تم اُسے ٹھکانے کیوں نہیں لگا سکتے؟''

''اُس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اُسے کچھ ہوا تو ہمارے خلاف ثبوت کسی نامعلوم ذرائع سے میڈیا تک پہنچ جائیں گے۔''

''ہوں...... اس کا مطلب ہے کہ اُس غنڈے کو زندہ رکھنا ہماری مجبوری ہے؟''

''ہاں...... جب تک اُس کے پاس ہمارے خلاف ثبوت موجود ہیں ہم اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

''نہیں کرمانی!'' پاشا بولا۔ ''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتی طور پر انسان کو کوئی حل نہیں سوجھتا۔''

''میرا تو سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ آپ ہی اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالیں تاکہ میں چین کی نیند سو سکوں۔'' کرمانی نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

پاشا چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا جب کہ کرمانی بے چینی سے اُس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کرمانی۔'' ذرا دیر کے بعد پاشا کی آواز سنائی دی۔ ''تم اُسے عماد بنا کر جیل بھیج دو، میں کچھ ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ زندگی بھر جیل سے باہر نہیں آسکے گا۔ جیل میں ہی مر کھپ جائے گا۔''

''میں...... میں سمجھا نہیں پاشا صاحب! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' اُس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

پاشا نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ جیل میں بند اگر کسی قیدی کی فائل گم ہو جائے تو اُس کا کیا بنتا ہے؟''

''اوہ...... ویری گڈ پاشا صاحب! میں سمجھ گیا۔'' وہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو عامی کبھی بھی جیل سے باہر نہیں آسکے گا۔''

''سمجھو ایسا ہو گیا، تم بس اُسے جلد سے جلد جیل بھجوا دو۔ باقی سب کچھ میں دیکھ لوں گا۔'' پاشا نے پُریقین انداز میں جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

عامی گزشتہ تین ماہ سے جیل میں بند تھا مگر اُسے ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ یہ تین ماہ اُس نے جیل کی حوالات میں کاٹے تھے۔ حوالات میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جو پولیس کے ریمانڈ پر ہوتے ہیں یا پھر اُن کے کیس عدالتوں میں زیرِ سماعت ہوتے ہیں۔ تین ماہ کے بعد عامی کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے حوالات سے نکال

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کر جیل کی ایک بارک میں شفٹ کر دیا گیا۔ اُنھیں دنوں ایک سینئر قیدی سے اُس کی دوستی ہوگئی جو دوہرے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ قیدی کا نام بہاول خان تھا اور وہ سہراب گوٹھ کا رہائشی تھا۔

''عامی بیٹے! تمھیں کس جرم میں اور کتنی سزا ہوئی ہے؟'' ایک دن بہاول خان نے اُس سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''چاچا! جرم تو میں نے بہت بڑے بڑے کیے ہیں مگر سزا کا تا حال کوئی پتا نہیں ہے۔ ابھی تک تو مجھے عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔''

''یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟'' بہاول خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''عدالت جب تک کسی مجرم کو سزا نہیں سنا دیتی تب تک اُسے جیل کی حوالات میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ جب کہ تم یہاں سزا یافتہ قیدیوں کی بارک میں رہ رہے ہو...... پتا کرو بھئی! یہ کیا چکر ہے؟''

''کیسے اور کس سے پتا کروں چاچا؟'' اُس نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

''جیلر سے بھئی...... اور کس سے پتا کرو گے؟'' بہاول خان نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''چاچا! میں پہلی بار جیل آیا ہوں۔ مجھے یہاں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ جیلر سے بھلا مجھے کون ملنے دے گا؟''

''کیوں نہیں ملنے دے گا......... میں ملاؤں گا تجھے جیلر سے، جیل کے ریکارڈ روم میں ہر قیدی کی فائل ہوتی ہے، جس میں قیدی کی تصویر، جرم اور دیگر معلومات ہوتی ہیں۔ وہاں تمھاری بھی فائل موجود ہوگی۔''

''بہت بہت شکریہ چاچا میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

''کوئی بات نہیں تم میرے بیٹے جیسے ہو۔'' بہاول خان نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

وعدے کے مطابق بہاول خان دوسرے دن اُسے جیل سپرینٹنڈنٹ کے آفس میں لے گیا اور سارا واقعہ جیل سپرینٹنڈنٹ کو سنا دیا۔ جیل سپرینٹنڈنٹ نے سر تا پا عامی کا بغور جائزہ لیا اور پھر افسرانہ شان سے سوال کیا۔ ''اپنا پورا نام اور جرم بتاؤ؟''

''عامر شفیق عرف عامی ولد محمد شفیق، جرم تین سو دو۔'' اُس نے بلا جھجک جواب دیا۔

''تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' سپرینٹنڈنٹ نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ ''عامر شفیق تو ایک مشہور ٹارگٹ کلر تھا۔ جو تین ماہ قبل پولیس مقابلے میں انسپکٹر اسلم کرمانی کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہو چکا ہے۔''

یہ خبر عامی کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ لمحہ بھر کے لیے تو اُس کے اعصاب ہی جواب دے گئے تاہم پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ میں زندہ ہوں...... یہ دیکھو...... آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

سپرینٹنڈنٹ بولا۔ ''مجھے تو تم پاگل لگتے ہو...... تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم عامر شفیق ہو؟''

''یہی سوال میں بھی آپ سے کر سکتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں عامر شفیق نہیں ہوں؟''

''ابھی دکھاتا ہوں۔'' اُس نے سر ہلایا اور پھر ایک چوبی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کے پٹ کھول کر اُس نے ایک خانے سے پرانے اخبارات کا بنڈل نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر اُنھیں ایک ترتیب سے چیک کرنے لگا۔ ذرا دیر کے بعد اُس نے تین مختلف اخبارات نکالے اور عامی کے سامنے ٹیبل پر پھینکتے ہوئے بولا۔ ''یہ رہے ثبوت، اچھی طرح چیک کر لو۔ ان اخبارات میں نہ صرف عامر شفیق کی تصویریں موجود ہیں بلکہ پولیس مقابلے کی تفصیل بھی درج ہے۔''

عامی نے تینوں اخبار باری باری چیک کیے۔ اُن میں عامی کی ہلاکت کے بعد کی خون آلود تصویریں بھی موجود تھیں اور ایک کونے میں اُس کی فائل فوٹو بھی لگی ہوئی تھی۔ بلا شک وشبہ وہ اُسی کی تصویریں تھیں۔ لیکن اُس کا دل یقین کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کہیں کوئی گڑبڑ تھی جو اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ اس سازش کے پیچھے انسپکٹر کرمانی اور سلیمان پاشا کا ہاتھ ہے مگر یہ اخبارات میں موجود اُس کی تصویریں اور ہلاکت کی خبریں اُس کے حلق سے نہیں اُتر رہی تھیں۔ وہ بھلا اُس کی ایسی تصویریں کس طرح بنا سکتے تھے؟ یقیناً وہ کوئی اور تھا جسے اُس کی جگہ قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ شاید اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ بچارا عامی کا ہم شکل تھا۔

تینوں اخبار اچھی طرح چیک کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''سر! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ہی عامر شفیق ہوں۔ یہ شخص جسے انسپکٹر کرمانی نے پولیس مقابلے میں ہلاک کیا ہے یہ کوئی اور ہے۔ پلیز میرا یقین کریں۔''

''نو......میں نہیں مان سکتا۔'' سپرینٹنڈنٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''عامر شفیق مر چکا ہے۔''

''اوکے تو پھر میں کون ہوں؟'' اُس نے سوال کیا۔

''یہ تو تمہیں پتا ہوگا کہ تم کون ہو؟'' سپرینٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

''میں نے تو بتا دیا ہے کہ میں عامر شفیق ہوں۔ آپ ہی نہیں مان رہے۔''

''ماننے والی بات ہو تو مانو ناں؟''

''ٹھیک ہے تو پھر جیل کے ریکارڈ روم سے میری فائل منگوائیں، مجھے پتا تو چلنا چاہیے کہ میں کون ہوں کس جرم میں جیل میں ہوں اور مجھے کتنی سزا ہوئی ہے؟''

''کیا تم واقعی اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟'' اُس نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

عامی بولا۔ ''جانتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا؟''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم کل پتا کرنا تب تک میں ریکارڈ روم سے تمہاری فائل منگوا لوں گا لیکن......''

''لیکن کیا سر؟'' عامی نے بے چینی سے پوچھا۔

''نام والا مسئلہ ہے۔ ہر فائل پر قیدی کا نام و پتا درج ہوتا ہے۔ تمہاری فائل ہم کس نام سے ڈھونڈیں گے؟''

''نام تو میرا عامر شفیق ہی ہے سر! اب اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''ایک نام کے ہزاروں آدمی ہوتے ہیں جناب! مجھے یقین ہے کہ اس کی فائل مل جائے گی۔'' بہاول خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ فائل تلاش کرنے کا حکم تو صادر فرمائیں، سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

''اوکے......یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' سپرینٹنڈنٹ نے سر ہلایا اور وہ دونوں سلام کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئے۔

وہ دوسرے دن جیل سپرینٹنڈنٹ کے آفس میں پہنچے مگر وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ سو ناکام لوٹ آئے۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد انھیں سپرینٹنڈنٹ تو مل گیا مگر عامی کی فائل باوجود کوشش کے نہ مل سکی۔ جیل سپرینٹنڈنٹ کے کہنے کے مطابق ریکارڈ روم کے عملے نے سارا ریکارڈ روم چھان مارا تھا مگر اُنھیں نہ تو کسی فائل میں عامر شفیق کا نام ملا تھا اور نہ ہی کسی فائل میں اُس کی تصویر ملی تھی۔ تب عامی نے جیل سپرینٹنڈنٹ سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی تو وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ میرا نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے۔''

''تو پھر مجھے عدالت میں پیش کیجیے سر۔'' وہ ملتمس ہوا۔ ''یہ میری شناخت کا مسئلہ ہے۔''

''یہ بھی ممکن نہیں ہے۔'' سپرینٹنڈنٹ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہ تمہارے نام کا پتا ہے، نہ جرم کا۔ تم خود سوچو میں تمہیں کس طرح عدالت میں پیش کر سکتا ہوں؟''

''تو پھر مجھے رہا کر دیں......جب میرے متعلق یہاں کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے تو پھر مجھے قید میں رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ بھی میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ میں نہ کسی کو قید میں رکھ سکتا ہوں اور نہ سزا ختم ہونے سے قبل رہا کر سکتا ہوں۔''

''لیکن ہر قیدی کی سزا کا تعین بھی تو ہوتا ہے۔ میں یہاں کب تک قید رہوں گا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ اس سلسلے میں تمہارے رشتا دار ہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

''مگر میرا تو کوئی رشتا دار نہیں ہے۔'' اُس نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔ ''تو کیا میں مرتے دم تک جیل میں ہی رہوں گا؟''

وہ بولا۔ ''میں صرف وزیرِ جیل خانہ جات کو چٹھی بھیج سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

وہ ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت دنوں تک عامی وزیرِ جیل خانہ جات کی چٹھی کا منتظر رہا۔ مگر چٹھی نے نہ آنا تھا نہ آئی۔ اب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ لہٰذا فرار کے منصوبوں پر غور کرتا رہتا

تھا۔ اس دوران ایک سال کا عرصہ بیت گیا لیکن وہ بے شناخت ہی رہا۔ بارک کے قیدی اُسے عامی کے نام سے ہی جانتے تھے مگر خود وہ مشکوک ہو چکا تھا۔ اُسے لگتا تھا جیسے وہ عامی نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے۔ کوئی ایسا شخص جس کی یادداشت گم ہو چکی ہے۔ وہ افسردہ اور بے زار سا رہنے لگا تھا۔ بہاول خان خلوص دل کے ساتھ اُس کی دلجوئی میں لگا رہا اور پھر ایک دن بہاول خان کے اصرار پر اُس نے اُسے اپنی آپ بیتی من وعن سنا دی۔ کوئی ایک واقعہ بھی اُس نے پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔

اُس کی آپ بیتی سننے کے بعد بہاول خان بولا۔ ''مجھے لگتا ہے تمہارے خلاف بہت بڑی سازش کی گئی ہے اور اس سازش میں انسپکٹر کرمانی اور سلیمان پاشا ہی ملوث ہیں۔ تمہیں باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس جال میں پھنسایا گیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں چاچا لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ انھوں نے اتنی بڑی سازش رچائی کس طرح؟''

''تم سے ملتا جلتا کوئی قربانی کا بکرا انھوں نے ڈھونڈ لیا ہوگا۔'' بہاول خان نے جواب دیا۔

''نہیں چاچا!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چکر کوئی اور ہے اخبارات میں جو تصویریں چھپی ہیں وہ سو فی صد میری ہی ہیں۔''

''ہو سکتا ہے وہ تمہاری ہی تصویریں ہوں۔ پیسے کے دم پر اس ملک میں کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ خریدار کم ہیں جب کہ بکنے والے دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ پیسے کی خاطر ایمان تک بیچ دیتے ہیں لوگ۔''

''چاچا! مجھے لگتا ہے میں جیل سے زندگی بھر نہیں نکل پاؤں گا۔ دشمنوں نے بہت مضبوط جال بُنا ہے میرے گرد۔'' اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا۔ ''مرنے کے بعد یقیناً مجھے لاوارث سمجھ کر دفنا دیا جائے گا۔''

''میں تجھے ایک مشورہ دیتا ہوں، کیا مانو گے؟ بہاول خان نے پوچھا۔

''ضرور مانوں گا چاچا! آپ حکم کریں؟''

''عامی! تم پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو اور ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری رہائی کا کوئی نہ کوئی راستا نکل آئے گا۔ اُس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے چاہے کوئی نیک ہو یا گناہ گار، بس شرط یہ ہے کہ اُسے دل سے پکارے تب وہ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔''

''ہاں چاچا۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب تو بس اُسی کا آسرا ہے ورنہ تو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔''

''وہ بڑا کارساز ہے تاریکیوں کو اُجالوں میں بدل دیتا ہے۔ تم اُسے پکار کر تو دیکھو۔''

بہاول خان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اُس نے خود کو یکسر بدل ڈالا اور اللہ تعالیٰ سے لو لگا لی۔ نماز اور ذکر میں اُسے وہ سکون ملا کہ اُس نے قید کے دن شمار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اس دوران مزید چھ ماہ بیت گئے مگر وہ خوش وخرم تھا۔ اُسے اب اس لاتناہی قید کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

اُس کی روٹین تھی کہ وہ عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جایا کرتا تھا گو کہ اُس کے ساتھی قیدی شور مچائے رکھتے تھے لیکن وہ ذکر کرتے کرتے بڑے سکون کے ساتھ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔ اُس رات بھی وہ حسب معمول عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد فرشی بستر پر دراز زیر لب ذکر کرتے ہوئے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کہ دیگر قیدی شور وغل میں مصروف تھے۔ کوئی اپنی بے سُری آواز میں فحش گانا گا رہا تھا تو کوئی چرس بھرے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اُس کا بستر بہاول خان کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا تاہم بہاول خان دیر سے سونے کا عادی تھا۔ عامی کی ابھی پوری طرح آنکھ نہیں لگی تھی کہ جیل میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ جیل کا عملہ حواس باختگی کے عالم میں ادھر سے اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ سائرن کی آواز بھی گونج رہی تھی۔ بارک کے اس ہال نما کمرے میں جتنے بھی قیدی تھے وہ دوڑ کر بند دروازوں پر جا کھڑے ہوئے۔ سب قیدی ناجرا جاننے کے لیے بے چین تھے۔

عامی بھی اپنے بستر سے اُٹھا اور قیدیوں کے ساتھ اُلجھتا ٹکراتا دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران بارک کے کمروں کے دروازے کھلنے لگے اور قیدی بارک کے دالان میں اکٹھے ہونے لگے۔ چند لمحوں کے اندر ہی اُن کے

کمرے کا دروازہ بھی کھل گیا۔وہ بھاگتے ہوئے کمرے سے نکلے تو تب اُنھیں ایک بارک میں آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیے۔یہ بارک اُن کی بارک سے کافی فاصلے پر واقع تھی۔جونہی تمام قیدی دالان میں اکٹھے ہوئے تو اُنھیں ایک انسپکٹر نے جیل سپرینٹنڈنٹ کا حکم سنایا۔''تمام قیدی بالٹیاں ، کنستر یا جو بھی برتن اُنھیں میسر ہے۔فوراً اُٹھائیں اور پانی لے کر آگ بجھانے کی کوشش کریں۔یاد رکھنا اگر کسی قیدی نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کی تو اُسے گولی ماردی جائے گی۔جیل کو چاروں طرف سے مسلح فورس نے گھیر رکھا ہے۔فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی ابھی پہنچ جائیں گی۔''

سب قیدی حکم کی تعمیل میں دوبارہ بھاگتے ہوئے اپنے اپنے کمرے میں گھس گئے اور بالٹیاں اور خالی کنستر لے کر پانی لینے کے لیے واٹر ٹینکی کی طرف دوڑ پڑے جہاں ایک بڑے سائز کا تالاب بنا ہوا تھا۔یہ تالاب قیدیوں کے نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے بنایا گیا تھا۔عامی نے بھی ایک بالٹی اُٹھائی اور کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ معاً کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ چاچا بہاول خان تھا،جس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ طاری تھی۔

''کیا بات ہے چاچا؟''اُس نے قدرے تحیر سے پوچھا۔''کیا بالٹی چاہیے؟''

''احمق انسان!بالٹی پھینک دو اور ادھر آؤ، ایسا نادر موقعہ تمھیں دوبارہ نہیں ملے گا۔'' بہاول خان نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔

''کک......کیسا موقعہ چاچا؟'' اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''یہاں سے نکلنے کا......اور ابھی زیادہ سوال جواب مت کرو، جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔''

عامی نے بالٹی پھینک دی بہاول خان کے ساتھ چل پڑا۔بہاول خان سیدھا اپنے لاکر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔جیل میں ہر قیدی کے پاس دیوار میں پیوستہ ایک الماری نما فولادی لاکر ہوتا ہے جس میں قیدی اپنا ذاتی سامان اور نقدی وغیرہ رکھتا ہے۔بہاول خان نے لاکر کھولا اندر سے ایک شاپنگ بیگ نکالا اور عامی کے حوالے کرتے بولا۔''اس میں پولیس کی وردی موجود ہے۔باتھ روم میں جا کر اسے پہن لو......شاباش دیر مت کرو،رات کے وقت اس افراتفری کے عالم میں کوئی بھی تجھے نہیں پہچان سکے گا۔مجھے یقین ہے کہ جب فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اندر آئیں گی تو اُس وقت تمھیں باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔''

عامی کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔اُس نے تیزی سے بہاول خان کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ جھپٹا اور دوڑتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔پانچ منٹ کے اندر ہی جب وہ باتھ روم سے نکلا تو ایک ہینڈسم پولیس مین نظر آرہا تھا۔بہاول خان نے اُس پر ایک ستائشی نظر ڈالی اور بولا۔''بہت خوب تم واقعی ایک سپاہی نظر آرہے ہو۔''

''ہاں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔'' اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

''تم بس پُراعتماد رہنے کی کوشش کرنا کوئی تم پر شک نہیں کر سکے گا......چلو اب نکلو اور جیل کے صدر دروازے کی طرف بڑھنا شروع کردو۔''

وہ آگے بڑھ کر بہاول خان سے لپٹ گیا۔''مجھے معلوم ہے چاچا!یہ وردی آپ نے اپنے فرار ہونے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔'' وہ ممنون انداز میں بولا۔''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''تم وقت ضائع کر رہے ہو بیٹے!شاباش جلدی کرو۔'' وہ اُس کی پشت تھپکتے ہوئے الگ ہوگیا۔

''میرے لیے دعا کرنا چاچا۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور پھر باہر نکل گیا۔

ایسے ہی وقت فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے اور عامی اندھا دھند جیل کے صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

☆☆☆

ظہیر صدیقی کو نوجوان بیٹے کی موت نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کردیا تھا۔کچھ عرصہ تو اُس نے پولیس کے ساتھ عماد کی موت کے سلسلے میں قانونی جنگ لڑی تھی مگر عدالت کے سامنے اُس کے وکیل کے کم زور دلائل نہیں چل سکے تھے۔عماد کی شکل چونکہ سوفی صد عامی ٹارگٹ کلر

سے ملتی تھی، اس لیے عدالت کے پاس کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چنانچہ چند پیشیوں کے بعد وہ کیس ہار گیا تھا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق پولیس مقابلے میں مارا جانے والا شخص عماد نہیں بلکہ مشہور ٹارگٹ کلر عامر شفیق عرف عامی تھا۔ جب کہ عماد کو عدالت نے گم شدہ قرار دے دیا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے کوشش کرنے کے باجود وہ عماد کو بھلا نہیں پایا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ عماد کی موت کے پیچھے سلیمان پاشا کا ہاتھ ہے لیکن وہ سلیمان پاشا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ ایک کم زور اور عام سا شخص تھا جب کہ پاشا کراچی جیسے انڈسٹریل شہر میں کئی فیکٹریوں کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ اُس کی پہنچ اسلام آباد کے ایوانوں تک تھی۔ چند وفاقی منسٹرز سے تو اُس کے گہرے تعلقات تھے کہ اُنھیں اقتدار کے ایوانوں تک پہنچانے میں اُس کی دولت کارفرما تھی۔ سو ایسے طاقت ور شخص سے پنگا لینا ظہیر صدیقی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا تھا کہ اُس سے بڑا منصف کوئی نہیں تھا۔

اُس رات عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی وہ سو گیا تھا۔ چونکہ عماد کی موت کے بعد اُسے بے خوابی کی شکایت رہنے لگی تھی، اس لیے وہ خواب آور گولیاں استعمال کرتا رہتا تھا۔ بغیر گولی لیے اُسے کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تو وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑا آنکھ کھلنے کے سبب پر غور کرتا رہا، پھر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے وہ اُٹھا اور ٹیوب لائٹ آن کرنے کے بعد کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایسے ہی وقت اُسے کچن میں کسی برتن کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً محتاط ہو گیا۔ کچن کا دروازہ وہ ہمیشہ بند کر کے سوتا تھا۔ برتن گرنے کا مطلب تھا کہ کچن میں کوئی موجود ہے۔ عماد کی موت کے بعد اُسے ویسے ہی زندہ رہنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اُس نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید وہ اب تک موت کو گلے لگا چکا ہوتا۔ اُس نے ٹیبل کی دراز سے لوڈڈ ریوالور نکالا اور محتاط قدموں سے کچن کی طرف بڑھنے لگا۔ کچن کی لائٹ جلتی دیکھ کر اُس کا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ کچن میں کوئی موجود ہے۔

وہ بلی کی طرح دبے قدموں چلتا ہوا کچن میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک شخص پولیس یونی فارم پہنے موجود تھا، اُس کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ کیس کے چولھے پر کوئی چیز گرم کرنے میں مصروف تھا۔ اُسے ظہیر صدیقی کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ظہیر صدیقی نے ریوالور تانتے ہوئے درشت انداز میں پوچھا۔

اجنبی اُس کی آواز سن کر بوکھلا کر پلٹا اور اُس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔ ظہیر صدیقی کی نظر جونہی اُس کے چہرے پر پڑی تو اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کے سامنے عماد پولیس کی وردی میں ملبوس کھڑا ہوا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی جگہ خوف تھا۔ وہ اگر عماد ہوتا تو اُسے دیکھ کر یوں خوف زدہ کیوں ہوتا؟ ابو کہہ کر اب تک اُس سے لپٹ چکا ہوتا۔ چند لمحے تو ظہیر صدیقی کسی ٹرانس کے زیر اثر اُسے دیکھتا رہا لیکن جلد ہی وہ حقائق کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس کے سامنے کھڑا یہ شخص سو فی صد وہی ٹارگٹ کلر تھا۔ جسے کے حصے کی موت اُس کے بے گناہ بیٹے کا مقدر بن گئی تھی۔

''تم عامر شفیق عرف عامی ہی ہو ناں؟'' اس بار ظہیر صدیقی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ہاں میں ...... عامی ہی ہوں...... مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' اُس نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں جواب دیا۔

''بہت لمبی کہانی ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔ ''جب کہ تم بھوکے ہو پہلے کچھ کھا لو، پھر تجھے پوری کہانی سناؤں گا۔''

''سوری۔'' اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں انتہائی مجبوری کے عالم میں آپ کے گھر میں داخل ہوا ہوں، دراصل ......''

''میں نے کہا ناں! کہ تم بھوکے ہو، پہلے کھانا کھا لو۔ اس کے بعد میں تمہاری کہانی بھی ضرور سنوں گا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' ظہیر صدیقی نے طنزیہ انداز میں اُس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

وہ شکریہ کہہ کر دوبارہ چولھے کی طرف متوجہ ہو گیا، جس

پر رکھا ہوا کھانا گرم ہو چکا تھا۔ اُس نے کھانا نکالا اور پھر وہیں ایک چوبی اسٹول پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس دوران ظہیر صدیقی اُسے بغور دیکھتا رہا۔ ریوالور بدستور اُس کے ہاتھ میں تھا جس کا رخ عامی کی طرف تھا۔ اُس کی کسی بھی غلط حرکت پر وہ گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ ذرا دیر بعد جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو ظہیر صدیقی سے بولا۔ ''آپ کو مجھ سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے آپ پلیز یہ ریوالور ہٹا لیں۔''

''خطرہ مجھے نہیں تجھے ہے۔'' ظہیر صدیقی نے اُسے گھورا۔ ''تمہیں اس گھر میں تمہاری شامتِ اعمال لے کر آئی ہے۔''

''مم......میں سمجھا نہیں......آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟......دیکھیے! میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ بلکہ میں تو کسی پناہ گاہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔''

ظفر صدیقی بولا۔ ''جو شخص تمہارا نام جانتا ہے کیا وہ تمہارے ماضی سے آگاہ نہیں ہو گا؟''

''مگر میں تو اپنے ماضی کو کب کا دفن کر چکا ہوں۔ اب تو میں ایک بے شناخت سا شخص ہوں جس کا نہ کوئی نام ہے اور نہ ہی پہچان۔''

''اُٹھو۔'' وہ اچانک گرجا اور پھر اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے ماروں گا اور ضرور ماروں گا لیکن اس سے پہلے تجھے تیرا گناہ ضرور بتاؤں گا۔''

عامی چار و نا چار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''چلو میں تجھے تیرا گناہ بتاتا ہوں اور وہ بھی تمام ثبوتوں سمیت جنھیں تم چاہتے ہوئے بھی نہیں جھٹلا سکو گے۔''

وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے اپنی خواب گاہ میں لے آیا اور پھر اُسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''خبردار! اگر کوئی بھی غلط حرکت کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ چپ چاپ بیٹھے رہنا، ہلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔''

''انکل! شاید آپ کو کوئی غلط فہمی......''

''خاموش ہو جاؤ جلاد کہیں کے۔'' صدیقی گلا پھاڑ کر چلایا تو اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ''اپنی گندی زبان سے مجھے انکل مت کہو، میں تمہاری موت ہوں۔ سمجھے تم۔''

عامی کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا مگر ایک مسلح شخص کے سامنے وہ کوئی بھی غلط حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ سو دم سادھ کر بیٹھا رہا۔ صدیقی نے آگے بڑھ کر دیوار سے ایک فریم شدہ تصویر اُتاری اور اُسے تھماتے ہوئے بولا۔ ''اسے جانتے ہو؟''

عامی نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور متحیر ہو کر کہا۔ ''یہ......یہ تو......میری تصویر ہے آپ کے پاس کیسے پہنچی؟''

''یہ تمہاری تصویر نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔ ''میرے اکلوتے بیٹے عماد صدیقی کی ہے جسے انسپکٹر اسلم کرمانی نے تمہارے شبے میں مار ڈالا۔ شاید اُس نے ایسا تمہیں بچانے کی خاطر کیا تھا۔ مگر آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔''

وہ بولا۔ ''انکل! میں مانتا ہوں کہ عماد کو میرا ہم شکل ہونے کی وجہ سے جھوٹے پولیس مقابلے میں مار دیا گیا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے ایک موقع نہیں دیں گے؟ اگر آپ کو میری کہانی جھوٹی لگے تو بے شک مجھے گولی مار دینا۔ میں آپ سے رحم کی کوئی بھیک نہیں مانگوں گا۔''

وہ چند لمحوں کے لیے کش مکش کا شکار رہو گیا۔ جیسے دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عامی اُمید بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں پل بھر کے لیے اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر ظفر صدیقی خاموشی توڑتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے صفائی کا موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہ کھیل انسپکٹر کرمانی نے سلیمان پاشا کے ساتھ مل کر کھیلا ہے۔ وہ دونوں آپ کے اور میرے مشترکہ دشمن ہیں۔ اُنھوں نے مجھے جال میں پھنسا کر آپ کے بیٹے کو مار ڈالا۔'' اتنا کہہ کر اُس نے اپنی زندگی کی ساری روداد بغیر کسی قطع و برید کے صدیقی کے سامنے بیان کر دی۔

صدیقی نے کہا۔ ''میں کیسے یقین کر لوں کہ تم نے سچ کہا ہے۔ تمہاری یہ داستان من گھڑت بھی تو ہو سکتی ہے؟''

''اگر کوئی تیسرا شخص میری اس کہانی کی تصدیق

کر دے تو کیا پھر آپ یقین کر لیں گے؟''
''تیسرا کون؟'' اُس نے سوال کیا۔
''انسپکٹر کرمانی۔''
''وہ بھلا تمہارے حق میں گواہی کیوں دے گا؟'' اُس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
وہ بولا۔ ''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کہ میں اُس سے کس طرح گواہی دلواتا ہوں؟''
''شاید تم فرار ہونے کے لیے یہ چکر چلا رہے ہو؟'' اُس نے خدشہ ظاہر کیا۔
''نہیں۔'' عامی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں آپ سے چاہوں بھی تو دھوکا نہیں کر سکتا۔''
''وہ بھلا کس طرح؟'' اُس نے چونک کر پوچھا۔
''مجھے شناخت چاہیے، جو صرف آپ ہی مجھے دے سکتے ہیں۔''
''کیا مطلب......میں سمجھا نہیں؟'' اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔
وہ بولا۔ ''سیدھی سی بات ہے عامر شفیق عرف عامی مر چکا ہے جب کہ عماد صدیقی زندہ ہے۔ مجھے عماد صدیقی کی شناخت چاہیے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے یہ شناخت باآسانی دے سکتے ہیں۔ میں اُس گناہ کی تلافی کرنا چاہتا ہوں جو میں نے کیا ہی نہیں ہے۔''
''میں اپنے بیٹے کے قاتل کو اپنا بیٹا کس طرح بنا سکتا ہوں؟'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔''
''میں پہلے خود کو بے گناہ ثابت کروں گا۔ تب آپ مجھے شناخت دینا۔ اگر میں خود کو بے گناہ ثابت نہ کر سکا تو تب آپ مجاز ہوں گے کہ مجھے گولی مار دیں۔''
وہ ایک بار پھر کش مکش کا شکار ہو گیا۔ اُس کی صورت دیکھ کر دل مچلنے لگا تھا کہ اُسے عماد کا نعم البدل تسلیم کر لیا جائے جب کہ دماغ دل کی مخالفت کرتے ہوئے سمجھا رہا تھا کہ یہ شخص تمہارے بیٹے کا ہی نہیں اور بھی بہت سے معصوم اور بے گناہوں کا قاتل ہے، اسے بیٹا بنانے کی بجائے گولی مار کر اپنا دل ٹھنڈا کر لو۔
اُسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر عامی بولا۔ ''اگر آپ کو میری نیت پر شک ہے تو پھر سوچنا کیا؟ چلاؤ گولی میرا سینہ حاضر ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ''مار ڈالو مجھے آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ پولیس ریکارڈ میں تو مجھے پہلے ہی مردہ قرار دیا جا چکا ہے۔''
وہ ریوالور پھینک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ''جاؤ تم آزاد ہو، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔'' پھر ایک دم اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔
عامی چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''انکل! خدا گواہ ہے کہ عماد کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ تاہم یہ بات میں مانتا ہوں کہ اُسے میرا ہم شکل ہونے کی سزا ملی ہے۔ لیکن آپ خود سوچیں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟''
''میں جانتا ہوں۔'' وہ پہلی بار نرم انداز میں بولا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ عماد اگر میری بات مان لیتا تو شاید ایسے انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ اُسے وعدہ خلافی کی سزا ملی ہے، باپ کی نصیحت نہ ماننے کی سزا ملی ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ اُس لڑکی سے نہ ملے مگر اُس نے میری ایک بھی نہ مانی۔ خود تو مر گیا لیکن مجھے مر مر کر جینے کے لیے چھوڑ گیا۔''
''یہ......لڑکی کا کیا چکر ہے، کیا عماد کسی کو چاہتا تھا؟'' عامی نے سوال کیا۔
''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر جو کچھ بھی اُسے معلوم تھا اُس نے عامی کو بتا دیا۔
''تو لڑکی کا نام زارا احمد ہے اور وہ کسی امیر کبیر شخص کی بیٹی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ امیر شخص سلیمان پاشا ہو سکتا ہے؟''
''سو فی صد وہی ہے۔'' اُس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔
عامی لمحہ بھر کے لیے سوچوں میں ڈوب گیا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر ایک دم چونک کر بولا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی بار مجھے دیکھ کر وہ چونک اُٹھا تھا۔ یقیناً اُس نے پہلی نگاہ میں مجھے عماد سمجھا ہو گا۔''
''ہو سکتا ہے......میں بھی تو پہلی نگاہ میں تجھے عماد ہی سمجھا تھا۔''
''آپ چاہیں تو اب بھی مجھے عماد سمجھ سکتے ہیں۔ بے

شک میں عماد کی طرح پڑھا لکھا نہیں ہوں مگر آپ کی نافرمانی کبھی نہیں کروں گا۔"

"میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔"

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے انکل۔" وہ پہلی بار مسکرایا اور اُس سے بغل گیر ہو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر اسلم کرمانی سہ پہر تین بجے کے بعد اپنی ذاتی گاڑی میں پولیس اسٹیشن سے باہر نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس وقت وہ یونی فارم کی بجائے عام ڈریس میں تھا۔ اُس کا گھر شہر کی ایک نئی اور مشہور و معروف کالونی میں واقع تھا۔ وہاں زیادہ تر امیر لوگوں کے بنگلے تھے۔ وہ مختلف شاہراہوں اور چوراہوں سے گزرتا ہوا ایک مشہور چوراہے تک پہنچ گیا۔ اکثر اُس چوراہے پر ٹریفک کا بہت زیادہ رش رہا کرتا تھا۔ وہاں ہارن اور گاڑیوں کے شور میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ چوراہا کراس کرنے ہی لگا کہ اچانک سگنل کی بتی سرخ ہو گئی۔ وہ بریک لگا کر بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جونہی سبز بتی جلی اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ٹریفک کے اژدہام سے نکل کر وہ ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گیا۔ اسی روڈ پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کا شان دار بنگلا واقع تھا۔ جہاں وہ اپنی خوب صورت بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گنگناتا ہوا ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ معاً اُسے اپنی پشت پر چبھن کا احساس ہوا۔ اُس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک نقاب پوش ہاتھ میں خوف ناک قسم کا ریوالور پکڑے اُسے گھور رہا تھا۔ نقاب پوش کا تمام چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جو انگارے برسا رہی تھیں۔ ریوالور کا رخ انسپکٹر کرمانی کی طرف تھا۔ وہ ایک لمحہ کرمانی کو گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔ "اگر تم میری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو محفوظ رہو گے ورنہ دوسری صورت میں مجھے تمہاری کھوپڑی اُڑاتے ہوئے ذرا سا افسوس بھی نہیں ہوگا۔"

نقاب پوش کی آواز کرمانی کو جانی پہچانی لگی۔ اُس نے دماغ پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اُسے کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ یہ آواز اُس نے کب اور کہاں سنی تھی؟ نقاب پوش کے لہجے میں چھپی دھمکی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اُس پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ سو اُس نے کوئی بھی غلط حرکت کرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا کہ اسی میں اُس کی بھلائی تھی۔ تاہم وہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں ایک......"

"حرامی قسم کا پولیس انسپکٹر اور دوست کش انسان ہوں......یہی کہنا چاہتے تھے ناں تم؟" نقاب پوش نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

اُس کی بات سن کر کرمانی کے تن من میں آگ بھڑک اُٹھی۔ "میں تجھے اس بدتمیزی کا مزا......"

"چوپ۔" نقاب پوش گرجا اور کرمانی ایک دم خاموش ہو گیا۔ "اب اگر تم نے میری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ زندگی پیاری ہے تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

اب کرمانی کے لیے اُس کے حکم پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اُس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ساحل سمندر کے قریب واقع ایک بنگلے تک پہنچ گیا۔ بنگلے کا مین گیٹ بند تھا۔ چنانچہ نقاب پوش کی ہدایت پر کرمانی نے گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ نقاب پوش نے گاڑی سے اُترے بغیر جیب سے سیل فون نکالا، کال ملائی اور رابطہ قائم ہوتے ہی بولا۔ "انکل! گیٹ کھول دیں، میں شکار لے کر پہنچ گیا ہوں۔"

چند ثانیوں کے بعد گیٹ کھل گیا۔ تب نقاب پوش نے کرمانی کو گاڑی اندر لے جانے کا حکم دیا تو اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کو بنگلے کے پورچ میں ٹھہرانے کے بعد نقاب پوش نے کرمانی کو نشانے پر رکھتے ہوئے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ وہ بے چوں چراں نیچے اُترا اور نقاب پوش کے آگے آگے چلنے لگا۔ طویل کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ آخری کمرے میں پہنچ کر رک گئے۔ اسی دوران ایک اور نقاب پوش کمرے میں داخل ہوا، اُس نے ایک نظر کرمانی پر ڈالی اور مٹھیاں بھینچتا ہوا کمرے کے ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ فرش پر جھک کر اُس نے ایک چوبی تختہ

اُٹھایا تو نیچے بیسمنٹ کی سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ وہ بلاتردد نیچے اُتر گیا۔ کرمانی خوف زدہ نگاہوں سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ اُسے نقاب پوش سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہورہی تھی۔

''چلو نیچے تہہ خانے میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' نقاب پوش نے کرمانی کو حکم دیا۔

''پ...... پلیز...... مم...... مجھے جانے دو۔'' کرمانی نے لرزتی ہوئی آواز میں التجا کی۔

''شاید تم کتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟'' نقاب پوش نے ریوالور سیدھا کیا۔ ''چلو آگے بڑھو ورنہ میں گولی چلانے لگا ہوں۔''

نقاب پوش کے لہجے میں قطعیت تھی۔ کرمانی کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ جب کہ نقاب پوش بھی اُس کی تقلید کرتا ہوا پیچھے پیچھے تھا۔ نیچے پہنچ کر نقاب پوش نے اُسے ایک کرسی پر بٹھایا، رسی لی اور اُسے مضبوطی سے کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔

''تم...... لوگ...... مم...... میرے ساتھ...... ایسا سلوک کیوں کررہے ہو؟'' کرمانی نے فریادی انداز میں پوچھا۔

''تم ایک سانپ ہو کرمانی اور سانپ کا سر کچلنا کوئی جرم یا گناہ نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر نقاب پوش نے نقاب اُتار دیا۔

اُس کی شکل دیکھ کر حیرت سے کرمانی کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ اُس کے سامنے مشہور ٹارگٹ کلر عامی کھڑا اُسے خون خوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''یہ...... یہ کیا ہے عامی!...... کیا میں نے اس لیے تمہاری جان بچائی تھی کہ تم میرے ہی دشمن بن جاؤ؟''

''تم سچ مچ پاگل ہوگئے ہو کرمانی!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''عامی کو تو تم نے خود پولیس مقابلے میں ہلاک کیا تھا۔ کیا بھول گئے؟ میں تو عماد صدیقی ہوں۔''

''نن...... نہیں...... مم...... میں نے تو عماد کو...... پولیس مقابلے میں...... ہلاک کیا تھا۔'' اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کیوں مارا تھا اُسے کمینے!'' دوسرا نقاب پوش بھو کے

عقاب کی طرح اُس پر جھپٹا اور تہہ خانہ تھپڑوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ "میں...... تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... مار ڈالوں گا تجھے...... تیرے گندے اور ناپاک جسم کو چیل کوؤں کی خوراک بنادوں گا۔" اُس پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ میکانکی انداز میں چل رہے تھے، جب کہ کرمانی بے تحاشا چلا رہا تھا۔ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ خود کو بچانے سے قاصر تھا۔

عامی چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا ساتھی جو کہ ظہیر صدیقی تھا، خود ہی تھک کر کرمانی کو چھوڑ دے گا۔ ظہیر صدیقی چند لمحے تو کرمانی کے چہرے پر تھپڑ اور گھونسے برساتا رہا، پھر عامی کی توقع کے عین مطابق وہ ہانپنے لگا۔ تب عامی آگے بڑھا اور ظہیر صدیقی کو سہارا دیتے ہوئے بولا۔ "بس انکل! اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

"نہیں۔" وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں...... اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔ تب کہیں جا کر...... میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔"

"کبھی نہیں انکل!" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے گندے خون سے میں آپ کو ہاتھ نہیں رنگنے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! جیسے تمہاری مرضی۔" وہ غیر متوقع طور پر رضامند ہو گیا۔

"ہاں تو مسٹر کرمانی! کیا خیال ہے؟" عامی، کرمانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "کس قسم کی موت مرنا پسند کرو گے؟ میں نے سارا بندوبست کیا ہوا ہے۔ تمہیں بس انتخاب کی زحمت اُٹھانا پڑے گی باقی کام میرا ہے۔"

"کک...... کیا...... تت...... تم...... مجھے مار ڈالو گے؟" خوف سے کرمانی کا رنگ زرد پڑ گیا اور زبان ہکلانے لگی تھی۔

"ہاں...... میں چاہوں بھی تو تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔" اُس نے جواب دیا۔

"پلیز عامی پلیز......" وہ گڑگڑانے لگا۔ "تمہیں خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو...... میں تمہارے پانچ کروڑ روپے بھی لوٹا دوں گا، بلکہ جتنا کچھ بھی میرے پاس ہے سب تجھے دے دوں گا...... پلیز مجھ پر رحم کرو پلیز......"

"انکل ظہیر کو اُس کا بیٹا لوٹا دو، میں تجھے معاف کر دوں گا۔"

"یہ...... یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟" وہ پھر گڑگڑایا۔ "مم...... میں اُسے...... کیسے واپس لا سکتا ہوں؟"

"تمہاری چیک بک کہاں ہے؟" عامی نے ایک غیر متعلق سوال کر دیا۔

"گاڑی میں...... ڈیش بورڈ کے اندر رکھی ہے۔" اُس نے فوراً جواب دیا شاید دل ہی دل میں اُس نے کوئی اُمید باندھ لی تھی۔

"انکل! یہ ریوالور لو اور اس پر نظر رکھنا، میں گاڑی سے چیک بک نکال کر لاتا ہوں۔" عامی نے ظہیر صدیقی کی طرف ریوالور بڑھایا۔

"نہیں چیک بک لے کر میں آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کرمانی کا دایاں ہاتھ آزاد تھا اور وہ چیک فل کرنے کے بعد سائن کر رہا تھا کہ اُسی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے سائن کرنے کے بعد چیک عامی کی طرف بڑھا دیا اور پھر اُسے اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ عامی نے اُس کی جیب سے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی تو کسی شبانہ کرمانی کا نام دکھائی دیا۔

"شبانہ کرمانی کا فون ہے۔ کون ہے یہ...... بیگم یا گرل فرینڈ؟" اُس نے کرمانی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔ اس دوران فون بجنا بھی بند ہو گیا۔

"مم...... میری بیوی ہے۔"

"ٹھیک ہے اسے بتا دو کہ تم ایک دو دن تک گھر نہیں پہنچ سکو گے، کسی سرکاری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے ہو۔ اس کے علاوہ تم نے مزید اُس سے کچھ بھی نہیں کہنا اور نہ ہی کسی قسم کی چالاکی دکھانی ہے ورنہ مجھے ایک سیکنڈ لگے گا اور تم لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔"

"مم...... میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔" کرمانی نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

عامی نے اثبات میں سر ہلایا اور شبانہ کرمانی کو کال

بیک کرنے لگا۔ جونہی رابطہ ہوا اُس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے فون کرمانی کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو......'' اُس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''کرمانی! آپ کب تک پہنچ جائیں گے؟'' بیگم نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''میں دو دنوں تک گھر نہیں پہنچ سکوں گا۔ شہر سے باہر گیا ہوا ہوں ایک سرکاری کام ہے۔''

''ٹھیک ہے تو کیا میں امی کے ہاں چلی جاؤں؟''

''چلی جاؤ، یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے؟'' کرمانی نے جواب دیا۔

''تھینکس کرمانی۔'' بیگم نے پُر مسرت آواز میں کہا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد کرمانی نے عامی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک ماتحت آفیسر کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ دو دنوں کے بعد پولیس اسٹیشن پہنچے گا کیونکہ اُسے کوئی گھریلو مسئلہ درپیش ہے۔

وہ ساری رات اُنھوں نے کرمانی کے ساتھ تہہ خانے میں گزار دی تھی۔ کھانے پینے کا بندوبست اُنھوں نے کرمانی کو اغوا کرنے سے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ چنانچہ تہہ خانے میں رہتے ہوئے اُنھیں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔ صبح اُنھوں نے پہلے کرمانی کو ناشتا کرایا اور پھر خود کیا۔ لگ بھگ صبح کے نو بجے اُنھوں نے کرمانی کو تہہ خانے میں چھوڑا اور خود باہر چلے گئے۔ تہہ خانے کا تختہ اپنی جگہ پر لگانے کے بعد عامی نے ظہیر صدیقی کو الرٹ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے ریوالور اُس کے حوالے کر دیا۔

''انکل! ہوشیار رہنا میں ایک گھنٹے کے اندر لوٹ آؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھا اندرونِ شہر کی جانب گامزن تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی سوزوکی مہران کار تھی، جو اُسے ظہیر صدیقی نے خرید کر دی تھی۔ ایک بینک کے سامنے گاڑی روک کر اُس نے ایک درمیانے سائز کا بریف کیس اُٹھایا اور گاڑی کو لاک کرنے کے بعد بینک کے اندر داخل ہو گیا۔ بینک میں اُسے تقریباً نصف گھنٹا لگ گیا مگر جب وہ باہر نکلا تو اُس کے بریف کیس میں پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود تھی۔ انسپکٹر کرمانی سے اُس نے اوپن چیک لیا تھا۔ اُس نے گاڑی کو ان لاک کیا بریف کیس ساتھ والی سیٹ پر رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بینک کی عمارت سے باہر آ گیا۔ اب اُس کا رخ شہر کی ایک معروف مارکیٹ طرف تھا۔ مارکیٹ میں پہنچ کر اُس نے ایک دکان سے ہینڈ کیری وڈیو کیمرا خریدا اور واپس روانہ ہو گیا۔

جب وہ دوبارہ بنگلے میں داخل ہوا تو اُس وقت ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ اُس نے پورچ میں جا کر گاڑی روکی، بریف کیس اُٹھایا اور تیزی سے اُس کمرے کی جانب بڑھ گیا جس میں ظہیر صدیقی موجود تھا۔ ظہیر صدیقی واقعی کسی فوجی جوان کی طرح الرٹ بیٹھا ہوا تھا۔ عامی کو دیکھتے ہی اُس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''کام ہو گیا ہے انکل۔'' اُس نے بریف کیس لہرایا۔ ''اس میں پورے پانچ کروڑ روپے کی رقم موجود ہے۔ ہم دونوں میرے گاؤں چلے جائیں گے اور وہاں سکون سے زندگی گزاریں گے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں بیٹے! عماد کے بعد اب میرا بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے اس شہر سے۔ ویسے بھی اب یہ شہر درندوں کی آماج گاہ بن چکا ہے۔ روزانہ کتنی ہی ماؤں کے لختِ جگر اور باپوں کے بڑھاپے کی لاٹھیاں چھین لیتا ہے۔ اب یہاں چاروں طرف موت کا بسیرا ہے۔''

''تو چلیے پھر عماد کے قاتل سے نمٹ لیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے تہہ خانے کا چوبی تختہ ہٹا دیا۔

ایک بار پھر وہ بندھے ہوئے کرمانی کے سر پر موجود تھے۔ ایک ہی رات میں کرمانی کی بُری حالت ہو گئی تھی اور وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔

''کیا حال ہے مسٹر اسلم کرمانی عرف ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ!'' عامی نے ریوالور کے ذریعے اُس کی تھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''خدا کے لیے......مم مجھے چھوڑ دو۔'' وہ روتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اب تو میں نے تمہارے پانچ کروڑ روپے بھی لوٹا دیے ہیں۔''

''چھوڑ دیں گے بھئی! اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ پہلے ذرا

اپنے دوست پاشا کو تو کال کر کے یہاں بلالو، اُس کے ذمے بھی اپنا بہت سا حساب کتاب باقی ہے۔ جو مجھے بے باق کرنا ہے۔''

''وہ بھلا یہاں کیوں آئے گا؟'' اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

''یہ تجھے میں بتاؤں گا کہ وہ کیسے آئے گا؟'' عامی نے ذومعنی انداز میں جواب دیا اور پھر کرمانی کا دایاں بازو رسیوں سے آزاد کرنے لگا۔

کرمانی کا فون عامی کی جیب میں موجود تھا، جسے اُس نے آف کر رکھا تھا۔ اُس نے جیب سے فون نکال کر آن کیا اور پھر فون بک میں جا کر پاشا کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

سلیمان پاشا دیر سے جاگنے کا عادی تھا۔ اُس وقت وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھا جب اچانک اُسے انسپکٹر کرمانی کی طرف سے کال آنے لگی۔ پہلے تو اُس نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں کرمانی! صبح صبح تم پر کون سی مصیبت نازل ہوگئی ہے؟''

''پاشا صاحب! کیا آپ اسی وقت اپنے ساحلِ سمندر والے بنگلے پر پہنچ سکتے ہیں؟'' کرمانی نے استفسار کیا۔

''تم.......تم وہاں کس طرح پہنچ گئے؟'' پاشا کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ''وہ تو ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور وہاں صرف ایک چوکیدار رہتا ہے۔''

''دراصل میں عامی اُستاد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ جیل سے فرار ہو کر آپ کے اس بنگلے میں روپوش تھا۔ اس وقت وہ میرے قبضے میں ہے۔ مجھے لگتا ہے اُس نے ہم دونوں کے خلاف ثبوت اسی بنگلے میں کہیں چھپا رکھے ہیں۔ کیا اس بنگلے میں کوئی تہ خانہ وغیرہ ہے؟''

کرمانی نے تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں سوال کیا۔

''ہاں ہاں...... بالکل ہے۔'' وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ''میں بس ابھی پہنچتا ہوں، خیال رکھنا وہ نکلنے نہ پائے۔''

''ڈونٹ وری پاشا صاحب! اس وقت وہ کسی کتے کی طرح میرے پیروں میں بندھا پڑا ہے۔ بنگلے کا مین گیٹ کھلا ہوگا آپ بے دھڑک اندر چلے آیئے۔'' کرمانی نے فخریہ انداز میں بتا کر رابطہ کاٹ دیا۔

پاشا نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور پھر بغیر ڈرائیور کے ساحلِ سمندر والے بنگلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ بنگلے کے مین گیٹ سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ گاڑی روک کر وہ نیچے اترنے ہی لگا تھا کہ عامی کسی بلائے ناگہانی کی طرح اُس کے سر پر پہنچ گیا۔

''ہاتھ اُوپر پاشا صاحب۔'' وہ اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے غرایا۔ ''ورنہ بھون ڈالوں گا۔''

''تت.......تم.......وہ.......کرمانی......کہاں ہے؟'' اُس نے اٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نیچے تہ خانے میں پڑا ہوا ہے اور کسی خارش زدہ کتے کی مانند چلا رہا ہے۔ چلو وہ تمہارا منتظر ہے۔''

''دیکھو! تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو.......تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' پاشا نے دھمکی دی۔

''چلتے ہو یا چلاؤں گولی؟'' عامی نے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

اُس کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر پاشا نے دوبارہ منہ کھولا تو جواب میں گولی آئے گی۔ سو وہ بلاچوں چرا عامی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے تہ خانے کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں کرمانی ایک کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ پاشا کو عامی نے دوسری کرسی پر بٹھا دیا اور پھر اُس کی جیب سے سیل فون نکال کر آف کرنے کے بعد ظہیر صدیقی کے حوالے کر دیا۔

''پاشا!'' عامی اُسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم نے عماد کو کیوں اور کیسے مروایا تھا؟ اگر تم نے ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو میں بلاجھجک گولی چلا دوں گا۔''

پاشا گو کہ بہت بڑا آدمی تھا مگر ایسی صورتِ حال سے اُس کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ چنانچہ ایک ٹارگٹ کلر کے سامنے جلد ہی اُس کے اعصاب جواب دے گئے اور اُس نے فر فر ساری کہانی سنا دی۔

بہت خوب پاشا!'' عامی نے اسے داد دی۔ ''اگر تم اسی طرح تعاون کرتے رہے تو شاید ایک بُری موت مرنے سے بچ جاؤ۔''

''مم.......مجھے مت مارنا.......میں تعاون کروں

گا۔'' پاشا نے فوراً جواب دیا۔

نصف گھنٹے کے اندر عامی ایک ایسی وڈیو فلما چکا تھا کہ وہ اگر کسی چینل سے آن ایئر ہوجاتی تو عوام پاشا کی بوٹی بوٹی کردیتے۔ وہ بیک وقت انڈین ایجنسی را، اسرائیل کی موساد اور امریکا کی سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ سے لے کر بلوچستان کی خون ریزی تک وہ ملوث تھا۔ اُس کی ساری دولت انہی ایجنسیز کی عطا کردہ تھی۔ جب کہ انسپکٹر کرمانی بھی ان جرائم میں شامل رہا تھا۔

''تم سوچ سکتے ہو پاشا!'' وڈیو فلمانے کے بعد عامی نے کہا۔ ''جب یہ وڈیو کل مختلف چینلو سے آن ایئر ہوگی تو تب تمہارا اور اس کرمانی کا کیا حشر ہوگا؟''

''نن..... نہیں.....'' پاشا اچانک ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''تت..... تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔ آج ہی یہ وڈیو مسٹر تک پہنچ جائے گی۔'' عامی نے ملک کے ایک مشہور و معروف صحافی کا نام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا سب کچھ لے لو..... مگر ایسا مت کرو۔'' پاشا نے اُسے پیش کش کی۔

''مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے پاشا۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں اب تائب ہوچکا ہوں۔ مجھے نئی شناخت مل چکی ہے۔ میں اب عامی نہیں ہوں عماد صدیقی ہوں اور.....''

عامی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ معاً پاشا نے جیب سے ایک بڑے سائز کا کیپسول نکالا اور پلک جھپکنے کی دیر میں نگل لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے کرسی سے لڑھک کر نیچے پختہ فرش پر جا گرا۔

اس کے بعد کے واقعات نہایت تیزی سے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ کرمانی کو عامی کے منع کرنے کے باوجود ظہیر صدیقی نے گولی ماردی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ قاتل کو قتل کرنا جرم ہے نہ گناہ اور کرمانی میرے بیٹے کا قاتل ہے..... سو میں نے جو بھی کیا ہے وہ درست ہے۔ بنگلے سے نکلنے سے قبل عامی وہاں سے اپنی موجودگی کے آثار مٹانا نہیں بھولا تھا۔ عامی نے اُسی دن کوریئر سروس کے ذریعے وہ وڈیو ایک مشہور و معروف چینل کو بھجوادی تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد جب وہ دونوں عامی کے گاؤں جانے کی تیاری کررہے تھے تو عین اسی وقت دروازے کی کال بیل بج اُٹھی۔ عامی نے جاکر دروازہ کھولا تو سامنے ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ ''جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' عامی نے تعجب سے پوچھا۔

''عماد صدیقی سے۔'' لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ ٹپٹا گیا۔

ایسے ہی وقت ظہیر صدیقی دروازے پر پہنچ کر بولا۔ ''ارے زارا بیٹی تم..... چلو اندر آجاؤ۔''

وہ بولی۔ ''انکل! پہلے اس نقلی عماد صدیقی کو تو راستے سے ہٹائیے۔''

ظہیر صدیقی نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر عامی سے بولا۔ ''راستے سے ہٹو یار! یہ زارا احمد ہے جس کی کہانی میں نے تجھے سنائی تھی۔''

ذرا دیر کے بعد وہ تینوں ایک کمرے میں موجود ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے کہ معاً عامی نے زارا سے کہا۔ ''مس زارا! گو کہ میں عماد صدیقی نہیں ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں۔ ویسے بھی انکل نے مجھے بطور عماد صدیقی قبول کرلیا ہے۔''

''تو اور کیا میں یہاں تمہاری شکل دیکھنے کے لیے آئی ہوں؟..... اَن پڑھ گنوار کہیں کے۔'' زارا نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرا ظہیر صدیقی کے فلک شگاف قہقہے سے گونج اُٹھا۔

انصاف

سلیم اختر

خون کے ایک گندے قطرے سے جنم لینے والا انسان جب اندھیری راہوں کا قصد کرتا ہے تو شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے اور خوشی سے رقص کرتا ہے کہ اس نے آدم کو سجدہ نہ کر کے درست کیا۔

انسانوں کے روپ میں چند شیطانوں کی روداد، جو دنیا کے لیے ایک دھبہ سے کم نہیں

سردار مراد علی حویلی کے آنگن میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ گاؤں کی دائی فضلاں کو کمرے سے باہر آتے دیکھ کر وہ اس کی طرف بے تابی سے لپکا۔ ''کیا بات ہے فضلاں! تم گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو، خیریت تو ہے ناں؟''

''سردار جی! حالات میرے اختیار سے باہر ہیں۔ سردارنی کو شہر لے جانا پڑے گا۔'' فضلاں گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم ہی کچھ کرو فضلاں! تم جانتی ہو، حویلی کی کوئی عورت اولاد کو جنم دینے اسپتال نہیں جاتی۔''

''جانتی ہوں سردار جی! مگر یہ سردارنی کی زندگی کا معاملہ ہے اس لئے دیر نہ کریں۔ اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے کہ، میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تم سردارنی کو گاڑی تک لے آؤ۔'' سردار مراد پریشان سا ہو کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

''یا پروردگار! خیر کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ وہ جلد از جلد شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے نرسنگ ہوم پہنچنا چاہتا تھا۔

سردار مراد علی نے سکینہ سے پسند کی شادی کی تھی۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے، اس لئے سکینہ اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہ بہت ہی خوش تھے کہ ان کی محبت کی تکمیل ہونے والی ہے۔ حویلی کا وارث اس دنیا میں آنے والا ہے مگر انسان تو فقط ایک کھلونا ہے اس کی چابی قدرت کے پاس ہے۔ شہر پہنچنے سے قبل ہی سکینہ ایک بیٹی کو جنم دے کر زندگی ہار گئی۔ سردار مراد اس روز دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی مگر اس کے آنسو سردارنی کو واپس نہ لا سکے۔ سردار مراد نے سکینہ کی آخری نشانی کو گلے سے لگایا تو وہ ایک بار پھر بے قابو ہو گیا۔ وہ بچی کو بے تابانہ انداز میں چومتا بھی تھا اور روتا بھی تھا۔ بچی کا نام نرگس رکھا گیا۔

مراد علی پنڈ سرداراں کا سب سے بڑا زمین دار تھا جو اسے باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ گاؤں میں اس کی بڑی شاندار حویلی تھی۔ محبت، امن، انصاف اور انسانیت سے محبت اس حویلی کا ورثہ تھا۔ مراد علی اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چل رہا تھا تبھی تو اس نے ایک معمولی زمیندار کی لڑکی سکینہ کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنایا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ سکینہ اس حویلی کی بہو بننے سے ڈرتی تھی۔ وہ اکثر سردار مراد سے کہا کرتی تھی۔ ''مجھے اونچی حویلیوں اور چوباروں سے ڈر لگتا ہے۔ مجھ جیسے غریبوں کی تو آوازیں بھی اس کے درودیوار میں دب جاتی ہوں گی اس لئے مجھے ایسے خواب مت دکھاؤ۔ سردار مراد! مجھے اپنی اوقات میں رہنے دو اور کسی سردارنی سے شادی کر لو۔''

''سردارنی تو میں تمہیں ہی بناؤں گا۔ ہمارے مذہب

کی رو سے سب انسان برابر ہیں اس لئے تم وسوسوں کو دل میں جگہ نہ دو۔ میں ثابت کروں گا اونچی حویلیوں والے بھی باوفا، جاں نثار اور وعدے کے پکے ہوتے ہیں۔"

سکینہ کی باتیں اسے یاد آتیں تو وہ بے خود سا ہو جاتا۔ زندگی اسے بوجھ لگنے لگتی۔ ایسے ہی نرگس اس کے تمام غم اور دکھ بھلا دیتی تھی۔ اب نرگس ہی اس کے جینے کا آسرا تھی۔ اس کی جان نرگس میں تھی۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی جاگیر کا آدھا حصہ نرگس کے نام کر دیا۔ نرگس کی دیکھ بھال اور پرورش کے لئے کئی عورتیں ملازم رکھی گئیں۔ ایک استانی سکول کا سبق دینے اور ایک مولوی صاحب قرآن مجید پڑھانے حویلی آتے تھے۔ اسی عرصہ میں بہنوں اور عزیزوں کے اصرار پر سردار مراد علی نے دوسری شادی کر لی۔ صفوراں اس کی برادری کی تھی۔ سکینہ کے ساتھ مراد علی کی شادی سے قبل وہ بھی مراد کو چاہتی تھی مگر مراد اس پر کم ہی توجہ دیتا تھا۔ اب تو صفوراں ہواؤں میں اڑتی تھی مگر حویلی میں ہر معاملہ میں فوقیت نرگس کو ہی حاصل تھی۔ مراد علی نے صفوراں پر واضح کر دیا تھا کہ نرگس کو اسے کسی بھی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دینا ہے۔ سوتیلے پن کے سائے سے اسے بچانا ہے۔ اسے اپنی سگی اولاد جان کر اس کی پرورش کرنی ہے۔

صفوراں نے مراد علی کی ہاں میں ہاں ملائی اور وہی کچھ کیا جس کا حکم سردار مراد نے دیا تھا۔ جب نرگس بھی اپنی سوتیلی ماں سے مطمئن اور مسرور نظر آتی تو سردار مراد کے دل میں صفوراں کے لئے بھی جگہ بن گئی۔ وہ اس کا بھی خیال رکھتا مگر سکینہ کو وہ پھر بھی نہیں بھولا تھا۔ باتوں باتوں میں سکینہ کا ذکر آ ہی جاتا جو کہ صفوراں کو ناگوار گزرتا۔ صفوراں کو سکینہ کے نام چڑ تھی کیونکہ وہ اس دنیا میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی سوکن تھی۔ وہ سکینہ اور نرگس دونوں

سے نفرت کرتی تھی مگر مراد علی کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے کی اس میں جرات نہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سکینہ مرنے کے باوجود مراد علی کے دل سے نہیں نکلی ہے۔ جب صفوراں ایک بیٹے سلطان کی ماں بنی تو اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ سردار مراد علی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے جی بھر کے خوشیاں منائیں۔ خیرات تقسیم کی گئی۔ صدقہ دیا گیا۔ غریبوں اور ناداروں کو اناج اور نقد رقم دی گئی۔ سلطان بھی مراد علی کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے جائیداد کا وارث مل گیا تھا۔ نرگس اور سلطان دونوں مل کر کھیلتے، لڑتے اور جھگڑتے تو حویلی کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ سلطان کی پیدائش کے بعد صفوراں نرگس کی طرف سے بے پروا ہو گئی۔ اب اس کی تمام توجہ کا مرکز صرف اور صرف سلطان تھا کیونکہ وہ اس حویلی کا حقیقی وارث تھا۔ صفوراں کو معلوم تھا کہ سردار مراد اپنی آدھی جائیداد نرگس کے نام کر چکا ہے۔ سردار مراد کا یہ عمل صفوراں کو اچھا نہ لگا تھا مگر اب اس فیصلے میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک روز حویلی میں صفوراں اور مراد علی اکیلے بیٹھے تھے۔ نرگس مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ سلطان ان کے پاس ہی پلاسٹک کے بنے ہوئے گھوڑے سے کھیل رہا تھا۔ مراد علی کا خوشگوار موڈ دیکھ کر صفوراں بولی۔

"سردار جی! آپ نے آدھی جائیداد نرگس کے نام کر دی ہے حالانکہ بیٹیاں تو آٹھویں حصے کی مالک ہوتی ہیں۔"

"نرگس آٹھ بیٹوں بھی بھاری ہے" مراد علی نے دو ٹوک جواب دیا۔

"باقی سب کچھ۔ بشمول اس حویلی کا مالک سلطان کا ہی تو ہے۔ میرے بعد یہی ان کا وارث اور مالک ہوگا۔" یہ کہہ کر مراد علی اٹھ کر باہر نکل گیا۔ صفوراں کی بات نے اس کے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ وہ جان گیا کہ صفوراں نرگس سے حسد کرتی ہے۔ اس کا سوتیلا پن سامنے آ گیا ہے۔ سوتیلے پن کا جلایا سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے مگر وہ نرگس کی اہمیت کو کم نہ ہونے دے گا۔ سکینہ کی نشانی کو وہ گرم ہوا بھی نہ لگنے دے گا۔ صفوراں کی اس بات نے مراد علی کے دل میں گرہ لگا دی۔ وہ صفوراں کی طرف سے چوکنا ہو گیا۔

سردار مراد علی کے ہاں مزید اولاد پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو پا کر بھی خوش تھا کہ ان کا خاندان مکمل ہو گیا ہے۔ مراد علی کو اب کوئی دکھ اور پریشانی نہ تھی اگر پریشانی تھی بھی تو یہ کہ نرگس اب جوان ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان نے بھی خوب قد کاٹھ نکالا تھا کہ وہ نرگس سے بھی بڑا لگتا تھا۔ سلطان، نرگس سے قطعی مختلف نکلا۔ نرگس کی دنیاوی تعلیم کم سہی مگر دینی تعلیم کے معاملہ میں وہ بہت آگے تھی۔ وہ نماز پابندی سے پڑھتی۔ صبح صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتی جب کہ سلطان نے مشکل سے نزدیکی اسکول سے پانچ جماعتیں پاس کی تھیں۔ نماز وہ پڑھتا ہی نہ تھا۔ قرآن مجید بھی اس نے پورا نہ پڑھا تھا۔ اسے صرف گھوڑوں اور شکاری کتوں کا شوق تھا۔ اس نے حویلی میں کئی گھوڑے اور کتے پال رکھے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکاری کتوں کے ہمراہ جنگل کی طرف نکل جاتا اور اپنے شوق کی تکمیل کرتا۔ اس نے لڑائی والے کتے بھی پال رکھے تھے۔ نرگس کو بھائی کے یہ شوق ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ انہی باتوں پر دونوں بہن بھائی میں تکرار ہوتی رہتی تھی۔ سلطان کا رویہ سخت ہوتا تھا جب کہ نرگس کے رویے میں لچک اور نرمی، نرگس سلطان کو سگا بھائی سمجھ کر بہت پیار کرتی تھی۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتی۔ راتوں کو جب وہ دیر سے گھر آتا تو اس کے لئے تازہ کھانا تیار کرتی۔ اس کے لئے دودھ گرم کرتی مگر اس کے برعکس سلطان کو بہن کی کوئی پروانہ تھی۔ وہ اتنا اکھڑ اور بے مہار ہو گیا کہ بہن کے جذبات کا بھی خیال نہ کرتا۔ ہر بات پر اس کو تضحیک کا نشانہ بناتا۔ اس کے من میں بھی یہی خلش تھی کہ اس کے باپ نے نرگس کو آدھی جائداد کا مالک بنا کر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ماں بیٹا آپس میں اس معاملے پر بات کرتے رہتے اور اندر ہی اندر گھلتے اور کڑھتے تھے مگر نرگس یا مراد علی کے سامنے یہ مسئلہ چھیڑنے کی ہمت نہ پاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سردار مراد علی نرگس کو سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔ سلطان کا یارانہ پنڈ ٹھاکراں کے ٹھاکر میرو کے خاندان سے تھا۔ ٹھاکر میرو بھی بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا مگر سردار مراد کی نسبت اس کی جائداد کم تھی۔ علاقے میں ٹھاکروں کی جائداد سیاست اور بدمعاشی کی دھوم تھی۔ لوگ اس خاندان کے نام ہی سے خوف کھاتے تھے۔ اپنی عزت اور جان مال کی حفاظت کی

خاطر کوئی ان سے ٹکر ہی نہ لیتا تھا اس وجہ سے ان کے حوصلے بلند تھے۔ کوئی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہ کرتا۔ ٹھاکر میرو سردار مراد علی سے مختلف تھا۔ میرو اپنے علاقے کی یونین کونسل کا چیئرمین تھا اور یہ سب کچھ ان کی بدمعاشی کی بدولت تھا۔ میرو شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ کسی کی عزت کی اسے پروا ہی نہ تھی۔ اس کے بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چل رہے تھے جن میں سرفہرست ٹھاکر نواز تھا۔ نواز اور سلطان پانچویں کلاس تک اکٹھے پڑھے تھے۔ وہاں سے ہی ان کی دوستی شروع ہوئی تھی جو جوان ہونے کے باوجود جاری تھی۔ دونوں کی طبیعتوں میں ہم آہنگی تھی۔ دونوں نے ہی پانچویں کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا۔ دونوں کے شوق بھی ایک جیسے تھے اس لئے ان کی دوستی بھی تھی۔ سلطان اکثر نواز کے گھر جاتا رہتا تھا مگر نواز کم ہی سلطان کے گھر آتا تھا۔ وہ آتا بھی تو اسے مہمان خانے کے علاوہ کہیں اور جانے کی اجازت نہ تھی۔

سردار مراد علی کو سلطان اور نواز کی دوستی پسند نہ تھی۔ اسے ٹھاکر خاندان کی عادات واطوار سے نفرت تھی۔ وہ ان لوگوں کی ذہنیت کو جانتا تھا۔ اس کے برعکس میرو کی یہ خواہش تھی کہ سردار مراد علی سے اس کے خاندان کے تعلقات اچھے ہو جائیں۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا ہو جائے۔ اس نے کئی بار سردار مراد علی کو دوستی کی دعوت دی مگر مراد علی اسے نزدیک نہ آنے دیتا تھا کیونکہ ان دونوں کے کردار اور طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان دنوں پنڈ سرداراں اور پنڈ ٹھاکراں کا وارڈ ایک ہی تھا کہ بلدیاتی الیکشن کا موقع آ گیا۔ ٹھاکر میرو نے سردار مراد علی کی منتیں کیں کہ وہ اسے ووٹ دیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پنڈ سرداراں کے تمام لوگ سردار مراد علی کے کہنے پر ہی ووٹ دیں گے۔ پنڈ سرداراں کے ووٹر بھی ہزار کے قریب تھے۔ ٹھاکر میرو اکیلا بھی آیا تھا اور جرگہ بھی لے کر آیا مگر سردار مراد علی نے ہامی نہ بھری۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ ''ٹھاکر میرو! تمہارا کردار اچھا نہیں ہے اس لئے میں تمہیں ووٹ نہیں دوں گا۔ ووٹ کی اصل روح ہی ووٹر کی مرضی ہے اس لئے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ میں گاؤں کے کسی فرد کو بھی منع نہیں کروں گا۔ جس کی مرضی ہے وہ تمہیں ووٹ دے یا کسی اور کو، حتیٰ کہ میں اپنی بیوی اور اولاد کو بھی مجبور نہیں کروں گا۔''

میرو ناکام واپس چلا گیا۔ پنڈ سرداراں کے باسیوں نے سردار مراد علی کی پیروی کی۔ یوں پہلی بار ٹھاکر میرو کو شکست ہوئی۔ ٹھاکر میرو کو گہرا صدمہ پہنچا۔ وہ اندر ہی اندر بل کھانے لگا مگر اس میں مراد علی سے ٹکر لینے کی ہمت نہ تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سردار مراد ایک سچا اور کھرا انسان ہے جب کہ وہ خود منافق اور جھوٹا ہے، شکست ہمیشہ جھوٹ کو ہوتی ہے۔ میرو نے سردار مراد علی کے دل میں جگہ بنانے کے لئے سوچ بچار شروع کر دی۔ جب کبھی بھی سردار سلطان کی حویلی میں آتا وہ اسے بہت احترام دیتا۔ اس کی خدمت کی جاتی۔ سردار مراد علی کی نرگس سے بے پناہ محبت اور پھر نصف جائداد کی مالکن ہونا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ سردار کی یہ کمزوری میرو اور نواز کے ہاتھ میں آ گئی تو انہوں نے سلطان کی اور بھی خاطر مدارت شروع کر دی۔ انہوں نے سلطان کو ایسا قابو کیا کہ وہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ سلطان کو پنڈ ٹھاکراں کی ایک لڑکی پسند آ گئی تھی۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرو اور نواز نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس سے شادی کرا دیں گے مگر سردار مراد کے سامنے بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ ایک دو بار سلطان اور صفوراں نے اس سلسلے میں سردار مراد سے بات کرنا چاہی تو اس نے دونوں کو جھڑک دیا۔

''سردار مراد علی کے فیصلے کے آگے کسی کو بولنے کی جرات ہی نہ تھی لہٰذا ماں بیٹا خاموش ہو گئے۔

ایک روز سردار مراد علی کسی کام کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا کہ نواز، سلطان سے ملنے اس کی حویلی میں آ گیا۔ سلطان اسے مہمان خانے کی بجائے حویلی کے اندر لے آیا اور اس کی ملاقات اپنی ماں سے کرا دی۔ صفوراں نے اپنے بیٹے کے یار کی عزت کی۔ وہیں نواز نے نرگس کو دیکھا تو وہ اس کے من کو بھا گئی۔ وہ گاؤں واپس آیا تو اس نے نرگس کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے باپ سے اس خواہش کا اظہار کیا۔

''نواز! تو نے فیصلہ بہت اچھا کیا ہے۔ اگر تمہاری خواہش حقیقت میں بدل جائے تو ہماری پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی لیکن یہ بیل منڈھے چڑھنی مشکل ہے۔ سردار مراد کے جیتے جی یہ نہ ہوگا۔''

''سلطان اور اس کی ماں تو مان جائیں گے۔'' نواز بولا۔

''تو پھر ان سے بات کرو۔ اگر وہ راضی ہوئے تو ہم ان کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلائیں گے۔'' ٹھاکر میرو مکارانہ انداز میں بولا۔ ایک روز جب سلطان اور نواز شکار کھیلنے کے بعد واپس آ رہے تھے تو نواز نے اپنے دل کی بات سلطان سے کہہ دی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں سلطان برا نہ مان جائے مگر سلطان نے یہ کہہ کر نواز کی ڈھارس بندھا دی۔ ''نواز! تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ نرگس کی شادی تو ہم نے کرنی ہی ہے۔ وہ تمہاری حویلی میں آئے گی تو اس سے ہمارے وقار میں بھی اضافہ ہوگا۔''

''مجھے تمہارے باپ سے ڈر لگتا ہے۔'' نواز نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''تم اپنے بابا کو میرے بابا کے پاس بھیجو۔ میں اور امی پوری کوشش کریں گے۔'' سلطان نے نواز کو خود ہی راہ دکھا دی۔ سلطان نے گھر آ کر اپنی ماں سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے بیٹے کی ہاں میں ہاں میں ملائی۔ وہ دونوں نرگس کو اس حویلی سے جلد از جلد نکالنا چاہتے تھے۔ ٹھاکر میرو کی زبان سے اپنی بیٹی کا نام سن کر سردار مراد بھڑک اٹھا۔

''میرو! آئندہ اپنی زبان پر میری بیٹی کا نام بھی لائے تو بہت برا ہوگا۔ میں تمہاری اور تمہارے بیٹے کی حیثیت اور حقیقت جانتا ہوں اور اس لئے خاموشی سے لوٹ جاؤ۔ میری بیٹی تم لوگوں کے قابل نہیں ہے۔'' ٹھاکر میرو ناکام لوٹ گیا مگر نواز پھر بھی باز نہ آیا۔ وہ سلطان کے کان بھرتا رہا۔ صفوراں اور سلطان نے سردار مراد کے انکار پر برا منایا اور اسے کہنے لگے۔

''نرگس کے لئے تو اس جیسا لڑکا نہ ملے گا۔ وہ ہمارے پائے کے زمیندار ہیں۔ یوں ہماری پوزیشن علاقے میں اور بھی مضبوط ہوگی۔ نرگس بھی وہاں راج کرے گی۔''

مگر سردار مراد نے ان کی رائے سے بھی اتفاق نہ کیا تھا مگر صفوراں اور سلطان کو کسی پل چین نہ تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سردار مراد کے ساتھ نرگس اور نواز کی شادی کی ہی بات کرتے جب کہ نرگس خاموش تھی۔ اس نے سب کچھ اپنے باپ پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ جو بھی قدم اٹھائے گا وہ اس کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہی ہو گا۔ سردار مراد علی نے ابھی تک نرگس کے مستقبل کا فیصلہ ہی نہ کیا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی معقول رشتہ نہ تھا۔ پھر بھی اس نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ نرگس کی شادی کسی غریب اور شریف لڑکے کے ساتھ کرے گا۔ ٹھاکروں کے بارے میں تو وہ سوچنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نواز کی والدہ سے نواز کے باپ کے ناجائز تعلقات شادی سے پہلے کے تھے۔ شادی کے پانچ ماہ بعد ہی نواز پیدا ہو گیا تھا۔ میرو نے یہ کہہ کر لوگوں اور مخالفین کے منہ بند کروانے کی کوشش کی کہ ہم نے چھ ماہ پہلے ہی خفیہ طور پر شادی کر لی تھی اور لوگ خوف کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔ سردار مراد علی کو بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ ان لوگوں کا کوئی دین مذہب نہیں، ان کو حلال اور حرام کی تمیز بھی نہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس نے صفوراں اور سلطان کو بھی اس حقیقت سے آگاہ کیا تو انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اتنی اہم بات انہوں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔ ان کا اب بھی یہ موقف اور اصرار تھا کہ نواز جیسا بھی ہے علاقے کا با اثر اور بڑے زمیندار ہی ہے وہاں بھی وہ ایسے ہی عیش کرے گی بلکہ راج کرے گی۔ سردار مراد علی کا معمول تھا کہ وہ صبح کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھنے کے بعد کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ وہ صرف مزارعوں پر ہی بھروسہ نہ کرتا بلکہ اپنے ہاتھوں سے بھی کام کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت شاندار تھی۔ اس روز بھی وہ حسب معمول اندھیرے میں کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ اس رات سلطان اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گیا تھا اور رات کو گھر واپس نہ آیا تھا۔ صفوراں اور نرگس دونوں ہی پریشان تھیں۔ مراد علی کھیتوں میں زندہ سلامت گیا تھا مگر واپسی پر اس کی لاش حویلی میں لائی گئی تھی۔ کسی ظالم نے گولیوں سے اس کا سینہ چھلنی کر ڈالا تھا۔ پنڈ سرداراں میں کہرام بپا ہو گیا۔ وہاں کے ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ نرگس کی آہیں اور بین آسمان کو چھونے لگے۔ اسے اپنی خبر ہی نہ رہی۔ وہ ہر سو دوزیاں سے بیگانی ہو گئی۔ کئی دن گزر گئے۔ اسے اپنا ہوش نہ تھا اس کا باپ اس کے لئے ایک سائبان تھا۔ اب وہ نہ رہا تھا تو لگتا تھا جیسے سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب وہ ہی حویلی تھی وہی گھر کے افراد تھے مگر وہ چاہت اور خلوص عنقا

تھے جو سردار مراد علی کی زندگی کا خاصا تھا۔ وہ جو خون کے رشتے تھے وہ بھی بدل گئے تھے۔ اس کا باپ تو اس کے لئے ایک پہاڑ تھا، ایک مضبوط قلعہ تھا جس کے اندر وہ اپنے آپ کو ہر غم، ہر دکھ اور سرد گرم ہواؤں سے محفوظ سمجھتی تھی۔ سردار مراد، علی نواز کے ساتھ شادی کے معاملہ میں ایک عبور نہ ہونے والی دیوار تھا مگر اب وہ دیوار گر گئی تھی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ قلعے کی دیواروں میں شگاف پڑ گیا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں اور بھائی کو تو اب آزادی، خود مختاری کے ساتھ حکومت بھی مل گئی تھی۔ انہوں نے سردار مراد علی کا چالیسواں ہونے کے دو دن بعد ہی نرگس کی شادی نواز سے کر دی۔ انہوں نے نرگس کے غموں کا احساس ہی نہ کیا۔ وہ تو ابھی باپ کی جدائی کے غم کو بھی نہ بھول پائی تھی کہ اسے دکھوں کی ایک اور بھٹی میں جھونک دیا گیا۔ شادی بیاہ تو دل کی راحت اور ذہنی خوشی سے مربوط ہوتے ہیں۔ نرگس کا من تو حزن و ملال سے عبارت تھا۔ باپ کی بے وقت جدائی اس کے احساسات پر یوں محیط تھی کہ اس کی آشنائی ایک معمولی سی راحت تک بھی نہ تھی۔ کتنی بدقسمت تھی نرگس کہ اپنی حویلی میں راج کرتی تھی۔ اس کا باپ اس کے ناز اٹھاتا تھا۔ اس کی خواہش منٹوں میں پوری کرتا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا مگر قسمت نے ایسا پلٹا کھلایا کہ اب وہ جیتے جی ایک جہنم میں آ گئی تھی۔

سلطان نے اپنے باپ کے قتل کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی تھی مگر اس نے کسی پر شک کا اظہار نہ کیا تھا۔ گاؤں کے لوگ سردار مراد علی کے قتل کو معمولی بات نہ سمجھتے تھے۔ انہیں ٹھاکروں پر شک تھا کہ ایسا گھناؤنا قدم وہی اٹھا سکتے ہیں۔ سردار مراد کی کسی کے ساتھ دشمنی نہ تھی۔ وہ تو امن اور نیکی کی علامت تھا۔ وہ ٹھاکروں کے غلط کاموں کی راہ میں دیوار تھا اس لئے شک کی تمام کڑیاں ان کی طرف جا کر ملتی تھی مگر سردار مراد کا اپنا بیٹا ٹھاکروں کا نام لینے کی بھی اجازت نہ دیتا تھا۔ یوں سلطان کی عدم دلچسپی کے باعث سردار مراد کے قتل کا کیس تھانے کی فائلوں میں دب کر رہ گیا مگر نرگس کو تو ایک پل بھی چین نہ تھا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ بھیانک مذاق کیا تھا۔ باپ کی شفقت چھن جانے کے بعد وہ ان لوگوں میں آ گئی تھی جن کو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین تھی۔

وہ اس کی زندگی کی یادگار سہاگ رات تھی۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ٹھان لی تھی کیونکہ وہ مشرقی لڑکی تھی۔ وفاداری درس ورثے میں ملا تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ نواز جیسا بھی ہے اس کا مجازی خدا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہر حال میں نباہ اور وفا کرے گی۔ وہ اپنی محبت اور چاہت سے نواز کو راہ راست پر لے آئے گی۔ ادھر ٹھاکر میرو اور نواز کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ انہوں نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا تھا۔ ان کے شملے اونچے ہو گئے تھے کہ وہ پنڈ سرداراں کے سردار کی بیٹی کو بہو بنا کے لے آئے ہیں۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ رات دیر گئے تک ناچنے اور گانے والے اپنے کرتب اور فن دکھا کر دولت بٹورتے رہے۔ نواز نے جب حجلہ عروسی میں قدم رکھا تو نرگس شرم سے سکڑ گئی۔ نواز نے آگے بڑھ کر نرگس کا زرتار گھونگھٹ ایک جھٹکے سے اتار کر دور پھینک دیا۔ نرگس کو اس سے یہی امید تھی مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا شوہر اس کے ہوتے ہوئے بھی شراب کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا آئے گا۔ نرگس نے کوئی بھی مزاحمت نہ کی اور اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ شاید اس کے مقدر میں ہی یہی لکھا تھا۔

نواز جب بھی رات دیر گئے اس کے کمرے میں آتا وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا آتا۔ نرگس پھر بھی اس کی منتظر ہوتی۔ یوں ہی دن، ہفتے، مہینے اور سال گزرنے لگے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ نرگس کے لئے اذیت ناک بن گیا۔ نواز اور نرگس کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نواز نے تو شادی بھی محض جائیداد کے لئے کی تھی اس کی بیوی کئی ایکڑ کی مالک تھی۔ نواز ایک جابر اور حکم دینے والا شوہر تھا۔ وہ معمولی بات بھی غصے بھرے لہجے میں کرتا۔ نرگس تو لمحہ لمحہ سہم اور ڈر کر گزارنے لگی۔ نرگس اس حویلی میں بھی نماز اور تلاوت کلام پاک کی پابند تھی۔ وہ پاک اور صاف رہتی تھی لیکن نواز تو غسل تک نہ کرتا تھا۔ منہ ہاتھ بھی طریقہ سے نہ دھوتا تھا۔ صبح صبح جب نرگس اکثر ان کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتی۔ وضو کے بعد نماز پڑھتی اور پھر تلاوت کلام پاک کرتی تو نواز کی گرج دار آواز اسے جھنجھوڑ ڈالتی۔

”پہلے میرے لئے چائے لاؤ۔“ نرگس تلاوت ادھوری چھوڑ کر اس کے لئے چائے تیار کرتی اور چائے پینے کے بعد پھر سے جانوروں کی طرح خراٹے بھرنے لگتا۔ ایسے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

میں بھی نرگس سے چائے بنانے یا پیش کرنے میں دیر ہو جاتی تو وہ نرگس کو گندی گندی گالیاں دیتا بلکہ کئی دفعہ تو اس کا ہاتھ بھی اٹھ جاتا مگر نرگس پھر بھی اف نہ کرتی۔ چائے پیش کرنے کی ڈیوٹی صرف اور صرف نرگس کی تھی۔ اس کے علاوہ گھر کی کسی نوکرانی کو ایسا کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ نواز کے نزدیک بیوی شوہر کی نوکرانی ہی ہوتی ہے۔ ایک صبح نرگس تلاوت کر رہی تھی کہ چائے بنانے میں دیر ہو گئی۔ نواز کو دیر ہو جانے پر غصہ آ گیا وہ اٹھا اور نرگس کا ہاتھ پکڑ کر غصہ میں نرگس کی مرحومہ ماں کو گالی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

''مولانی جی! یہ نمازیں اور تلاوتیں مرنے کے بعد تمہارے کام نہیں آئیں گی۔ تم میری خدمت کرو گی، میری تابعداری کرو گی تو وہ کام آئیں گی۔''

نرگس اندر ہی اندر رونے لگی کہ اس کے مقدر میں قدرت نے کیسا شوہر لکھا دیا ہے مگر اس نے زبان نہ کھولی ان دونوں میں کوئی میل نہ تھا۔ نرگس ہر معاملے میں نواز سے بڑھ کر تھی۔ نہایت ہی صابر، سمجھدار اور فرمانبردار مگر نواز اس کے الٹ تھا۔ نرگس نے ماں اور بھائی سے نواز کے وحشیانہ رویہ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے الٹا نرگس کو ہی ڈانٹا کہ تمہیں ہر صورت میں نباہ کرنا ہو گا۔ اس حویلی پر اب تمہارا کوئی حق نہیں رہا۔ تم ہر بات کو اپنی حویلی تک محدود رکھو۔ وہاں کی باتیں یہاں نہ سناؤ۔ یوں صغراں اور نواز نے اس کے تمام راستے بند کر دیئے اس لئے اس نے میکے جانا ہی چھوڑ دیا اور سسرال کو ہی اپنے لئے قبرستان بنا لیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب اس حویلی سے اس کا جنازہ ہی نکلے گا۔ وہ تو پہلے ہی زندہ درگور ہو گئی تھی۔ اس کی خواہش اور خوشیاں اس کے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہو گئی تھیں۔ اس کے من میں اب کوئی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ کوئی طلب نہ رہی تھی۔ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے جو مل گیا کھا لیا۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لئے زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے اندر خزاؤں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ نواز کے رویہ میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔

نرگس اس حویلی کے انداز اطوار دیکھ کر دنگ تھی کہ یہ لوگ تو جاہلوں اور جانوروں کی مانند زندگی گزارتے ہیں۔ ان لوگوں میں انسانوں کی عادتیں ناپید تھیں۔ نواز، نرگس کے ہوتے ہوئے بھی ادھر ادھر منہ مارتا تھا۔ نرگس سب جانتی تھی مگر اندر ہی اندر کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس نے ایک دو بار زبان کھولی اور شکوہ کرنا چاہا تو نواز نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور کہا کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھے اور حویلی کے دوسرے معاملات میں دخل نہ دے۔ نرگس کی صرف ایک ہی نند تھی جو اس کی شادی سے قبل ہی ایک دوسرے گاؤں میں بیاہ دی گئی تھی۔ نرگس کی اپنی نند زیبو سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ زیبو اسے بہت ہی اچھی اور ان سب سے مختلف لگی تھی مگر اس کے بعد وہ حویلی میں اسے ملنے یا کسی بھی اور کام کی غرض سے نہ آئی تھی۔ ٹھاکروں کی حویلی میں زیبو کا ذکر بھی نہ ہوتا تھا۔ نرگس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ زیبو سے ملے اور اس کو اپنے دکھ اور درد سنائے مگر اس سے ملاقات مشکل کام تھا۔ اس نے کئی بار نواز کو بھی کہا کہ وہ زیبو سے ملنا چاہتی ہے یا وہ زیبو کو یہاں لے آئے یا اسے اس کے گاؤں ہی لے جائے مگر نواز نے اس کی یہ خواہش پوری نہ کی۔ زیبو کا نام سن کر ہی نواز کو غصہ آ جاتا اور اس کو برا بھلا کہہ کر نرگس کی بات سنی ان سنی کر دیتا۔

یوں ہی ایک سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا۔ اس عرصے میں نرگس کے بھائی سلطان کی شادی ہو گئی۔ جس میں نواز پیش پیش تھا۔ شادی کا سارا انتظام نواز نے ہی کیا تھا۔ شاید اس نے سلطان کا وہ احسان چکایا تھا جو اس نے نرگس کی اس کے ساتھ شادی کر کے کیا تھا۔ نواز کا باپ میرو بھی کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اسے اپنے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی مل گئی تھی۔ بیماری کے دنوں میں اس کی آہیں دور دور تک جاتی تھیں مگر نواز نے اس کا اثر نہ لیا، توبہ نہ کی بلکہ اسے تو اور بھی آزادی مل گئی۔ وہ انسان نہ رہا، درندہ بن گیا مگر کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ہر کوئی اس کا تابعدار تھا۔ وہ اپنے آپ کو علاقے کا خدا سمجھتا تھا۔ انسان اشرف المخلوقات ضرور ہے مگر اس سے بڑھ کر شاید ہی حیوان بھی کوئی ہو۔

ڈیڑھ سال بعد جب نرگس ایک بیٹی سعدیہ کی ماں بنی تو اس کے غموں میں کچھ کمی آ گئی۔ اب بچی کی خاطر اس میں جینے کی امنگ پیدا ہو گئی مگر نواز پر تو اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے چند لمحوں کے لئے بیٹی پر نظر ڈالی اور پھر وہ بھلا بیٹی کی کیا پرواہ کرتا۔ راتوں کو اگر سعدیہ جاگ جاتی، رو

پڑتی تو نواز کا غصہ آسمان کو چھونے لگتا۔ وہ نرگس اور سعدیہ دونوں کو ہی برا بھلا کہتا۔ نرگس کے لئے یہ دکھ بھی جان لیوا تھا مگر اس نے زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ اسے بیٹی، نماز اور کلام پاک کی تلاوت کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی ہی نہ رہی تھی۔ وہ گاؤں کی ٹھاکرانی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کی نظروں میں اس کا ایک مقام تھا۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ وہ اپنے بڑے خاندان کی بہو بنی ہے لیکن اس کے اندر کے دکھ کو کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ جوان اور حسین تھی، لاکھوں میں ایک تھی۔ شادی کے شروع کے چند دن ہی اس نے بناؤ سنگھار کیا تھا لیکن اس کے بعد اس نے تو کبھی آئینے میں اپنی صورت نہ دیکھی تھی کیونکہ بناؤ اور سنگھار تو وہ عورت کرتی ہے کہ جسے کوئی چاہنے والے ہو، ناز اٹھانے اور اس کے حسن کی تعریف کرنے والا ہو جب کہ نرگس کے اندر تو خزاں رت ہمیشہ کے لئے ڈیرہ لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

سعدیہ دو سال کی ہوئی تو ٹھاکروں کی حویلی میں، میں نے جنم لیا۔ ان دنوں ٹھاکر نواز نے باپ کی وفات کے بعد پہلی بار کونسلر کا الیکشن دو دن قبل ہی جیتا تھا۔ اس کی خوشیاں آسمان کو چھو رہی تھیں کہ میں اس دنیا آگئی۔ میرے باپ نے الیکشن جیتنے کی خوشی میں مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا، چوما اور میرا نام خوش بخت رکھا لیکن اس کے بعد وہ بھول گیا کہ میں ہی اس کی کامیابی کی پہلی نشانی تھی۔ اس خوشی کے موقع پر اس نے میری ماں کو نہ جانے کیا سبز باغ دکھائے، نہ جانے اسے کیسے رام کیا کہ میری ماں نے اپنی جائداد کا کافی حصہ میرے باپ اور ہم دونوں بہنوں کے نام کردیا۔ یہ جاگیریں پایا کہ بہت سکھ دیتی ہیں مگر حقیقت میں جھگڑے، لڑائیاں اور قتل وغارت یہ سب جائداد والوں کے بکھیڑے ہیں جن میں کھو کر خون، خون اور بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔

میرا اباپ کونسلر کیا بنا کہ وہ سیاست کے نشے میں غرق ہوگیا۔ ہماری حویلی میں نت نئے سیاسی اور بدمعاش قسم کے لوگ آنے لگے۔ اس کے علاقے میں اور بھی دہشت پھیل گئی۔ اب تو اس کا زیادہ وقت باہر ڈیرے پر ہی گزرنے لگا۔ میرا ماموں سلطان بھی اس کا ہم نوا بن گیا۔ وہ دونوں اب حویلی کے اندر کم ہی آتے تھے جب بھی ہمارا باپ حویلی کے اندر آتا تو ماں سے تو وہ کوئی بات کم ہی کرتا۔ اسے وہ کوئی کام کرنے یا کھانے پکانے، چائے، لسی بنانے کا ہی حکم دیتا تھا۔ اس کے انداز میں غصہ اور نفرت بھری ہوتی۔ میں نے کبھی ابا کو امی سے پیار سے بھرے لہجے میں یا آرام اور سکون سے بات کرتے نہ دیکھا۔ ہم دونوں بہنوں کو تو ہمارا باپ فالتو اور ناکارہ چیزیں سمجھتا۔ ہمیں اس نے کبھی پیار نہ کیا، کبھی گود میں نہ اٹھایا، کبھی پیار سے نہ بلایا، کبھی کھلونے، کپڑے اور جوتے تک خرید کر نہ دیئے۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو ڈاکٹر کو نہ دکھایا، دوا تک لاکر نہ دی۔ یہ دکھ امی کو اندر ہی آری کی مانند کاٹتا رہتا تھا۔ وہی ہماری ماں وہی ہمارا باپ تھی۔ ماں ہی ہمیں گود میں سلاتی، ماں ہی پیار کرتی، ماں ہی کھلونے، کپڑے اور جوتے خرید کر منگواتی، ہمارے ننھے سے ذہن تو کچھ سمجھنے سے قاصر تھے مگر ماں تو سب جانتی تھی۔ عورت تھی، وہ ہمیں اپنے دائیں بائیں سلاتی، لوریاں دیتی۔ ماں نے حویلی میں ہی ہماری تعلیم کا بندوبست بھی کر ڈالا۔ وہ ہی ہمیں اسکول کے کام کراتی، قرآن مجید کے قاعدے پڑھاتی ورنہ ہمارا باپ تو لڑکیوں کی پڑھائی کے ہی خلاف تھا۔ ماں نے اپنی حویلی میں جو کچھ پڑھا اور سیکھا تھا وہ ہم بہنوں کو منتقل کر رہی تھی۔ ماں خود بھی کہیں نہ جاتی تھی اور باپ کی طرف سے ہمیں کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ جوں جوں ہماری حویلی میں سیاسی لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی گئی توں توں ہمارے باپ کی عادتیں بگڑتی چلی گئیں جو پہلے ہی کچھ کم نفرت انگیز نہ تھیں۔ پھر جب وہ علاقے کی یونین کونسل کا چیئرمین بنا تو اس کی عادتیں مکروہ سی ہوگئیں۔ نت نئی بازاری عورتیں حویلی میں آنے لگیں۔ اس پر ستم یہ کہ میری ماں سے ان کی خدمت کرائی جانے لگی۔

میری ماں نے شروع میں دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ میری ماں پر تشدد تک کیا گیا۔ ایک دن ماموں سلطان حویلی میں آیا تو ماں نے اس سے ابا کے رویئے کی شکایت کی تو انہوں نے ہمدردی یا دلاسہ دینے کی بجائے الٹا میری ماں ہی کو ڈانٹا اور کہنے لگے۔

"تم تو شروع ہی سے اس رشتے کے خلاف تھیں۔ تمہیں عزت راس نہیں آرہی کہ اب ایسی باتیں کر کے

سرداروں کی ناک کٹوانا چاہتی ہو۔"

ماں نے رو رو کر ماموں کو یقین دلانا چاہا مگر انہوں نے ماں کی ایک نہ سنی اور غصے میں حویلی سے نکل گئے۔ انہوں نے ماں کی کہی ہوئی باتیں ہمارے ابا سے کر دیں تو وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا۔ شام ڈھلے وہ حویلی میں آیا۔ پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ماں پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اس کے ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ وہ ہم بہنوں کے سامنے ماں کو غلیظ اور مکروہ گالیاں بھی دینے لگا۔ ہم دونوں بہنیں ایک کونے میں دبکی ظلم وستم کا یہ تماشا دیکھتی رہیں۔

ایسے ظلم اور ستم بھرے تماشے آئے دن کا معمول تھے۔ ہمارا باپ علاقے اور حکومت کی نظروں میں بڑے کام اور پائے کا آدمی تھا۔ اس کی شہرت ہر طرف تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری حویلی برائیوں کا گڑھ بن چکی تھی۔ ٹھاکر نواز کو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ ضلع کے بڑے بڑے افسر اب حویلی میں آتے۔ ان کی تواضع شراب اور کباب سے کی جاتی کیونکہ ہمارا باپ اوپر اور اوپر جانا چاہتا تھا۔ اب اس کی اگلی منزل ضلع کونسل کا الیکشن لڑنا تھا۔

یوں ہی دس بارہ سال کا عرصہ بیت گیا ہم دونوں بہنیں اب جوان ہو گئی تھیں۔ قدرت نے ہمیں بھی اچھی شکل صورت سے نوازا تھا۔ ہم ماں پر گئی تھیں۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اور سیرت کے لحاظ سے بھی، یہ انسان اور عورت کے لئے قدرت کی عطا ہوتی ہے۔ انسان اس کی ہی عطا پر بعض اوقات ناز کرتا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے اور انسان سے شیطان بن کر انسان پر قیامتیں ڈھاتا ہے وہ انسانوں کو جیتے جی مار ڈالتی ہیں۔ لمحہ لمحہ عذاب میں مبتلا کئے رکھتی ہیں۔ ہر سانس کرب و آزار میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ قدرت انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر اچھے برے اور پرائے اپنے کی تمیز بھی بھلا دیتا ہے۔

کئی دنوں سے ضلع کونسل کے الیکشن کا شور تھا۔ ہمارا باپ بھی اس الیکشن میں امیدوار تھا۔ اب اس کا حلقہ بڑا تھا اور مقابلہ بھی ایک مضبوط امیدوار سے تھا۔ مخالف لوگ بھی بدمعاشی بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ پنڈ سرداراں کے لوگ ٹھاکر نواز کے خلاف تھے۔ انہوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ پورا گاؤں نواز کو ووٹ نہیں دے گا کیونکہ وہ سردار مراد علی (میرے نانا) کی موت کا غم ابھی تک نہ بھولے تھے۔ میرے باپ نے میری ماں کو یہ مشن سونپا کہ اس نے پنڈ سرداراں کے تمام ووٹ اسے لے کر دینے ہیں ماں نے ٹال مٹول کی تو اسے گالیوں سے نوازنے کے ساتھ یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے اپنے باپ کے گاؤں سے ووٹ نہ دلائے تو وہ اس کو طلاق دے کر حویلی سے نکال دے گا۔ ماں نے مجبوراً ہامی بھر لی۔ جب میری ماں نے پنڈ سرداراں کے باسیوں سے ووٹ مانگے تو وہ انکار نہ کر سکے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ "سردار بیٹی! ہم تمہارے منہ کی خاطر ووٹ دے رہے ہیں۔"

میرے باپ کو فتح نصیب ہوئی۔ اس خوشی میں ہماری حویلی میں ایک بار پھر جشن کا سماں پیدا ہوا۔ بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے ساری رات رقص و سرود کی محفل جاری رہی ہم ماں بیٹیوں کو اس جیت کی کوئی خوشی نہ تھی۔ ہماری زندگیوں میں تو ایک ہی موسم آ کر ٹھہر گیا تھا۔ خزاں کا موسم، دکھ کے دن رات مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں سجدہ ریز تھیں اور دعائیں مانگتی تھیں کہ اے پروردگار! ٹھاکر نواز کو سیدھا رستا دکھا دے، اسے موم کر دے۔

ہمارے باپ نے اس پر ہی اکتفا نہ کیا۔ وہ ضلع کونسل کے چیئرمین کا بھی امیدوار بن گیا۔ اب تو بڑے بڑے سیاسی لوگوں کی آمد ورفت شروع ہو گئی۔ لین دین اور جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے باپ نے شہر میں بھی ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کروا دی۔ گاڑیوں کی تعداد دو سے بڑھ کر چار ہو گئی۔ اسے حکومت کی حمایت بھی حاصل تھی اس لئے وہ ضلع کونسل کا چیئرمین بھی بن گیا۔ قدرت نے اسے اور ڈھیل دے دی۔ اسے ایک اور آزمائش میں ڈال دیا۔ یہ کامیابیاں انسان کے لئے ایک آزمائش ہی تو ہوتی ہے مگر وہ طاقت اور اقتدار کے نشے میں یہ سب بھول جاتا ہے۔ اب اس نے ایم پی اے بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

"نرگس، سعدیہ، خوش بخت!" وہ ہم تینوں کو آوازیں دیتا ہوا حویلی کے اندر داخل ہوا تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "تم کو مبارک ہو، میں ضلع کونسل کا چیئرمین بن گیا ہوں۔" خوشیاں اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی

تھی۔

"کل ہم سب شہر چلیں گے اور خوب شاپنگ کریں گے۔" ہم تینوں کو باپ کی اس پیشکش کا یقین نہ آیا کیونکہ سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو سکتا مگر یہ حقیقت تھی۔

"نرگس! تم اور بچیاں کل تیار رہنا۔" ہمارے باپ نے دوبارہ یہ الفاظ کہے۔

"میں تو نہیں جاؤں گی، سعدیہ اور خوش بخت تیار رہنا۔" باپ نے ماں کے جانے پر اصرار نہ کیا۔ اس رات مارے خوشی کے ہم دونوں بہنوں کو نیند ہی نہ آئی۔ باپ کے رویے کی تبدیلی نے ہمارے اندر سیروں خون بڑھا دیا۔ ہم اپنی اپنی پسند کی چیزوں کی فہرست بناتی رہیں جس میں ماں کے استعمال کی چیزیں بھی تھیں۔

لینڈ کروزر میں بیٹھ کر ہمیں بہت مزہ آ رہا تھا تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم شہر پہنچ گئیں۔ ہم پہلے اپنی کوٹھی میں گئے۔ اتنی بڑی اور شاندار کوٹھی اور اس کے اندر کی سجاوٹ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ ہمارے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے تھے۔ ہر کمرا ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ صوفہ سیٹ، قالین سب کے سب قیمتی تھے۔ گرمیوں کے دن تھے اس لئے ائیر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک نے ہمیں اتنا سکون دیا کہ سعدیہ کہنے لگی۔

"اب ہم یہاں ہی رہیں گے۔" میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا "میں ابو سے کہوں گی کہ امی کو بھی یہاں ہی لے آئیں۔ اب ہم شہر میں ہی رہیں گے۔" ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ ابو نے ہمیں بازار چلنے کو کہا۔ ہم تینوں کے علاوہ ایک ڈرائیور ہمارے ہمراہ تھا۔ ابو نے ہمیں جی بھر کر خریداری کرائی۔ ہم جو چیزیں بھی پسند کرتے، ابو ہمیں خرید دیتے۔ امی کے لئے بھی وہ سب کچھ خریدا گیا جو انہوں نے کہا تھا۔ اس کے علاوہ سب کچھ بھی جو ہم نے اپنی مرضی سے پسند کیا حتیٰ کہ میک اپ کا سامان بھی خرید لیا گیا۔ کپڑوں سلے اور ان سلے سوٹ خریدے گئے۔ آخر میں ابو نے ہمیں اپنی مرضی سے عروسی ناپ کا ایک نہایت ہی قیمتی سوٹ خرید کر دیا۔ ہم شام ڈھلے بازار سے واپس آئے۔ ابا جان کے بے حد اصرار پر ہم نے وہ سوٹ پہن کر انہیں دکھائے انہوں نے اپنی مرضی سے خریدے تھے۔

"میری بیٹیاں دلہنیں بن گئی ہیں۔" ابا جان نے ہماری تعریف کی تو ہم شرما گئے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے سونے کی تیاری کر لی۔ ابا جان کسی پارٹی ممبر سے ملنے چلے گئے تھے۔ کوٹھی پر ملازم موجود تھے اس لئے ہمیں کوئی ڈر اور خوف نہ تھا۔ سونے سے قبل ہم نے جوس کا ایک ایک گلاس پیا تھا جو ایک ملازم لے کر کمرے میں آیا تھا۔ جوس پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارا باپ کب واپس آیا تھا۔ کاش! ہماری زندگی میں وہ رات نہ آئی ہوتی یا پھر اس رات کے بعد صبح نہ ہوئی ہوتی۔ اس رات نہ زمین پھٹی، نہ آسمان ٹوٹا، نہ قیامت آئی، صرف حوا کی بیٹیاں لٹ گئیں۔ اس جوس میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی۔ ہمارے باپ کا کمرہ ہمارا کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ دونوں کے درمیان ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ ہمیں تو خبر نہیں کہ اس رات باپ کی بجائے ایک وزیر اس کمرے میں ٹھہرا تھا جس نے باری باری سے ہم دونوں کو برباد کر ڈالا۔ ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے مل کر دھاڑیں مار مار کر اپنی بربادی اور بدقسمتی کا ماتم کرنے لگیں تو وہ اندر آ گیا۔ وہی جسے باپ کہتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے۔

"خاموش ہو جاؤ اگر تم میں سے کسی کی آواز بھی حلق سے باہر نکلی تو مار مار کر قیمہ بنا ڈالوں گا۔" اس کے لہجے میں درندوں جیسی سفاکی تھی۔ لگتا تھا وہ ہمیں مار ڈالے گا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی شرمندگی اور ندامت نہ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے اپنے لاشے اٹھائے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے ہونٹوں پر چپ اور جبر کے تالے پڑے تھے۔ آنکھیں بے نور تھیں۔ اس نے ہمیں حویلی کے گیٹ پر اتارا اور گاڑی آگے ڈیرے کی طرف بڑھ گئی۔

دوڑتی اور روتی ہوئی ماں تک پہنچیں تو ماں نے ہمیں سینے سے لگا لیا۔ ہم دونوں کی چیخیں حویلی میں گونجنے لگیں۔ ماں بھی اس اچانک افتاد سے گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ ہم پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ "کیوں کیا ہوا میری بچیو! تمہارا باپ تو ٹھیک ہے ہیں!" ماں نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔ ہم نے اس قدر غم انگیز اور مجروح نظروں سے ماں کی طرف دیکھا کہ وہ لرزنے لگی۔

"ہاں ہاں کہو نا بیٹا۔" ماں نے ہمیں دلاسا دینا چاہا۔

’’ماں! سچ سچ بتانا‘‘ سعدیہ روتے ہوئے بولی۔ ’’کیا نواز ہمارا سگا باپ ہے؟‘‘ سعدیہ کے لہجے کی شکستگی دیکھ کر ماں سانس تک لینا بھول گئی اور حیرانی سے ہمیں دیکھنے لگی۔

’’ہاں ہاں‘‘! ماں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’نہیں! قطعاً نہیں۔‘‘ میں بھی بول پڑی۔ ’’یہ شخص ہمارا باپ نہیں ہو سکتا کوئی شریف باپ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کی آبرو پامال نہیں کروا سکتا اس کے بعد ہم دونوں بہنوں کے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ ہم دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔

سعدیہ نے تمام تفصیل روتے ہوئے ماں کو بتا دی۔ ماں نے یقین کر لیا کہ اس کا خون جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہی تو ہماری تربیت کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹیاں مریم کی طرح مقدس ہیں مگر اب تو ان کا تقدس پامال ہو گیا تھا اور یہ تقدس خود اس کے باپ نے برباد کر دیا تھا۔

’’اے خدا! اے خدا!‘ ماں چیخ پڑی تھی۔ ’’تو قیامت کیوں بپا نہیں کرتا۔ تو کہاں ہے؟ تیرے فرشتے سچے تھے کہ تیرا بنایا ہوا انسان زمین پر فساد پھیلائے گا مگر میرا خاوند تو انسان بھی نہیں ہے۔ وہ شیطان سے بھی بڑھ کر ہے۔

’’ماں نے ہم دونوں کو گود میں بھر لیا۔ آنسوؤں اور سسکیوں کی برسات ہونے لگی۔ ہماری آہ و زاری جاری تھی کہ وہ شیطان جسے باپ کہنا بھی گناہ ہے، حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اس نے حویلی کے بڑے گیٹ کی کنڈی لگا کر اسے تالا لگا دیا اور بڑے فاتحانہ انداز سے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ ہماری ماں کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی اس لیے اس کے لبوں سے بددعائیں اور گالیاں ابلنے لگیں۔ ماں کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ ماں نے اسے دے مارا پھر ماں اس پر چیتے کی مانند لپکی اور اس کا گریبان پکڑ لیا مگر وہ تو ماں سے کئی گناہ طاقتور تھا۔ اس نے ماں کو ایک ہی جھٹکا دیا اور وہ دیوار سے جا لگی مگر پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں کو اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ ماں چیختے جا رہی تھی۔ اسے برا بھلا کہے جا رہی تھی اور جو بھی چیز ہاتھ لگتی، دیوانہ وار اس کو مارے جا رہی تھی۔ اس نے کئی بار ہماری ماں کو زمین پر پٹخا مگر ماں پھر اٹھ جاتی۔ اسے اپنی چوٹوں اور زخموں کا احساس ہی نہ تھا۔ ہم ایک کونے میں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے روئے جا رہی تھیں۔ اس نے ماں کو اتنے زور سے پٹخا کہ ماں کا سر برآمدے کے ستون سے ٹکرایا تو ماں بے ہوش ہو گئی پھر ہماری باری آ گئی۔

’’تم نے اپنی ماں سے میری شکایت لگائی۔ میں تم دونوں کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔‘‘ وہ یہ کہہ کر ہماری طرف بڑھا تو ہم رونے لگیں اور اس سے معافیاں مانگنے لگیں مگر اس درندے کو ہم پر بھی ترس نہ آیا اس نے ایک ایک زوردار تھپڑ ہم دونوں کو مارا اور کہنے لگا کہ اب اگر تم نے کسی سے اس بات کا ذکر کیا تو زبان کھینچ لوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر باہر نکلا اور ہماری ماں کو گھسیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ پھر اس نے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی اور خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ہم دونوں ماں سے لپٹ گئے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ کافی دیر بعد ماں کو ہوش آیا تو وہ اپنا درد بھول کر ہم دونوں کو سینے سے لگا کر تقدیر کے ستم کا ماتم کرنے لگی۔ ماں ہمارے دکھ کو دیکھ کر اس قدر دکھی ہو گئی کہ آنسو اس کی پلکوں پر رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ اس کے اندر آتش فشاں سا پھٹ پڑا تھا۔ رگوں میں خون کی بجائے پارہ دوڑنے لگا تھا۔ سانسوں میں تیزاب کی آمیزش تھی۔ ماں کے لئے تو ویسے بھی زندگی عذاب ہی رہی تھی۔ اب ہم بھی اس عذاب کا شکار ہو گئے ہم ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہے تھے لمحہ لمحہ پور پور اجڑ رہے تھے۔ مستقبل کے زہریلے ناگ ہمیں ڈس رہے تھے۔ اذیت ناک سوچیں ہمیں چین نہ لینے دے رہی تھیں۔ اب کیا ہو گا۔ کون ہمیں بیاہ کر لے جائے گا؟ شور مچایا تو اپنی ہی بدنامی ہو گی تو پھر ہم کیسے جئیں گے؟ ہم نے احتجاج کیا بھی تو کوئی بات کا یقین نہ کرے گا۔ تو پھر کیا کریں، کس طرح اس بھیڑیئے سے اپنے آپ کو بچائیں؟ کس کو مدد کے لئے پکاریں۔ کون ہماری پکار سنے گا۔ کون ہمیں دلاسا دے گا کون ہماری حفاظت کرے گا؟ دنیا کی نظروں میں تو ہمارا باپ ہی ہمارا نگہبان تھا۔ وہی مالی اور وہی رکھوالا تھا مگر جب مالی، رکھوالا اور نگہبان ہی لٹیرا بن جائے تو پھر دنیا کی کون سی معتبر ہستی ہو گی جس پر اعتماد کیا جائے دن اور راتیں ہمارے لیے عذاب بن گئیں۔ ہم اپنے ہی گھر میں محتاج ہو گئے۔ تین دن تک اس نے ہمیں کمرے میں بند رکھا کیونکہ اسے یہ خوف تھا کہ ہم اس کے کرتوت لوگوں کو نہ بتا دیں۔ ان تین دنوں میں حویلی کے اندر کسی کو بھی آنے کی اجازت

نہ تھی۔ ہماری اپنی حویلی ہی ہمارے لئے قید خانہ بن گئی تھی۔ کھانا وہ ڈیرے پر پکواتا اور صرف رات کا ہمارے لئے کھانا لے آتا۔ ہم مجبور اور بے بس اس کے رحم کرم پر سسک سسک کر زندگی گزار رہی تھیں۔ ایک روز وہ ہمارے ماموں کو ہمارے خلاف بھڑکا کر حویلی لے آیا۔ اسے دیکھ کر ماں کے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اس نے ماموں کو کھری کھری سنا ڈالیں کہ اس نے نواز کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی جہنم بنا ڈالی ہے۔ یہ انسان نہیں شیطان ہے۔ حیوانوں سے بھی بڑھ کر مگر ماموں نے ماں کی بات ان سنی کر دی۔ وہ الٹا ماں اور ہم پر برس پڑا۔ کہنے لگا۔

''مجھے نواز نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ تم طلاق لے کر کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہو۔ تمہیں اس نے اس لئے بند رکھا ہے کہ تم گھر سے بھاگنے کا ارادہ کر چکی مگر یاد رکھو نرگس میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ کان کھول کر سن لو یہ حویلی تمہارا پہلا اور آخری ٹھکانا ہے۔ تم یہاں ڈولی میں بیٹھ کر آئی تھیں۔ اب یہاں سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہئے''۔

ماموں ہمیں دھمکیاں دے کر چلا گیا کیونکہ وہ ابا کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ اس نے ہماری امیدوں کے دیئے بجھا دیئے ہمارے ماموں کو خودداری اور جھوٹی شان تو یاد رہی مگر وہ یہ بھول گیا کہ بہنوں اور بھائیوں کے کچھ حقوق بھی ہوتے ہیں۔ ماموں چلا گیا تو ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر سسکنے لگیں۔ تین دن بعد ہم کمرے سے باہر آگئیں مگر حویلی سے باہر جانے کی پھر بھی اجازت نہ تھی۔ اس ذلیل انسان میں تو شیطان حلول کر گیا تھا۔ وہ ہمارے طرف ہوس بھری نگاہوں سے دیکھتا تو ہماری جان نکل جاتی۔ ماں تو اس سے بات بھی نہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ حویلی کا مالک تھا۔ ''اب اگر تم نے میری بچیوں کی طرف گندی نگاہ اٹھائی تو میں تمہاری جان لے لوں گی۔'' امی غصہ اور نفرت سے اسے دیکھ کر کہتیں۔ ''دیکھ لوں گا۔'' وہ ہماری طرف نگاہ اٹھا کر کہتا ہوا حویلی سے باہر نکل جاتا تو ہم امی کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتیں۔

''حوصلہ رکھو! اللہ بہتر کرے گا۔ تم ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرو۔'' ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا مگر مختلف وہموں کے کالے ناگ ہمیں مسلسل ڈس رہے تھے ہم سوچتی تھیں کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔ ہم تو اب اپنے مرنے کی دعائیں مانگنے لگی تھیں۔ کبھی میں سوچتی کہ کسی طریقے سے یہاں سے فرار ہو جائیں۔ تا کہ اس شیطان سے نجات مل جائے لیکن جائیں بھی تو کہاں اس شیطان کا تعلق تو بڑے بڑے افسروں سے تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے۔ اگر بھاگنے کے بعد اس نے ہمیں ڈھونڈ لیا تو پھر زندگی مستقل عذاب بن جائے گی۔ ہماری خاموشی اور ہمارے آنسو ہماری کمزوری بن گئے۔ اس کمزوری کا اس شیطان نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے کھانے میں کوئی بے ہوشی کی دوا ملا دی اور سعدیہ کے ساتھ پھر وہی شیطانی کھیل کھیلا۔ ہمیں صحیح پتا نہیں مگر اندازہ تھا کہ لاہور سے وہی وزیر ڈیرے پر آیا تھا جسے ابا حویلی میں چپکے سے لے آئے۔

ہماری حویلی میں پھر قیامت آگئی۔ ایک بار پھر ماں کی زبان حرکت میں آگئی اور اس کے بدلے میں اس کو اتنی مار کھانی پڑی کہ وہ چارپائی کی ہوگئی۔ میں نے اور سعدیہ نے دن رات ماں کی خدمت کی تو اس کی طبیعت سنبھل گئی مگر وہ شیطان اپنے مکروہ کھیل سے باز نہ آیا۔ جی چاہتا تھا ہم تینوں مل کر خودکشی کر لیں اور اس ذلت بھری زندگی سے نجات حاصل کر لیں مگر ماں کہتی تھی کہ خودکشی حرام ہے، اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ خودکشی کرنے والے کی بخشش ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ وہ خبیث انسان خدا، رسول ﷺ اور اس کے احکام کو بھلا کر وحشی بن کر ہم پر ستم ڈھاتا رہا اور ہم روتے اور دیواروں کے ساتھ سر ٹکرانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ کر سکیں۔

اس روز صبح جب میں اور امی نماز کے لئے جاگ گئی تھیں۔ ہم وضو کر چکیں تو سعدیہ بھی اٹھ گئی۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ جوں ہی وہ اٹھی، اسے قے اور متلی شروع ہو گئی۔ امی فوراً ہی سمجھ گئیں کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر دعا مانگتے وقت ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ امی اتنی بے بسی سے روئیں کہ میری آنکھیں بھی بہنے لگیں۔ یقیناً درودیوار بھی امی کی آہ و زاری سن کر لرز اٹھے ہوں گے۔ انہوں نے نواز نامی شیطان کو بد دعائیں بھی دیں مگر اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ سعدیہ بھی جان گئی، سعدیہ کی حالت دیکھ کر میری حالت بھی

غیر ہوگئی۔ اس رات وہ شیطان گھر پر نہ تھا۔ وہ کسی سرکاری میٹنگ کے سلسلہ میں شہر گیا ہوا تھا۔ دو دن بعد آنا تھا۔ اسے پرواہ ہی نہ تھی کہ اس نے ایک باپ ہو کر کیا ستم ڈھایا ہے۔ سارا دن بے تابی اور بے قراری سے گزارا اور پھر رات آ گئی۔ سعدیہ جان گئی کہ اس کی رسوائی اس کی ماں اور بہن کو بھی بدنام کر ڈالے گی۔ زمانے کو حقیقت سے کوئی غرض نہ ہوگی۔ وہ تو ظاہری احوال دیکھیں گے۔ اس رات سعدیہ نے ماں کا کہنا نہ مانا۔ اس نے سنڈی مارنے والی دوا کھا کر زندگی سے ناتہ توڑ لیا۔ اس نے تمام دکھوں سے نجات پالی۔

حویلی میں کہرام مچ گیا۔ میرا اور امی کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ شیطان بھی لوٹ آیا تھا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی میری پھوپھی زیبو بھی سعدیہ کی وفات کا سن کر آ گئی تھیں۔ وہ تین راتیں اور دن ہمارے گھر رہی۔ وہ مجھے اور امی کو دلاسا دیتی مگر چین اور قرار کس کو تھا۔ پھوپھی نے جب امی سے سعدیہ کی موت کے بارے میں پوچھا کہ اسے کیا ہوا تھا، کیا بیماری تھی تو امی سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس شیطان کے مکروہ کرتوتوں سے پھوپھی کو آگاہ کر دیا۔

پھوپھی زیبو یہ سب کچھ جان کر ششدر رہ گئی۔ کہنے لگیں۔ ''وہ ذلیل اور کمینہ اتنا گر جائے گا کہ اپنی بیٹیوں کی عزت بھی پامال کر دے گا۔ وہ خود ہی حرام کی پیداوار ہے۔ اس میں شرم اور حیا نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پھوپھی بھی رونے لگیں اور روتے روتے بتانے لگیں کہ اس نے میری عزت بھی پامال کرنا چاہی تھی۔ مگر میں اس کے ستم سے بچ گئی۔ اس کے اس دوست کی جم پٹائی کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس حویلی میں نہیں آتی۔ نہ ہی اس میں اس کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہ ہی اس سے کوئی بات کرتی ہوں۔ میں نے اس کا سماجی بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ وہ میری نظروں میں مجرم ہے اس لئے مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھی تھی کہ اس کو پچھتاوے کا احساس مار ڈالے گا اور وہ سدھر جائے گا۔ لوگ تو شیطان سے پناہ مانگتے ہیں مگر میں تو اس جیسے انسان سے پناہ مانگنے لگی ہوں۔ خود باغبان ہی اپنا گلشن اجاڑ دے، سگا باپ سگی بیٹیوں کا یہ حشر کر دے۔ الاماں اے پروردگار! ہم خود کو مسلمان کہنے والے اس حد تک قعر ذلت میں ڈوب چکے ہیں کہ قیامت آ جانی چاہیے ایسے انسانوں کی شکل بگڑ جانی چاہئے۔

''بھابی! مجھے تمہاری اور تمہارے بیٹیوں کے مقدر پر رونا آ رہا ہے کیونکہ یہ میرا بھی تو خون ہے مگر اب شرعی لحاظ سے تم آزاد ہو۔ خوش بخت کی زندگی اور آبرو کی خاطر تم دونوں اس حویلی سے فرار ہو جاؤ۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم کہاں جائیں؟'' امی نے بے تابی سے پوچھا۔

''اس کا سارا بندوبست میں کروں گی۔'' پھوپھی نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے الیکشن ہو رہے ہیں۔ اس دوران بڑے بڑے جلسے ہوں گے۔ یہ راتیں بھی باہر گزارے گا۔ میں کسی رات تم دونوں کو فرار کرا دوں گی۔ تم بے فکر ہو جاؤ اور انتظار کرو۔ پھوپھی زیبو ہمارے غم ہلکے کر کے چلی گئیں۔ سعدیہ کو ہم ایک پل کے لئے نہ بھول پائی تھی امی اور میں اس جدائی میں آنسو بہاتی رہیں۔ امی دعا مانگا کرتی تھی ''اے پروردگار! تو سعدیہ کو بخش دے اور ایسی ذلت کسی دشمن کو بھی نہ دینا۔''

وہ الیکشن کے دن تھے۔ وہ شیطان واقعی صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لے رہے تھا اسے ایک بڑی پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا اور اس کی حمایت بھی اسے حاصل تھی مگر مخالف جماعت کا امیدوار بھی کمزور نہ تھا۔ وہ اس سے قبل دو بار ایم پی اے رہ چکا تھا۔ نہایت کانٹے دار مقابلہ تھا جس نے اس شیطان کی نیندیں حرام کر ڈالی تھیں۔ وہ دن رات مصروف رہنے لگا۔ اسے ہماری یاد ہی نہ رہی تھی اور یہی موقع ہمارے لئے غنیمت تھا۔ پھوپھی زیبو اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھیں۔ انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر تمام معلومات حاصل کر لی تھی۔ وہ دس فروری کو حویلی آئیں۔ انہوں نے ہم ماں بیٹی کو حوصلہ دیا اور کہنے لگیں۔ ''کل رات شہر میں پارٹی کا بڑا جلسہ ہے جس سے پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر خطاب کریں گے۔ وہ شیطان بھی وہیں ہوگا۔ رات کو بھی اس کی واپسی نہ ہوگی۔ اس لئے تم رات کو گیارہ بجے تیار رہنا۔ میں نے گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کر لیا ہے، فکر نہ کرو۔ ڈرائیور اعتماد کا آدمی ہے۔ وہ رات کو تمہیں جی ٹی روڈ سے لاہور جانے والی بس میں بٹھا دے

گا۔ تم صبح صبح لاہور پہنچ جاؤں گی۔ وہاں سے رکشا یا ٹیکسی لے کر چونگی امر سدھو چلی جانا۔ میں تمہیں ایڈریس لکھ کر دے دوں گی اور سمجھا بھی دوں گی۔ وہ تمہیں پناہ بھی دے گا تمہاری مدد اور حفاظت بھی کرے گا۔" پھوپھی ہمیں سب کچھ بتا کر اور سمجھا کر چلی گئیں۔

اگلے روز ہم نے حویلی چھوڑنے کی مکمل تیاری کر لی۔ ماں نے اپنا زیور اور کچھ رقم بھی اکٹھی کر لی۔ رات گیارہ بجے پھوپھی زیبو گاڑی اور ڈرائیور لے کر آ گئیں۔ انہوں نے اپنا عہد نبھایا اور جو کہا تھا کر دکھایا۔ جب ماں اور میں پھوپھی کے گلے لگیں تو دونوں طرف سے آنسو بہہ نکلے۔

"خدا کرے ہماری پھر ملاقات ہو مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ اس نیکی کی مجھے بڑی بھیانک سزا ملے گی"۔ پھوپھی نے کہا اور رات کے اندھیرے میں پیدل ہی اپنے گاؤں کی طرف چل پڑی۔ تین گھنٹے کے سفر کے بعد ڈرائیور نے ہمیں جی ٹی روڈ پر ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچا دیا۔ دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ہمیں لاہور جانے والی بس مل گئی صبح ہم لاہور پہنچ گئیں اور ٹیکسی میں بیٹھ کر قادر کے گھر پہنچ گئیں۔ پھوپھی زیبو کا نام سن کر اس نے ہمیں بہت ہی احترام دیا۔ ماں نے اسے بتایا کہ وہ نواز کی بیوی اور میں اس کی بیٹی ہوں اور اس کے ظلم وستم سے گھبرا کر بھاگ آئی ہوں۔ تو وہ بھی اس شیطان کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس نے ہمیں تسلی دی کہ ہم جب تک چاہیں اس کے گھر میں رہ سکتی ہیں وہ ہمیں کسی قسم کی پریشانی اور تکلیف نہ ہونے دے گا قادر جوان تھا اور کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس کا گاؤں آنا جانا کم ہی ہوتا تھا کیونکہ گاؤں میں اس کا کوئی عزیز زندہ نہ تھا۔ امی کے کہنے پر اس نے اسی محلہ میں ایک بڑا مکان لے لیا جس میں دو کمرے تھے اب ایک کمرہ میں قادر اور ایک کمرہ میں، میں اور امی سونے لگی۔ امی نے گھر کے اخراجات کے لئے قادر کو زبردستی رقم دی تاکہ ہم اس پر بوجھ نہ بنیں۔ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ شیطان ہمیں ڈھونڈ نہ لے اگر اس نے ہمیں ڈھونڈ لیا تو زندگی ہمارے لئے جہنم بنا دی جائے گی۔ قادر ہمیں تسلی دیتا رہتا تھا وہ مجھ سے زیادہ بات نہ کرتا تھا۔ پھوپھی زیبو کی وہ بڑی تعریفیں کرتا اور میرے باپ کو گالیاں دیتا رہتا۔ وہ بھی اس شیطان کا ستایا ہوا تھا۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس شیطان نے اس کے ساتھ کیا زیادتی کی ہے۔ الیکشن ہو گئے اور وہ شیطان جیت گیا۔ اس روز امی اور میں بھی بہت روئی تھیں۔ اپنی اور عوام کی بدقسمتی پر آنسو بہائے تھے کہ ہمارے عوام کس قدر جاہل ہیں کہ ایک شیطان کو اسمبلی کا ممبر بنا دیا ہے بھلا ایسے لوگ قوم اور ملک کی کیا خدمت کریں گے؟

امی اب بھی دن رات اپنی بدقسمتی اور سعدیہ کی بے حرمتی اور موت کا دکھ سینے سے لگائے رکھتی تھیں یہ دکھ اندر ہی اندر ان کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا اور وہ بیمار رہنے لگیں۔ وہ گھر چھوڑنے کے بعد صرف چھ ماہ ہی زندہ رہیں اور زندگی سے ناتہ توڑ گئیں۔ اس روز میں بہت روئی تھی کہ میں تنہا اور بے آسرا ہو گئی ہوں۔ اب کون میرے دکھ بانٹے گا؟ کون میرے آنسو پونچھے گا؟ کون میرا سر اپنی گود میں رکھ کر سہلائے گا۔ نہایت ہی خاموشی سے میری امی شہر خموشاں میں جا سوئی تھی۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز اس شیطان کے قافلے پر بم حملہ ہوا اور اس کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے گاڑی کے ساتھ میرا ماموں بھی تھا اس خبر پر میری آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ آیا بلکہ میں نے فوراً رب کے حضور سجدہ شکر بجا لائی تھی مگر اب میں دنیا میں تنہا تھی جلد ہی پھوپی نے میرا نکاح قاسم سے کر دیا اب میں اس کے ہمراہ واپس اپنی جاگیر کا انتظام سنبھالنے اپنے گاؤں جا رہی تھی۔

عشنا کوثر سردار

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے۔اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر......وہ خوف......تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی عین النور اس کی طرف سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔

خاموشی میں سوال اور سوالوں کے اطراف بہت سے حاشیے اور دائرے اور دائروں میں دبی سرگوشیوں میں چلتی پھرتی خاموشی مجھے اندازہ نہیں ہو پاتا خاموشی زیادہ بولتی ہے یا آنکھیں اور ان خاموشیوں میں سوال دب کیوں نہیں جاتے؟

تیمور بہادر یار جنگ نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ عین فوری طور پر نفی میں سر ہلانے لگی تھی اگر چہ وہ اس کے مد مقابل نہیں تھا اور فون پر تھا مگر وہ جتاتے ہوئے بولی تھی۔

''زندگی خاموشی میں چھپے لفظوں کو سمجھنا اور ان کے معنی ڈھونڈنا ہے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ لفظوں کے معنی کتنے الجھے ہوئے ہیں خاموشی کے راز جان لینے سے تمام الجھنیں سلجھنے لگتی ہیں بشرطیکہ آپ کو سننے سمجھنے کی عادت اور صلاحیت ہو۔'' اس کا انداز جتانے والا تھا۔

''آپ کی بات سے اتفاق کر بھی لوں تو عین النور پٹوڈی محبت دور ستاروں کہکشاؤں پر بنا کوئی گھر لگتا ہے۔ جس کے بارے میں سوچنا خواب لگتا ہے اور وہاں جا کر رہنا ناممکن مگر پھر بھی ان کہکشاؤں کی دنیا کے بارے میں جاننے کا تجسس کہیں بڑھتا جاتا ہے اور اگر چہ عقل جانتی ہے سب ناممکن ہے مگر ان ستاروں سے نگاہ ہٹتی نہیں۔'' تیمور دوسری طرف اسے لاجواب کرتا ہوا مسکرایا تھا۔

عین لمحہ بھر کو خاموش رہ گئی تھی پھر کچھ یاد آنے پر یکدم بولی تھی۔

''ہم آپ سے بعد میں بات کریں گے تیمور فی الحال دادی جان کی بات سننا ضروری ہے شاید وہ ہمیں بلا رہی ہیں مگر وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''عین النور پٹوڈی میں نہیں جانتا کہ جہاں ربط نہیں ہوتا وہاں کوئی رشتہ کیسے جڑتا ہے میں غیب کے کلیوں اور مفروضوں کے اعداد و شمار کو سمجھنے کی سعی نہیں کر سکتا مگر مجھے ایک الہام ہوتا ہے جیسے آپ کا ہاتھ تھامنا اور قدم قدم آپ کے ساتھ چلنا اور اس سفر میں آپ کو محفوظ کرنا جیسے میرا حق ہے اور اولین فرض بھی سو آپ چاہیں بھی تو اس سفر میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے سے مجھے نہیں روک سکتیں۔'' تیمور کا لہجہ جیسے بہت سے راز اپنے اندر رکھتا تھا عین چونک گئی تھی۔

''ہم ایسے کلیوں اور مفروضوں پر یقین نہیں رکھتے تیمور بہادر یار جنگ ان کی حقیقت کچھ نہیں کیونکہ یہ حقیقت کی نفی کرتے ہیں اور حقیقت کو یہ قبول نہیں۔'' عین کی آواز پر اعتماد تھی اور وہ دوسری طرف مسکرا دیا تھا۔

''میں ابھی تک اندازہ نہیں کر پایا، سوال آنکھوں میں زیادہ ہیں یا باتوں میں، باتیں مختصر ہوتی ہیں کبھی طویل، سمجھنے میں الجھنیں سر اٹھانے لگتی ہیں مگر آنکھوں کے الجھاوے لامحدود سوالوں میں قید کرنے والے ہیں، ایسے میں تالوں کی چابیاں ڈھونڈنے کی سعی کون کرے گا جبکہ دیکھنے والی نگاہ کو تالے بھی دکھائی دے رہے ہوں سو دوزیاں کا شمار کرنا کسے یاد رہے گا۔'' تیمور بہادر یار جنگ کا لہجہ جیسے اسے حیران کن لگا تھا وہ لمحہ بھر کو کچھ بول نہیں پائی تھی اور وہ بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

''وہ حیران کن حد تک حیران کن ہے اور میں حیرتوں کا شمار کرتے جیسے کسی گہرے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا ہوں۔ میں عقل کا سہارا لینا چاہتا ہوں مگر پھر یہ سوچتا ہوں عقل کے کلیے اور مفروضات کی حدود اپنا تعین خود آپ کرتے ہیں اور میں جز وکل کا شمار عقل و فہم سے نہیں، دل سے کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کس کا ذکر کر رہا تھا کیا اس کھو جانے والی محبت کا، یا کسی اور کا؟ تبھی وہ الجھ کر بولی تھی۔

''کس کا ذکر کر رہے ہیں آپ۔''

''میری کھوئی ہوئی محبت جو آس پاس نہیں مگر ہر طرف ہے اور ہر گھڑی آس پاس ہے۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''یہ کیسی محبت ہے؟'' وہ چونکی تھی۔

''میں محدود عقل کے ساتھ کھڑا اسے حیرت سے تکتا سوچتا ہوں اور مجھے مان لینا پڑتا ہے کہ محبت ہر بار، ہر سوال کا جواب دے محبت کے لیے یہ ضروری نہیں، شاید کبھی کچھ چیزوں کے معنی ہمیں خود تلاش کرنا پڑتے ہیں۔'' تیمور بہادر یار جنگ کیا جتانا چاہتا تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی اور عین الجھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''ہم سمجھ نہیں پا رہے تیمور بہادر یار جنگ آپ کی باتوں کے رخ کس سمت جاتے ہیں۔ ہم راستوں میں کھونے لگے

ہیں جب کبھی آپ مدمقابل آ کر بیٹھیں گے تو یا نہیں واضح ہو سکیں گی۔" وہ بات کو ٹالتا ہوئی مسکرائی تھی۔

"نواب زادی عین النور پٹوڈی لفظ کھونے لگتے ہیں صرف اس گمان میں کہ آپ مقابل ہیں میں کہنے کی جسارت نہیں کر پاتا اور لفظوں کے تعاقب میں دوڑنے لگتا ہوں۔ آپ کے روبرو کہنے کی ہمت کہاں سے لاؤں گا۔" وہ مسکرایا تھا عین مسکرادی تھی۔

"لفظوں سے کھیلنے کا ہنر سیکھ گئے ہیں آپ تیمور بہادر یار جنگ ہم آپ کے اسلوب پر حیران رہ جاتے ہیں۔ زمانہ کتنا کچھ بدل دیتا ہے تغیر وقت سے کیسے کیسے لوگ بدل جاتے ہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

"ہاں میں بھی اکثر ہی سوچتا ہوں عین النور پٹوڈی، مگر اس ضمن میں مجھے مان لینا پڑتا ہے کہ تغیرات کے ساتھ آنے والے زمانے صدیوں تک جگنوؤں کے تعاقب میں رہے ہیں اور جگنو جیسے زمانوں سے آپ کے تعاقب میں رہے ہیں حرف حرف سے روشنی پھوٹتی ہے جب آپ بات کرتی ہیں بہر حال آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ جا کر دادی جان کی بات سن لیں اور ان کو میرا آداب کہیے گا اور جلال کو میرا پیغام دے دیں شام کو ان سے ملنے آؤں گا۔" تیمور نے گفتگو کا اختتام دیتے ہوئے کہا تھا عین نے سر ہلایا تھا۔

"بہتر ہے ہم آپ کا پیغام دیں گے۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا تھا اور جانے کیوں کئی لمحوں تک معمول کے کام نمٹاتے ہوئے وہی لب ولہجہ اور آواز سماعتوں میں گونجتے رہے تھے۔

❁....❁....❁

"کیا ہوا تمہیں فتح النساء بیٹا اتنی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہیں آپ۔" بوا نے اس کا من پسند گاجر کا حلوہ اس کے سامنے رکھا تھا فتح النساء چونکتے ہوئے بوا کو دیکھنے لگی تھی۔

"بوا ہمارا من نہیں ہے آپ ایسا کریں ساتھ والی نمو کو بھجوا دیں کل بھی آپ کے حلوے کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔" فتح النساء کے کہنے پر بوا نے اسے بغور دیکھا تھا۔

"معاملہ کیا ہے، ہمیں بھی تو پتا چلے ایسے تیور کیوں بنا رکھے ہیں ایسے سر جھاڑ منہ پھاڑ پڑی ہیں جیسے اللہ نہ کرے کوئی سانحہ گزر گیا ہو، ہم سے تو آپ کا ایسا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہیں جاتا، صاف بتا دیجئے مدعا کیا ہے کس بات کا قلق ہے یہ ہر شے میسر ہے کسی بات کا کوئی کمی نہیں ہونے دی کبھی ہم نے تو جان وار دی آپ پر آپ کو کسی بات کا کوئی احساس ہی نہیں، ماں نہیں ہیں مگر ہم ماں جیسے تو بنے ہیں کیسے اگر ہم سے کوئی بھول چوک کبھی سرزد ہوئی ہو تو آپ کو کوئی کمی محسوس ہونے دی ہو تو۔" بوا اس کی افسردگی پر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔ ان کا انداز ان کے اندر کے اس دکھ کا غماز تھا جو وہ فتح النساء کے لیے محسوس کر رہی تھیں۔ فتح النساء نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"بوا آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں آپ کے احسانات تو ہم کبھی چکا ہی نہیں سکتے ماں اور باپ دونوں کی محبت دی ہے آپ نے ہمیں ہم آپ سے شکایت کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ جتاتے ہوئے بولی تھی اور بوا نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم کوئی احسان نہیں جتانا چاہتے ہمیں آپ کی خوشی درکار ہے بس ایک ہنسی آپ کے چہرے پر اور ہم اس پر خوش ہو جائیں گے ماں بچے کی خوشی کو مقدم جانتی ہے۔" ہمیں بس اس سے غرض ہے کہ آپ خوش رہیں آپ افسردہ ہوں گی تو ماں کیسے مسکرائے گی۔ ہم تو چلتے پھرتے آپ کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر ہی سانس لے رہے ہیں جانے یہ سانس کب رک جائے اور......!"

"بوا برائے مہربانی آپ ایسی باتیں کرنے کا عمل ترک کر دیں ہم ایسی کوئی بات آپ کے منہ سے دوبارہ سننا گوارا نہیں کریں گے۔" عین نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا تھا بوا اس کا چہرہ محبت سے تھام کر اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"آپ کی خوشی ہمارے سانس لینے کا باعث ہے۔ فتح النساء آپ چاہتی ہیں کہ ہم خوش رہیں تو اس بوڑھی بوا پر ایک احسان فرما دیں۔ آپ خوش رہیں آپ کی خوشی ہمیں خوش کرتی ہے۔" بوا نے کہا تھا اور فتح النساء نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

"اب آپ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں کوئی نیا سوال آپ کے دماغ میں کھد بھد تو نہیں مچانے لگا۔" بوا نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے قیاس آرائی کی تھی وہ بوا کی سمت سے

نگاہ پھیر گئی تھی اور مدہم لہجے میں بولی تھی۔

"نواب سیف الدین پٹوڈی چاچا نے ہماری کفالت کا ذمہ کیونکر لیا، یہ حویلی ہمیں دان کیوں کر دی جب اپنوں نے سب چھین لیا تھا تو انہوں نے یہ کرم کیوں کیا، ہمارے ابا جان کی وفات کے بعد جب زمانے نے ان کی جائیداد پر قرعہ فال ڈال کر بانٹ لیا تو سیف چاچا نے نیکی کرنے کی کیوں ٹھانی؟" اس نے مدہم لہجے میں پوچھا تھا اس کی آنکھوں میں کئی سوال مزید تیر رہے تھے اور بوا اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی تھیں۔

"نواب صاحب خدا ترس آدمی ہیں پھر وہ آپ کے ابا جان کے قریبی دوستوں میں سے ہیں جب دوست کو اتنا عزیز جانتے تھے تو اس کی اولاد کا خیال کیسے نہ کرتے آپ کے ذہن میں دراصل کس بات کا خناس سما گیا ہے یکدم سے کس نے کیا کہا۔" بوا نے اسے گھورا تھا۔

"کیا ہم اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں سے مل سکتے ہیں۔"

"اب یہ کیا سوال ہوا آپ کو یکدم سے تجسس میں گھر گئیں فتح النساء یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اکیس برس تک تو آپ نے کچھ نہ پوچھا، نہ جاننے کی کوئی لگن سامنے آئی پھر آج اچانک کیسے؟" بوا کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"بس ہم جاننا چاہتے ہیں ہمارا حق ہے ہمارے ابا جان کے رشتوں سے ملنا کیا نہیں مل سکتے ہم۔" فتح النساء سوالیہ نظروں سے بوا کو دیکھنے لگی تھی۔

"کیا کریں گی آپ ان سے مل کر، خون سفید ہو گیا ہے آپ کے ان رشتوں کا، چند ماہ کی تھیں آپ جب آپ کو گود میں لیا تھا ان کو اتنا خیال ہوتا تو کیا وہ تب آپ کی پروانہ کرتے۔" بوا نے جتایا تھا۔

"بے شک وہ ہماری پروانہ کرتے ہوں، مگر ہم ان سے ایک بار ملنا چاہتے ہیں۔" وہ ارادہ باندھ کر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

"جانے کیا ٹھانے بیٹھی ہیں آپ مگر جان لیجیے ان سے مل کر بھی تشفی نہیں ہو گی آپ کی فتح النساء ایسے رشتے دار ملنے کے لائق نہیں ہیں درانتی کی طرح جڑیں کاٹتے ہیں اور دیمک کی طرح کھوکھلا کرتے ہیں ہم نہیں چاہیں گے کہ ان میں سے کسی کا سایہ بھی آپ پر پڑے اور اب اس گفتگو کا سلسلہ یہیں برخاست کر دیں تو مناسب ہو گا ہم اس معاملے میں مزید کوئی بات چیت نہیں چاہتے۔" بوا حتمی انداز میں کہتے ہوئے اٹھ گئی تھیں اور فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اف اماں اتنے دلکش و دلفریب زیورات، آپ کی شادی کے ہیں چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں۔" عین النور نے ماں کے قیمتی زیورات کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"آپ کی پڑدادی اماں نے ہمیں یہ زیورات تحفے میں دیے تھے۔"

"اف اتنے نادر و نایاب نمونے اس سے قبل ہم نے نہیں دیکھے کم کی مہارت کا جواب نہیں کیا ہم یہ زیورات پہننے کی غرض سے لے سکتے ہیں۔" عین نے زیورات کو اٹھا کر ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا اماں مسکرائی تھیں۔

"یہ سارے زیورات آپ کے لیے ہی سنبھال رکھے ہیں۔"

"ہمارے لیے۔" عین حیرت سے آنکھیں کھولتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ اماں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

"لیکن اتنے سارے زیورات کا کیا کریں گے ہم کچھ جلال کی دلہن کے لیے بھی چھوڑ دیں ہماری بھابی بھی اہمیت کی حامل ہیں۔" عین نے زیورات کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

دادی جان تخت پر بیٹھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

"عین کا دل ہمیشہ کسی اور کے لیے پہلے سوچتا ہے اپنے لیے بعد میں اپنی پڑ دادی پر چلی گئی ہے رحم دل اور ایثار پرست مگر آپ جلال کی دلہن کی فکر مت کریں اس کے لیے زیورات ہیں ہمارے پاس ہم دے دیں گے اس سے بھی نادر و نایاب نمونے ہیں آپ اس بارے میں فکر نہ کریں۔" دادی جان مسکرائی تھیں عین مسکرا دی تھی۔

"ہمیں تو فکر ہونے لگی تھی بہر حال اماں اگر آپ چاہیں تو ہمارے کچھ زیورات محدود کر کے ہماری بھابی جان کے لیے بھی کچھ بچا رکھیں۔" عین نے مشورہ دیا تھا دادی پاس پر

چونا لگاتے ہوئے مسکرائی تھیں۔
''چاندسی دلہن لائیں گے ہم اپنے جلال کی لکھنو کے نواب زادہ ہیں کوئی عام لڑکی تو نہیں ڈھونڈیں گے ان کے لیے۔'' دادی جان کے کہنے پر عین مسکرائی تھی۔
''دادی اماں، فتح النساء کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے آپ لوگ کتنی پیاری سلجھی ہوئی لڑکی ہیں وہ ہماری سہیلی ہیں اور ہمیں تو بہت عزیز ہیں۔'' عین نے فتح النساء کا تذکرہ کیا تھا اماں خاموشی سے زیورات سنبھال کر دوبارہ صندوق میں رکھنے لگی تھیں اور دادی جان نے بھی جیسے کان لپیٹ لیے تھے اور تذکرہ ہی بدل دیا تھا۔
''حمیدن باورچی خانے سے نکل کر کبھی باہر بھی جھانک لیا کریں آپ بارش کا موسم ہو رہا ہے بادل گھر گھر آرہے ہیں جایئے آپ فوراً چھت سے کپڑے اتار لائیں۔'' دادی جان حمیدن سے مخاطب ہوئی تھیں۔
''دادی جان ابھی تو دور دور تک بارش کا کوئی پتا نہیں میں آپ کی کھیر کے لیے بادام کتر رہی تھی آپ اجازت دیں تو میں واپس جا کر کام جاری رکھوں میں زہرہ بی بی سے کہہ دیتی ہوں وہ کپڑے اتار لائیں گی یوں بھی سجنے سنورنے کے علاوہ وہ اور کسی کام کو تو ہاتھ لگاتی نہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے آپ نے انہیں۔'' حمیدن بوا نے شکایت کی تھی۔
''آئے ہائے بے چاری بن ماں باپ کی بچی ہے خدا ترسی بھی کوئی چیز ہے حمیدن ایسے مت کہا کریں آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں ہم نے ملازمین اور گھر کے افراد میں کبھی تفریق نہیں جانی اور زہرہ بی بی تو آپ کے بھیا کی اکلوتی اولاد ہیں بتاؤ کبھی اگر ہم نے عید یا شب برات پر بھی زہرہ بی بی کو دینے میں کوئی بھول چوک کی ہو، ہم اسے گھر کی بچی ہی سمجھتے ہیں اور آپ بھی تو اس کی بوا ہیں نا کچھ حقوق تو آپ پر بھی واجب ہوتے ہیں۔'' دادی جان نے حمیدن بوا کو لتاڑا تھا وہ دیکھ کر رہ گئی تھیں۔
''اچھا جا ادیب کو بھیج اپنے نام کے بالکل الٹ ہیں موصوف اس محل کے ملازمین کی فوج میں کیسے کیسے نمونے بھرے ہیں اس کی خبر ہمیں ہوتی رہتی ہے۔ اکثر مگر اب کیا کریں برخاست بھی نہیں کر سکتے اللہ کو ناراض نہیں کرنا تا کسی کا رزق روڑی محل میں لکھا ہے تو اس سے یہ حق کیسے چھینیں

حضرت محمد ﷺ

+ آپؐ جو چادر مبارک اوڑھتے تھے اس کی لمبائی 4 گز اور چوڑائی سوا دو گز تھی۔
+ آپؐ جو امامہ پہنتے اس کی لمبائی 7 گز تھی۔
+ آپ کو دو خوشبوئیں پسند تھیں، عود اور مشک۔
+ آپؐ جس دھات کی انگوٹھی پہنتے تھے وہ چاندی تھی۔
+ آپؐ کے پاس 3 تلواریں تھیں، ذوالفقار، آسور، تابار۔
+ آپؐ کے پاس 2 اونٹنیاں تھیں، عقبی اور قسوی۔
+ آپؐ نے اسلام کی دعوت صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر دی یہ پہاڑی مکہ میں ہے۔

تارا شاہ...... چکوال

......☆☆......

عورت

سچے پیار کا مظہر ہیں یہ عورت کے دو روپ
جلتے دن میں سایہ ہے وہ ٹھٹھرے دن میں دھوپ
قدم قدم قربانی ہے وہ قدم قدم ایثار
وہ آنکھوں سے چن لیتی ہے ہر اک راہ کے خار
وقت کے طاق میں رکھ دیا ہے اس کا اک اک پل
نسلِ نو کا آج اسی سے اور اسی سے کل
روشنی، رنگ، ہوا اور خوشبو سب اس کی پہچان
وہ جو نہ ہو تو دنیا ساری ہو جائے ویران

کلام: سعد اللہ شاہ
انتخاب:۔ ارسہ عرفان

خدا ترسی بھی اللہ نے ہمیں ہی نوازنی تھی۔'' دادی جان جان نے کہا تھا حمیدن مسکرا دی تھیں۔

''اماں آپ کا دل بڑا ہے اور بڑے دل والوں کو اللہ اور کرم سے نوازتا ہے جب وہ زمین پر کرم کرتے ہیں۔'' حمیدن بوا کے کہنے پر دادی اماں نے سر ہلا دیا تھا۔

''دیکھ لے جو پسند ہے وہ اٹھا لے جو نہیں پسند میں واپس صندوق میں رکھوا کر تجوری میں واپس رکھوا دیتی ہوں۔'' اماں نے عین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا عین مسکرا دی تھی۔

''اماں ایسے کیسے بتا دیں ہم فتح النساء آئے گی تو اس سے پوچھ کر مطلع کر دیں گے آپ کو ہم سے اکیلے کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔'' عین النور نے کہا تھا تو اماں نے اسے گھورا تھا۔

''فتح النساء کے بنا کچھ نہیں کر سکتی آپ کیا دم چھلا بنا رکھا ہے آپ نے اسے اپنی برابری پر لا کر کھڑا کر لیا ہے اب کیا فتح النساء نواب زادی عین النور کو بتائیں گی کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا؟'' اماں نے ناگواری سے کہا تھا۔ دور بیٹھی دادی جان نے انہیں چشمے کے پیچھے سے دیکھا تھا۔

''ارے بہو بیگم کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ فتح النساء نواب زادی عین النور کی سہیلی ہیں اور اس گھر میں انہیں وہی عزت و مقام دیا جاتا ہے جو ہماری نواب زادی عین النور کو ہے اب آپ برابری کی باتیں تو جانے ہی دیں آئندہ ایسی چھوٹی باتیں مت کیجیے گا ہمارے سامنے۔'' دادی جان نے تنبیہ کی تھی اماں کان لپیٹ کر بنا کچھ کہے زیورات سمیٹنے لگی تھیں اور تب عین بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

✿.....✿.....✿

''لیجیے میاں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی آپ کے عشائیے کی باتیں تو اب بھی زیر بحث بنی ہوئی ہیں عجیب بات ہے کہ کانگریس والوں میں آپ کی اس بیان بازی کو تنقیدی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔'' حکمت بہادر یار خان نے کہا تھا اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''کرتے رہیں تنقید ہم ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے یوں بھی جس طور تحریک کا عمل تیز ہو رہا ہے اور فرنگیوں کی حمایت مسلم لیگ کو حاصل ہو رہی ہے اور جو امپورٹنس مسلم لیگیوں کو مل رہی ہے اس پر کانگریس بپھر رہی ہے وہ سمجھ رہے تھے ان کے موقف کی حمایت ہوگی اور ان کی سنی جائے گی اور مسلمان ہاتھ ملتے رہ جائیں گے مگر ایسا ہوا نہیں اور یہی بات ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ دراصل ان سے مسلمانوں کی نفسیاتی فتح ہضم نہیں ہو رہی۔'' نواب صاحب پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے شطرنج کی چال چلنے لگے تھے۔

''یہ بات تو صاف سمجھ میں آتی ہے نواب صاحب کہ اب یہ تحریک بے کار جانے والی نہیں جو خواب ہندو دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے انگریزوں نے جس طور راج چھین لیا تو اب اس پر بندر بانٹ والا کھیل کھیلا جائے گا تو وہ خود ہی اپنی سوچ پر شرمندہ ہو کر رہ گئے ہیں ان کے راج کرنے کی تمنا اب پوری ہونے والی نہیں، ان کے ہاتھ وہ راج کبھی نہیں آئے گا مسلم لیگ ایسا ہونے نہیں دے گی۔'' حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''کل کی مسلم لیگ کی بیٹھک میں آپ کے سپوت بھی براجمان تھے حکمت صاحب ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا ماشاء اللہ کیا مدبر گفتگو کرتے ہیں کس قدر دلائل کے ساتھ اس دن عشائیے پر دیکھا تھا بہت چپ چاپ سے لگے تھے دیکھ کر اندازہ نہ تھا کہ وہ بچہ جس کا بچپن ہمارے گھر کھیلتے گزرا ہے وہ ایسا ہونہار نکلے گا۔'' نواب سیف الدین نے تیمور بہادر یار جنگ کی تعریف کی تھی حکمت صاحب مسکرا دیے تھے۔

''نوازش ہے سیف صاحب جب آپ اپنے سپوت کو پڑھنے کے لیے انگلستان بھجوا رہے تھے تو مجھے بھی ہمت ہوئی تھی، جلال اور تیمور بچپن کے دوست ہیں سو مجھے لگا دونوں کو ایک دوسرے کی رفاقت میسر رہے گی تو تعلیمی مدارج طے کرنے میں آسانی رہے گی بہرحال دونوں بچے ہونہار ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ دونوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی ہے اپنے نئے جوش اور ولولے کی ضرورت اس تحریک کو تھی اب وقت آ گیا ہے جب نیا اور پرانا خون مل کر اس تحریک کو آگے بڑھا رہا ہے اور خواتین بھی اس میں معاونت کر رہی تھیں۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور سیف صاحب نے سر ہلایا تھا گویا وہ اتفاق کر رہے

تھے۔

❁.......❁.......❁

فتح النساء عین النور پٹوڈی کو ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس پر آئی تھی جب سامنا جلال الدین پٹوڈی سے ہو گیا تھا وہ فوراً مڑ کر وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی جب اس کی بھاری آواز نے قدم روک لیے تھے۔

''فتح النساء۔'' جلال نے پکارا تھا اور فتح النساء کے قدم وہیں تھم گئے تھے مگر اس نے فوری طور پر مڑ کر نہیں دیکھا تھا اس دن کے واقعے کے بعد وہ دانستہ جلال کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی اور جلال جیسے اس بات کو بھانپ گیا تھا سو چلتے ہوئے سامنے آن رکا تھا اور فتح النساء کے لیے جیسے فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے تھے وہ اسے سامنے دیکھ کر لحہ بھر کو بھونچکی رہ گئی تھی کچھ بولنے کا یارا ہی نہیں رہا تھا زبان گنگ رہ گئی تھی اور وہ اس کی سمت دیکھ بھی نہ رہی تھی۔ پہلی نگاہ جو دانستہ پڑی تھی تو وہ فوراً ہی چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ جلال نے اسے بغور دیکھا تھا اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کی رفتار بڑھنے لگی تھی لانبی پلکوں پر جیسے کوئی بوجھ آن پڑا تھا وہ اس کی سمت دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

''آپ ہمارا سامنا کرنے سے کنی کیوں کترانے لگی تھیں۔'' جلال الدین پٹوڈی نے پوچھا تھا۔

''نن...... نہیں ایسی بات نہیں نوابزادہ جلال الدین پٹوڈی ہم آپ سے کنی کیوں کترانے لگے۔'' اس نے جلال کی سمت دیکھنے سے مکمل گریز کرتے ہوئے کہا تھا اور تب جلال نے انہیں بغور دیکھا تھا اور آہستگی سے گویا ہوئے تھے۔

''جلال...... جلال نام ہے ہمارا آپ ہمیں جلال کہہ کر بھی بلا سکتی ہیں فتح النساء۔'' اس کے جتانے پر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس قدر بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔

''ہاں ہم جانتے ہیں۔'' اس نے اپنی بوکھلاہٹ پر قدرے قابو پانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی اور تب جلال نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ ہم سے خوفزدہ ہیں یہ ڈر ہم سے ہے تو اس کا باعث کیا ہے کوئی جواز تو ضرور ہوگا نا۔'' جلال نے اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا مگر تب اس نے ہمت کر کے اس کی سمت دیکھا تھا اور سر ہولے سے انکار میں ہلا کر نگاہ کا رخ پھیر گئی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے جلال، ہم آپ سے خوفزدہ بالکل نہیں ہیں اور خوفزدہ ہوں گے بھی کیونکر آپ کو ایسا وہم کیوں ہوا؟'' وہ کوشش کر کے خود کا اعتماد بحال کرنے لگی تھی۔ جلال نے خاموشی سے دیکھا تھا جب وہ جتاتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے آپ بچپن کے دوست ہیں اور ہم آپ سے خوفزدہ ہرگز نہیں ہیں۔'' اسے بھرپور یقین دلانے کی سعی کی تھی۔

''ہم جانتے ہیں فتح النساء کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے اگرچہ آپ بتانے پر مائل نہیں ہیں اور ہم جاننے کے لیے اتنے متجسس بھی نہیں ہیں مگر کہہ دینے سے دلوں پر آیا ایک غبار چھٹ جاتا ہے سو کیا مضائقہ ہے جو اگر آپ کہہ کر اس بوجھ کو دل سے اتار پھینکیں۔'' جلال نے بغور دیکھتے ہوئے جتایا تھا تب اس کو متفق ہو کر سر اثبات میں ہلانا پڑا تھا۔

''آپ بجا فرماتے ہیں جلال مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہو۔'' اس نے سچ بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا تھا تب جلال نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''جانتا ہوں آپ بتانا نہیں چاہتیں مگر اتنا دباؤ دل پر لینا ٹھیک نہیں ہے فتح النساء، مانا اس عمر میں دل مضبوط ہوتا ہے اور اسے خطرات کم ہوتے ہیں مگر دل پر بوجھ مسلسل پڑا رہتا ہے وہ کہیں نہ کہیں دل کو کسی قدر کمزور کر رہا ہوتا ہے۔ میں چاہوں گا اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ہم اچھے دوست ہیں یا کبھی رہے ہیں تو آپ دل کا یہ بوجھ اتار کر ہم سے بانٹ سکتی ہیں ہمیں دوست کے دل کا یہ بوجھ لینے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی۔'' جلال نے کہا تھا اور اس کے انداز پر وہ آہستگی سے مسکرا دی تھی۔

''بہت نوازش ہے جلال آپ ہمیں دوست سمجھتے ہیں ہم تو سمجھے تھے اس دوستی کا کوئی وجود باقی نہیں رہا بہر حال آپ کا اس قدر خیال کرنا اچھا لگا دوست ہونے کے ناتے آپ نے جس قدر پذیرائی بخشی اس پر ہم ممنون ہیں۔'' فتح النساء

مشکور دکھائی دی تھی۔

''اتنی مروت کی ضرورت نہیں ہے فتح اچھا یہ بتایئے کسی نے آپ کا دل دکھایا۔ یا کچھ کہا کیا وہ آپ کی دوست عین النور ہیں۔'' جلال نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا تھا اور فتح النساء نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''نہیں، آپ نے سوچا بھی کیسے کہ عین ہمارا دل دکھا سکتی ہیں، عین ہمیں بہت عزیز ہیں اور جو لوگ اس قدر عزیز ہوں وہ تکلیف پہنچانے کا باعث نہیں بنتے۔'' اس نے وضاحت دی تھی اور وہ مسکرایا تھا۔

''ایسا واجب اور درست نہیں بھی ہوتا فتح النسا بعض اوقات جو لوگ عزیز ہوں وہ دل دکھانے کا باعث بھی بن جاتے ہیں بہر حال ہم اپنی گفتگو میں واپس آتے ہیں اس شام عشائیے میں کچھ تو ہوا تھا جو آپ واپس بھی جلد لوٹ گئی تھیں۔'' جلال بات کی تہہ تک پہنچنے کا جیسے قصد کر رہا تھا اور فتح النساء اس کی تحقیق پر کسی قدر الجھ گئی تھیں۔

''ہم نے کہا نا ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جلال اور ہوتی بھی تو ہم کہہ دیتے نا۔'' فتح النساء نے انکاری ہوتے ہوئے کہا تھا جب وہ تیزی سے اس کے لبوں پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

آپ انکار نہیں کر پائیں گی فتح النساء اگر ہم کہیں کہ ہم نے آپ کو عشائیے کی شام حیدر سراج الدولہ کے ساتھ دیکھا تھا۔'' جلال بولے تھے اور وہ ساکت سی رہ گئی تھی نظریں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کی سانسوں کی رفتار یکدم مدہم ہوئی تھی فقط یہ جان کر کہ جلال نے اسے حیدر کے ساتھ دیکھا تھا اور اگر چہ وہ مدعا نہیں جانتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ بات کیا ہوئی مگر اگر وہ قیاس آرائی پر اتر آتے تو صورت حال فتح النساء کے خلاف جا سکتی تھی تبھی اس نے ہمت کر کے جلال کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹایا تھا اور اس کی سمت دیکھتی ہوئی مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''جانے آپ کیا قیاس کرنے جا رہے ہیں مگر مدعا یہ ہے کہ ہم وہاں اچانک حویلی کے احاطے میں نکلے تھے جب حیدر میاں سے ہمارا سامنا ہو گیا تھا ہمیں خبر نہیں تھی کہ وہ وہاں موجود ہوں گے اگر خبر ہوتی تو ہم وہاں کا رخ بھی نہ کرتے۔'' وہ جیسے اپنا دفاع کرتے ہوئے بولی تھیں اور

جلال نے انہیں خاموشی سے دیکھا تھا اور پھر نرمی سے گویا ہوئے تھے۔

''ہم آپ سے یہ نہیں کہہ رہے کہ آپ وہاں حیدر سراج الدولہ کے لیے گئی تھیں یا آپ کا مقصد ان سے ملاقات تھا مگر......!'' جلال بولتے بولتے رکے تھے اور فتح النساء کی جان پر بن آئی تھی۔

''مگر......!'' اس نے جیسے بہت مشکل سے سانس لی تھی اور جلال نے اس کو بغور جانچتی نظروں سے دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''ریلیکس ہم آپ پر کوئی الزام فی الحال نہیں لگا رہے فتح النساء آپ عین کی سہیلی ہیں اور ہم آپ کو اتنا تو جانتے ہیں کہ آپ کا مزاج جان سکیں بہر حال آپ کے لیے پریشان کن بات کوئی نہیں ہے تاہم کوئی تحقیقاتی کمیٹی اس ضمن میں بٹھا رہے ہیں ہم حسرت سے قیاس آرائی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ صورت حال کیا رہی ہوگی۔'' جلال اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے تھے یہ ابھی فتح النساء کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ انہیں حیدر کے ساتھ دیکھ چکے تھے اور وہ یقیناً نہیں جانتے تھے کہ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی مگر وہ یقیناً اپنی ہمشیرہ کے مستقبل کو لے کر کسی قدر متفکر دکھائی دیے تھے ایسا تھا کہ صرف فتح النساء کا کوئی قیاس تھا وہ نہیں جانتی تھی مگر موجودہ صورت حال اس کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن گئی تھی وہ کچھ بولنے کا قصد کر رہی تھی جب جلال مڑا تھا اور چلتے ہوئے وہاں سے نکل گیا تھا اور فتح النساء اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

***

''عجیب انسان ہیں آپ شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں آپ کو اس دور میں جب شاعرات اور مشاعروں کا دور ہے اور غزلیات اور نظمیں لکھی کہی جا رہی ہیں اس دور میں آپ سیاست میں کود گئے چلیے ابا جان کی تقلید کرتے ہوئے جلال بھائی تو اس میدان میں اترنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے آپ کو کیا سوجھی کہ آپ بھی یکدم سے مسلم لیگ کا حصہ بن گئے۔'' چائے کا سپ لیتے ہوئے عین النور نے تیمور بہادر یار جنگ کو کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا وہ مسکرا دیا تھا۔

"اس میں حیرت کی بات کیا ہے ہم سیاست میں نہیں کودے ہم نے ایک تحریک کا حصہ بننے کی ٹھانی ہے اور ہمارے نزدیک ہم پر واجب اور درست ہے۔" تیمور بہادر یار جنگ نے کہا تھا اور عین مسکرادی تھیں۔

"جانے دیجیے تیمور بہادر یار جنگ ہم نے تو سنا تھا آپ یہاں واپس لوٹنے کی بجائے وہیں فرنگیوں کے دیس قیام کرنے کے لیے پرتول رہے تھے اور یہ تک سنا گیا کہ آپ کو اس غلامی کی زندگی میں واپس لوٹنے سے زیادہ وہاں کی غلامی زیادہ قابل قبول لگ رہی تھی۔" عین النور پٹوڈی نے مسکراتے ہوئے طنز کیا تھا وہ مسکرادیا تھا اور چائے کے سپ لیتے ہوئے کسی قدر پرسکون انداز سے عین النور پٹوڈی کو دیکھا تھا۔

"ایسی کوئی بات کبھی نہیں رہی عین النور پٹوڈی ہم نے ایسا کبھی نہیں کہا کہ ہمیں غلامی قبول ہے ہمارے تایا جان اور چاچا جان فریڈم فائٹرز رہے ہیں جنہوں نے اس سرزمین کے لیے اور آزادی کے لیے لڑتے ہوئے اپنی جانیں دیں۔ انہوں نے جو مظالم سہے ہیں اس کے لیے ہم اپنا سر فرنگیوں کے سامنے جھکا کران قربانیوں کو رائیگاں کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟" تیمور نے کہا تھا اور عین مسکرادی تھی۔

"خیر تو ہم نہیں جانتے کہ معاملات کیا ہیں مگر یہ بات تو ہے کہ آپ کو سر جھکا کر اتنی بزدلی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہیے تھا اگر آپ ایسا کرتے تو آپ ہمارے دل سے تو اتر جاتے۔" اس نے برملا کہا تھا اور تیمور نے اسے بغور مسکراتے ہوئے دیکھا تھا وہ نظریں جیسے بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور عین جانے کس بات کی پاسداری کرنے کو اس کی سمت سے اپنا رخ پھیر گئی تھی تبھی وہ مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"ہم آپ کے دل سے اترنا چاہیں گے یہ آپ نے کیسے سوچ لیا نواب زادی عین النور پٹوڈی۔ لکھنؤ کی نواب زادی کا دل خالی کرنے اور اپنی نشست ختم کرنے کے بارے میں ہم بھلا کیسے سوچ سکتے ہیں۔" وہ ذومعنیت سے مسکرایا تھا تبھی عین فوراً بولی تھیں۔

"بات کا رخ کسی ریل گاڑی کی طرح ایک پٹڑی سے دوسری پٹڑی پر جارہا ہے تیمور بہادر یار جنگ ہمارا مقصد وہ

انمول موتی

رشوت...... انصاف کو کھا جاتی ہے

توبہ...... گناہ کو کھا جاتی ہے

غیبت...... عمل کو کھا جاتی ہے

نیکی...... بدی کو کھا جاتی ہے

غصہ...... عقل کو کھا جاتا ہے

جھوٹ...... رزق کو کھا جاتا ہے

اور فکر...... عمر کو کھا جاتی ہے

مبین رانا...... سمندری

......☆☆......

قول حضرت علیؓ

حضرت علیؓ نے فرمایا "کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجاتا ہے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔"

جسم ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا ہے، تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔"

سدرہ شاہین...... خانیوال

......☆☆......

وجوہات غربت اور محتاجی

غربت اور محتاجی چار چیزوں سے آتی ہے۔

☆ جلدی جلدی نماز پڑھنے سے

☆ کھڑے ہوکر پانی پینے سے

☆ منہ سے چراغ بجھانے سے

☆ آستین یا دامن سے منہ صاف کرنے سے

ناہید اختر...... احسان پور

نہیں تھا ہم نے تو بات کی تھی آپ تو کھال نکالنے لگے۔'' عین نے اس کی کلاس لی تھی وہ مسکرا دیے تھے۔

''جن زادہ ہوں نا انسانوں کی دنیا سے ربط جوڑنے کے چکر میں عجیب بے ربط ہو رہا ہوں۔'' تیمور مسکرایا تھا۔ عین النور اسے دیکھتے ہوئے نگاہ پھیر گئی تھی۔

''آپ باتوں کو یاد رکھتے ہیں بھولتے نہیں۔''

''باتیں بھولنے کے لیے نہیں ہوتیں عین النور پٹوڈی باتیں بھول جائیں تو حوالے بھی ذہن سے محو ہونے لگتے ہیں ایسے میں عجیب کشمکش والی صورت حال سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا وہ خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔

''آپ خوش نہیں ہیں۔'' اس کے دیکھنے پر جانے کیوں تیمور نے پوچھا تھا۔

''یہاں اس سوال کی کیا وجہ بنتی ہے۔'' عین نے ان کی سمت دیکھے بنا کہا تھا تیمور نے اس کی سمت بغور دیکھا تھا پھر شانے اچکا دیے تھے۔

''میں نہیں جانتا نواب زادی عین النور میں نے کبھی اس درجہ ناپ تول کر گفتگو نہیں کی میں آپ کی دنیا کے راہ و رسم اور طور طریقے قبول کرنے سے قاصر ہوں۔'' اس کی دھیمی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک جیسے اس بات کی غماز تھی کہ وہ صورت حال سے بھرپور طور پر محظوظ ہو رہا تھا۔

''اگر ہمیں خبر ہوتی کہ آپ ایسی طبیعت کے ہوں گے تو میں۔'' اس نے سلگ کر کہا تھا اور ان کی سرخ ناک اور آنکھیں دیکھ کر تیمور مسکرا دیے تھے۔

''کہکشاؤں کو آنکھوں میں چمکتے دیکھنے کا تجربہ یقیناً حیران کن ہے میں نہیں جانتا تھا کہ تاروں کو دوڑتے بھاگتے دیکھنے کے اس عمل میں محبت کس طرح وقوع پزیر ہوتی ہے اور دل کیسے بازی ہارتا ہے مگر میں ان آنکھوں میں رنگوں کے شمار کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان شفاف آئینوں میں تارے چمکنے اور ٹوٹنے کا یہ عمل یقیناً دلچسپی لیے ہوئے ہے جو نگاہ اور دل کو باندھ دیتا ہے۔'' تیمور بہادر یار جنگ کا لہجہ مدہم تھا اور عین اس کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھی اور مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''ہم خوش ہیں خوشی دکھائی دینے والی شے ہوتی تو بھرپور دکھائی دیتی مگر دل میں خوشی کا احساس فقط چہرے یا آنکھوں سے ممکن نہیں ہے تیمور بہادر یار جنگ۔'' اس نے گویا جتایا تھا جب تیمور بہادر یار جنگ نے اس کی سمت کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا۔

''اور یہ واقعی محبت ہے، اگر یہ محبت ہے تو کیا یہ عمر بھر کے لیے کافی ہے۔'' اس کا سوال عین کو ساکت کر گیا تھا وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکی تھی اور تیمور اسے جتاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

''محبت ہو تو اس کے لیے یقین لفظ کو ڈھونڈنے کی اس درجہ ضرورت نہیں پڑتی عین النور پٹوڈی محبت کا احساس اور دل میں یقین کو مکمل کرتا ہے دل کو وسوسوں میں مبتلا نہیں کرتا۔'' وہ جانے کس ضمن میں کہہ رہا تھا اور وہ سر جھکا کر بولی تھی۔

''حیدر ہمارے ساتھ ہیں ہم بس یہ جانتے ہیں کہ یہ ساتھ زندگی بھر کے لیے ہے یہ رشتہ بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور سچ جانیے تو اب ہم اس رشتے کے عادی ہو چکے ہیں۔'' وہ ہر طرح کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے مسکرائی تھی دوسرے معنوں میں وہ مسکرا کر صورت حال کو معمول پر ظاہر کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں کی بے چینی بڑھتی چلی گئی تھی۔

''ان آنکھوں کی بے چینی کا کیا مفہوم ہے اگر آپ کے دل میں خوشی ہے تو۔'' وہ جانے کیوں پوچھنے لگا تھا اور عین کے پاس اس سوال کا سرے سے کوئی جواب نہیں تھا۔

''خاموشیوں کو لفظ سونپ دینے سے یا وضاحتیں دینے سے مفہوم بدل نہیں جاتا عین کیونکہ بعض اوقات آپ جتنا شور مچانے کی سعی کرتے ہیں وہ شور آپ کے اندر دوڑتے بھاگتے سوالوں کی اس قدر نفی کر رہا ہوتا ہے۔'' تیمور کی نظروں میں نرمی تھی اور لہجہ مدہم وہ بغور اس چہرے کو دیکھ رہا تھا اور وہ اسے چڑ کر دیکھنے لگی تھی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ حیدر کو ہم سے محبت نہیں یا جو احساس ہمارے دل میں ان کے لیے ہے وہ محبت نہیں۔'' عین کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

''معاف کیجیے جن زادے کی دنیا کا آپ کی انسانی دنیا سے کوئی تال میل بظاہر دکھائی نہیں دیتا آپ انسان بہت سی باتوں کے مفہوم دانستاً بدلتے ہیں اور سیدھی سیدھی باتوں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کے مفہوم بھی بدل جاتے ہیں ہمیں اس سے غرض نہیں کہ آپ کو حیدر صاحب سے محبت ہے کہ نہیں یا حیدر صاحب آپ سے محبت میں مبتلا ہیں کہ نہیں ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب نہیں ہیں مگر خیر جانے دیجیے۔ ہم اس موضوع کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے۔'' وہ اٹھا تھا اور چلتے ہوئے وہاں سے نکل گیا تھا انداز خفگی اور غصے سے بھرپور تھا ان قدموں میں زمین کا سینہ چیر دینے کی صلاحیت تھی جیسے یا عین کو لگ رہا تھا کہ اس کے قدم دل پر ہیں وہ اپنے اندر در آنے والے اس نامعلوم سے محسوسات کو فوری طور پر کوئی نام نہیں دے پائی تھی مگر اس کی طرف سے فوری طور پر چہرہ پھیر گئی تھی اور بڑبڑاتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی کسی کی زندگی میں جب چاہو منہ اٹھا کر گھستے چلے جاؤ اور جب بات خود پر آئے تو ناراضگی دکھانے بیٹھ جاؤ خیر ہمیں بھی پروا نہیں، ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں خفا ہم کیوں پروا کرنے لگے بھلا۔'' اس نے ایک خاص تمکنت سے شانے اچکائے تھے اور تبھی نگاہ دانستہ طور پر بھٹکتی ہوئی جانے کیوں اس شخص کی جانب اٹھ گئی تھی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا جانے کیوں عین اس سمت دیکھے گئی تھی۔ تیمور نے پلٹ کر یا رک کر نہیں دیکھا تھا اور گیٹ کراس کر گیا تھا۔

❀ .... ❀ .... ❀

''حاکم خاتون کی محبت ہمیں فنا کرنے کے درپے ہے اور وہ یقین کرنے کو تیار نہیں۔'' حیدر نے سرد آہ بھر کر کہا تھا اور دوست ان کی بے چینی دیکھ کر رہ گیا تھا پھر گہری سانس خارج کر کے بولا تھا۔

''آپ کی بے چینی بے معنی ہے حیدر سراج الدولہ حاکم خاتون آپ سے محبت میں مبتلا نہیں ہیں شاید ان کا دل کسی اور سمت مائل ہے۔'' دوست کے قیاس کرنے پر حیدر بے طرح چونکے تھے۔

''آپ کا اشارہ کس طرف ہے ہمایوں کھل کر بات کریں جہاں تک ہمیں معلوم ہے حاکم خاتون ہم میں دلچسپی رکھتی ہیں اگر وہ دلچسپی نہیں رکھتیں تو ہم سے تحفہ قبول نہیں کرتیں۔'' حیدر نے کہا تھا تو ہمایوں نے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

''آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں حیدر یہ محبت نہیں ہے اگر حاکم خاتون کو محبت ہوتی تو وہ آپ کی دعوت قبول کرتیں مگر انہوں نے آپ کی دعوت پر کوئی جواب نہیں دیا اگر انہیں آپ سے محبت ہوتی تو ان کی نگاہیں اتنی بے قراری سے کسی اور کی متلاشی نہ ہوتیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا ہمایوں حاکم خاتون کی نگاہیں کس کی متلاشی تھیں۔'' حیدر نے ناگواری سے پوچھا تھا ان کی پیشانی کی رگیں تن گئی تھیں اور آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑکنے لگی تھی ہمایوں نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ نہیں جانتے کیا۔'' ہمایوں نے جیسے تصدیق کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

''آپ بتاتے ہیں یا آپ کو کتوں کے ساتھ باندھ دیا جائے۔'' حیدر سراج الدولہ نے بھڑکتے ہوئے الاؤ جیسے لہجے میں کہتے ہوئے ہمایوں کو گھورا تھا ہمایوں لمحہ بھر کو خاموش ہوا تھا اور پھر اس کے لب آہستگی سے ہلے تھے۔

''نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی۔''

''کیا......!'' حیدر بے طرح چونکے تھے۔

''یہ درست ہے حیدر میاں آپ کی حاکم خاتون جو آپ پر التفات اور نظر کرم کرنے کو تیار نہیں وہ در حقیقت بے نیازی نہیں برت رہیں بلکہ ان کا دل اور نگاہ کہیں اور مائل بہ کرم ہے آپ کو یقین نہ آئے تو آپ حاکم خاتون سے پوچھ لیجیے۔'' بابر نے ڈر کر ہمایوں کا دفاع کرتے ہوئے حیدر کو مطلع کیا تھا، حیدر کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ کانچ کا قیمتی گلدان اٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے باہر نکل گیا تھا حویلی کے باہر سے موٹر گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز آئی تھی اور ہمایوں نے سہم کر باہر کی سمت دیکھا تھا۔

❀ .... ❀ .... ❀

''محبت کیا ہے اور کیسی ہوتی ہے ہم اس کا ذکر خود سے بھی کرتے ڈرتے ہیں نواب زادے ہمیں محبت راس نہیں مگر اندر کہیں خواہشوں کا تسلسل دھڑکنوں کے ساتھ بڑھتا ہے تو ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ محبت کا وجود اس قدر ضروری کیوں ہے اور محبت ابد تک قائم رہنے والی ہے تو دل میں ہر گھڑی فنا کیوں ہوتی جاتی ہے۔'' حاکم خاتون کا لہجہ مدہم تھا اور آواز میں افسردگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی

نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی نے انہیں بغور دیکھا تھا پھر ان کی آنکھوں کے کناروں کی نمی کو لحہ بھر میں ہاتھ بڑھا کر صاف کیا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''محبت فنا ہونے والا عمل نہیں ہے خوشنما ہم محبت کو فنا ہوتے نہیں دیکھ پائیں گے آپ کے وسوسے گٹھری میں باندھ کر کہیں دور چھوڑ آئیں گے اتنی دور کہ پھر یہ خدشے کبھی آپ کی زندگی میں دوبارہ واپس نہیں آ پائیں گے۔'' وہ جذبات سے بوجھل لہجے میں بولا تھا اور حاکم خاتون انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''آپ ہمیں خوشنما کیوں پکارتے ہیں اوروں کی طرح ہمیں حاکم خاتون کیونکر نہیں کہتے ہم دنیا کے لیے خوشنما نہیں ہیں۔'' حاکم خاتون نے کہا تھا اور جلال مسکرا دیا تھا۔

''آپ نے خود کہہ دیا کہ آپ دنیا کے لیے خوش نما ہیں اور ہم دنیا اور دنیا داری پر یقین نہیں رکھتے ہم انسان کی برابری اور عزت دینے پر یقین رکھتے ہیں آپ ہمارے لیے اس قدر مقدم ہیں جس قدر کوئی کوئی خاتون ہونا چاہیے چاہے آپ کہیں بھی بیٹھی ہوں اور کسی بھی حیثیت سے موجود ہوں عورت کو خدا نے ایک عورت بنایا ہے وہ بازار میں بٹھانے لائق نہیں جو اسے بازار کا راستہ دکھاتے ہیں وہ خود خاک ہو جاتے ہیں۔'' جلال نے مضبوط لہجے میں کہا تھا حاکم خاتون انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''آپ پڑھے لکھے ہیں نواب زادے، دنیا دیکھی ہے آپ نے ہم آپ کی عزت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اس دنیا سے لوٹ جایئے اور پھر کبھی اس طرف کا رخ بھی مت کیجیے۔'' وہ حتمی لہجے میں گویا ہوئی تھیں جلال انہیں خاموشی سے دیکھنے لگے تھے۔

''ایسا ممکن ہوا تو ہم ایسا ضرور کرنا چاہیں گے خوشنما۔''

''کیوں کرتے ہیں آپ ایسا، ہماری بات کیوں نہیں مانتے آپ؟''

''معلوم نہیں، ہم نہیں جانتے۔'' وہ شانے اچکا کر بولے تھے۔

''آپ ایسے بے تاثر نہیں بن سکتے نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی آپ کے خاندان کی عزت آپ کیسے داؤ پر لگانا چاہیں گے کیا ہے یہ تعلق، بس نہ سمجھ میں آنے والی بات ہی تو ہے نا سچ بتائیں ہمیں بھی یہ تعلق سمجھ نہیں آتا ہم آپ کے رویوں میں ایک خیال اور پرواصاف محسوس کرتے ہیں مگر یہ محبت سے کئی گناہ زیادہ ہمدردی بھی ہو سکتی ہے۔'' حاکم خاتون مدہم لہجے میں بنا ان کی سمت دیکھتے گویا ہوئی تھیں اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''محبت ہماری بھی سمجھ میں فی الحال نہیں آتی خوشنما مگر ہم آپ کو یہاں بیٹھا نہیں دیکھنا چاہتے آپ ایک باوقار خاتون ہیں اور ہم آپ کی دل سے عزت کرتے ہیں آپ عزت کرنے کے قابل ہیں۔'' وہ مدہم لہجے میں بولا تھا اور حاکم خاتون انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❁ ❁ ❁

کتنی بے چینی وجود کے اندر بڑھ گئی تھی جیسے کوئی بہت خاص شے یکدم سے کھو گئی تھی یا نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی عین نے دسویں بار چھت پر یہاں سے وہاں چکر لگایا تھا اور جب اپنے اندر کے اس احساس کو نہ سمجھ پائی تھیں تو چلتے ہوئے ٹیرس پر رکھے میز کرسی کی طرف آ گئی تھیں اور دھم سے بیٹھ گئی تھیں نگاہ دانستہ آسمان کی سمت اٹھی تھی چمکتے تاروں کی ضیا نے نگاہ باندھ لی تھی۔

''محبت کیا واقعی بند مٹھی میں چھپی ہوئی بات ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے یکدم چونکی تھیں پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے گویا خود کی سوچ کو رد کیا تھا۔

''محبت بس وہ ہے جو ہم کو حیدر میاں سے ہے اور ان کی ہم سے محبت ایسی ہی ہوتی ہے اس میں کسی بند مٹھی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔'' انہوں نے خود کو جیسے یقین دلانا چاہا تھا۔

''ہاں بس یہی حقیقت ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت نہیں ہے محبت کوئی شے نہیں جو کھو جائے اور اسے ڈھونڈ کر پھر مٹھی میں دبوچ لیا جائے اور ڈر کے تحت پھر مٹھی کھولی ہی نہ جائے، ہمیں ایسی کسی محبت کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہوگی ایسی محبت دوسروں نے کی ہوگی ہم کو اس سے کچھ واسطہ نہیں اور یہی بات اس وقت کی سچائی ہے اور ہماری زندگی اسی سچائی پر کھڑی ہے۔'' وہ خود کو باور کراتے ہوئے تاروں سے نگاہ ہٹا کر اڑتے ہوئے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے بے خبری سے اور کسی قدر بے نیازی

سے شانے اچکا کر بے نیاز بن جانے کی کوشش کرنے لگی تھیں مگر تبھی یکدم غیر ارادی طور پر ان کی مٹھی سختی سے بند ہوتی چلی گئی تھی اور انہوں نے چونکتے ہوئے اس مٹھی کو دیکھا تھا اور آہستگی سے کھولا تھا وہاں کسی شے کی موجودگی واقعی تھی یا پھر اس کا وہم تھا ہتھیلی جانے کیوں جلتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی یہ کیسا احساس اس ہتھیلی پر تھا کسی کا لمس آج بھی اس ہتھیلی پر جلتا ہوا سا کیوں محسوس ہوا تھا؟'' عین النور پٹوڈی اس احساس اور کیفیت پر حیران رہ گئی تھی۔

''میں نہیں جانتا راستوں کو کہاں اور کیسے بانٹنا ہے آغاز سفر کرتے ہوئے اس اعداد و شمار پر نگاہ نہیں تھی اور سفر کے اختتام کی اگر چہ خبر نہیں مگر محبت کہیں دور کھڑی چپ چاپ تکتی ہے تو الہام یہ بھی ہوتا ہے کہ اختتام چاہے کچھ بھی ہو، مگر یہ سفر بہت دلچسپ ہوگا۔'' کوئی آواز اس کے ارد گرد پھیلی تھی تو وہ چونکتے ہوئے اپنے اطراف دیکھنے لگی تھی۔

وہاں کوئی نہیں تھا ارد گرد کسی کی موجودگی دور دور تک نہیں تھی، مگر فضا میں ایک احساس پھیلا تھا کسی کی آواز بکھر رہی تھی اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

''دل کو بولتے ہوئے کبھی نہیں سنا کیونکہ شاید آس پاس شور بہت زیادہ ہوتا ہے اتنا کہ بہت قریب کی آواز سنائی نہیں دیتی تا آنکھ کو اتنے قریب کے منظر دیکھنے کے لیے اور دور کی آوازیں سننے کے لیے کہیں دور جانا نہیں پڑتا اس کے لیے اپنے اندر مکمل خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے اس خاموشی میں جو سنائی دیتا ہے اس کے معنی بہت واضح ہوتے ہیں کہ پھر کوئی اور شواہد ڈھونڈنا نہیں پڑتے۔'' کوئی لہجہ خوش بو بنا اس کے تعاقب میں تھا جسے وہ اس کیفیت پر حیران رہ گئی تھی اور سر جھٹکتے ہوئے اس احساس سے بچنے کی سعی کرنے لگی تھی۔

''محبت دور ستاروں کی کہکشاؤں پر بنا کوئی گھر لگتا ہے جس کے بارے میں سوچنا خواب لگتا ہے اور وہاں جا کر رہنا ناممکن مگر پھر بھی ان کہکشاؤں کی دنیاؤں کے بارے میں جاننے کا تجسس کہیں بڑھتا جاتا ہے اور اگرچہ عقل جانتی ہے سب ناممکن ہے مگر ان ستاروں سے نگاہ ہٹتی نہیں۔'' کوئی بے پروائی سے کہہ رہا تھا اور عین نے ان آوازوں سے بچنے کی سعی کرتے ہوئے زور سے آنکھیں میچ لی تھیں تبھی کسی آواز نے گرفت میں لیا تھا۔

''رشتوں کو زمین پر ڈھونڈنا عبث ہے عین النور پٹوڈی کیونکہ رشتے زمین پر نہیں بنتے بلکہ آسمان پر جڑتے ہیں آپ جن رشتوں کا خون اپنے اندر اپنی دھڑکنوں میں محسوس کرتی ہیں ان کی وقعت اسی ڈر کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے کیونکہ رشتے ڈر نہیں دیتے، تحفظ دیتے ہیں جو رشتہ نظروں سے خوف بھرے اور دھڑکنوں کو بے ربط کردے وہ وہیں دم توڑ رہا ہوتا ہے اسے ختم کرنا یا مارنا نہیں پڑتا۔'' اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور کوئی سامنے کھڑا دکھائی دیا تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ یہ اس کا وہم تھا یا واقعی کوئی حقیقت تھی مگر کس کا خیالوں سے نکال سے سامنے آتا کھڑا ہوتا اسے شدید حیرت میں مبتلا کر گیا تھا اور اگر وہ خیال تھا تو وہ اسے رد کرتے ہوئے آواز بلند جتاتے ہوئے بولی۔

''رشتوں کی وقعت انہیں ماننے سے ہوتی ہے تیمور بہادر یار جنگ اور جن رشتوں کو ہم مان لیں ان کی وقعت بھی جانے نہیں دیتے۔'' عین النور نے بھرپور نفی کرنے کی کوشش کی تھی اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

''رشتوں کی نفی کرنا نہیں پڑتی عین النور رشتے اپنی وقعت خود سمجھاتے ہیں چاہے کوئی کتنا بھی انکار کرے اگر کوئی تعلق بہم دل سے جڑا ہے تو اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا محبت بند صندوق میں چھپایا گیا کوئی راز نہیں ہے کہ اس صندوق کو کھول کر ہر بار تسلی کرنا پڑے کہ محبت یہاں مقیم ہے محبت کا احساس تالوں چابیوں سے قید ہونے والا نہیں محبت ان پرانے بند صندوقوں سے نکل کر باہر آنے کی صلاحیت رکھتی ہے یقین نہ ہو تو آزمالیں۔'' تیمور کا لہجہ بہت مضبوط تھا اور نواب زادی عین النور اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ وہ وہم تھا یا کوئی خیال یا صرف احساس تبھی سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

''میں خیالی باتوں کے واقع ہونے پر یقین نہیں رکھتی تیمور بہادر یار جنگ آپ خیالی دنیا آباد کرنے میں ماہر ہیں اگر آپ ہمارے بچپن کے دوست نہ ہوتے تو ہم آپ کو واقعی کوئی جادوئی کردار سمجھ لیتے یا جن زادہ تصور کر لیتے آپ کی دنیا کا جیسے حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے آپ حقائق نظر انداز کرتے ہیں اور یہ حماقت ہے۔'' وہ کہہ کر چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزرنے لگی تھی جب کلائی تیمور بہادر یار

جنگ کے ہاتھ کی گرفت میں آ گئی تھی اور وہ چونکتے ہوئے اسے دیکھنے لگی تھی گویا وہ خواب و خیال یا کوئی وہم یا گمان نہیں تھا وہ حقیقت میں اس کے سامنے رکا کھڑا تھا۔ نواب زادی عین النور حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی اور جیسے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

''محبت خوابوں خیالوں کی بات نہیں ہے نواب زادی آپ اپنی سوچوں سے خود الجھ رہی ہیں ہم کوئی جن زادے ہوتے تو بھی حقیقت بن کر آپ سے ملنے چلے آتے کیونکہ جذبہ صادق ہو تو خیالوں کو حقیقت بنا لینا کوئی ناممکن بات نہیں۔'' تیمور مدہم لہجہ میں گویا ہوا تھا۔

''آپ کیا باتیں کرتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں بہر حال ہم کل دعوت پر اپنے سسرال جا رہے ہیں ہماری ساس صاحبہ نے خود ہمیں فون پر بات کر کے اس دعوت کے لیے خود دعوت دی ہے اور حیدر میاں بھی اصرار کر رہے تھے۔'' وہ جیسے دانستہ اس تعلق کا ذکر کرنے لگی تھی مقصد شاید اسے جتانا مقصود تھا کہ وہ اس کے لیے پرائی ہے اور وہ اس کی آرزو نہ کرے اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

''نواب زادی عین النور آپ محسوسات پر قدغن لگا رہی ہیں اور رشتوں کو پابند کرنا چاہ رہی ہیں اور آپ سے کہنا صرف یہ تھا کہ آپ غلطی کر رہی ہیں کیونکہ محبت کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ بہاؤ کس سمت ہے اور راہ کس سمت بنا رہی ہے اگر محبت آنکھیں اور چہرہ نہیں رکھتی تب بھی محبت اپنے بہاؤ میں ہی بہتی ہے اور راستوں کی پہچان رکھتی ہے محبت کو پابند کرنا حماقت ہو سکتی ہے۔'' وہ مکمل یقین سے مسکرایا تھا اور عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی پھر کوشش کر کے اپنی کلائی کو اس کی گرفت سے چھڑایا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''کیسے دوست ہیں آپ آپ کو ہماری خوشی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔'' وہ اسے دوسرے لفظوں میں جتانے لگی تھی اور وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا تھا

''میں آپ کی خوشی سے خوش ہوں آپ توقعات کو بڑھا رہی ہیں اور مجھے ڈر ہے ان توقعات کا نہ پورا ہونا آپ کو کسی دکھ سے دوچار نہ کر دے۔'' وہ چونکی تھی۔

''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ محبت کرتی ہیں تو توقعات کو ایک طرف رکھ دیں جہاں توقعات ہوں گی وہاں محبت خدشات کی بات کرنا ضروری خیال کرے گی اور خدشات اگر پورے ہو جاتے ہیں تو افسوس آپ کو ہوگا۔'' وہ سمجھانے لگا تھا۔

''ہم سمجھے نہیں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔'' وہ بے سمجھی سے ایک الجھن میں گرفتار سی اسے دیکھنے لگی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔

''آپ اپنے فیانسی سے کچھ زیادہ توقعات وابستہ کر رہی ہیں۔''

''وہ ہم سے اس طور وابستہ ہیں کہ توقعات کا آ جانا کوئی عبث نہیں ہے۔ آپ کیوں ہمیں خبردار کر رہے ہیں کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ توقعات پوری نہیں ہوں گی۔'' وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی تھی اور تیمور نے خاموشی سے آسمان کو سر اٹھا کر دیکھا تھا اس کی نظریں تاروں سے الجھنے لگی تھیں اور عین اسے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی جب وہ اس کی سمت دیکھے بنا گویا ہوا تھا۔

''میں آپ کو آپ کی توقعات میں ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا مگر اگر آپ واقعی حیدر سے محبت کرتی ہیں تو آپ کا یقین قائم رہنا چاہیے پھر چاہے کوئی کچھ بھی کہے مگر آپ کا حقیقت کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا وہ الجھتی ہوئی نظروں سے خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی، جب تیمور نے اس کا ہاتھ خاموشی سے تھاما تھا اور اس کی ہتھیلی کو چھوا تھا اس لمس میں کیسا احساس تھا کہ جیسے اس کی روح میں کوئی بہت زورآور شے سرایت کرنے لگی تھی۔

''محبت واسطوں کا ذکر نہیں کرتی محبت کو راستوں کی بھی پروا نہیں اور محبت خدشوں کو بھی بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ محبت کو ان سب سے کوئی سروکار نہیں مگر اس تمام عمل میں محبت یقین سے خالی نہیں ہوتی محبت امید کے ساتھ سفر کرتی ہے عین النور پھر چاہے سفر آسمانوں پر ہو یا زمینوں پر محبت اپنے شواہد کے ساتھ یقین سے اپنی منزل کی سمت بڑھنے کا عمل ترک نہیں کرتی آپ اگر کسی سے محبت رکھتی ہیں تو اس کا یقین کریں وہ یقین آپ کے دل میں ہوگا تو محبت ہارے گی نہیں۔'' وہ جانے اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا کہاں کیا غلط تھا؟ وہ جان نہیں پائی تھی مگر اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور وہ جانے کے

لیے مڑی تھی جب تیمور نے پکار لیا تھا۔

''عین۔''

اور وہ وہیں تھم گئی تھی قدم تھے کہ آگے بڑھنا بھول گئے تھے وہ ایسے ساکت کھڑی تھی جیسے کسی نے اسے اپنا معمول بنا لیا ہو اس لمحے میں کیسا سحر تھا وہ جان نہیں پائی تھی مگر وہ ساکت سی کھڑی تھی اور ایک قدم بھی اس شخص کے مخالف سمت نہیں اٹھا سکی تھی یہ کیسا بھید تھا اس لمحے میں کیسا جادو تھا کہ وہ اس کے مکمل زیر آ چکی تھی یا پھر یہ سب اس کا وہم تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر اسے اپنی وہ ہتھیلی جلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جس ہتھیلی پر اپنی کچھ دیر پہلے تیمور بہادر یار جنگ نے چھوا تھا اس نے اس طرح کھڑے ہاتھ پھیلا کر اپنی اس ہتھیلی کو دیکھا تھا اور وہاں اگر چہ کچھ نہیں تھا مگر کوئی احساس اتنا بھرپور زندہ تھا کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔

''آپ اس احساس کو جھٹک نہیں سکتیں عین النور، بظاہر جہاں کچھ نہیں ہے وہاں بھی بہت کچھ ہے مگر یہ آپ کو ان ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دے گا، نہ ظاہری نظر کبھی اسے ڈھونڈ پائے گی محبت دکھائی دینے والی شے نہیں ہے اور محبت کو اس طرح شواہدات کی ضرورت بھی نہیں پڑتی آپ حوالے دینا چاہتی ہیں تو آپ کے تمام دلائل بے اثر رہیں گے۔'' وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے مکمل یقین سے کہہ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر غصے سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ہم نہیں جانتے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر یہ باتیں ہماری عقل سے باہر ہیں اور ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم حیدر میاں سے بہت محبت کرتے ہیں اتنی محبت کہ ہم اپنی زندگی ان کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں محبت کہتی ہے کہ اگر میں موجود ہوں تو آنکھیں بند کر کے میرا اعتبار کرو سو ہم حیدر سراج الدولہ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ ہم ان کا مکمل اعتبار کرتے ہیں چاہے لوگ کچھ بھی کہیں مگر ہمیں ان کا مکمل اعتبار ہے۔'' عین النور پر یقین لہجے میں بولی تھی۔

تیمور بہادر یار جنگ مسکرایا تھا جیسے وہ اس کی نفی کر رہا تھا۔

''معاملات محبت اثر پذیر ہیں، ان کی بات کرنا ایسے ہی ہے جیسے آپ ایک اندھیری تنگ راہ سے گزر رہے ہوں بعض اوقات بہت سی باتوں کی سمجھ نہیں آتی تاریکی کے

باعث نگاہ کو وہ سب دکھائی نہیں دیتا جو در حقیقت ہوتا ہے مگر محبت دیکھتی ہے اور جانتی ہے سو آپ اگر محبت کا انتظار کرتے ہیں اور محبت کا یقین کرتے ہیں تو پھر آپ کے اندر شکوک جنم نہیں لیتے۔''

تیمور بہادر یار جنگ کیا ثابت کرنا چاہتا تھا وہ اس لمحے جیسے جان نہیں پائی تھی مگر وہ اس کی باتوں پر جیسے کان دھرنا نہیں چاہتی تھی تبھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

''ہم ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے اور ایسی بے سروپا باتوں پر تو بالکل نہیں آپ جو کہتے ہیں ضروری نہیں سب ویسا ہی ہو، آپ کے دیکھنے کا نظریہ ہمارے نظریہ سے مختلف ہو سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہم آپ کے نظریات سے اتفاق کریں۔'' وہ ایک خاص انداز سے تنی ہوئی گردن کے ساتھ غرور سے بولی تھی تیمور مسکرا دیا تھا۔

''محبت کو کسی بھی اینگل سے دیکھا جائے اس کی ہئیت وہی رہتی ہے نواب زادی عین النور آپ محبت کی ہئیت اور حجم کو نہیں بدل سکتیں نا محبت آپ کے کہنے پر اپنا نظریہ بدل سکتی ہے آپ آزما کر دیکھ سکتی ہیں محبت آپ کی بتائی گئی راہوں پر چلنا ضروری خیال نہیں کرے گی اور نا آپ کے نظریات کی پیروی کرے گی، آپ مجھ سے اختلاف رکھ سکتی ہیں مگر محبت سے نہیں۔'' تیمور بہادر یار جنگ نے کہہ کر خاموشی سے اسے دیکھا تھا اور پلٹ کر آگے بڑھنے لگا تھا عین النور اسے دیکھتی رہی تھی تا دیر جانے کیوں نگاہ اس سمت سے ہٹی ہی نہیں تھی اور تب بہادر یار جنگ نے چلتے چلتے مڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا اور جانے کیوں وہ چور بننے لگی تھی تیمور بہادر یار جنگ اس کی سمت دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس مسکراہٹ میں بہت کچھ باور کرانے کے لائق تھا وہ اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی اور تب وہ چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا۔

تیمور اسے کیا جتانے کو رکا تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر جیسے خجل سی ہو گئی تھی اور مڑ کر چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

❁......❁......❁

''آج کی میٹنگ میں کوئی خاص پہلو زیر بحث آئے۔'' نواب صاحب نے بیٹے سے پوچھا تھا اور جلال نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''ابا جان آپ جانتے ہیں فرنگیوں کے دماغ ہماری تحریک کو سمجھنے کے لیے نہیں کھلتے ہمیں لگا تھا ہم وائسرائے کو اپنا موقف بیان کر سکیں گے مگر ان کا انداز ٹالنے والا تھا ہم مسلم لیگیوں کی باتوں پر وہ یوں بھی کان لپیٹ لیتے ہیں اور ہندوؤں کے موقف کی بھرپور حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں بہر حال وہ میٹنگ بس ایک میٹنگ ہی رہی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ہم بھی کچھ بہت زیادہ توقع نہیں کر رہے تھے سو ہمیں اس کا کوئی زیادہ افسوس نہیں ہے قطرہ قطرہ پتھر پر گرتا رہے تو اپنی اہمیت جتا لیتا ہے ہمیں امید ہے اس برس میں کچھ تو اہم رونما ہوگا ہی پھر چاہے ہندو کتنی بھی کوشش کر لیں۔'' جلال بولا تھا اور ابا نے ڈنر کرتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

''یہ کیا تم باپ بیٹا کھانے کی میز پر بھی سیاسی گفتگو اٹھا لائے؟'' دادی جان نے انہیں گھورا تھا اور ساتھ ہی بہو کو دیکھا تھا۔

''اے بٹیا اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کو کچھ سمجھا دیا کرو اتنی سیاست تو گویا ایوانوں میں بھی نہیں ہوتی ہوگی جتنی ہمارے گھر کے دستر خوان پر ہوتی ہے حد ہو گئی۔'' دادی جان خفا دکھائی دی تھیں اور عین النور مسکرا دی تھی۔

''دادی جان آپ جانتی ہیں نا جلال بھائی نے مسلم لیگ جوائن کر لی ہے سو اب تو یہ سلسلہ لگا رہے گا۔ ویسے آپ بھی کچھ باخبر رہا کریں ہمارا ملک آزاد ہونے والا ہے آپ ہی کو گلا رہتا ہے نا کہ فرنگی موئے کب اس سر زمین کو اپنے ناپاک وجود سے خالی کریں گے تو سمجھیں اب وقت آن پہنچا ہے یہی نیا جوش اور نیا ولولہ ہے اس نئے خون میں جو تحریک کو تیز ترین بنا رہا ہے ہمیں تو یہ ایک اچھا شگون لگتا ہے آپ کو کیا لگتا ہے ابا جان۔'' عین نے مسکراتے ہوئے ابا کو دیکھا تھا دادی جان چشمے کو پیچھے سے گھورنے لگی تھیں۔

''اے لو، دیکھو ذرا ان دختر صاحبہ کو بھی پر لگ گئے باپ اور سپوت تو اس سیاسی گفتگو میں آگے تھے ہی اب ماشاء اللہ سے دختر صاحبہ بھی حصہ بٹانے آ گئیں ارے بہو بیگم آپ کیوں چپ ہیں آپ بھی اس سیاسی عمل میں حصہ لیجیے گا یوں بھی فاطمہ جناح اور بی اماں نے خواتین کو ایک تحریک دے

ہی ڈالی ہے اس سیاسی فضا میں حصہ بٹانے کی تو آپ کیوں پیچھے رہیں۔'' دادی جان نے گھورا تھا۔ سب مسکرا دیے تھے۔

''ارے ہماری پیاری دادی جان یہ تو اچھی بات ہے نا کہ اب ہماری قوم بیدار ہو رہی ہے اور خواتین بھی فعال ہو رہی ہیں اسی تحریک کی تو ضرورت تھی ہمیں اگر یہ عمل پہلے شروع ہو جاتا تو فرنگی اس زمین سے دم دبا کر بھاگ جاتے نا، پہلے پہل تو ہم انگریزی بولنے کو ہی گناہ عظیم تصور کرتے رہے تھے انگریزی نہ بولنے کے باعث ہم ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ہمارے انگریزی بول چال کے عادی نہ ہونے کا تمام فائدہ ہندوؤں نے اٹھایا اور اپنا موقف بہترین انداز میں فرنگیوں کے سامنے رکھا تو اچھا ہوا ہماری قوم کو عقل آئی اور انگریزی پڑھنے لگے اس سے فائدہ کس کو ہوا؟'' جلال مسکرایا تھا دادی جان نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر ہاتھ سے انہیں مزید بولنے سے روکا تھا۔

''ارے بس بیٹا اب انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ شروع مت کر دینا ہمیں تو اپنی مادری زبان ہی بھلی ہم رہے بولنے سے ان فرنگیوں کی زبان، غلامی میں تو جی ہی رہے ہیں اب کیا بول چال سے بھی غلام بن جائیں تم لوگ بولو یہ فرنگیوں کی زبان، انہیں سمجھاؤ اپنا موقف ہم تو بنا انگریزی کے ہی بھلے کافر تو ہونے سے رہے اب اس عمر میں ہم اپنے ایمان سے بھی جائیں گے کیا ہمیں تو بخش ہی دو۔'' دادی اماں بولی تھیں تو جلال مسکرا دیا تھا۔

''چلیں ٹھیک ہے دادی جان آپ کی خوشی زیادہ اہم ہے یہ زمین ان فرنگیوں سے آزاد ہو جائے گی تو ہم دوبارہ کلمہ پڑھ لیں گے آپ اس کی فکر نہ کریں مگر کافروں کو مدعا سمجھانے کے لیے ہمیں ان کی زبان کو تو اپنانا ہی تھا اس زبان کے بنا ترقی اور کامیابی ممکن نہیں تھی بہر حال آپ لوگ ڈنر کریں ہم کچھ ضروری پیپرز تیار کر کے دے کر آتے ہیں۔'' جلال میز سے اٹھ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''لو یہ تحریک تو جان کو آ گئی بچہ کھانا کھائے بنا اٹھ گیا حد ہو گئی اب ان باتوں کے بعد تو ہمیں بھی بھوک نہیں رہی، صبح ناشتے پر ملیں گے امید کرتے ہیں تب ناشتہ فرنگیوں کے ذکر کے بنا ہو گا۔'' دادی جان اٹھ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

''کیا کرتے ہیں خود تو بگڑے تھے ساتھ بیٹے کو بھی لگا لیا، دیکھیں اماں کھانا کھائے بنا اٹھ گئیں۔'' ظہوری بیگم نے نواب صاحب کو دیکھا تھا نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''اماں جان آزاد سوچ کی مالک ہیں مگر فرنگیوں کے معاملے میں کبھی کبھی قنوطی ہو جاتی ہیں دراصل وہ اس جدوجہد سے اکتا جاتی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں بزرگوں کو بھی کبھی بچوں جیسے ہو جاتے ہیں اماں جان کو بس یہ ہے کہ اب فرنگی یہاں سے دم دبا کر بھاگ جائیں مگر یہ کام چھڑی گھما کر ہونے لائق نہیں اس میں وقت تو لگے گا نا بہر حال ہم کوشش کریں گے کہ کھانے کی میز پر ایسی باتیں ڈسکس نہ ہوں۔''

نواب صاحب بولے تھے اور ظہوری بیگم نے سر ہلایا تھا۔

''ابا جان آپ کی اجازت ہو تو ہم بھی اس تحریک کا حصہ بننا چاہیں گے۔'' عین نے دبے دبے لہجے میں خواہش کا اظہار کیا تھا ابا انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''آپ کی سسرال کو یہ قبول نہیں ہو گا عین النوریں بھی آپ کے محترم سسر صاحب تو کانگریس کے ساتھ منسلک ہیں کہیں آپ کا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنا انہیں خفا نہ کر دے۔'' ابا نے بہت نرمی سے سمجھایا تھا ظہوری بیگم نے بھی بیٹی کو دیکھا تھا۔

''آپ کے ابا جان درست فرما رہے ہیں ایک گھر سے پہلے ہی دو افراد اس تحریک کا حصہ ہیں ضروری نہیں کہ آپ باقاعدہ شمولیت اختیار کریں آپ اس تحریک کو کئی طرح سے تعاون فراہم کر سکتی ہیں۔'' ظہوری بیگم نے بیٹی کو سمجھایا تھا اور نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''آپ کی اماں جان درست فرما رہی ہیں جلال اور ہم اس تحریک کا باضابطہ حصہ ہیں یہ کافی ہے آپ اپنے سسرال کی مخالفت بھول جانے کا نہ سوچیں کل کو آپ کو انہی کے ساتھ آئندہ کی زندگی بسر کرنا ہے۔'' ابا نے پرسکون لہجے میں سمجھایا تھا۔

''آپ اپنے سسرال کی دعوت میں جانے کی تیاری کریں اور سیاست کو بھول جائیں۔'' ظہوری بیگم نواب

صاحب کو شامی حلوہ کے تھال سے حلوہ نکال کر دیتے ہوئے مسکرائی تھیں عین نے چونکتے ہوئے ان کو دیکھا تھا۔

''آپ میں سے کوئی اس دعوت میں نہیں جائے گا۔''

''ارے بھئی آپ کی سسرال نے آپ کو دعوت دی ہے آپ کو جانا چاہیے آپ کی ساس صاحبہ نے تلقین کی تھی کہ اس تقریب میں آپ کی شرکت یقینی ہونا چاہیے۔'' ظہوری بیگم مسکرائی تھیں عین نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی ایسی باتیں ہماری عقل سے تو باہر ہیں آپ لوگوں کے بنا ہم دعوت میں جا کر کیا کریں گے ہمیں نہیں جانا اس دعوت میں پھر۔'' وہ روٹھ کر بولی تھیں ظہوری بیگم نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو دیکھا تھا۔

''بڑی ہو جائیں اب آپ نواب زادی ابھی تک بچوں والی حرکتیں اور ضد یہ ان کی نجی دعوت ہے اور ان کے قریبی عزیز مدعو ہیں اگرچہ ہمیں بھی دعوت نامہ موصول ہوا ہے مگر ہم نے ہی نواب صاحب سے کہا کہ اچھا نہیں لگتا ان کے قریبی رشتے داروں میں ہمارا کیا کام آپ کو اس لیے کہا جا رہا ہے کیونکہ غالباً وہ آپ کو اپنے کچھ قریبی رشتے داروں سے ملوانا چاہتے ہیں۔'' ظہوری بیگم نے کہا تھا۔

''ہم تو اس لیے بھی اس دعوت میں شرکت نہیں کر پائیں گے کہ ہمیں ایک اہم کانفرنس کا حصہ بننا ہے اور آپ کی اماں کی ایک عزیزہ کو ان سے ملنے آنا ہے آپ تو جانتی ہیں میکے سے آئے مہمان کتنے عزیز ہوتے ہیں سو ہماری بیگم صاحب نے ہمیں صاف بتا دیا ہے کہ کہیں مت جایا جائے بہرحال آپ اگر چاہیں تو آپ بھی کوئی بہانہ بنا کر منع کر سکتی ہیں کوئی ایسا ضروری بھی نہیں سسرالی دعوتوں میں شرکت کرنا۔'' ابا نے بیٹی کو اداس دیکھ کر ان کی حمایت کی تھی، عین انہیں دیکھنے لگی تھیں فوری طور پر کچھ نہیں بولی تھیں۔

❁ .... ❁ .... ❁

''اور پھر ماجرا کیا تھا؟'' جلال نے فتح النساء کو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بغور دیکھا تھا فتح النساء حویلی سے قریبی عزیز کی طرف جانے کو نکلی تھیں جب حویلی کے باہر ہی جلال نے ان کے سامنے اپنی موٹر کار روک دی تھی اور تب فتح النساء کو اس موٹر کار میں بیٹھنا پڑا تھا۔

''کچھ نہیں آپ کو بتایا تو تھا کہ ایسا کچھ خاص نہیں تھا۔'' فتح النساء نے انہیں ٹالا تھا تب جلال نے انہیں بغور دیکھا تھا اور گویا ہوئے تھے۔

''دیکھیے محترمہ فتح النساء، ہم اتنے بھولے نہیں ہیں اور آپ بھی جانتی ہیں کہ اس طرح کچھ چھپانا جائز نہیں سو ہمیں بتا دیجیے کہ معاملہ کیا تھا ورنہ ہمارے پاس جاننے کے ہزاروں اور بھی راستے ہیں پنڈی محل میں واقع ہونے والی کوئی بات چھپی تو رہ نہیں سکتی ہزار ملازموں کی فوج ہے کسی نہ کسی نے کچھ نہ کچھ تو ضرور دیکھا ہوگا اس کا یقین تو ہمیں ہے، ہم آپ کی زبانی سننا چاہ رہے ہیں سو کیا آپ اب مدعا بیان کرنا چاہیں گی۔''

جلال نے نرمی سے پوچھا تھا۔ فتح النساء کچھ ثانیوں کو خاموش رہی تھیں پھر گویا ہوئی تھیں۔

''حیدر سراج الدولہ نے ہم سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی ہمیں بری نیت سے دیکھا اور......!'' وہ دانستہ ان کی سمت دیکھتے ہوئے بولتے بولتے رک گئی تھیں۔

''اور......!'' جلال نے ایک اچٹتی نظر ان پر ڈالی تھی۔

''اور ہمیں بہت بری نیت سے دیکھا اور اپنے گھٹیا عزائم کے لیے ہمیں استعمال کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اگر ہم نہیں مانتے تو ان کے پاس کئی راستے اور بھی ہیں...... اور......!'' وہ اچانک بولتے ہوئے رکی تھیں۔ تب جلال نے ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔

''اور کیا آپ نے ان چھوٹی چھوٹی بریکس کے لیے بنا پوری بات ہمیں بتا سکتی ہیں۔ ہم مدعا سننا چاہتے ہیں ہمیں یقین تھا کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے مگر ہم اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ وہ اس درجہ گرنے کا تصور کریں گے وہ بھی ہمارے گھر کی خواتین کے ساتھ ابا آپ کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں اس کے باوجود انہوں نے اتنی گھٹیا حرکت کی۔'' جلال کی رگیں تن گئی تھیں وہ شدید غصے میں آ گئے تھے اور فتح النساء کو ان کی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت موٹر کار چلا رہے تھے اور اسے ڈر تھا ان کا غصے میں آنا ان کی جان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے یا ان سے گاڑی بے قابو نہ ہو جائے تبھی ان کی سمت دیکھتی ہوئی گویا ہوئی تھیں۔

''آپ اگر کچھ سننا چاہتے ہیں تو آپ اتنا زیادہ غصہ کرنا بند کیجیے ورنہ ہم آپ کو کچھ مزید نہیں بتائیں گے۔'' فتح النساء

نے دھمکی دی تھی جس پر جلال اگلے چند لمحوں تک بنا ان کی طرف دیکھے خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے تھے اور پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے تھے۔

''ہم خواتین کی عزت کرتے ہیں فتح النساء ہم سے ایسا نا زیبا سلوک برداشت نہیں ہوتا حیدر میاں کی ہمت بھی کیسے ہوئی آپ سے اس طرح پیش آنے کی ہمیں تو سوچ کر ہی حیرت ہو رہی ہے کہ ہماری بہن ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے جا رہی ہیں جن کو خواتین کی عزت بھی کرنا نہیں آتی آپ نے یہ بات اپنی عزیزہ سہیلی عین النور کو کیوں نہیں بتائی۔ اگر آپ کو وہ عزیز ہیں اور آپ نہیں چاہتیں کہ ان کے ساتھ کچھ غلط ہو تو پھر یہ خاموشی بھی کیوں، آپ تو ان کی عزیز سہیلی ہیں نا۔'' وہ عجیب شکی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا وہ افسوس سے ان کی سمت دیکھتی ہوئی نگاہ ہٹا گئی تھی۔

''ہمیں یہی گمان تھا کہ آپ اس طور پیش آئیں گے اور کوئی نہ کوئی بات اپنی طرف سے اخذ کرلیں گے تبھی ہم آپ کو کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے کہ آپ الٹا ہم پر ہی شک کریں گے جب آپ جانتے ہیں کہ ہم عین کی اتنی اچھی سہیلی ہیں تو آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں ہم عین کے خیر خواہ نہیں مگر ہمیں لگ رہا تھا اگر عین نے ہمارا یقین نہ کیا تو اور ایسا ہونا عین ممکن بھی تھا کہ نواب زادی ہمارا یقین نہیں کرتیں کیونکہ وہ حیدر میاں سے اپنے رشتے کو لے کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتی ہیں سو ہمیں یہی گمان تھا کہ کہیں وہ ہمارے خلاف کھڑی نہ ہو جائیں اور وہ دوستی اس طور اختتام پذیر نہ ہو جائے ہم عین کے خیر خواہ ہوتے ہوئے بھی چپ رہے کہ شاید وہ ہماری بات کا یقین ہی نہ کریں تو پھر جب آپ اس طرح بھڑک اٹھے اور ہمارا یقین نہیں کر رہے تو ایسا نواب زادی کے ساتھ بھی تو ممکن تھا نا یہی بات تھی جو ہمیں کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔ بہرحال ہم عین سے بہت مخلص ہیں ان کو زک نہیں پہنچا سکتے۔'' فتح النساء کہہ کر خاموش ہوئی تھیں تب جلال نے ان کی سمت ایک نگاہ ڈالی تھی ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ فتح النساء سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ ان کا یقین کر رہے تھے یا گویا اب بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، تبھی وہ ان کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی جلال نے بھی انہیں مخاطب کیا تھا اور مدہم لہجے میں بولے تھے۔

"اور دوسرا معاملہ کیا تھا آپ وہ بتانا گوارا کریں گی یا ہم آپ سے پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔" اور آپ بتانے کا کوئی حق واجب نہیں رکھتیں۔" عجیب لہجے میں جلال الدین پٹوڈی کی طرف سے سوال آیا تھا وہ لمحہ بھر کو انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

کیا وہ اس پر شک کر رہے تھے ان کا انداز کس بات کا غماز تھا وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ ان کو سمجھانا چاہتی تھی کہ ان کا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا سو ہوا وہی تھا جس کا انہیں شک تھا اسی باعث اس نے نواب زادی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اب معاملہ وہی ہوا تھا اسے شک کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا گویا جلال ان کی نیت پر شک کر رہے تھے اور حیدر میاں صاحب بچ نکلے تھے۔

"آپ اپنی باقی ماندہ سوچوں کو فی الحال ایک طرف رکھ دیں ابھی ان کی گنجائش نہیں نکلتی ہم نے جو آپ سے پوچھا ہے فی الحال اس کا ایک واضح سا جواب دے دیجیے۔" جلال نے گاڑی کی ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر انہیں اچٹتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا وہ بات بتانا اس قدر ضروری ہے۔" فتح النساء تعرض برتتی ہوئی بولی تھیں، تب جلال الدین پٹوڈی خاموش ہو گئے تھے اور فتح النساء کو صاف لگا تھا وہ مزید قائل کیوں نہیں کرنا چاہتے انہیں برا لگ گیا تھا تبھی وہ ان کی سمت سے نگاہ ہٹا کر آہستگی سے بولی تھیں۔

"حیدر میاں نے ہم پر انگلی اٹھائی ہماری شناخت پر سوال اٹھایا جب ہم نے کہا کہ ہم روسیا کی اولاد ہیں ہم پر بری نظر رکھنا آپ کو زیب نہیں دیتا تو وہ تمسخر اڑانے لگے کہ ہم جہاں پیدا ہوئے ہیں وہاں ماں باپ کا نام درج نہیں ہوتا یہ سوال ہمارے لیے تازیانہ تھا ہم اسی دن سے الجھے ہوئے ہیں اور اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں کہ ہم کون ہیں اور اسی لیے ہم اس مدعے کو آپ کے سامنے کھولنے سے اور بات کرنے سے گریز کر رہے تھے کیونکہ یہ ہمارا نجی معاملہ ہے اور ہم کسی کے سامنے اس کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔" فتح النساء کھڑکی کی طرف گردن پھیرے بولی تھیں ان کا لہجہ بہت خالی پن لیے ہوئے تھا اور مدہم آواز کسی قدر بوجھل تھی جلال نے ان کی سمت ایک نگاہ دیکھا تھا۔

"آپ اباجان کے دوست کی بیٹی ہیں اور یہ حوالہ کافی تھا ان کو بتانے کو۔" جلال سرسری لہجے میں بولے تھے۔

"ویسے انہیں کیوں لگا کہ آپ پٹوڈی خاندان کے قریبی دوست کی بیٹی نہیں۔" جلال نے نقطہ اٹھایا تھا وہ خاموشی سے دیکھ کر رہ گئی تھی تبھی وہ بولا تھا۔

"آپ خود اپنے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں تو آپ دوسروں کے سامنے خود کا دفاع کیسے کر سکتی ہیں پہلے خود ڈٹ کر کھڑا رہنا سیکھیے جب آپ خود مضبوطی سے کھڑا ہونا سیکھ لیں گی تو یہ تمام سوال بے معنی ہو جائیں گے۔" وہ جتانے والے انداز میں گویا تھے۔

"یہ بات ہماری نہیں ہے آخر حیدر سراج الدولہ نے ایسا کہا بھی کیوں ان کے ذہن میں کوئی بات تو چل رہی ہوگی نا۔" وہ سوچتی ہوئی بولی تھی۔

"اور آپ کو لگتا ہے کہ ان کے کہہ دینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"اور کیا آپ ان کے اتنا کہہ دینے سے خود کے بارے میں بے یقین ہو جائیں گی۔" وہ الٹا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ الجھ کر خاموش ہو گئی تھی جب جلال گویا ہوئے تھے۔

"دیکھیے فتح النساء، ہم آپ کے خیر خواہ ہیں سو آپ کو ایک بات جتانا چاہتے ہیں جو نہیں ہیں ان کی فکر میں گھلنا ٹھیک نہیں آپ کی اپنی ایک ذات ہے ایک پہچان ہے آپ کے والدین کا وجود تھا ابا کے اچھے دوستوں میں سے تھے آپ کے اباجان اور اکثر ابا ان کا ذکر بھی کرتے ہیں ہم نہیں جانتے آپ ایسے شکوک وشبہات میں کیوں پڑ رہی ہیں، اکیس برس تک آپ اسی سوچ اور اعتماد کے ساتھ جیتی رہی ہیں نا کہ آپ کے والدین سلامت تھے اور آپ کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے تو اب کیا آفت آ گئی ہے۔ دیکھیے حیدر کی باتوں میں نہ آئیں وہ انسان ٹھیک نہیں ہے اور اب ہم گھر میں مدعا اٹھائیں گے ہم اباجان سے خود بات کریں گے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل کچھ سوچ لیں یہ نواب زادی کی زندگی کا معاملہ ہے۔" وہ اپنی بہن کے لیے بہت متفکر دکھائی دیے تھے۔

"کیا آپ ایک کام کر سکتی ہیں ہمارے لیے۔" وہ اس

فکر میں بولے تھے۔

"کیا۔" فتح النساء چونکی تھیں۔

"کیا آپ یہ سب اپنی سہیلی کے گوش گزار کرسکتی ہیں ہم چاہتے ہیں آپ ان سے اس سلسلہ میں بات کریں۔" جلال بولے تھے اور وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"آپ جانتے ہیں جلال آپ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں، نواب زادی نے اگر ہمارا یقین نہ کیا تو ہماری دوستی جاتی رہے گی آپ جانتے ہیں وہ اپنے اور حیدر میاں کے تعلق کو لے کر کس قدر شدت پسند ہوجاتی ہیں اور ہمیں ڈر ہے ہم ان کو کھو نہ دیں۔" وہ خوف کے باعث بولی تھیں تبھی وہ ایک نگاہ انہیں دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

"ہم آپ سے جو کہہ رہے ہیں آپ وہ کیجیے یہ درخواست ہے آپ سے۔" وہ قطعی لہجے میں گویا تھے اور فتح النساء انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی وہ مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"اسی باعث ہم آپ کو لینے آئے تھے ہمیں علم ہوگیا تھا کہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے اور یہ معاملہ اگر نواب زادی کی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی لانے کا باعث بن سکتا ہے تو آپ کو ان کی سہیلی ہونے کے ناتے اتنا رسک تو لینا چاہیے کیا آپ چاہیں گی کہ نواب زادی زندگی میں ایک غلط فیصلہ لیں اور ایک غلط انسان کے ساتھ اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کردیں۔" وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولے تھے اور فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

❁......❁......❁

"ماشاء اللہ آپ کے سپوت بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں مسلم لیگ میں فرنگی بھی ان کے خیالوں سے خوب متاثر دکھائی دیتے ہیں۔" فریدہ بیگم نے اپنے شوہر حکمت بہادر یار جنگ کی طرف دیکھا تھا وہ دھیمے سے مسکرائے تھے اور اپنے ہونہار سپوت کو دیکھا تھا وہ سیڑھیاں اترتے دکھائی دیے تھے۔

"بیٹا جوان ہوجائے تو باپ کی توانائی دوگنی ہوجاتی ہے فریدہ بیگم ہم خوش ہیں کہ جس خاندان کا بہت نام تھا اس خاندان سے ایک اور سورما نکل رہا ہے آزادی کی جنگ میں ہمارا خاندان پیش پیش رہا ہے۔

ہمارے بڑے بھائی فریڈم فائٹر تھے چچا جان بھی فریڈم

قرآنی معلومات

قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے۔

قرآن پاک کی سب سے چھوٹی سورۃ الکوثر ہے۔

قرآن پاک میں 30 پارے 114 سورتیں اور 558 رکوع ہیں۔

قرآن پاک کی عروس القرآن سورۃ رحمٰن کو کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک کا دل سورۃ یٰسین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں 6666 آیتیں ہیں۔

قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت "آیۃ الکرسی" ہے۔

سورۃ التوبہ قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جس کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی۔ قرآن پاک میں کل لفظ 323760 ہیں۔

سورۃ الناس قرآن پاک کی ایسی سورۃ ہے جو حرف "س" پر اپنی آیت ختم کرتی ہے۔ قرآن پاک کی سات منزلیں ہیں۔

قرآن پاک میں قل سے شروع ہونے والی کل ۵ سورتیں ہیں سورۃ الجن، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس۔

رابعہ ساحر...... جہانیاں

گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تمہارے گناہوں کو معاف کردے اور تمہارے درجے بلند کردے؟" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "ضرور اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ناگواری اور مشقت کے باوجود کامل طریقے پر وضو کرنا، مسجد کی طرف چل کر جانا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ تمام اعمال اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آنے کا ذریعہ ہیں۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

سیدہ علیشاہ...... بہاولپور

فائٹرز میں سے تھے اور اب ہمارا بیٹا بھی اس تحریک میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے چلو پڑھائی کا ایک فائدہ تو ہوا کہ لڑائی لڑنے کا طریقہ بدل گیا ایک پڑھا لکھا دماغ دماغ سے لڑائی لڑتا ہے اور ان پڑھ ہتھیار سے دیکھیے بیرون ملک جا کر پڑھنے سے جو آپ کو قلق تھا کہ آپ کا بیٹا آپ سے دور کر دیا تو اب یہ قلق ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ آپ کے سپوت کی تعلیم و تربیت نے انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ میں بڑے بڑے لیڈران کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں آج نیا جوش اور نیا ولولہ تحریک کا حصہ بن رہا ہے اب تو بس فرنگیوں کے قدم اکھڑے ہی دیکھیے۔'' حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے اور فریدہ بھی مسکرا دی تھیں۔

''لیجیے آپ نے تو اپنے سپوت کی قصیدہ خوانی شروع کر دی ہم تو آپ سے یہ کہنے والے تھے کہ بیٹا جوان ہو گیا ہے اب آپ ان کی شادی کی فکر کریں کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر نکاح کریں اور بہو گھر لائیے بیٹے کا اس طرح لور لور پھرنا مناسب نہیں۔'' فریدہ مسکرائی تھیں اور حکمت بھی مسکرا دیے تھے۔

''ہم نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا فریدہ بیگم کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں۔'' ویسے آپ کے سپوت بیرون ملک پڑھائی مکمل کر کے لوٹے ہیں ذرا ان سے بھی پوچھ لیجیے انہیں کوئی وہاں نہ بھا گئی ہو آپ تو جانتی ہیں کہ بچے بیرون ملک پڑھنے جاتے ہیں تو اکثر وہیں کسی کو پسند کر لیتے ہیں۔'' حکمت صاحب نے چھیڑا تھا فریدہ مسکرا دی تھیں۔

''چلیں اگر پسند کر بھی لیا ہے کسی کو تو کیا حرج ہے ہمارے بیٹے کی پسند کوئی خاص ہی ہو گی ہم ان ماؤں میں سے نہیں جو اپنے بچوں کو پسند کا حق بھی دینا نہیں چاہتیں ہمارے لیے یہ تو وہ جو کوئی بھی ہو گی بہت اہم ہو گی ویسے ہم بات کریں گے تیمور سے۔'' فریدہ نے شوہر کے سامنے چائے کے لوازمات رکھے تھے اور ان کو مٹھائی سرو کرنے لگی تھیں۔

''یہ کیا آپ نے مٹھائی کی ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھی تھی۔

''جانے بھی دیں حکمت صاحب یہ مٹھائی تو ہم نے آپ کے لیے بنوائی تھی آپ کو میٹھا کھانے کا بہت شوق ہے نا اور تیمور کی دلہن کو منتخب کرنے پر ایسی مٹھائی تھوڑا نا کھلائیں گے آپ کو پھر تو مٹھائی بھی کچھ اور خاص ہوگی۔'' فریدہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا تو حکمت صاحب نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا تبھی تیمور وہاں آئے تھے۔

''آداب امی جان، آداب ڈیڈ۔''

''تسلیمات یہ کیا بیٹا آداب بھی اور ڈیڈ بھی ارے موئے فرنگی الفاظ گھر کی چار دیواری میں پکار کر گھر کی فضا کو تو ناپاک نہ کریں آپ۔'' فریدہ نے جواب دیتے ہوئے بیٹے کو گھورا تھا تیمور مسکرا دیا تھا اور حکمت کو دیکھا تھا۔

''ڈیڈ سوچ لیں اماں کو فرنگی پسند نہیں اور آپ تو کل مادام مارگریٹ سے ملنے والے تھے نا۔'' تیمور نے چھیڑا تھا حکمت نے مسکراتے ہوئے بیٹے کو دیکھا تھا تیمور نے جھک کر مٹھائی کی ڈلی اٹھا کر کھائی تھی اور دوسری اٹھائی تھی فریدہ نے بیٹے کو گھورا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، یا آپ دونوں باپ بیٹا کون سی کھچڑی پکا رہے ہیں کہہ رہے ہیں ہم آپ سے اب سدھر جائیں یہ کسی فرنگن سے مل رہے ہیں آپ؟'' فریدہ نے شوہر کو گھورا تھا حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے اور بیوی کو دیکھا تھا۔

''اب اس عمر میں ہم کیا کریں گے محترمہ مارگریٹ مادام وائسرائے کی ماتحت ہیں ایک گزارشات ان کو دینا تھی اسی لیے ان سے ملنے کا وقت مقرر ہوا تھا۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا اور بیٹے کو دیکھا تھا۔

''تمہارے چاچا نواب پٹوڈی بہت تعریف کر رہے تھے تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے وائسرائے سے ہونے والی میٹنگ میں تم نے اور جلال نے متاثر کن نمائندگی کی ہمیں خوشی ہے تم دونوں اس تحریک کا حصہ بنے۔'' حکمت نے بیٹے کو بھرپور سراہا تھا تبھی فریدہ بیگم گویا ہوئی تھیں۔

''اچھا اب یہ سیاسی باتیں گھر میں کرنا منع ہے اگر ایسی سیاسی گفتگو فرمانے کا ایسا ہی شوق ہو رہا ہو تو چلتے ہوئے گھر کی حدود سے باہر نکل جائیے آپ دونوں باپ بیٹا ورنہ ہم تو کان لپیٹنے سے رہے۔''

فریدہ کے ڈپٹنے پر تیمور مسکرایا تھا اور والد کی طرف دیکھا تھا۔

''ڈیڈمم کو مادام مارگریٹ کا ذکر کچھ پسند نہیں آیا بہر حال ہم تو باہر جا رہے ہیں آپ اماں حضور کی ڈانٹ سنتے رہیے۔'' تیمور نے مسکراتے ہوئے مٹھائی اٹھا کر منہ میں رکھی تھی جب فریدہ نے ان کا کان پکڑ لیا تھا اور ڈپٹتے ہوئے بولی تھیں۔

''بیٹھ جایئے خاموشی سے کہیں نہیں جا رہے آپ بھی ہمیں آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے سو آج آپ کا باہر جانا منسوخ سمجھیے۔'' فریدہ نے انہیں پکڑ کر بٹھا دیا تھا اور تیمور ماں سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

❁......❁......❁

نواب زادی عین النور اس تقریب میں آ تو گئی تھیں مگر اکیلے وہ بہت عجیب محسوس کر رہی تھیں اتنے سارے سسرالی رشتے داروں سے ملنے کا تجربہ نیا تھا اور بیشتر کو تو وہ جانتی بھی نہیں تھیں۔

''کیا ہوا آپ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں آپ کی تو اپنی سسرال ہے غالباً آپ اس گھر میں اجنبی تو نہیں۔'' کسی بہت دلکش لڑکی نے ان کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا اور عین نے چونکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا حسن بہت دلفریب تھا وہ جو کوئی بھی تھیں بہت زیادہ حسین اور دلکش تھیں ان کی تو آواز میں بھی اتنی نغمگی تھی کہ عین حیران رہ گئی تھی۔

''آپ ہمیں کیسے جانتی ہیں۔'' عین النور نے حیرت سے پوچھا تھا وہ مسکرا دی تھیں اور نرمی سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی گویا ہوئی تھیں۔

''نواب زادی عین النور پٹوڈی کو کون نہیں جانتا ہوگا حیدر سراج الدولہ کی منگیتر اور نواب سیف الدین کی بیٹی کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

''اور آپ کون ہیں۔'' عین نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

''ہم خوشنما ہیں۔'' وہ بہت دلکشی سے مسکرائی تھیں اور اس سے قبل کہ عین ان سے کچھ اور پوچھتی وہ چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھیں۔

عین النور کو ماننا پڑا تھا کہ اس نے آج سے قبل ایسا اچھوتا حسن نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کون تھیں۔'' عین نے الجھ کر سوچا تھا پھر شانے اچکاتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھیں گھر کے اس احاطے میں ویرانہ سا تھا۔ تقریب دوسرے حصے میں منعقد کی گئی تھی اور گھر کا یہ حصہ نسبتاً گھر سے مخالف سمت تھا عین النور نے کبھی اس گھر کو اس درجہ غور سے نہیں دیکھا اور اس حصے کو قطعاً نہیں دیکھا تھا۔

وہ حیرت سے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جب اسے یکدم اپنے پیچھے کسی کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی وہ چونکتے ہوئے مڑی تھیں وہ آواز ایک نسوانی چیخ کی تھی وہ سمجھ نہیں پائی تھیں کہ آواز کس سمت سے آئی تھی گھر اتنا بڑا تھا کہ سمت کا تعین کرنا مشکل لگ رہا تھا عین النور ہراساں سی مڑی تھی جب ان کی نظریں ساکت رہ گئی تھیں تبھی کسی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور ان کی چیخ نکل گئی تھی تبھی کسی نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور ان کے بولنے کی سکت نہیں رہی تھی، وہ کسی مصیبت میں پھنس رہی تھیں وہ سمجھ نہیں پائی تھیں مگر ان کا دل خوف سے بہت بھر گیا تھا اتنا خوف تھا کہ لگتا تھا دل بند ہو جائے گا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

ریاض بٹ

ایک تازہ تفتیشی کہانی حاضر خدمت ہے یہ ایک پراسرار واردات تھی جسے اگر انسپکٹر خالد چاہتا تو آسانی سے داخل دفتر کرسکتا تھا لیکن وہ تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں بال کی کھال اتارنے والا تھانیدار تھا اس لیے دیکھیں کہ وہ اس کیس کو کیسے حل کرتا ہے آخر میں آپ بھی حیران رہ جائیں گے کہ ایسے بھی ہوسکتا ہے۔

جاسوسی ادب پڑھنے والوں کیلئے تحفہ

میں انسپکٹر خالد ریٹائرڈ آج آپ کو پچاسویں تفتیشی کہانی سنا رہا ہوں۔ میں نے تین چار دنوں میں اس کہانی کے چیدہ چیدہ واقعات اپنی ڈائری سے ذہن میں فیڈ کیے ہیں۔ میں ہمیشہ اس طرح کرتا ہوں اس طرح میرے ذہن میں بیٹھا تھانیدار جاگ اٹھتا ہے اور کہانی سنانے لگتا ہے۔

جیسا کہ پچھلی کہانی میں ذکر آچکا ہے کہ ایک زیر تفتیش کیس مجھے نئے تھانے میں آتے ہی مل گیا تھا۔ جانے والے تھانیدار نے زیادہ تفتیش نہیں کی تھی وہ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے ٹرانسفر کے آرڈر آگئے تھے۔ ویسے اس نے کیس کی فائل میرے حوالے کرتے ہوئے تمام باتیں میرے گوش گزار کردی تھیں۔ میں پہلے آپ کو بتا دیتا ہوں کہ کیس کیا تھا۔

یہ سب آپ پہلے والے تھانیدار چوہدری شفقت کی زبانی سنیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک صبح میں جب تھانے آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تو سپاہی منظور نے مجھے اطلاع دی۔

''سر قاسم آباد کے قبرستان میں کسی جوان کی لاش پڑی ہے چوہدری قاسم نے ایک بندہ بھیجا ہے جو یہ اطلاع لے کر آیا ہے۔''

میں نے پہلے بندہ کو بلا کر اس سے معلومات حاصل کیں بندے کا نام عنایت تھا۔ رنگ سانولا قد تقریباً پانچ فٹ ہوگا وہ ایسا ہی تھا جیسے اکثر روایتی چوہدریوں کے رکھے ہوئے ڈشکرے ہوتے ہیں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ وہ جائے ہم تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اور کانسٹیبل خورشید قبرستان میں موجود تھے۔ لاش ایک جوان العمر آدمی کی تھی۔ یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سو کے قریب گھر ہوں گے۔ چھوٹا سا ڈسپنسری نما اسپتال تھا اسکول صرف مڈل تک تھا۔ ڈاک خانے اور پکی سڑک سے محروم تھا۔ لاش دو ساتھ ساتھ بنی قبروں کے پاس پڑی تھی۔ بہرحال ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بڑی مشکل سے شہر میں واقع سول اسپتال بھیجی مشکل سے اس لیے کہ چوہدری قاسم نے کافی واویلا کیا تھا بقول اس کے جوان کو شیریں یا وقار کی روح نے مارا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب یہ کہانی میں سن لوں گا۔ آپ ابھی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے جانے دیں۔ ورنہ مجھے اپنے سرکاری اختیارات استعمال کرنا پڑیں گے۔'' میں نے انتہائی خشک لہجے میں کہا۔

میرے لہجے سے چوہدری کا واویلا دم توڑ گیا۔ لیکن

بات رسی والی تھی کہ رسی تو جل گئی تھی لیکن بل نہ گیا تھا۔وہ بولا۔

"ٹھیک ہے آپ اپنی مرضی کرلیں لیکن آپ نقصان میں رہیں گے۔" میں نے اس سے فضول بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ اس کی حویلی میں آ گیا۔ اس کی حویلی گاؤں کے وسط میں کھڑی اپنی شان وشوکت کا اظہار کررہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس کی ایک ایک اینٹ کئی کہانیاں سنارہی ہو۔ان میں ایک کہانی چوہدری نے بھی مجھے سنائی تھی۔

جن قبروں کے پاس جوان کی لاش ملی تھی، وہ اسی گاؤں کے دو دیوانوں کی تھیں جو ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی اپنے دور میں شاید شیریں اور فرہاد نے کی ہوگی۔ بعض لوگوں کے بقول دونوں پیار کی حدیں پھلانگ کر عشق کی معراج تک پہنچ چکے تھے۔

نام ان کا شیریں اور وقار تھے جس طرح کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔اسی طرح ان دیوانوں کی محبت بھی دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی۔ وہ قبرستان میں ہی ملتے تھے۔ایک دن شیریں کے بھائی نے رات کے اندھیرے میں انہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔اسے کچھ دن پہلے یہ سن گن ملی تھی کہ اس کی بہن شیریں گاؤں کے مچھیرے کے بیٹے وقار سے ملتی ہے اور کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وقار نے تمہاری عزت اور وقار کو اپنے پیروں تلے روند دیا ہے حالانکہ وہ رات کے درمیانی پہر میں ملتے تھے جب گاؤں کے لوگ دن بھر کے تھکے ہارے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہوتے تھے لیکن پھر بھی ایک آدمی نے جسے بے خوابی کی شکایت تھی انہیں دیکھ لیا۔ شیریں کا کمرہ عقبی طرف تھا اور کمرے کا عقبی دروازہ قبرستان کی طرف کھلتا تھا شیریں

کے بھائی نے بہن پر نظر رکھنا شروع کردی۔ ایک رات وہ اپنے محبوب سے ملنے قبرستان میں پہنچی تو اچانک طوفان آ گیا۔ اتنی تیز ہوا تھی کہ کئی کمزور درخت زمین بوس ہو گئے باقی درخت بھی اسی طرح ہل رہے تھے جیسے ابھی گر پڑیں گے شیریں کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں تھی دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ موت ان کے سر پر آ پہنچی ہے۔

اگلی صبح بوہڑ کے پچاس سالہ درخت کے نیچے دونوں کی کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں اور شیریں کا بھائی انار گل کلہاڑی سمیت تھانے میں بیٹھا اپنے جرم کا اقرار کر رہا تھا۔ یہ تقریباً پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ قبرستان میں موجود بوہڑ کا درخت اس بات کا گواہ تھا کہ دونوں اسی جگہ اس کے تنے کے ساتھ بیٹھتے تھے یہیں انہوں نے اپنے خون سے اپنی محبت کو امر اور عشق کو معراج تک پہنچایا تھا اور اس درخت کے نیچے ان کی قبریں تھیں اور گاؤں کے لوگوں نے انہیں شیریں اور فرہاد کا لقب دے دیا تھا بقول شاعر۔

زندہ ہے تو جینے کی سزا دیتی ہے دنیا

وقار بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے دوستوں میں بیٹھتا تھا اس سے بانسری بجانے کی فرمائش ضرور ہوتی تھی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ شیریں اس کی بانسری کی آواز پر مرمٹی تھی لاشوں کے پاس ہی خون آلود بانسری پڑی اپنی کہانی سنا رہی تھی لیکن جو کہانی بعد میں مشہور ہوئی تھی وہ بھی کچھ دلچسپ اور پراسرار نہیں تھی ویسی ہی طوفانی اور تیز جھکڑوں والی رات اس واقعے کے تقریباً دو ماہ بعد پھر آئی تھی اور لوگوں نے درد میں ڈوبی ہوئی بانسری کی آواز قبرستان میں سنی تھی جو بوہڑ کے درخت کے اوپر سے آ رہی تھی سب سے پہلے گورکن نے یہ آواز سنی تھی۔

پھر چار سو اس آواز کے چرچے ہو گئے تھے اور یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جب بھی طوفان آتا ہے چاہے وہ رات کو آئے یا دن کے اجالے میں۔ بانسری کی درد میں ڈوبی آواز ضرور سنائی دیتی تھی جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے ان گنت کہانیاں چھوڑ جاتے ہیں ہیر رانجھا سسی پنوں، سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد وغیرہ تو مشہور لوک داستانیں ہیں لیکن اس کے علاوہ ان گنت کہانیاں ایسی ہیں جو ابھی تک عام آدمی کے کانوں تک نہیں پہنچیں کیونکہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا اور کہانیوں کو جنم دیتا رہے گا۔

چوہدری شفقت صاحب کو اس کیس پر کام کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا اور اب یہ پراسرار کیس میرے پاس تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد ورثاء کے حوالے کر دی گئی تھی اور میرے سامنے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تھی جو کیس کی فائل کے اوپر ہی لگی ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق بڑے بڑے ہاتھوں نے لاش کا گلا گھونٹا تھا۔ ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا تھا کہ کیا کسی انسان کے اتنے بڑے ہاتھ بھی ہو سکتے ہیں؟ موت کا وقت رات بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان کا لکھا تھا۔

پھر وہی آدھی رات...... لیکن بقول تھانے کے عملے کے وہ طوفانی رات نہیں تھی لیکن میرے من میں ایک طوفان برپا تھا۔ جب تک میں اس کیس کو حل نہیں کر لیتا مجھے سکون ملنا محال تھا۔ یہاں یہ بات بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مرنے والا جوان ماچھی نزاکت کا بھانجا تھا۔

قاسم آباد اور محبت آباد کے درمیان ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا تین کشتیاں سارا دن اس دریا کے اس پار سے اس پار تک چلتی تھیں جو دونوں گاؤں کے مکینوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی تھیں۔ ان کشتیوں کے مالکوں کا یہی ذریعہ معاش تھا اور اس دریا کی شمالی سمت پانی ذرا گہرا تھا۔ اس لیے جن کو تیرا کی نہیں آتی تھی وہ اس طرف جانے کی حماقت نہیں کرتے تھے وہاں دریا 30 فٹ گہرا تھا لیکن دریا کے اسی حصے سے نزاکت اپنی روٹی روزی حاصل کرتا تھا۔ درمیان میں گہرائی بیس فٹ سے زیادہ تھی۔

قارئین یہ سب تفصیل اس لیے آپ کے گوش گزار کی ہے تاکہ آپ کہانی پڑھتے ہوئے کسی الجھن کا شکار نہ ہوں بہر حال میں نے پہلے ماچھی نزاکت سے ہی تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ نزاکت جب اپنے بھانجے وقار کی لاش لینے چوہدری شفقت کے پاس آیا تھا تو اس نے درخواست کی تھی کہ معاملے کی تفتیش ضرور کی جائے۔ چوہدری شفقت نے اسے قانون کی مجبوری سے آگاہ کرتے ہوئے باقاعدہ رپورٹ درج کروانے کے لیے محرر کے پاس بھیج دیا تھا۔

ایک دن ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کے ہمراہ سرکاری جیپ میں

قاسم آباد پہنچ گیا۔ وہ گلابی جاڑے کے دن تھے میرے کہنے پر نزاکت نے ہمارے بیٹھنے کا بندوبست چھوٹے دریا کے کنارے ہی کردیا۔ سورج کی کرنیں دریا کے پانی پر بڑا سندر منظر پیش کررہی تھیں۔ اس کا دوسرا کنارا تقریباً تین میل دور تھا اس وقت پانی بڑی سبک رفتاری سے بہہ رہا تھا جیسے کچھ سوچتے ہوئے بہہ رہا ہو میں نے نزاکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نزاکت بھائی یہ تمہارے لیے دوسرا صدمہ ہے۔'' وہ ایک دھان پان سا بندہ تھا وہ عمر کی پچپن بہاریں دیکھ چکا تھا رنگ گورا اور تیکھے نقش پرکشش تھے اور اس عمر میں بھی اس کی صحت اچھی تھی۔

''تھانیدار صاحب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں...... دراصل ہمارے خون میں ہی محبت کے جراثیم ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے محبت کی شادی کی تھی۔ میرے بھائی شرافت نے بھی اسی عمل کو دہرایا تھا میرے بیٹے کی مثال بھی آپ کے سامنے ہے۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کا بھانجا بھی؟'' میں نے دانستہ فقرے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔ اللہ کی اللہ ہی جانے...... ویسے ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ میرا بھانجا شادی شدہ تھا۔ شادی کو دو سال ہوگئے تھے لیکن ابھی تک ان کے آنگن میں کسی بچے کی کلکاریاں نہیں گونجیں تھیں۔''

''اچھا۔'' میں نے ہنکارا بھرا...... تھوڑی دیر دریا کے نیلگوں پانی پر نظریں جمائے رہا۔ پھر نزاکت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ذرا اپنے ذہن کو پانچ سال پیچھے لے جاؤ کیا تمہیں یہ پتہ لگ گیا تھا کہ تمہارا بیٹا انار گل کی بہن شیریں سے محبت کرتا تھا۔''

''تھانیدار صاحب مجھے یہ کہانی اس کے قتل سے چند دن پہلے پتہ چلی تھی ابھی میں اس کے رشتے کی بات چلانے ہی لگا تھا کہ یہ واردات ہوگئی۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ میں اس کے ماضی کو ایک خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے کرید رہا تھا۔

''اب ایک بات کا جواب ذرا سوچ کر دینا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس طرح تمہیں پہلے اپنے بیٹے وقار کی محبت کا پتہ نہیں تھا اسی طرح بھانجے کی محبت بھی تم سے اوجھل رہی ہو۔'' اس نے اپنی انگلیوں سے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں جی' ہونے کو تو سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن میرا بھانجا تو شادی شدہ تھا۔''

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیا شادی شدہ بندہ محبت نہیں کرسکتا۔ میں ایسی بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں۔''

''بہرحال آپ تھانیدار ہیں۔ انسان کی نفسیات سے آگاہ ہوں گے اور آپ کے پاس ایسے کئی کیس آئے ہوں گے ویسے یہ بات تو آپ کے علم میں آ ہی گئی ہوگی کہ میرا بیٹا اور بھانجا مردانہ وجاہت کے شاہکار تھے۔ اس نے یہ بات کر کے ثابت کردیا تھا کہ وہ ذہن بھی ہے۔

''بات تو آپ نے عقل مندوں والی کی ہے۔ لیکن کان کو ادھر سے پکڑو یا ادھر سے بات تو ایک ہی ہے نا۔''

''بالکل جناب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''نزاکت تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

''اب تو جناب دو ہی رہ گئے ہیں ایک بیٹی نازو اور بیٹا صداقت۔''

''آپ کی بیٹی اور بیٹے کی کیا عمر ہوگی؟''

''بیٹی تو ماشاء اللہ ستائیس سال کی ہے جب کہ بیٹے کی عمر بیس سال ہے۔''

ان سوالوں وجواب سے میں اس کو جس طرف لانا چاہتا تھا وہ اس طرف آچکا تھا۔

''دیکھو سوال تو ذاتی نوعیت کا ہے لیکن یہ موجودہ حالات میں ایک ضروری سوال ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے آگے بولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''تھانیدار صاحب یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ خود چل کر میرے پاس آگئے ہیں ورنہ تفتیش کے لیے مجھے تھانے میں بلا سکتے تھے آپ جو سوال کرنا چاہیں میں جواب

دینے کے لیے حاضر ہوں۔"
"آپ کی بیٹی کی شادی ہوگئی ہے؟"
"نہیں ابھی تک نہیں ہوئی؟"
"کوئی خاص وجہ؟"
"سب سے بڑی وجہ غریبی۔" تھانیدار صاحب ہمارے خاندان میں صرف میری بہن فضیلت بیگم زندہ ہے یعنی اختر کی ماں لیکن وہ اپنے آپ کو فضیلت بیگم کی بجائے ٹھیکیدار عثمان کی بیگم مسز عثمان کہلانا پسند کرتی ہے۔
اس کا ذہن آسمان پر ہے۔ جب ہی تو نازو کو نظر انداز کر کے عثمان کے دوست شیخ وحید کی بیٹی مہہ جبیں سے اپنے بیٹے کی شادی کردی تھی اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میرا بھائی شرافت دو بیٹیاں چھوڑ کر مرا ہے۔ اس کی چھوٹی بیٹی صاعقہ میرے چھوٹے بیٹے کی منگیتر ہے۔ فضیلت بیگم یا مسز عثمان شہر میں رہتی ہیں۔
میں نے جب نزاکت سے اس کا پتہ پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ شہر کا وہی حصہ ہے جو ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔
"اچھا...... نزاکت بھائی...... آپ یہ بات بالکل نہ سوچیں۔ کہ میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میرے لیے قابل احترام ہیں اب ہم چلتے ہیں۔ اگر کوئی بات معلوم ہو تو مجھے اطلاع دینا۔"
"دیکھیں جی...... میں خود حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی سردیاں شروع ہوگئی ہیں۔ تازہ مچھلی میں آپ کے لیے ضرور لاؤں گا۔"
میں نے اسے نرمی سے منع کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔
نزاکت سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ میرے لیے آئندہ لائحہ عمل بنانے میں معاون ثابت ہوسکتی تھی۔ ویسے میرے ذہن میں ابھی کچھ سوال تھے۔ ان سوالوں کے ٹھیک جوابات مجھے نزاکت سے نہیں مل سکتے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں لبوں تک نہیں آنے دیا تھا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ چوہدری قاسم کا رویہ بھی میرے لیے ایک معمہ تھا۔
اس نے چوہدری شفقت سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کروائے۔ ورنہ وہ نقصان میں رہے گا۔ میں ابھی اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ اس جیسے فرعون چوہدری تو میری جیب میں پڑے رہتے تھے۔
اگلی صبح میں نے اس پھانس کو ذہن سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا جو میرے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔
میں نے دس بجے کے قریب ایس پی صاحب کو فون کیا۔
دوسری ہی گھنٹی پر انہوں نے فون اٹینڈ کرلیا۔ میری آواز سن کر بولے۔
"ہاں...... بھئی خالد کیا بات ہے؟"
پہلے میں نے انہیں کیس کے متعلق بتایا کہ اب تک کیا کارروائی ہوئی ہے پھر مودبانہ لہجے میں کہا۔
"سر...... اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک سوال کروں؟"
"بالکل بھئی اجازت ہے۔"
"سر...... چوہدری شفقت صاحب کی ٹرانسفر عام روٹین کی بات تھی یا......؟"
"عام روٹین کی بات تھی...... لیکن تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ کھل کر بات کرو۔"
"سر...... چوہدری قاسم نے شفقت صاحب کو کہا تھا کہ وہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کروائیں ورنہ خسارے میں رہیں گے۔" میں نے جان بوجھ کر نقصان کو خسارے میں تبدیل کردیا تھا۔
"اوہ...... میں سمجھ گیا...... تمہارے ذہن میں جو بات ہلچل مچائے ہوئے ہے۔ اسے نکال دو...... تم کھل کر تفتیش کرو میرا تعاون تمہارے ساتھ ہوگا۔"
"تھینک یو سر......" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کے بعد میں نے اے ایس پی آفاق کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے تمام صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔
"سر...... اگر آپ اجازت دیں تو چوہدری کو ٹٹولیں۔"
"کیسے ٹٹولو گے؟"
"سر میرے خیال سے مخبر عورت مناسب رہے گی۔"
"بات تو واقعی معقول ہے لیکن......" انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر گویا ہوئے۔ "معاملہ چوہدری قاسم کا ہے اور میرے خیال میں تم چوہدری کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔"

''سر آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔''
''ٹھیک ہے مجھے فی الحال اس بات کا جواب چاہئے کہ اس نے قاسم کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کیوں کی تھی؟''
اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔
''اکبر خان......'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تیاری کرو ٹھیکے دار عثمان کے گھر جانا ہے۔''
''ٹھیک ہے سر...... لیکن؟''
''لیکن...... کیا؟''
''سر...... وہ تو زیادہ تر باہر ہی رہتا ہے۔ دولت کمانے کی دھن اس پر سوار ہے۔ جیسے وہ اس دنیا میں صرف پیسہ کمانے کے لیے آیا ہو۔'' اکبر خان کی معلومات میرے لیے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''لگتا ہے تم اس کے متعلق بہت کچھ جانتے ہو؟''
''سر...... میرا گھر اس کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں ہے۔''
''اوہ...... پھر تو تم اس کے گھریلو حالات سے واقف ہو گے؟''
''سر...... اس کی بیوی بہت گھری اور مغرور ہے پڑوسیوں سے ملنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے۔''
''خیر تم تیاری مکمل کرو...... مجھے فی الحال عثمان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی بیوی اور بہو سے کچھ باتیں کرنی ہے۔''
''ٹھیک ہے سر...... آدھے گھنٹے میں آپ کو بالکل تیار ملونگا۔''
''لیکن......''
ابھی اکبر خان کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سپاہی منظور نے آ کر اطلاع دی۔
''سر...... چوہدری قاسم آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''اس کے ساتھ کون کون ہے؟'' مجھے تجربہ تھا کہ چوہدری قاسم جیسے بندے اکیلے کہیں نہیں جاتے۔

''دو گن مین ہیں سر اور ایک مسکین سا جوان۔''
''گن مینوں کو تھانے سے باہر نکال دو اور چوہدری اور جوان کو آنے دو۔''
کچھ دیر کے بعد چوہدری گردن اکڑائے میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے ایک جوان کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ جوان سہما ہوا تھا اس کے چہرے کے تاثرات اس کبوتر جیسے تھے جو کسی باز کے شکنجے میں پھنس گیا ہو۔
لیکن جوان کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ نزاکت ماچھی کا بیٹا صداقت تھا۔
چوہدری نے یوں مجھ سے ہاتھ ملایا جیسے میری سات پشتوں پر احسان کیا ہو۔
''چوہدری صاحب خیر تو ہے اس غریب کو کیوں پکڑ کر لے آئے۔''
''جناب...... یہ تو ابھی بتاتا ہوں پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے بندوں نے میرے گارڈز کو باہر کیوں نکال دیا؟''
''اس لیے کہ یہ آپ کی حویلی نہیں میرا تھانہ ہے اور یہاں کی حفاظت آپ کے گارڈز کی نہیں میرے اہلکاروں کی ذمہ داری ہے آپ تشریف تو رکھیں۔''
وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن تشریف اس نے رکھ دی اور بولا۔
''اس کو تو آپ جانتے ہی ہونگے۔''
''بالکل یہ ماچھی نزاکت کا بیٹا ہے لیکن آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ اس کو کیوں پکڑ کر لے آئے ہیں؟''
''تھانے دار صاحب میں نے موروں کا جوڑا منگوایا ہے۔ یہ کافی دنوں سے اس کی تاک میں ہے۔ آج میرے گارڈز نے اسے حویلی کے آس پاس منڈلاتے دیکھ لیا۔ اس لیے گارڈز کو میں ساتھ لے آیا ہوں۔''
میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے اور یہ بات کسی طرح بھی حلق سے اترنے والی نہیں تھی کہ وہ گارڈز کے بغیر (اگر درمیان میں صداقت کا معاملہ نہ ہوتا) تھانے میں نہ آتا۔ اگر وہ یہ حماقت والی بات نہ کرتا تو پھر کچھ بات بن جاتی۔ لیکن کہتے ہیں نہ کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور اس لیے وہ ایسی دلدل میں دھنس جاتا ہے جو اس کا بھانڈہ پھوڑ دیتی ہے لیکن یہ سب جو میرے تھانے دارانہ تجربے نے مجھے سکھایا

تھا۔ چوہدری پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے نرم لہجے میں کہا۔
''چوہدری صاحب آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں اگر آپ کے باڈی گارڈز کی ضرورت ہوئی تو انہیں بھی زحمت دی جائے گی۔'' چوہدری صاحب کو رخصت کرنے کے بعد میں نے جوان سے کہا۔
''بیٹھ جاؤ۔''
وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔
''کیا تمہارے والد صاحب کو پتہ ہے کہ چوہدری تمہیں یہاں لے کر آیا ہے؟''
''نہیں جناب ...... وہ پریشان ہو رہے ہونگے۔''
جوان بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ گھڑی گھڑی تھوک نگل رہا تھا۔
''اب سچ سچ بتادو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''تھانے دار صاحب۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ چوہدری صاحب کی حویلی کے صحن میں بڑے خوب صورت موروں کا جوڑا پھرتا رہتا ہے۔ میں اکثر انہیں دیکھنے جاتا ہوں آج بھی میں چند لمحے کھڑا ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک چوہدری صاحب کہیں سے آ گرجے۔
''اوئے ...... مچھیرے کی اولاد ...... لگتا ہے تم میرے موروں پر عاشق ہو گئے ہو اور آج انہیں چرانے آئے ہو۔''
میں نے جلدی سے کہا۔ چوہدری صاحب۔ ''ایسی کوئی بات نہیں میں تو انہیں صرف دیکھ رہا تھا۔ چوہدری صاحب کے ساتھ باڈی گارڈز بھی تھے اور اس طرح یہ مجھے تھانے میں لے آئے۔''
''اچھا ...... چلو ...... یہ بات مان لی۔ چوہدری صاحب نے رائی کا پہاڑ بنا دیا لیکن تم نے رائی تو مہیا کی نہ۔ یعنی تم اس کے موروں کو دیکھ تو رہے تھے نا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیا یہ جرم ہے؟ تھانے دار صاحب۔'' اس نے بھول پن سے کہا۔
''ہماری نظر میں نہیں ......''
بہر حال میں نے اسے کانسٹیبل کی بیرک میں بھیج دیا اور عملے کو تاکید کردی کہ اس کے کھانے پینے کا معقول بندوبست کیا جائے اور اگر اس کا باپ آئے تو اسے عزت و احترام سے بٹھایا جائے اور اسے بھی چائے پانی پلایا جائے۔'' ابھی میں یہ سب جھنجٹ نمٹا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اکبر خان نے آ کر اطلاع دی۔
''سر تیاری مکمل ہے۔''
کچھ دیر کے بعد میں اور اکبر خان سرکاری جیپ میں بیٹھے ٹھیکے دار عثمان کی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ ہم باقاعدہ وردی میں تھے۔
کوٹھی کے باہر ایک چھوٹا سا میدان تھا ...... ہم نے جیپ وہاں کھڑی کی اور کانسٹیبل اکبر خان نے کوٹھی کے مین گیٹ کے باہر لگی برقی گھنٹی پر انگلی رکھ دی اندر کہیں دور گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ پھر کوٹھی کا ذیلی چھوٹا سا گیٹ کھلا اور ایک چھوٹے سے قد کے بندے کی شکل نظر آئی۔ اس کا سر بالکل صاف تھا اور آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ وہ ہماری وردی دیکھ کر باہر نکل آیا اور حیران نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔
بہر حال کچھ دیر کی مغز کھپائی کے بعد ہم کوٹھی کی سجی سجائی بیٹھک میں بیٹھے مسز عثمان کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ اپنے بھائی کی طرح دھان پان سی تھی۔ عمر پچاس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ رنگ گورا اور تیکھے نقش اب بھی پرکشش تھے ویسے گزرے سالوں نے اس کے حسن کو کافی ماند کر دیا تھا۔
''بی بی ...... تمہارا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا۔'' میں نے نپے تلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔
''اس کا نام نہ لیں ...... ہم نے اسے بھلا دیا ہے۔ دیکھیں ہم اس کی لاش لینے بھی نہیں گئے۔ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''
''دیکھیں ...... خاتون سیانے کہتے ہیں ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔ پھر میں ایک واقعے کی تحقیقات کر رہا ہوں۔ میں نے عورت ہونے کے ناتے آپ کی عزت کا خیال کیا ہے ......'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر خشک لہجے میں کہا۔
''میں خود چل کر آ گیا ہوں ...... ورنہ آپ اس وقت تھانے میں بیٹھی ہوتیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے۔ مجھے اختر کے متعلق باتیں کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔'' وہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''مجھے آپ کے دکھ کا احساس ہے.....'' میں نے بھی ایک دم لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔ آپ کو اختر سے کیا شکایت تھی۔''

''میں نے اس کی شادی ایک اچھے اور معزز خاندان میں کی۔ لیکن وہ تو گاؤں کا دلدادہ تھا۔ دو مہینے بعد ہی اس نے اپنی بیوی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور ناراض ہو کر گاؤں چلا گیا۔ ویسے مجھے تو ایک اور شک ہے۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں نے بھی لہجے کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔

''کیسا شک؟''

''نازو نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔''

''کیا.....'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی آپ کی بھتیجی نے؟''

''جی ہاں.....بھی تو اس نے اپنی بیوی کے ساتھ نباہ نہیں کیا اور گاؤں چلا گیا۔''

''کیا آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟''

''ان باتوں کا کوئی ثبوت ہوتا ہے؟'' اس نے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کبھی اختر نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ نازو سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''

''نہیں.....کبھی نہیں.....اگر کرتا بھی تو میں کب اسے اپنی بہو بنا کے لے آتی؟''

''کیوں.....وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے.....؟''

''تھانے دار صاحب یہ ہمارے خاندانی معاملات ہیں۔ اس لیے اس موضوع کو آپ نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہے۔''

''اچھا.....یہ بتائیں.....کیا آپ بھی گاؤں والوں کے اس خیال سے متفق ہیں کہ آپ کے بیٹے کو شیریں فرہاد کی روحوں نے مارا ہے''

''مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں.....''

''پھر آپ کے خیال میں کیا بات ہو سکتی ہے۔؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''اچھا.....اپنی بہو کو ذرا اس بیٹھک میں بھیج دیں اور خود باہر ہی بیٹھیں۔''

''وہ تو کافی عرصے سے اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ جب بیٹا ہی گھر میں نہیں تھا تو.....''

اس کے بعد ہم نے اس کی بہو کا پتہ لے کر وہاں سے واپسی کا رخت سفر باندھ لیا تھا۔ ''عجیب گورکھ دھندا تھا۔

ویسے ایک الجھن تو دور ہو گئی تھی کہ لاش لینے اختر کے والدین تھانے میں کیوں نہیں آئے تھے۔ میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ نزاکت لاش تھانے سے لے کر گیا تھا اور اسے گاؤں میں ہی دفن کیا تھا۔ اسی قبرستان میں جہاں اس کے بیٹے اور اس کی محبوبہ کی قبر تھی۔

''یہ بات بظاہر حیرانگی والی تھی کہ کوئی والدین اتنے پتھر دل بھی ہو سکتے ہیں ویسے مجھے فضیلت بیگم عرف مسز عثمان لالچی اور خود غرض لگی تھی۔ ایسی ماں اپنی اولاد کو بھی اپنی جھوٹی انا اور ضد پر قربان کر سکتی تھی۔ خیر مجھے اب امید پیدا ہو چکی تھی کہ یہ کیس جلد کسی ٹھکانے لگنے والا تھا۔

جب میں تھانے پہنچا تو میری توقع کے عین مطابق مجھے پتہ چلا کہ نزاکت کافی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ پریشان اور مضطرب لگتا تھا۔ یہ تو ایک فطری بات تھی اس کا بیٹا تھانے میں بیٹھا تھا۔

''تھانے دار صاحب آپ نے صداقت کو کیوں بٹھایا ہوا ہے؟''

''تمہارا لخت جگر چوہدری قاسم کے موروں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''جناب یہ بالکل جھوٹ ہے۔''

''پھر سچ کیا ہے۔ نزاکت علی۔'' میں ہنس پڑا تا کہ اس کی پریشانی رفع ہو۔

''یہ تو مجھے پتہ نہیں ہے البتہ ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔''

’’کیا بات ...... کھل کر بات کرو میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ کسی سے ڈرنے کی جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔
’’چوہدری قاسم ...... کوئی خطرناک کھیل‘ کھیل رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں یہ لکھ کر دے دوں کہ......‘‘
’’ہاں ...... ہاں کہو۔‘‘ میرا تجسس ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔
’’چونکہ اختر نے شیریں فرہاد کی قبروں کی بے حرمتی کی تھی اس لیے ان کی روحوں نے اسے مار دیا ہے۔‘‘
’’چوہدری نے یہ بات کب تمہیں کہی تھی؟‘‘
’’جناب آج ہی اس کا ایک بندہ یہ پیغام پہنچا کر گیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں اگر یہ کام کر دوں تو اس کا بیٹا گھر آ سکتا ہے۔‘‘
’’اوہ......‘‘ میں یہ بات سن کر ذرا حیران نہیں ہوا۔ کیونکہ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ چوہدری نزاکت کے بیٹے کو تھانے میں پہنچا کر کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ موروں کو چوری کرنے والی بات بچکانہ لگتی ہے۔ میں نے صداقت کو صرف اس لیے تھانے میں بٹھالیا کہ مقصد معلوم ہو سکے۔
’’تم بالکل بے فکر ہو جاؤ ابھی اپنے بیٹے کو ادھر ہی رہنے دو میں نے اسے ملزموں کی طرح نہیں بلکہ مہمانوں کی طرح رکھا ہوا ہے اس میں تمہاری بہتری ہے۔‘‘
بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔
’’تھانے دار صاحب ...... اب ہمارا کیا ہوگا ...... ہم چوہدری کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔‘‘
’’تم اس کی بالکل فکر نہ کرو ...... اب یہ میری دردسری ہے کہ چوہدری کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ میں جلد ہی انشاء اللہ اس کیس کو حل کر لوں گا لیکن ......‘‘ میں نے چند لمحے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا۔ پھر بولا۔ ’’تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔‘‘
’’میرے تعاون کی ......؟‘‘ اس نے زیر لب دہرایا۔ پھر گویا ہوا۔
’’کس قسم کا تعاون؟‘‘
’’اختر کے متعلق۔‘‘ پھر میں نے اسے وہ باتیں بتائیں جو اس کی بہن اور میرے درمیان ہوئی تھیں۔
’’تھانے دار صاحب ...... اب اختر اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس لیے آپ شاید میری باتوں کا یقین نہ کریں۔ لیکن جو حقیقت ہے وہ میں آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔‘‘
’’اختر نازو کو اپنی کزن سے زیادہ بہن سمجھتا تھا ...... بات دراصل اتنی سی ہے کہ اسے اپنے گھر کا ماحول پسند نہیں تھا۔ وہ گاؤں کے ماحول میں پلا بڑھا تھا۔ اسے اس دریا سے عشق تھا۔ یقین کریں ...... جب اسے بتایا گیا کہ اس کی شادی اونچی سوسائٹی کی روح رواں مہہ جبین سے ہو رہی ہے تو اس نے مجھے کہا۔‘‘
’’ماموں میں یہ شادی نہیں کروں گا۔‘‘
میں نے اسے سمجھایا۔
’’بے وقوفی نہ کرو ...... شادی کر لو ...... ورنہ تمہاری ماں نازو کو بدنام کر دے گی۔‘‘ اس نے کہا تھا۔
’’ماموں جان ...... میں نازو کو اپنی سگی بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں اس پر کوئی الزام نہیں آنے دینا چاہتا۔ اس لیے میں یہ سولی چڑھ جاؤں گا۔‘‘
میں نے سوچا یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا اور واقعی ہوا بھی ایسے ہی وہ اسے لے کر یہاں بھی کئی دفعہ آیا تھا۔ آپ کو یہ بات بھی بتا دوں کہ میرے پاس دو کشتیاں ہیں۔ کشتی رانی اختر کا محبوب مشغلہ تھا وہ نازو اور مہہ جبین کو کئی دفعہ کشتی میں بٹھا کر دریا کی سیر کو لے کر گیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ پریشان رہنے لگا۔‘‘ میں نے کئی بار پوچھا بھی لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتا تھا۔‘‘ آخر ایک دن نازو نے اسے پوچھا۔
’’اختر بھائی کیا بات ہے ......؟ آج کل آپ بہت پریشان رہتے ہیں۔ کہیں بھابھی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟‘‘ وہ نازو کے سامنے رو پڑا اور بولا۔
’’میں ایک بند گلی میں آ گیا ہوں نہ آگے جا سکتا ہوں اور نہ ہی پیچھے آ سکتا ہوں۔ مجھے مہہ جبین سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ وہ اپنے کزن کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جاتی ہے۔ ایسی بولڈ محفلوں میں جاتی ہے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ عورت گھر کی چاردیواری کے اندر ہی محفوظ رہتی ہے اس کی عزت اور توقیر گھر کے اندر ہی محفوظ رہتی ہے۔

لیکن وہ میری باتوں سے مشتعل ہو جاتی ہے اور پتہ ہے نازو بہن ایک دن مجھے یہاں تک کہہ دیا کہ مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم اتنے دقیانوسی خیالات کے مالک ہو۔ میں گھر کی چار دیواری کے اندر گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی۔ تم مجھے اپنے پیروں کی دھول بنانا چاہتے ہو۔''

''میں نے اسے پیار سے سمجھایا کہ میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں وہ میرے دل کی ملکہ ہے لیکن اب میں کیا کروں وہ اپنی ڈگر سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گا اس کے بغیر زندگی محال ہے۔''

نازو نے اسے سمجھایا۔

''اختر بھائی آپ کچھ عرصے ادھر ہی رہ جائیں۔ بھابھی کو آپ کی قدر آ جائے گی اور وہ آپ کو خود آ کر لے جائے گی۔''

''مجھے امید نہیں...... خیر فی الحال تو میرا وہاں جانے کو دل نہیں کر رہا۔''

اور...... جب بات مجھ تک پہنچی تو میں نے بھی اسے تسلی دلاسہ دیا اور ایک کشتی اس کے حوالے دی کہ وہ مسافروں کو ادھر سے ادھر پہنچاتا رہے۔ اس طرح اس کا دل بھی بہلا رہے گا اور جو آمدنی ہو اس سے اپنا خرچ چلاتا رہے۔

''یہ کتنے افسوس کی بات ہے تھانے دار صاحب لاکھوں کا ملک اور تہی دست۔''

''ہم نے اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے اپنے پاس رہنے کے لیے کہا تھا۔ ہم اسے سہارا نہ دیتے تو وہ یا تو پاگل ہو جاتا یا دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔'' وہ خاموش ہو گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی سانس رک گئی ہو۔

اس دوران میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ ہم تھانے میں بیٹھے ہیں۔ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''نزاکت علی...... تم بے فکر ہو کر جاؤ...... میں ساری بات سمجھ گیا ہوں اور تمہاری بات پر یقین بھی آ گیا ہے۔ اب صرف ایک آخری بات بتاؤ۔ جس صبح اختر کی لاش قبرستان سے ملی تھی وہ رات کو کس وقت گھر سے نکلا تھا اور کیا بتا کر گیا تھا؟''

''وہ رات کو روز ہی باہر جاتا تھا اور جب جی چاہتا تھا واپس آکر سو جاتا تھا۔ یہاں تھانے دار صاحب چوری چکاری کا تو بالکل دھڑکا یا ڈر نہیں ہے۔ اس لیے دروازہ کھلا

رہتا ہے۔''

''عجیب بات ہے۔ بہرحال آخر صبح تو آپ کو پتہ چل ہی گیا ہوگا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔''

''وہ ذرا دیر سے اٹھتا تھا اس سے پہلے کہ ہمیں کوئی شک ہوتا یہ ہولناک اطلاع ہم تک پہنچی کہ قبرستان میں اس کی لاش پڑی ہے۔''

بات وہی آپہنچیں جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ بہرحال نزاکت علی کے جانے کے کچھ دیر بعد اے ایس آفاق کی شکل نظر آئی۔ اس کی شکل نظر آئی تو مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ میں نے اسے کوئی کام کرنے کے لیے کہا تھا اور جب میں نے اس سے کام کے متعلق استفسار کیا تو اس کے جواب سے میرے اندر باہر روشنی ہوگئی۔ منجھ عورت نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ مجھے مہہ جبین سے بھی ایک چھوٹا سا انٹرویو کرنا تھا یہ اسی شام کی بات ہے۔ میں سپاہی خورشید کو لے کر مہہ جبین کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔

یہ بھی ایک بڑی کوٹھی تھی۔ اس کی بناوٹ بتا رہی تھی کہ مکینوں نے کھلا پیسہ لگایا تھا۔ ویسے ہمیں اس سے کیا غرض ہوسکتی تھی ہم جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ حاصل کرنا تھا۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے۔

یہاں میں بات کو ذرا مختصر کروں گا۔ کچھ دیر کے بعد میں اور مہہ جبین ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سپاہی کو میں نے ڈرائیور کے پاس جیپ میں چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے مجھے تعارف تو کروانا پڑا تھا۔ میں نے مہہ جبین کا بغور جائزہ لیا۔ وہ گورے چٹے رنگ کی ایک خوب صورت اور سیکس اپیل رکھنے والی عورت تھی۔

اس وقت اس نے اچھی طرح اپنے آپ کو چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور کسی طرح بھی الٹرا ماڈرن نہیں لگتی تھی۔

''بی بی مجھے افسوس ہے کہ تم اس عمر میں بیوہ ہوگئی ہو۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تھانے دار صاحب میں نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے لیکن.....'' اس نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چادر کے پلو سے خشک کرتے ہوئے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ میں بتاؤں گی آپ نے اپنے تک محدود رکھے گا اب ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ میری آپ سے درخواست ہے۔''

''تم بلاجھجک سب کچھ کہہ دو۔''

''تھانے دار صاحب جب میری اختر سے شادی ہوئی تو میری ماں اور ساس نے میرے کان میں یہ بات ڈال دی کہ اختر کو اپنے قابو میں رکھنا۔ یہ اس جاہل گنوار نازو پر مرتا ہے اس لیے میں چاہتے ہوئے بھی اختر کے قریب نہ ہوسکی۔ وہ مجھے والہانہ چاہتا تھا۔ دوسرے ہمارے گھر کا ماحول اور سسرال کا ماحول ایک جیسا تھا اختر کو یہ آزادی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لیے ہمارے درمیان کھچاؤ کی کیفیت رہتی تھی۔ پھر آخر وہ یہاں سے چلا گیا.....اور میری ساس کو یہ بولنے کا موقع مل گیا کہ دیکھو میرا کہنا پتھر پر لکیر ثابت ہوا۔'' یہاں پہنچ کر وہ چند لمحے کے لیے رکی۔ پانی کا گلاس پیا۔ پھر اس کی آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں غلط تھی۔ میں نے نازو سے مل کر یہ اندازہ لگایا کہ وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی پھر ایک دن وہ آیا۔ جب میں اپنے کزن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ اختر آگیا۔ وہ ہمیں بیٹھا دیکھ کر چپ چاپ الٹے قدموں سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اس گھر میں نہیں آیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی نادانی میں یہ دن دیکھا ہے۔ اب میں یہ چاہتی تھی کہ اختر میرے پاس آجائے۔ میں اسے دنیا بھلا دوں گی یہ خواہش بھی تھی کہ میں اس سے یہ کہہ کر منا کرلے آؤں کہ اب میں بدل گئی ہوں..... میں تمہارے رنگ میں رنگ گئی ہوں۔ مگر اف یہ انا کی دیوار۔''

میری ساس نے کہا۔ وہاں ان جاہل گنوار لوگوں کے پاس جانے کی قطعی ضرورت نہیں وہ خود گھر چھوڑ کر گیا ہے۔ خود ہی آئے گا۔ میں سوچنے لگی کہ یہ کیسی پتھر دل ماں ہے مگر مجھے چین کہاں تھا؟ غلطی میری تھی آخر میں یہاں آگئی..... یہ کہہ کر آگئی کہ جب اختر آئے گا میں بھی آجاؤں گی معافی مانگ لوں گی۔ آخر ایک دن اپنی ایک سہیلی کے تعاون سے میں اختر کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ اختر نے یہ بتا کر میرے سر پر گویا بم پھاڑ دیا کہ اسے ایک لڑکی مل گئی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ اب ہمارے راستے جدا ہوگئے ہیں۔''

میں رو پڑی۔ ندامت پانی بن کر میری آنکھوں سے بہنے لگا۔ میں نے اختر کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ جوان مرد تھا۔ میں اس کی بیوی تھی۔ وہ پگھل گیا اور کہنے لگا۔

''یہ لڑکی خود میری طرف بڑھی تھی ایک دن کشتی میں بیٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اکیلی کشتی بک کروائی تھی۔ دھیرے دھیرے میں بھی اس میں دلچسپی لینے لگا۔ اب بات کافی آگے بڑھ گئی ہے۔ اس کے پاس چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ ہے۔ جو کیسٹ چلاتا بھی ہے اس نے کیسٹ پر صرف ایک گانا بھرا ہوا ہے......''

''وگدی ندی دا پانی رانج جا کے مڑنئی آندا جا کے جیویں جوانی۔ (بہتی ندی کا پانی اس طرح جا کے واپس نہیں آتا۔ جیسے جوانی جا کے واپس نہیں آتی۔) لیکن مہہ جبین اب تم نئے روپ (جو روپ مجھے پسند ہے) میرے سامنے آئی ہو تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہوں۔ مجھے محبت تو صرف تم سے ہے میں اس لڑکی کو بھی دھوکا دیتا رہا ہوں۔''

میں واپس آ گئی...... میں اب مطمئن تھی لیکن میرا یہ اطمینان چھ دن سے زیادہ برقرار نہ رہ سکا۔ وہ خود تو نہ آیا اس کے مرنے کی خبر مجھ تک پہنچ گئی میں بہت روئی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

''تھانے دار صاحب مجھے بہت دیر ہو چکی تھی ......میرے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ میں اس کا آخری دیدار کرنے گئی تو وہاں میں روتے روتے ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی اور مجھے ڈاکٹر کی تگ و دو کے بعد دو گھنٹے بعد ہوش آیا۔ جب میں نے اس سے لڑکی کے متعلق استفسار کیا تو مخبر عورت کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔

میں بوجھل دل کے ساتھ واپس آیا۔ راستے بھر میں سوچتا رہا کہ ہم اپنی غلطی کا ازالہ کرنے میں اتنا وقت کیوں ضائع کر دیتے ہیں کہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اب میں دیر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سپاہی عظمت ہیڈ کانسٹیبل رؤف روشن کو ساتھ لیا۔ اور منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔

ہمارے منزل چوہدری کی حویلی تھی۔ کیونکہ لڑکی چوہدری قاسم کی جوان سال بہن زیبا تھی۔

چوہدری مجھے سپاہی عظمت اور ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گیا اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی بہن زیبا سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے الگ کمرے میں لے گیا اور ایک معقول رقم کی پیش کش کی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

میں نے کہا۔

''چوہدری صاحب مجھے شرمندہ نہ کریں۔ عزت اور ذلت اس باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اب بات آگے بڑھ چکی ہے۔ آپ اپنی بہن کو بھیج دیں۔''

''دیکھیں......اس نے ساری بات مجھے بعد میں بتائی تھی۔ جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ آپ رپورٹ میں یہ لکھ دیں کہ اختر کا گلا شیریں فرہاد کی روحوں نے گھونٹا تھا اور پھر وہ بانسری کی آواز۔''

''دیکھیں...... چوہدری صاحب...... مجھے سختی پر مجبور نہ کریں...... بانسری کی آواز کا راز بھی میں پا کر رہوں گا۔ آپ زیبا کو لے کر آئیں۔''

چوہدری بوجھل قدموں سے اٹھ کر چلا گیا پانچ منٹ بعد آ کر بتایا کہ زیبا حویلی میں نہیں ہے۔

مجھے غصہ آ گیا اور میں جو منہ میں آیا کہنے لگا لیکن چوہدری پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ گم صم تھا پریشانی اس کے چہرے پر نقش تھی۔ آخر میں نے کہا۔

''چوہدری صاحب میں حویلی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

''سرچ وارنٹ کے بغیر آپ یہ کام نہیں کر سکتے۔''

چوہدری نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔

میں نے جیب سے وارنٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیئے۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ دراصل مجھے پتہ تھا کہ چوہدری ٹیڑھی کھیر ثابت ہوگا۔ اس لیے مہہ جبین کی طرف جانے سے پہلے میں نے اے ایس آئی آفاق کو کہا تھا کہ وہ چوہدری کی حویلی کا سرچ وارنٹ لے آئے اور میرے واپس آنے سے پہلے پہلے اس نے یہ کام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ معاملہ چوہدری قاسم کا تھا اس لیے میں نے یہاں آنے سے پہلے ایس پی صاحب کو فون کر کے بتا دیا تھا۔

بہر حال ہم حویلی سے بے نیل و مرام واپس آئے۔

زیبا ہمیں کہیں نہیں ملی تھی۔ اب چوہدری نے اسے کہیں بھیج دیا تھا یا وہ پولیس کو دیکھ کر خود ہی ادھر ادھر ہوگئی تھی۔ ویسے چوہدری کی اکڑفوں اب ہوا ہوگئی تھی اور اس نے مجھے اس دلیل سے یہ باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ اگر اس نے زیبا کو غائب کیا ہوتا تو حویلی کی تلاشی میں اتنی رکاوٹ نہ بنتا۔

دلیل کافی وزنی تھی...... لیکن ابھی میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا اس نے اپنے کسی گرگے سے اسے قتل کروا کے لاش کہیں دفن کروا دی ہو...... عزت اور غیرت میں یہ تو ہوتا ہے اگلی صبح وہ ہوگیا جس کی بہرحال مجھے توقع نہیں تھی۔

نزاکت علی نے اطلاع بھجوائی کہ زیبا کی لاش اس کے جال میں پھنس گئی ہے۔ وہ مچھلیوں کے لیے رات کو جال لگا دیتا تھا۔

میں نے ضروری تیاری کے بعد دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور دریا پر پہنچ گیا۔ وہاں بیس پچیس لوگ جمع تھے۔ جن میں چوہدری اور اس کے چار گارڈز بھی شامل تھے۔ نزاکت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے لاش باہر نکلوا کر چارپائی پر ڈلوا دی بہرحال ہم نے ضروری کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی۔

چوہدری کے شانے جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس بار پوسٹ مارٹم کروانے کے راستے میں رخنہ اندازی نہیں کی۔ کبھی کبھی حالات ایسے آ جاتے ہیں کہ اچھا بھلا آدمی ڈھے جاتا ہے۔ بہرحال چوہدری قاسم جیسے فرعونوں کے لیے ایسے مکافات عمل آئے ہیں۔

اب سوال یہ تھا کہ آیا زیبا کو دریا میں دھکا دیا گیا تھا یا اس نے خود چھلانگ لگائی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے سے پہلے یہ عقدہ بھی حل ہوگیا۔ مجھے تھانے کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔ لیجیے آپ بھی پڑھ لیجیے۔

''میں زیبا ہمشیرہ چوہدری قاسم باہوش وحواس یہ اقرار کرتی ہوں کہ میں دریا میں کود کر خودکشی کر رہی ہوں۔ آپ کو میری لاش مل جائے گی۔ آپ اسے ہتھکڑیاں لگا کر اپنی خواہش پوری کر لیجیے گا...... میں عرصہ دو سال سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اختر مجھے پسند آ گیا۔ اس کے دل میں کیا تھا اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن میں تو اس کی دیوانی ہوگئی تھی۔ میں کافی عرصے سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ لیکن وہ پتھر بنا ہوا تھا۔ آخر کچھ عرصہ پہلے یہ پتھر موم ہوگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی کے ساتھ نہیں بنی۔ اس لیے وہ ادھر ہی آ گیا ہے...... عجیب دھوپ چھاؤں کی کیفیت تھی۔ کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے چاہنے لگ گیا ہے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی اور بیگانگی ہلکورے لے رہی ہوتی تھی۔

پھر ایک دن اس نے یہ کہہ کر مجھے آسمان سے زمین پر پھینک دیا کہ وہ مجھ سے دل لگی کر رہا تھا۔ میں اسے بھول جاؤں۔ میں نے اسے کہا۔

''اختر میں بہت آگے نکل گئی ہوں۔ اب واپسی ناممکن ہے۔ اگر اس نے دامن چھڑانے کی کوشش کی تو میں اسے مار دوں گی یا خود دریا میں کود جاؤں گی۔''

اس نے کہا۔

''لوٹ جاؤ میں اپنی بیوی کے پاس واپس جا رہا ہوں۔ وہ بدل گئی ہے اور مشرقی عورت کے روپ میں واپس آ گئی ہے۔''

میں دن رات انگاروں پر لوٹنے لگی۔ میں نے اسے پیغام بھجوایا کہ وہ آخری بار مجھے قبرستان میں ملے۔ میری شادی ناکام ہوگئی تھی پہلے ایک مرد نے مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا تھا۔ اب یہ دوسرا مرد میرے ساتھ بے وفائی کر رہا تھا۔ میں نے اختر کو مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا اگر وہ میرا نہیں بن سکتا تو کسی کا بھی نہیں بننے دوں گی۔ میں اسے اس طرح مارنا چاہتی تھی کہ یہ کسی جن بھوت کا کارنامہ لگے۔ میں نے بڑے بڑے دستانے حاصل کیے اور آخری ملاقات پر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں خود حیران ہوں کہ اس رات میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں اختر کو مار کر بھی سکون میں نہیں تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ خودکشی کرنے سے میرے بھائی کی عزت بالکل ہی تار تار ہو جائے گی۔ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ شاید اس کیس کو داخل دفتر کر دیا جائے...... دراصل میں نے اسی رات کو ہی بھائی

جان کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

پھر اس دن میری ساری خوش فہمی ہوا ہو گئی جب آپ پوری تیاری کے ساتھ حویلی میں آئے۔ میں پچھلے دروازے سے نکل کر اپنی سہیلی کے گھر آ گئی۔ یہیں بیٹھ کر میں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے سہیلی کو سب کچھ بتا دیا ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اب میرے لیے خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔

وہ گم صم ہے۔ میں اس سے درخواست کروں گی کہ یہ خط صبح جا کر ضرور پوسٹ کر دے۔ اس بات کی وضاحت ایک بار پھر کر دوں کہ مجھے بھائی جان نے نہیں بھگایا تھا بلکہ میں خود نکل گئی تھی۔ میں حویلی سے گرفتار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

قارئین...... یہ توزیبا کا خط تھا جو اس نے خودکشی کرنے سے پہلے لکھا تھا۔ اب مسئلہ رہ جاتا ہے بانسری کی آواز کا۔ یہ دو دن بعد کی رات کا ذکر ہے۔ اچانک طوفان کے آثار نمودار ہو گئے۔ میں نے کانسٹیبل اکبر خان کو اور سپاہی خورشید کو ساتھ لیا۔ اور قبرستان میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک میں تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ طوفان میں شدت آنے لگی۔ درخت لرزنے لگے۔ ہم قبروں کے اوپر پچاس سالہ بوہڑ کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ اچانک ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی نزاع کی حالت میں بانسری بجانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آواز واضح نہیں تھی کبھی یہ آواز بانسری کی لگتی اور کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہوائیں رو رہی ہوں۔

ہم پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ جس میں درخت پر چڑھنے کا سامان بھی تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اس کام کا ماہر تھا اور دلیر بھی تھا۔ اس نے وردی کے اوپر ایک ایسی بلٹ بھی باندھی ہوئی تھی جیسی آپ نے اکثر بجلی ٹھیک کرنے والوں کے لباس کے اوپر دیکھی ہوگی۔ اس میں صرف ایک چیز کا اضافہ تھا کہ اس میں ایک ایسا خانہ بنا ہوا تھا جس میں ٹارچ جلا کر رکھی جا سکتی تھی۔

ہمارے ساتھ گورکن بھی تھا۔ ہم نے اسے ساری بات بتا دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ تقریباً پانچ سالوں سے لوگوں کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی بانسری کی غیر واضح آواز کا راز معلوم کرنے کے لیے اس طوفانی رات میں پہاڑوں کا باسی اکبر خان درخت پر چڑھ رہا تھا۔ بڑا پر اسرار اور رونگٹے کھڑا کر دینے والا ماحول تھا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہزاروں روحیں بین کر رہی ہوں۔ اور اس میں بانسری کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز (جو مجھے تو غیر واضح ہی لگ رہی تھی) مزید دہشت زدہ کر رہی تھی۔ ہم پولیس والے تو ایسے ماحول کے عادی تھے۔

ہمارے پاس بڑی بڑی ٹارچیں تھیں جو ہم نے جلا رکھی تھیں۔ البتہ گورکن مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد اکبر خان نیچے اتر آیا...... وہ ہنس رہا تھا پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس ماحول سے اس کا دماغ الٹ گیا ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

''سر...... کسی ماہر کاریگر نے اس بانسری کو بڑی مضبوطی سے لوہے کے تاروں کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ میں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ بانسری کے سامنے لوہے کی ایک پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ جو ہوا کو آگے جانے سے روکتی تھی۔ اس رکاوٹ سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی۔ جیسے کوئی نزاع کے عالم میں بانسری بجا رہا ہو۔ باقی اللہ کی اللہ ہی جانے۔ پھر اس نے لوہے کی پلیٹ بھی مجھے دکھائی تھی جو وہ اتار لایا تھا۔

طوفان اب بھی جاری تھا البتہ اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ میں نے غور سے سنا۔ اب صرف ہوائیں شور مچاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ بانسری کی کسی قسم کی آواز نہیں تھی۔ آخر میں یہ بات بتاتا چلوں کہ ہمیں وہ بندہ نہیں مل سکا تھا جس نے بانسری باندھی تھی۔ بہرحال ایک بات طے تھی کہ یہ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تھا ظاہر ہے ہم نے نزاکت کے بیٹے صداقت کو چھوڑ دیا تھا۔

دائرے

یاسین صدیق

جس طرح دنیا گول ہے اس طرح ہماری زندگی بھی گول دائرے کی طرح ہے ہم اسی دائرے کے اسیر ہیں، وقت کا سفر، وقت کی حرکت کے ساتھ بہتے ہوئے دوبارہ اسی نقطے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

ایک حرماں نصیب کی روداد

وہ زندگی سے فرار ہو کر دوبارہ اسی مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے چلا تھا

ہمیں اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی کے لیے رشتے کی تلاش تھی۔ چند دن قبل میرے دوست سلمان نے مجھے کال کر کے بتایا تھا کہ اس کے جاننے والوں کو بھی اپنی بیٹی کے لیے رشتہ درکار ہے۔ ان کی بیٹی نے میٹرک کیا ہے اور قرآن حفظ کیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی میں نے سلمان سے کہا کہ انہیں اتوار کو بلا لیں اور ساتھ ہی سلمان سے کہہ دیا وہ اس دن اپنی بیگم کو بھی لے کر خود بھی آجائے۔ اسی شام مجھے میری بیوی ساجدہ نے بتایا کہ ''عظمیٰ کا رشتہ دیکھنے کے لیے اس اتوار کو صادق آباد سے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔''

میں نے اور ساجدہ نے اپنے جاننے والوں کو بتایا ہوا تھا کہ ہمیں اپنی بیٹی اور بیٹے کے لیے رشتے درکار ہیں۔ اس لیے گزشتہ چھ ماہ سے ہمارے ہاں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا ساجدہ اپنی بہن عابدہ کو فون پر کہہ رہی تھی۔ ''اس اتوار کو صادق آباد سے عظمیٰ اور اوکاڑہ سے عظیم کو دیکھنے والے آ رہے ہیں۔۔ ہاں۔ ہاں۔ دونوں ایک ہی دن آ رہے ہیں''

تھوڑے وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا ''ہاں تم اتوار کو صبح سویرے آ جانا۔ مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔''

عابدہ کا میاں نعیم اور میں ان دونوں الگ الگ فیکٹریوں میں نوکری کرتے تھے۔ میں وہاں منشی اور نعیم چوکیدار تھا میری عمر پچتالیس برس سے زائد ہو چکی تھی۔ گزشتہ پچیس سال سے میں لاہور میں کام کے سلسلے میں مقیم تھا۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ عظیم بائیس برس کا تھا اس نے ایف اے کرنے کے بعد تعلیم کے سلسلے کو خیر باد کہہ دیا تھا اور کمپوزنگ کی ایک چھوٹی سی دکان شاہدرہ میں بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ عظمیٰ نے بیس برس کی عمر میں ایم اے انگلش کر لیا تھا۔ ان دونوں سے چھوٹا بیٹا معظم ابھی میٹرک میں زیر تعلیم تھا۔ ہم میاں بیوی نے فیصلہ کیا تھا کہ جیسے ہی معقول رشتے نظر آئے بہن بھائی کی ایک ساتھ ہی شادی کریں گے۔ ہمیں بیٹی کی زیادہ فکر تھی۔ لیکن معقول رشتوں کی تلاش میں چھ ماہ گزر گئے تھے۔ اب تک مہمانوں کی آمد پر ان کی ضیافت پر اتنا خرچہ ہو چکا تھا۔ جتنے پیسوں سے شادی ہو سکتی تھی۔

میرے خاندان میں ایک دو رشتے تھے لیکن ساجدہ وہاں نہیں مان رہی تھی اس کی وجہ ان کی کم تعلیم بتائی جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بیٹی بھی پسند نہیں کرتی کیونکہ گاؤں میں وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی طرح ایک دو خاندان کی لڑکیاں بھی میری نظر میں تھیں لیکن ان کے والدین میں سے کسی کو میرے بیٹے کا کام پسند نہیں تھا۔ کسی کے خیال میں اس کی تعلیم تھوڑی تھی۔ کوئی یہ نقص نکالتا کہ

سرکاری نوکری نہیں ہے کیونکہ جو وہ کام کر رہا تھا اس سے ''اوپری کمائی'' ممکن نہیں تھی ایک طرف دھوکا، تکبر، ضد اور خود غرضی نے خاندانوں کو بکھیر کے رکھ دیا ہے۔ دوسری طرف مال و دولت کی ہوس نے اندھا کر دیا ہے۔ اب رشتے ناتے دولت کے ترازو میں تولے جاتے ہیں اور ہم اتنے زیادہ کھاتے پیتے نہیں تھے۔ پچیس سال محنت کر کے میں نے لاہور میں پانچ مرلے کا ایک پلاٹ لیا تھا۔ اس پر ابھی مکان تعمیر کرنا باقی تھے یا اپنے بچوں کو پڑھایا تھا۔

اسلام میں بیٹے اور بیٹی کا رشتہ اس کی پسند کے مطابق کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے ساجدہ سے کہا تھا کہ وہ بیٹی اور بیٹے سے ان کی پسند پوچھ لے۔ دو دن بعد اس نے بتایا کہ ''عظمیٰ ایک لڑکے کو پسند کرتی ہے۔''

پھر اس نے بلا کم و کاست مجھے لڑکے اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بتایا۔ لڑکے کا نام فیروز تھا۔ اس کے والدین صادق آباد میں رہتے تھے۔ وہ لاہور میں آٹو کیڈ کمپیوٹر کورس کرنے کے لیے آیا تھا۔ جس اکیڈمی میں عظمیٰ نے ایم اے کی تیاری کی تھی اسی اکیڈمی کے پروفیسر اقبال کے پاس فیروز رہتا رہا تھا۔ چھ ماہ قبل اپنا کورس مکمل کرنے کے بعد وہ واپس جا چکا تھا۔ اب صادق آباد میں کسی مل میں ایڈمن لگ چکا تھا۔

ساجدہ نے مجھے میری طرف ایک ورق بڑھایا۔ ''یہ فیروز کا فون نمبر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم خود ہی اس سے بات کر لو اور اسے کہہ دو اپنے والدین کو بھیجے۔ پھر ہم جائیں گے اس کا گھر بار، کام وغیرہ دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔''

پھر میں نے ساجدہ سے پوچھا۔ اپنے بیٹے سے بھی پوچھ لیتیں۔

''میں نے اس سے پوچھا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے

بولی۔

"پھر کیا کہا اس نے۔" میرے لہجے میں اشتیاق تھا

وہ کہتا ہے۔ "مجھے رانی مکھرجی کی آواز۔ کترینہ کیف کا قد۔ کاجل کی آنکھیں پسند ہیں۔"

"مطلب وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"کہتا ہے کہیں بھی کر دو شادی۔ زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو۔ بالکل ان پڑھ بھی نہ ہو۔ بہت زیادہ خوبصورت نہ ہو لیکن بدصورت بھی نہ ہو۔ زیادہ لمبے قد کی نہیں ہونی چاہئے لیکن ٹھگنی بھی نہ ہو۔ اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔"

"اسے پوچھنا تھا خاندان میں کسی لڑکی کے بارے میں" میں نے دل کی آواز کو الفاظ دئے۔

"میں نے پوچھا تھا۔" ساجدہ نے بے رخی سے جواب دیا کیونکہ اسے علم تھا میں یہ سوال کیوں کر رہا ہوں۔ میں چاہتا تھا عظیم کی شادی اس کے چچا کی بیٹی سے ہو جائے۔ یہ بات ساجدہ کو پسند نہیں تھی۔ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"پھر کیا کہا اس نے"

"زبیدہ بی بی اگر اپنا نام بدل لے۔ صفیہ نے اگر بی اے کی بجائے میٹرک کیا ہوتا کوثر کا اگر قد لمبا ہوتا اختر بی بی زیادہ موٹی نہ ہوتی تو نرگس کی اگر منگنی نہ ہوئی ہوتی۔ صائمہ کی عمر اتنی تھوڑی نہ ہوتی۔ ان میں سے کسی سے بھی اس کی شادی کر دی جاتی اسے اعتراض نہیں تھا۔" ساجدہ نے کسی حد تک بیٹے کی نقل کرتے ہوئے بتایا۔

میں مسکرا دیا۔ "یعنی اسے کوئی بھی پسند نہیں ہے۔"

اتوار کے دن بھی میری ڈیوٹی تھی میں صبح کام پر چلا گیا اور گیارہ بجے وہاں سے چھٹی کی اور گھر آ گیا۔ نعیم اور اس کی بیگم عابدہ صبح سے ہی آئے ہوئے تھے۔ سلمان نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اسے کوئی ضروری کام تھا۔ میں خوش خوش جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، سامنے ایک صوفے پر جس خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی میں حواس باختہ ہو گیا۔

یہ تو وہی تھی جس کی وجہ سے میری زندگی تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔ ایک لمحے میں میری نظروں کے سامنے ماضی کے تلخ و شیریں واقعات گھوم گئے۔ سلمی کے چہرے کا رنگ بھی مجھے دیکھ کر فق ہو چکا تھا۔ سلمی پہلے سے کافی بدل گئی تھی اس کے کانوں میں سونے کی بھاری بالیاں تھیں۔ اب جسم پہلے سے موٹا ہو چکا تھا۔ گورا چہرہ، آنکھوں پر نظر کا چشمہ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور مدبر لگ رہی تھی۔ میں تو اس کے حسن میں ماضی کی طرح کھو ہی گیا تھا کہ اسی وقت "اسلام علیکم" کی آواز سن کر میں نے خود کو سنبھالا۔

ایک چالیس، پینتالیس سال کا دبلا پتلا مرد میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ سلمی نے بھی خود پر قابو پالیا تھا۔

"میرا نام ماجد ہے۔ ہم صادق آباد سے آئے ہیں۔ یہ میری بیوی سلمی ہے" اس نے سلمی کی طرف اشارہ کیا۔

اسے کیا خبر تھی کہ اس کی بیوی کو میں کب سے اور کتنا جانتا ہوں۔

میں نے سلمی کو دیکھتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے سلام کا جواب دیا۔ بالوں میں چاندی اتر آئی تھی لیکن انداز وہی تھا۔ جس کا کبھی میں دیوانہ تھا۔

نعیم نے اوکاڑہ سے آنے والے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ایک مرد جس کا نام ناصر علی تھا اور دو خواتین اور ایک نوجوان لڑکی رشتہ دیکھنے آئے تھے۔ جبکہ صادق آباد سے صرف سلمی اور اس کا خاوند ہی آئے تھے۔

تعارف کے بعد ساجدہ، عابدہ، عظمی مہمانوں کی خدمت میں لگ گئیں۔

کھانا وغیرہ کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا سلمی چپ چپ تھی۔ لیکن اس کا خاوند ماجد بڑھ چڑھ کر گفتگو میں حصہ لیتا رہا۔ میں خود ضرورت کے مطابق ہی گفتگو کرتا رہا۔ میری کمی نعیم اور ساجدہ نے پوری کیے رکھی۔ عظیم آدھے گھنٹے کے لیے آیا اور واپس دکان پر چلا گیا تھا۔ شام چار بجے مہمان رخصت ہوئے۔

ماجد نے کہا۔ "ہم گھر جا کر صلاح و مشورہ کرنے کے بعد کال کر کے بتا دیں گے کہ آپ کب تشریف لائیں"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں۔ ہم انتظار کریں گے آپ کی کال کا"

عظمی اور ساجدہ انہیں چھوڑنے دروازے تک گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اوکاڑہ سے آنے والے

مہمانوں میں سے ناصر صاحب جو کہ لڑکی کا باپ تھا نے مجھے مخاطب کیا۔

"بھائی صابر۔ آپ کا بیٹا ہمیں پسند ہے آپ بے شک کل ہی آئیں اور ہماری بیٹی دیکھ جائیں۔ تاکہ ہاں یا ناں میں جلد فیصلہ ہو جائے۔"

میں نے آنے والے اتوار کا وعدہ کیا۔ یہ مجھے بھلے لوگ لگے تھے۔ سیدھے سادھے بناوٹ سے پاک۔ میں نے سوچا اگر ان کی بیٹی قبول صورت ہوئی تو میں عظیم کی شادی کے لیے بات پکی کرلوں گا۔ مجھے زیادہ فکر عظمی کی تھی۔ شام سات بجے نعیم، اس کی بیوی عابدہ اور ان کے بچے بھی رخصت ہو گئے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی نیند مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ پچیس برس بعد سلمی کا اچانک سامنے آنا۔ پھر فیروز کی ماں ہونا۔ میری بیٹی کا فیروز کو پسند کرنا۔ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ پریشانی سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ساجدہ کب کی سو چکی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ بے چینی سی کوئی بے چینی تھی آج جب مہمان رخصت ہو گئے تو میں نے عظمی کے چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھے تھے۔ کیونکہ جسے وہ پسند کرتی تھی اس کے والدین اسے دیکھ کر گئے تھے۔ میرے اٹھ کر ٹہلنے سے ساجدہ بھی بیدار ہو گئی۔

"کیا بات ہے صابر۔" اس نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا

"کچھ نہیں۔" میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

مجھے اس پر غصہ آرہا تھا۔ شریک سفر ساتھ اکیلا تڑپتا رہے اور ہمسفر نیند کے مزے لیتا رہے۔ اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ میرے لہجے کی بے رخی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"کچھ تو ہے۔ جو اتنی دیر سے جاگ رہے ہو۔"

"تمہیں اس سے کیا۔ تم نے تو نیند پوری کرلی ہے نا۔"

"چائے بنا کر لاؤں۔" اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔ میں خاموش ہی رہا۔ تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد دو کپ چائے لیے میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"اب بتاؤ سلمی کو کب سے جانتے ہو" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا

"شاباش۔ شروع سے سناؤ۔ اب نیند اکھڑ تو گئی ہے اور تمہیں تو ویسے ہی نیند نہیں آرہی" اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی میں نے ماضی کی خاک کریدنا شروع کر دی۔

☆☆

ہمارا خضر والا کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ شہر نزدیک ہونے کے سبب عام ضرورت کی اشیاء خریدنے کے لیے شہر جانا پڑتا۔ گاؤں میں لڑکیاں اور لڑکے ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسکول بھی صرف پرائمری تک تھا۔ گاؤں کے بچے بچیاں اسی اسکول سے پرائمری کرنے کے بعد شہر میں داخلہ لیتے تھے۔ میری کلاس میں تین لڑکیاں اور سات لڑکے تھے۔ ہم نے ایک ساتھ جماعت پنجم کو پاس کیا۔ ان پانچ سال کے دوران میں سلمی، ثمینہ اور خادم حسین کے بہت نزدیک آگیا۔ یوں کہنا چاہئے خادم حسین اور سلمی کے علاوہ میرا کسی سے لین دین نہیں تھا۔ لین دین بھی کیا تھا۔ پنسل، سیاہی، تختی پر لگانے والا پوچا، سلیٹ اور اس پر لکھنے کے لیے سلیٹی یا چاک وغیرہ۔ ان دنوں گھر سے چار آنے بڑی مشکل سے ملتے تھے ہم تفریح کے وقت مل کر جتنے پیسے بھی ہوتے ایک ہی چیز خرید لیتے اور بانٹ کر کھایا کرتے۔ ثمینہ خادم کی تایا زاد بہن تھی اس لیے وہ ہمارے گروپ کی ممبر تھی اور سلمی خادم کے پڑوس میں رہتی تھی اور ثمینہ کی دوست تھی۔ ہمارے گھر سے پندرہ گھر آگے جا کر گلی دوسری طرف مڑتی تھی۔ اس گلی کے موڑ سے تیسرا گھر سلمی کا اور چوتھا ثمینہ، پانچواں خادم کا تھا۔ اسے گاؤں کا مین بازار ہی کہنا چاہیے کیونکہ مسجد بھی اس گلی کے اختتام پر تھی عین گاؤں کے درمیان میں۔ مسجد جانے کے لیے مجھے ان کے گھروں کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا تھا لیکن اسکول جانے کے لیے ان سب کو میرے دروازے کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا۔ کیونکہ اسکول گاؤں سے باہر بنا ہوا تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جس سے گزر کر سارا گاؤں شہر جاتا تھا۔

جماعت ششم میں ہم سب شہر کے اسکول میں داخل ہوئے۔ سلمی اپنے والد چوہدری ابراہیم کے ساتھ چلی جاتی۔ کبھی بائیک پر کبھی کار پر خادم اور ثمینہ تانگے پر ایک ساتھ جاتے۔ مجھے ابو نے سائیکل لے کر دے دی میں اس پر جایا

کرتا۔ خادم اور میں ایک ہی اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ ثمینہ اور سلمیٰ کا الگ گرلز سکول تھا۔ اب بھی میں جب خادم کے گھر جاتا تو سلمیٰ سے ملاقات ہو جاتی۔ یا کبھی سلمیٰ اور ثمینہ ملنے آجاتی عصر یا مغرب کی نماز پڑھنے جاتے ہوئے یا آتے ہوئے بھی کبھی کبھار وہ نظر آجاتی۔ وقت گزرتا رہا۔ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں سلمیٰ سے محبت کرتا ہوں اور شاید بہت بچپن سے محبت کرتا ہوں۔ اس وقت سے جب اس لفظ کے معنی سے بھی آشنا نہیں تھا۔ اب اس سے ملنے اسے دیکھنے، باتیں کرنے کی بے چینی رہنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں میں، دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے۔ ذومعنی فقروں کے تبادلے ہوتے رہتے۔ جماعت ہشتم میں اس نے نیلے رنگ کا ہاتھ سے کاڑھا ہوا رومال دیا جس کے ایک کونے میں میرا نام "صابر" لکھا ہوا تھا ساتھ دل بنا ہوا تھا۔ اس میں سے ایک تیر بھی گزارا گیا تھا۔ تھوڑا وقت گزرا تو سلمیٰ سے ملنا مزید مشکل ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو سلمیٰ سے ملنا، باتیں کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن اب پہلے جیسی ملاقات نہ رہی۔

ان دنوں محمد رفیع کا ایک گانا بڑا مشہور ہوا تھا۔

"ریشماں جوان ہوگئی۔
باغوں میں بہار آئی تو۔ گزرے وہ دور سے۔ ڈرے ملاقات سے۔ باتوں ہی باتوں میں ایک چھوٹی سی بات۔ داستان ہوگئی۔"

اس عمر میں سب کے ساتھ ہی شاید ایسا ہوتا ہے۔ میں بھی سمجھتا تھا محمد رفیع، احمد رشدی، لتا، مہدی حسن اور نورجہاں نے اپنے گانے مجھے سامنے رکھ کر گائے ہیں۔ ہر گانا ایسا لگتا جیسے میرے دل کی آواز ہو۔ یہ نغمات اب بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

"تم نے دی آواز تو لو میں آگیا۔ عمر ہی ایسی ہے یہ تم اور کسی سے پوچھ لو۔ ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے ہر ایک کو۔۔ یا۔ ملتے ملتے حسین وادیوں میں جو دل کھو گیا تو کیا کرو گے۔ یا جب ہم جواں ہوں گے جانے کہاں ہوں گے۔۔ وغیرہ"

اب ہم سب پر کچھ سماجی، کچھ اخلاقی پابندیاں لگ گئیں لیکن یہ گاؤں تھا۔ ملاقاتیں ہو ہی جاتیں۔ ایسے ہی ہم نے میٹرک کر لیا۔ خادم ایک ویلڈنگ کی دکان پر کام سیکھنے لگا۔ اس کا پروگرام سعودیہ جانے کا تھا۔ ثمینہ اور سلمیٰ نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ میں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ اب ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھنے شروع کر دیئے۔ یوں آدھی ملاقات ہونے لگی۔ پہلے تو ہم خود ہی جاتے آتے سب سے نظریں بچا کر خط ایک دوسرے کو دے دیتے۔ پھر چھوٹے بہن بھائی اس کام کے لیے استعمال ہونے لگے۔

اس دور کے لکھے خط آج پڑھیں تو کبھی ہنسی آتی ہے کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ چند ایک خط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ بہت سے میں نے ضائع کر دئیے تھے۔

جب سلمیٰ سے ملے اسے دیکھے تین ماہ گزر گئے تو بے چینی و بے قراری برداشت سے باہر ہوگئی۔ میں نے اسے ملنے کا خط لکھا۔ اس نے مجبوریاں بتائیں۔ اب اسے پردے کا حکم دے دیا گیا تھا کیونکہ وہ جوان ہو چکی تھی۔ کہیں آنا جانا بند ہوگیا۔ ایک سوال اٹھا "کیا یہ بچپن کا پیار یوں ہی کھو جائے گا"۔ اب ہمارے خطوں میں شادی کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ جو بڑی پریشان کن تھیں۔ ہم سندھو جٹ اور وہ گوندل تھے۔ ہمارا فرقہ ان کے فرقے سے الگ تھا۔ بلکہ ایک دوسرے کو کافر و گستاخ قرار دیتا تھا۔

(قارئین یہ ایک زمینی سچائی ہے۔ سچائی سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔)

اس کے والد گاؤں کے بڑے زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ہمارے پاس ان سے بیس گنا کم زمین تھی۔ سلمیٰ کے والد چوہدری ابراہیم گزشتہ الیکشن میں ایم پی اے کا الیکشن لڑ چکے تھے اور ہار گئے تھے۔ شہر میں ان کی آڑھت کی دکانیں تھیں اور ایک پٹرول پمپ بھی۔ گاؤں میں زیادہ زور دو فرقوں کا تھا۔ اس وجہ سے دو ہی مساجد تھیں گاؤں میں۔ یہ ذات پات۔ قوم و فرقہ الگ الگ ہونا۔ ان سب باتوں کا ہمیں پہلے تو علم ہی نہیں تھا۔ اب خطوط میں انہی باتوں کا ذکر ہوتا۔

ہمارے اس دور کے ایک دوسرے کو لکھے گئے خطوں میں یہ سب کچھ ہوتا۔ اپنی ذات بدلنا تو انسان کے بس میں ہی نہیں ہے۔ اسلام میں ذات پات کا نظام بھی نہیں ہے

لیکن مسلمان ہونے کے باوجود ہم سب کہیں نا کہیں ان باتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ بلکہ گاؤں میں تو رشتہ کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے یا لڑکی کے آباو اجداد ہندوستان کے کس علاقے سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ یہ سب پریشان کن باتیں تھیں۔ دوسری طرف اسے دیکھنے ملنے کی بے قراری بڑھنے لگی۔ یہ ہی حال اس کا تھا۔ پھر ایک دن اس نے لکھا کہ رات کو میں اسے ملنے اس کے گھر آجاؤں۔ سچ سچ ہی ہوتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جس دن کا سلمی نے مجھے ملنے کا کہا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد میں دیر تک بیٹھا رہا۔ اور اللہ سے دعا کرتا رہا۔ اس دن بادل چھائے ہوئے تھے۔ رات ٹھیک نو بجے میں دھڑکتے دل سے ان کے گھر داخل ہوا۔ حسب وعدہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دیوار سے لگ کر میں اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ اپنے مال مویشی باندھا کرتے تھے اسی کمرے کا سلمی نے کہا تھا۔ یہ کمرا دروازے سے تھوڑی ہی دور تھا۔ سامنے بڑا سا صحن تھا۔ اور دوسری طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ صحن میں دو درخت لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک نیم کا تھا۔

جس کمرے میں کھڑا تھا۔ وہاں بدبو اتنی تھی کہ سانس لینا دشوار تھا۔ یہ بدبو بکری کی مینگنیوں اور پیشاب کی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں مشہور گانا گنگنایا۔

''دل بر جانیاں اب تو آجا''

پھر میں نے دیوار سے لگ کر باہر جھانکا۔ کتے کی کھوں کھوں سن کر واپس کمرے میں آنے میں عافیت جانی۔ وہ اسی کمرے کے دروازے سے تھوڑا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

آج صبح سے ہی موسم خراب تھا۔ میں شام نو بجے سے اس کمرے میں قید تھا۔ میں جب آیا تھا تو بادل چھائے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا موسم بدلتا چلا گیا۔ اب بجلی چمکنے لگی۔ دوسری طرف بدبو ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ کیونکہ اندر حبس بڑھ گیا تھا باہر موسم خوشگوار تھا سلمی کو آنے میں اتنی دیر ہو گئی تھی یا میں ہی وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ پھر ایک خیال آیا کیا خبر وہ سو گئی ہو۔ انہی باتوں کو سوچتا ہوا وقت لمحہ لمحہ کر کے گزر رہا تھا۔ باہر بارش ہونے لگی۔ ایک طرف بدبو دوسری طرف مایوسی کے خیالات اور باہر بارش۔ مجھے متلی آ گئی۔ میں نے ایک کونے میں قے کی۔ اب کمرے کیا اسے کوٹھری کہنا چاہئے میں بدبو میں مزید اضافہ ہو گیا۔ گھپ اندھیرے میں نے گھڑی کا چھوٹا سا بلب جلا کر وقت دیکھا۔ پونے بارہ ہو چکے تھے۔ ڈراؤنی کالی رات، موسلا دھار بارش اور دل دہلا دینے والی کڑکتی بجلی۔ ایسے میں اچانک جب میں بالکل مایوس ہو چکا تھا وہ برستی بارش میں کمرے میں آ گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ بازوں میں سمٹی، اسے سونگھا تو میرے اردگرد خوشبو پھیل گئی۔ اس کے کنوارے جسم کی خوشبو میں کمرے کی بدبو کا احساس تک نہ رہا۔

میری زندگی کی حسین راتوں میں سے یہ پہلی رات تھی جسے زندگی بھر نہ بھول سکا۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

''اب کیا ہوگا۔ ایسے کب تک ملتے رہیں گے۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''شادی پر تو ماں باپ نہیں مانیں گے۔'' میں نے اس سے زیادہ پریشانی میں کہا۔

''تم اپنے ماں باپ کو بھیجو تو سہی۔'' سلمی نے ہزاروں بار کہی بات ایک بار پھر کہہ دی۔

''کاش بچپن ہی رہتا۔ نہ ذات پات تھی۔ نہ ملنے پر پابندی تھی۔'' میرے لہجے میں حسرت تھی

اس نے مجھے اپنی باہوں میں بھر کر جواب دیا۔

کیڈا چنگا یاہ او نکے بال ودے راہوں ہا۔
ساری زندگی تیڈے نال ودے راہوں ہا۔
(کتنا اچھا ہوتا ہم بچے ہی رہتے۔ تو ساری زندگی تیرے ساتھ ساتھ رہتے)

باہر بارش برستی رہی، اندر ہم محبت میں بھیگتے رہے۔ نہ ختم ہونے والی باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جن کو اب سوچیں تو ہنسی آتی ہے۔ کبھی بجلی کڑکتی کبھی بادل آپس میں ٹکرا کر گرجتے۔ لیکن رات کے مقدر میں لکھا ہے گزر جانا۔ چار بجے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی جب میں ان کے گھر سے سنبھل سنبھل کر باہر نکل رہا تھا۔ گلی میں پانی کھڑا ہوا تھا۔ میرے چلنے سے شڑاپ شڑاپ کی آواز آتی رہی۔ میں چوروں کی طرح اپنے گھر کی طرف بڑھتا رہا

۔بیٹھک کو میں نے باہر سے بند کیا تھا۔اس کی کنڈی کھولی اور گیلے لباس سمیت بستر میں جا گھسا۔ساری رات کھڑے کھڑے گزار دی تھی۔تھکاوٹ سے برا حال تھا ۔جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

☆☆

محبت میں سرشار وقت گزر رہا تھا۔ایک برس مزید گزر گیا۔اس دوران لاکھ کوشش کے باوجود ہماری محبت زبان زد عام ہوگئی۔سچ کہتے ہیں محبت خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔اس ایک برس میں ہماری اسی کمرے میں مزید تین ملاقاتیں ہوئیں۔ہم نے ایک دوسرے کو درجنوں خط لکھے ۔عصر اور مغرب کی نماز پڑھنے میں مسجد جایا کرتا تھا۔جاتے ہوئے یا آتے ہوئے سلمٰی کا دیدار ہو جاتا۔ہم مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے۔آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی میرے قدم آہستہ ہو جاتے۔خاندان میں ہماری اس معصوم سی محبت کی پیارے باتیں ہوتی رہتیں۔میرے اپنے ہی میرے خلاف تھے ۔ایک تو میری آپی کو اس پر اعتراض تھا۔اس کا کہنا تھا۔"یہ غلط راستہ ہے۔زندگی برباد کرلو گے۔"

ابو نے بیس سے زیادہ مرتبہ تنبیہ کردی تھی کہ"بندے بن جاو تعلیم پر توجہ دو"۔تیسری مخالف ہستی بھائی تھا اس کی مخالفت کی وجہ فرقہ تھا۔وہ سلمٰی کے فرقے سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن مجھے کسی بھی فرقے سے نفرت نہ تھی۔

چاچو نے کئی ایک بار مجھے پیار سے سمجھایا تھا۔

"صابر یہ لڑکیوں کی محبت انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔"

اصل میں وہ خود بھی محبت گزیدہ تھے۔سنا تھا انہوں نے بچپن میں ایک رخسانہ نامی لڑکی سے محبت کی تھی اور ناکامی کا زخم سہا تھا۔اب تک کنوارے تھے۔

ایک دن سلمٰی نے اپنے دروازے میں کھڑے ہوئے مجھے سلام کیا تو اس کے بھائی سلیم نے دیکھ لیا۔شک تو پہلے ہی تھا۔اب اس نے خود دیکھا تھا۔بات ایک قدم مزید آگے بڑھ گئی۔اس نے اپنے والد سیٹھ ابراہیم کو بتایا۔جس نے مجھے وارننگ دے بھیجی۔

"تم باز آجاو۔میں پیار سے سمجھا رہا ہوں۔یاد رکھنا یہ پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔اب تمہیں اس گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تو الٹا لٹکا دوں گا۔"

میں نے پیغام لانے والے مہر خالد سے کہا سیٹھ ابراہیم سے کہنا

"اپنی بیٹی کو روکے۔قصور برابر کا ہے۔گاوں سیٹھ ابراہیم کا نہیں ہے۔جو مجھے کسی گلی سے روک سکے"۔

مہر خالد نے سمجھایا۔"مجھے علم ہے قصور صرف تمہارا نہیں۔اس کی بیٹی کا بھی ہے۔وہ بدنامی نہیں چاہتا۔اس لیے تو مجھے بھیجا ہے۔تم اس کی بات مان لو اس میں تمہارا بھلا ہے۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔

لیکن نہیں ابھی تو عشق کے امتحان بہت پڑے تھے ۔اس دوران سلمٰی کے ساتھ جو ہوتا رہا میں اس سے بے خبر رہا۔میرا ایف اے کا رزلٹ آیا میں کالج گیا۔رزلٹ کارڈ لیا میں نے 821 نمبر حاصل کیے تھے خوشی خوشی اپنی سائیکل پر واپس آرہا تھا۔جس جگہ مین سڑک سے ہمارے گاوں کا لنک روڈ ملتا تھا وہاں دو بائیک سوار کھڑے تھے ۔میں ان کے پاس سے گزرا۔ابھی ایک فرلانگ کا ہی سفر طے کیا ہوگا کہ وہ دونوں میرے دائیں بائیں بائیک چلانے لگے۔ایک کی عمر تیس یا بتیس سال ہوگی۔تلوار مارکہ مونچھیں تھیں اس کی اس نے بائیک میری سائیکل سے ٹکرانے کی کوشش کی۔میں بڑی مشکل سے اس ٹکراو کو روک سکا۔اس کوشش میں دوسری طرف والے موٹر سائیکل سوار سے جا ٹکرایا جس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی اسے میں نے اور میرا بائیک جس سے ٹکرایا تھا اس نے مجھے ایک ساتھ گالی دی تھی۔میں نے سائیکل روک دی۔انہوں نے بھی اپنی اپنی بائیک کو اسٹینڈ لگایا اور میری طرف بڑھے ۔ابھی تک میں انہیں کوئی عام راہ گیر سمجھ رہا تھا جنہیں آگے کسی اور گاوں جانا ہوگا۔لیکن جب انہوں نے بائیک روک کر میری طرف بڑھنا شروع کردیا تلوار مارکہ مونچھوں والے نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا،الو کے پٹھے۔گالی کس کو دی۔"

دوسرا کہنے لگا۔"چوہڑے تو خود کو سمجھتا کیا ہے۔مجھ سے سائیکل کیوں ٹکرایا"

"غلطی تیری ہے"میں نے کہا۔

وہ تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔اسی لمحے میرے دماغ نے کام کیا کہ یہ مجھ سے پنگا لینے کے لیے ہی رکے ہوئے تھے۔اس موڑ پر اور انہوں نے جان بوجھ کر

مجھ سے ایکسیڈنٹ کرنے کی کوشش کی۔ یہ صرف لڑائی کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک لمحے کو میری ذہن میں مہر خالد کی شکل گھوم گئی۔ جسے میں نے کالج سے نکلتے ہوئے سڑک کی دوسری طرف کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کسی بائیک سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کوئی اشارہ بھی کیا تھا لیکن رزلٹ کی خوشی میں سرشار میں نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اب یہ سب یاد آیا تو میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''بے وقوف تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟'' اس کے لہجے میں شدید غصہ تھا

میں جو صورت حال کو سمجھ چکا تھا کہ کرائے کے غنڈے تھے اور انہیں سیٹھ ابراہیم نے بھیجا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''آپ کی غلطی ۔۔۔۔'' اس نے میرا گریبان پکڑ لیا ''غلطی کے بچے۔۔''

اس کے بعد دونوں مجھ پر پل پڑے۔ میں نے شدید مزاحمت کی لیکن وہ دو تھے اور مجھ سے عمر میں بھی زیادہ، تجربے میں بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے مجھے دھنک کے رکھ دیا۔ وہ مجھے مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

''عشق اچھے اچھوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ تم کس کھیت کی مولی ہے؟''

''خود کو بڑا ہیرو سمجھتے ہو''

''اب ہم تیری ٹانگیں توڑ دیں گے۔ پھر دیکھیں گے کیسے جاتا ہے ساجن کی گلی میں''

انہوں نے مجھے گھونسوں، مکوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔

میرے ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ جیسے زندگی کا آخیر آ گیا ہو۔ اس ایک لمحہ کی کیفیت میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یار دو یا مر جاو کا خیال نہ جانے کیسے آیا تھا۔ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ ان کو شکست دینے کے سوا راستہ نہیں۔ آخری سانس تک لڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں نے اپنے سامنے والے کو دیکھا۔ دھندلا سا نظر آیا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دوسرے نے پیچھے سے میرا ایک بازو پکڑا ہوا تھا۔ میں یک دم نیچے بیٹھ گیا۔ سامنے والے نے جھک کر دوبارہ میرا گریبان پکڑنا چاہا۔ میں نے یک دم پوری پوری قوت سے کھڑے ہوتے ہوئے اس کے منہ پر ٹکر دے ماری۔ میرا سر اس کی

تھوڑی سے ٹکرایا۔ ٹکر اتنی اچانک اور شدید تھی کہ تلوار مار کہ مونچھوں والا پیچھے الٹ گیا۔ میرا ڈوبتا ہوا شعور اس کامیابی پر دوبارہ بیدار ہونے لگا۔ اسی وقت پیچھے جس نے میرا بازو پکڑا ہوا تھا۔ میرے بازو کو پوری قوت سے مروڑ دیا۔ میری ایک چیخ کے ساتھ کڑک کی آواز آئی اور بازو کا کہنی سے جوڑ اکھڑ گیا۔ میں زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ درد نا قابل برداشت تھا۔ دور تک سڑک ویران پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے ٹوٹا ہوا بازو پکڑا اور بڑی مشکل سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت جس نے میرا بازو توڑا تھا وہ دوسرے ساتھی پر جھکا ہوا تھا۔ جو بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کا منہ خون سے بھر گیا تھا۔ دونوں موٹر سائیکل اور سائیکل ہماری اس لڑائی میں گر چکے تھے۔

''اٹھ مجید اٹھ۔۔''

اس نے اپنے ساتھی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ اسے اب یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ کوئی آ گیا تو وہ بے ہوش ساتھی کو کیسے لے کر فرار ہو گا۔ لیکن وہ اپنا ہوش کھو چکا تھا۔ اسی وقت ایک ٹریکٹر ٹرالی شہر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ میں بڑی تیزی سے ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ ایک ایک قدم پر میری جان نکل رہی تھی۔ ایک دو منٹ میں ٹرالی ٹریکٹر قریب آ پہنچا۔ میں ان سے مدد لینے سڑک کے بیچ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے ٹریکٹر روک دیا۔ ہمارے ہی گاوں کا ٹریکٹر ٹرالی تھا۔ شبیر ڈرائیونگ سیٹ سے چھلانگ لگا کر اترا۔ میں نے جلدی جلدی اسے سب بتایا۔

''دو بدمعاشوں نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔ میرا بازو ٹوٹ گیا ہے''

شبیر اور میں نے دیکھا۔ دوسرے بائیک سوار نے اپنے ساتھی کو اسی حالت میں چھوڑا اور بائیک اسٹارٹ کر لی۔ شبیر میری بات سن کر اس کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ اس وقت تک گیئر لگا چکا تھا۔ دوسرے لمحے موٹر سائیکل شبیر اور میرے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے بعد ہم جائے وقوع پر پہنچے۔ تلوار مار کہ مونچھوں والا بے ہوش تھا۔ اس کا بائیک اور میری سائیکل پاس پاس پڑے تھے۔

''یہ کون تھے۔ ان کی تم سے کیا دشمنی تھی۔'' شبیر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں کون تھے''
میں نے اس کے بعد شبیر کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک تانگہ پہنچ گیا۔ جس میں ہمارا پڑوسی ساون سوار تھا۔ ایک دو موٹر سائیکل سوار بھی آ گئے۔ اب ان سے شبیر باتیں کر رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل پر مجھے دوسرے پر بے ہوش مجید کو شہر کے اسپتال لایا گیا۔ شبیر میرے ساتھ تھا۔ جس سے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔

تربیت یافتہ فرسٹ ایڈ کے ملازمین دوڑ کر آئے اور مجید کو اٹھا کر لے گئے۔ ایک ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹول کر بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ جلد ہوش میں آ جائے گا۔ دوسرے ڈاکٹر نے مجھے چیک کیا۔ تین گھنٹوں بعد ہمارے گاؤں سے بہت سے افراد اسپتال میں تھے۔ جن میں میرے والد صاحب بھی تھے۔ اس وقت تک میرا جوڑ بٹھا کر بازو باندھ دیا گیا تھا۔ مجید ہوش میں آ چکا تھا اس کی زبان کٹ گئی تھی اور سامنے کے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ میں بار بار وہی سب دہراتا رہا۔ لیکن اصل بات کسی کو نہیں بتائی۔ پولیس آئی میرا بیان قلم بند کیا۔ گاؤں کے چند افراد کا گواہی میں نام لکھا۔ شبیر اور ساون کا میں نے خود لکھوایا۔ ہمیں گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

☆☆☆

دس پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اپنی بیٹھک میں سو رہا تھا۔ موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''دروازہ کھولیں میں ہوں سلمیٰ۔''

حیرت اور خوشی کے سبب میں سکتے میں آ گیا۔

''سلمیٰ۔'' میری آواز میں بے یقینی تھی۔

''صابر دروازہ کھولیں۔'' سلمیٰ کی تیز سرگوشی گونجی۔

میں نے ننگے پاؤں اٹھ کر دروازہ کھولا۔ میرے سامنے سلمیٰ کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس آئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر پوچھا۔

''تم آدھی رات کو۔۔ خیر ہے۔''

اس نے ایک ہاتھ میں کلہاڑی پکڑی ہوئی تھی اسے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں خیر ہی ہے۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔''

ایک لمحے کو اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے کہا۔

''دروازہ ٹھیک سے بند کر لیں'' میں نے ایسا ہی کیا۔

گلی سنسان تھی۔ میری سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ دل دھڑکنوں سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''صابر مجھے تم سے محبت ہے۔۔ مجھے لے کر بھاگ چلو۔ ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ ابو تمہیں قتل کروا دیں گے۔۔ اس شہر سے دور بہت دور چلتے ہیں''

میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہا۔ وہ سینے سے لگ گئی۔ خاموشی پورے کمرے میں قفل ڈالے ہوئے تھی۔ ہمارے دل کی دھڑکیں بول رہی تھیں۔

میری نظروں کے سامنے گھروں سے بھاگ کر شادی کرنے والوں کے انجام گھومنے لگے۔ ہمارے بھاگ جانے سے میرے گھر والوں پر جو قیامت گزرتی اس کا تصور کر کے میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''نہیں میں اپنے گھر والوں کو اپنی محبت کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''میں تمہارے لیے اپنا گھر چھوڑ سکتی ہوں تم کیوں نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے خود سے الگ کر دیا لیکن رہی میرے قریب ہی۔ میں نے دوبارہ اسے خود سے مزید قریب کیا اور کہا۔

''صبر کرو ابھی وقت نہیں آیا۔۔ پہلے مجھے انتظام کر لینے دو''

''پھر وقت نہیں آئے گا۔ یہی وقت ہے۔ میرے پاس پچاس ہزار روپے کے زیور ہیں'' اس کی آواز سرگوشی سے بلند ہو گئی۔

ایک لمحے کو میں نے سوچا وہ ٹھیک کہتی ہے۔ دوسرے لمحے خیال آیا

''کل میرے اولاد ہو گی اس کو سب بھاگی ہوئی ماں کی اولاد کہیں گے۔''

ہمارے بھاگ جانے سے میرے والدین، سلمیٰ کے والدین کی کتنی بے عزتی ہو گئی۔ چوہدری ابراہیم کی معاشرے میں کتنی عزت ہے سب خاک میں مل جائے گی

۔وہ تو اب ایم پی اے کا الیکشن لڑنے کا سوچ رہا ہے۔اس بدنامی کو کیسے سہے گا۔پھر سلمی کے بھائی بہن،میرے بھائی بہن اس معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں رہیں گے۔سلمی اب جذباتی ہو رہی ہے۔وقتی ابال ہے وقت سے اتر جائے گا۔میں اس کے ساتھ وقت گزارنے لگا ۔ایک وقت ایسا آیا کہ میں اپنے آپ میں نہ رہا۔اسی وقت اس نے مجھے روک دیا۔

''صبر کرو۔۔پہلے مجھ سے شادی کرو۔میں اتنی سستی نہیں ہوں''

''میں شرمندہ ہوں۔شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں لیکن میں تمہیں بھگا کر نہیں لے جاوں گا۔''

''یعنی تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔''

''محبت کا ثبوت کیا یہی ہے کہ میں تمہیں،تمہارے ماں،باپ کو،بہن بھائیوں کو،اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو رسوا کر دوں۔''

جذبات سے میری آواز بلند ہوئی اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ کوئی بیٹھک کے دروازے پر موجود ہے ۔میں ایک دم خاموش ہو گیا۔سلمی نے بھی یہ بات محسوس کی اور مجھے دیکھنے لگی۔ہم دونوں خاموش ہو گئے۔سلمی نے زمین پر سے کلہاڑی اٹھالی۔

میں خاموش رہا۔۔۔وہ خاموش رہی۔۔۔۔سناٹا پھر طاری ہونے لگا۔بڑی دیر گزر گئی۔باہر کوئی کھٹک نہیں ہوئی

۔

''میں چلتی ہوں۔یاد رکھنا یہ وقت پھر نہیں آئے گا ۔''ایک لمحے کو وہ خاموش ہوئی،مجھے دیکھا اور بولی

''مجھے تم صرف اسی راستے پر چل کر مل سکتے ہو۔کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔اس نے خود ہی کنڈی کھولی۔اور باہر نکل گئی۔اس وقت مجھے ہوش آیا میں اس کے پیچھے لپکا۔میں اپنی بیٹھک کی دیوار سے ٹیک لگائے اسے گلی میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔آخر رات کے اندھیرے نے اسے نگل لیا۔

☆☆

میں نے سلمی سے اس ملاقات کا کسی کو نہیں بتایا لیکن یہ بات گاوں میں پھیلتی چلی گئی۔بعد ازاں اس راز سے پردہ اٹھا کہ اس رات دروازے پر کون تھا۔ہوا یہ تھا کہ ان دنوں ملک بھر میں ہتھوڑا گروپ کی بڑی دہشت طاری تھی۔اخبارات سنسنی خیز خبروں سے بھرے ہوتے۔یہ ہتھوڑا گروپ رات کو کسی گاوں،ڈیرے پر سوئے ہوئے افراد پر حملہ آور ہوتے اور ہتھوڑے سے ان کا سر کچل دیتے ۔پنجاب میں ان کا خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔ہمارے قریبی گاوں میں چند دن قبل ایک واردات ہو چکی تھی۔یہ ڈاکو نہیں تھے،کچھ لوٹتے بھی نہیں تھے۔بس لوگوں کو ہتھوڑے سے قتل کرتے تھے۔اخبارات میں ان کی خبریں تھیں کہ یہ صرف دہشت پھیلا رہے ہیں۔ہمارے گاوں میں خفیہ طور پر چند نوجوانوں کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جو گاوں میں گھوم کر چوکیداری کرتے تھے۔اس رات بھی پہریداروں کی اس ٹولی نے سلمی کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔محمود جٹ نے سلمی کا پیچھا کیا اور مجھ سے اس کا رات کے اندھیرے میں ملاقات کرنے کا احوال خوب نمک مرچ لگا کر سینہ بہ سینہ گاوں میں پھیل گیا۔ہر ایک نے اس میں اضافہ کیا۔جتنے منہ اتنی باتیں بن گئیں۔کہا جا سکتا ہے کہ رائی کا پہاڑ بنا دیا گیا۔لوگوں نے ہنسی اڑائی،اوباش، بدچلن،آوارہ لڑکی کہا۔

☆☆

پھر زندگی میں وہ کالی منحوس رات آئی۔ہم سب اپنے گھر میں بے خبر سوئے ہوئے تھے۔اچانک ایسے لگا جیسے کسی دشمن کی فوج نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا ہو۔رات کے دو بج رہے ہوں گے جب چھ سات افراد گھر کی دیوار پھلانگ کر گھر میں کودے۔

انہوں نے سب گھر والوں کو ایک جگہ جمع کیا۔مجھے ان میں سے الگ کیا گیا۔پھر ان میں سے دو افراد نے مجھے ڈنڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ہم چیختے رہے،خدا کا واسطہ دیتے رہے۔ان وحشی درندوں نے ،بھوکے بھیڑیوں نے ہم سب کو جس میں میری ماں،میرا باپ ،بہن اور چھوٹا بھائی شامل تھا تشدد کا نشانہ بنایا۔انہوں نے خاص طور پر مجھ پر بہت تشدد کیا۔امی،ابو پر اس لیے کہ وہ مجھے بچانے آگے آ گئے تھے۔اسی طرح پڑوسی بیدار ہوئے تو ان کو بھی ایک جگہ جمع کر لیا گیا۔تین افراد نے اسلحہ کے زور پر سب کو ایک جگہ جمع کیا باقی کمروں میں گھس کر آگ

لگاتے رہے۔ان کے بے پناہ تشدد کے سبب سے میرے سارے کپڑے خون سے تر ہو گئے تھے۔میرے جسم کا پور پور پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔اپنی طرف سے انہوں نے میری ٹانگیں توڑ دی تھیں۔امی،ابو،میرا بھائی بھی شدید زخمی تھے۔ہمارے پڑوسی مجید صاحب اور اس کی فیملی کو بھی زودکوب کیا گیا۔ان کے بیدار ہونے شور کرنے کے سبب حملہ آوروں نے جلدی سے دونوں گھروں کو آگ لگائی۔اور شہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔چند منٹ میں یہ بات گاؤں میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

ایک طرف آگ بجھائی جا رہی تھی دوسری طرف گاؤں کا واحد ڈاکٹر زخمیوں کی مرہم پٹی اور انجکشن لگا رہا تھا تیسری طرف چند افراد کی ٹولی ان حملہ آوروں کی تلاش میں روانہ ہوئی۔جن کا کھرا گاؤں سے شہر جانے والی سڑک تک جاتا تھا۔انہوں نے اسکول کی دیوار کے ساتھ کوئی گاڑی کھڑی کی تھی وہاں سے پیدل آئے تھے۔اور اپنا کام کرنے کے بعد غائب ہو گئے تھے۔کون تھے؟اس راز سے کبھی پردہ نہ اٹھ سکا۔

دوسرے دن اخبار میں خبر تھی۔

نامعلوم افراد نے گزشتہ شب دو سے زائد گھروں کو آگ لگادی اور اہل خانہ کو تشدد کا نشانہ بنایا۔تفصیل کے مطابق نامعلوم افراد جن کی تعداد سات بتائی جاتی ہے گزشتہ شب دو گھروں سے مکینوں کو باہر نکال کر تشدد کا نشانہ بنایا اور بعدازاں گھروں کو سامان سمیت آگ لگادی جس سے گھروں میں موجود تمام سامان جل کر راکھ ہوگیا۔علاقے کی ایک بااثر شخصیت اس میں ملوث بتائی جاتی ہے۔

پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔

بدن کے درد سے کہیں زیادہ درد میرے دل میں تھا۔مجھے اور میرے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں تک کو وہ سزا دی گئی جن کا قصور ہی نہیں تھا۔کیا ہم غریبوں کا،کمزوروں کا جنم ہی اسی لیے ہوا ہے۔اگر میں فلمی ہیرو ہوتا،یا کسی ناول کا کردار تو اس کا پورا بدلہ لیتا۔ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے کہ کسی جاگیر دار،وڈیرے،چوہدری کے خلاف ایک عام سا فرد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اور اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔حقیقی زندگی میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔بے شک اپنے اردگرد دیکھ لیں۔طاقت ور زیادتی بھی کرتا ہے اور معافی بھی کمزور کو مانگنا پڑتی ہے۔ہمارے ہاں قانون،انصاف،پولیس سب مایا کے غلام ہیں۔کمزور اور غریب کو جینے کا حق نہیں ہے۔جو طاقت ور ہیں قانون ان کا غلام ہے۔کہتے ہیں جب دولت بولتی ہے تو سچائی خاموش ہو جاتی ہے۔اور اصل مجرم بچ جاتا ہے۔جرم نامعلوم افراد پر ڈال دیا جاتا ہے۔

ہمارے گھروں میں صف ماتم بچھی رہی لیکن چوہدری ابراہیم کا نام تک کسی اخبار نے نہیں لکھا۔اخبارات کے مقامی نمائندوں میں اتنی جرات نہ تھی کہ چوہدری ابراہیم کا نام لکھ سکتے۔اسی طرح ہماری تھانے میں شنوائی نہ ہوئی۔سارا ملبہ نامعلوم افراد پر ڈال دیا گیا۔پورا گاؤں جانتا تھا لیکن کوئی ثبوت نہیں تھا۔ویسے ہمدردی سب کو ہمارے ساتھ تھی۔سب کہتے تھے کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی تھی۔بدلہ،نفرت کی آگ اور بے بسی،معاشرے کی بے حسی کی آگ۔پھر قانون کا لاچار اور بے وقعت ہونا،انصاف کے لیے تھانے میں ایف آئی آر کا درج ہونا لیکن وہ بھی نامعلوم افراد کے خلاف ان سب باتوں نے مجھے مایوس کر دیا۔تھانے کچہری کے چھ سات ماہ دھکے کھانے کے بعد ہم سب بیٹھ گئے اور یوں ہمارے مقدمے کی فائل داخل دفتر کر دی گئی۔

☆☆

میں تو مزید پڑھنا چاہتا تھا جبکہ والدین کا خیال تھا کہ مجھے اب نوکری کر لینی چاہیے تاکہ میں جلد کسی قابل ہو جاؤں اور میری شادی کی جا سکے۔اس دن بھی امی یہ ہی بات لے کر بیٹھی تھیں۔

''تم اب نوکری کرلو کب تک باپ کی کمائی پر پلتے رہو گے''

''اچھا امی جان''میں نے کہا۔''کرتا ہوں کچھ،میرا ایک دوست لاہور کام کر رہا ہے اسے خط لکھتا ہوں''

''تم نے جو صدمہ دل کو لگا لیا ہے۔ایسے کیسے زندگی بسر کرے گا؟''امی کہہ رہی تھی۔''یہاں ایسے ہی جینا ہے کچھ نہیں بدلے گا۔''وہ ایک لمحے کو رکی اور بولیں۔

''اپنا مسئلہ اللہ کے سامنے رکھ کر اسے بھول جاو،اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دنیا میں کوئی نہیں رہا، ایک اور دنیا بھی ہے، اس دنیا میں سب کا حساب ہوگا، وہاں انصاف مل جائے گا"

میں نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ وہاں کوئی طوفان، کوئی ہلچل، کوئی ڈر اور کوئی برتری یا کمتری کا احساس نہ تھا۔

"ماں مجھے معاف کر دو۔ تمہارا سپنا پورا نہ کر سکا۔۔۔ کیا ہونا تھا اور کیا ہوگیا۔"

وہ خاموش رہی آنسو اس کی آنکھوں سے سیدھے میرے دل پر گرے۔ میں اداس ہوگیا۔ ماں نے حوصلہ دیا۔ "وقت بدلتا ہے، وقت کسی کا نہیں، وقت کا انتظار کرو یہ سنت رسول ﷺ بھی ہے۔ جاو اس شہر سے گاوں سے نکل جاو۔ قسمت آزمائی کرو۔"

اور میں نے ماں کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس سے پہلے میں سلمی سے ملنا چاہتا تھا۔ اب تو ہمارے درمیان کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے ثمینہ یاد آئی۔ ہماری کلاس فیلو۔ سلمی کی پڑوسن، بچپن کی ساتھی۔ ایک ہی گاوں میں ہونے کے باوجود اس سے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ میرا ایک ہی دوست تھا ثمینہ کا منگیتر اور تایا زاد بھائی خادم حسین جو سعودیہ چلا گیا تھا۔ ثمینہ کے گھرانے سے ہمارے تعلقات اچھے تھے۔ ایک دن میں سرِ شام ان کے گھر چلا گیا۔ ایک چھوٹا سا رقعہ اسے سب کی آنکھ سے بچا کر دیا آیا۔ چند دن بعد وہ ہمارے گھر آئی۔

قصہ مختصر ثمینہ کی کوشش سے میری سلمی سے ملاقات طے ہوئی۔ سلمی کے گھر سے چند گھر پہلے ایک مائی جنت بی بی کا گھر تھا۔ اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا ایک ہی بیٹا تھا جو بیرون ملک چلا گیا تھا۔ اب مائی جنت اکیلی رہتی تھی۔ اس کے گھر رات گیارہ بجے کا وقت طے ہوا۔

گلی سنسان تھی۔ ٹھیک گیارہ بجے رات میں جنت بی بی کے گھر کو جا رہا تھا۔ موڑ پر کوئی کھڑا تھا۔ "کون ہے؟" کی آواز لگا کر میں گلی کے دہانے کی دیوار سے چپک گیا۔ "میں ہوں۔" مانوس آواز سن کر میں دیوار سے ہٹ گیا۔ یہ مہر خالد تھا جو کبھی سیٹھ ابراہیم کی دھمکی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ پہلے سوچا کہ واپس پلٹ جاوں لیکن مہر خالد میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی شاید وہ بھی پہچان چکا تھا۔

"تو یہاں آدھی رات کو کیوں آیا ہے۔۔۔؟"

اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں جنت بی بی کے گھر کے پاس پہنچ چکا تھا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گی۔

"تو گلی کا ماما لگتا ہے؟"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی پوری طاقت سے مکا جڑ دیا۔ میری حالت جنونی تھی۔ اس کا بازو میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے گھما کر اسے دیوار سے دے مارا ایک بار دو بار، وہ گرا تو اٹھ نہ سکا۔ میں جلدی سے جنت بی بی کے گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس سلمی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں نے بازو پکڑا، دروازے پر زور لگایا، دروازہ کھل گیا، دروازے کے پاس ہی کانپتی ہوئی سلمی کو میں نے سینے سے لگایا

"صابر۔ میں نے کہا تھا نا۔ اس رات"

اس نے اس رات کا حوالہ دیا جب مجھے بھاگنے کا کہہ رہی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا

"ہاں تو سچ کہتی تھی" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ثمینہ کہہ رہی تھی تم گاوں چھوڑ کر جا رہے ہو، اس لیے میں ملنے آگئی لیکن۔۔"

اس نے باہر کی طرف اندھیرے میں دیکھا

"ہاں یہ شاید ہماری آخری ملاقات ہے۔" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

دروازے کے سامنے سے ایک سایہ سا گزر گیا۔ غالباً یہ مہر خالد تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ مجھے علم تھا کہ سلمی کی رفاقت کے یہ چند لمحے ہیں۔ یہ ہی زندگی کا حاصل ہیں۔ میں نے ان لمحوں کو یادگار بنانے کے لیے سلمی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے مہر لبوں پر لگا دی۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔

اس وقت کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔

"صابر، بھائی سلیم کی آواز ہے، شاید مجھے تلاش کر رہا ہے، تم بھاگ جاو"

اس نے مجھے باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا سلمی اللہ نے چاہا تو زندگی کے کسی موڑ پر ملیں گے۔''

گلی کے موڑ سے ایک شور اٹھا۔ میں اور سلمی ایک ساتھ باہر نکلے، وہ اپنے گھر کی طرف اور میں اپنے گھر کی طرف بڑھے۔ اسی وقت گلی میں بھگدڑ مچ گئی جیسے بہت سے افراد آ رہے ہوں۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ مہر خالد نے شاید پورا گاؤں بیدار کر دیا تھا۔ یہ ایک رات پورے محلے پر بھاری ہوگئی۔ گاؤں والوں نے میری تلاش میں کتنے دروازے کھلوائے۔ سارا گاؤں جاگ گیا۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں بھاگتا رہا۔ آخر مسجد کی دیوار پھلانگ کر دیوار کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ گزرنا مشکل ہوگیا۔ پورے گاؤں میں میری تلاش جاری رہی۔ میں اللہ کے گھر بیٹھا رہا۔ صبح کے تین بجے میں مسجد کے پچھلے دروازے سے نکلا اور کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اپنے گھر آیا۔ گھر والے جاگ کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ابو، بھائی، چچا اور حمید صاحب میری تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ امی اور بہن صحن میں ٹہل رہی تھیں۔

''ہائے اللہ، ایسی اولاد کیوں دی مجھے''

امی نے مجھے دیکھ کر دہائی دی، بہن ''اللہ کا شکر ہے'' کہتی ہوئی گلے آ لگی۔

اس کے بعد جب ابو وغیرہ آئے تو انہوں نے جو کچھ کہا ان میں سے بہت کچھ ناقابل تحریر ہے۔ دوسرے دن گاؤں میں پنچائت ہوئی جس میں ابو اور چچا شامل ہوئے۔ گاؤں والوں نے فیصلہ سنا دیا کہ

''اب صابر گاؤں میں مزید ایک دن بھی نہیں رہ سکتا''

یوں مجھے پورے گاؤں نے نکال دیا۔ ویسے اگر وہ پنچائت میں یہ فیصلہ نہ بھی کرتے تو میں خود ہی امی کے کہنے پر جلد نوکری کی تلاش میں لاہور جا رہا تھا۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے میں خضر والا کے بس سٹاپ پر کھڑا فیصل آباد کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔

ذرا ٹھہرو......!
مجھے محسوس کرنے دو
اذیت سے بھرے لمحے
بچھڑتے وقت کے قصے
مجھے ان پتھروں میں بین کرتی۔ چیختی گویائی کو محسوس کرنے دو
ذرا ٹھہرو......!
مجھے محسوس کرنے دو
جہاں قسمت محبت کی کہانی میں
جدائی لکھ رہی ہوگی
مجھے ان سرد لمحوں میں سسکتے درد کی
گہرائی کو محسوس کرنے دو
روح کے اندر تھے سناٹے بہت
ہم حصارِ ذات میں گونجے بہت
دستکیں تھیں جانی پہچانی ہوئی
دل مقفل ہو کے بھی دھڑکے بہت
اپنے ہی قدموں میں آ کر گر پڑے
تھے ہمارے خواب تو اونچے بہت

فیصل آباد سے لاہور لکڑ منڈی پہنچا۔ یہاں ہمارے گاؤں کے اشفاق، ریاض، ندیم وغیرہ ایک جوتے بنانے کے کارخانہ میں کام کرتے تھے چند دن۔ بعد مجھے ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی۔

☆☆

میں نے اپنی بیوی کو اپنے اور سلمی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ایک بات بڑی حیران کن تھی اسے سب کچھ بتاتے ہوئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کسی اور کے ساتھ بیتا ہو۔ تب وہ دن کتنے کرب انگیز تھے اور اب انہی دنوں کی داستان چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی رہی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ میرے اور سلمی کے تعلقات میں آلودگی نہیں تھی۔ اس لیے اس کے بیٹے سے ہم اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر سکتے تھے۔ اس لیے بھی کہ میری بیٹی کی یہ پسند کا رشتہ تھا۔

یہ قسمت کی عجب ستم ظریفی تھی کہ میری بیٹی کو اس عورت کے بیٹے سے ہی محبت ہوئی جس کے سبب مجھے اپنے رشتے دار، شہر تک کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی جب میں نے اپنی کہانی ختم کی۔ ساجدہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک وہ خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔

''عظمی بضد ہے کہ اس کی شادی اس کی پسند سے ہو۔''

وہ ایک لمحے کو رکی میرے چہرے کی طرف دیکھا، اور بولی۔

"جیسے آپ نے ماضی کے واقعات سنائے ہیں، میرا خیال ہے، سلمیٰ رشتہ ہم سے طے نہیں کرے گی۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دیتا بھی تو کیا دیتا، میری خاموشی پر اس نے پوچھا۔

"اب گاوں کے حالات کیا ہیں۔ مطلب سلمیٰ کے والدین، بہن بھائی وغیرہ"

"سلمیٰ کا والد گزشتہ سال فوت ہوا تھا۔ اب اس کے بیٹے سلیم نے بھی کاروبار اور سیاست سنبھالی ہوئی ہے۔ میرے والدین بھی فوت ہو چکے ہیں" میں نے ساجدہ کو بتایا۔ صرف ایک بھائی اور چچا کی اولاد گاوں میں ہے۔ چچا آج کل گاوں کے نمبردار ہیں"

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"اس کہانی کے دو کرداروں سے تم مل چکی ہو ایک تیرے سامنے اور دوسری سلمیٰ"

میں نے ساجدہ کے سامنے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ دروازے پر جا کر میں نے کہا۔

"تم تیاری کرو، ہم صادق آباد جائیں گے، سلمیٰ کے گھر، اپنی بیٹی کے لیے بھیک مانگیں گے، میں ابھی نماز پڑھ کر آیا"

اس دن پہلی مرتبہ میں نے رو رو کر اپنی بیٹی کے لیے دعا مانگی

"یااللہ دو میں سے جو تجھے پسند ہے کر دے، یا تو فیروز سے اس کی شادی، یا فیروز کا اس کے دل سے خیال نکال دے۔"

چند دن بعد دن کے دو بج رہے تھے جب میں اور پروفیسر اقبال، صادق آباد بس سٹاپ پر اترے، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، جب ہم مدینہ ٹاؤن پہنچے تو بارش بہت تیز ہوگئی۔ چوہدری ماجد کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تانگے سے اتر کر بھیگتے ہوئے ہم ان کے دروازے پر پہنچے۔ جب ہم ان کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، بارش کی تیزی میں شدت آگئی۔

"بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی"۔ پروفیسر اقبال نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بہت دنوں کے بعد کچھ انجوائے کر رہا ہوں۔"

میری جان پر بنی تھی اور پروفیسر صاحب انجوائے کر رہے تھے۔ میں نے پھیکی اور بھیگی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ انہوں نے دوبارہ کنڈی کھڑکا دی۔ اندر سے پوچھا گیا

"کون ہے؟"

آواز مردانہ تھی، پروفیسر نے اپنا تعارف کروایا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے سامنے ماجد صاحب چھتری لیے کھڑے تھے۔ ڈرائنگ روم تک اس نے ہماری رہنمائی کی اور پھر اندر کمروں میں چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ ہم دونوں نے ان باتوں پر غور کیا جو ہم یہاں کرنے آئے تھے، سلمی، ماجد دونوں آئے، اتنی سی دیر میں انہوں نے ہمارے لیے چائے بنا لی تھی۔ سلمی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ہم سب چائے پیتے رہے، موسم کی باتیں کرتے رہے، ٹھنڈی ہوا بھی چلتی رہی۔

"چلو موسم خوش گوار ہوگیا۔" ماجد نے کہا۔

"بہت گرمی تھی۔۔۔راحت ملی۔" اقبال صاحب نے کہا

"کیسے آنا ہوا۔" سلمی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اور اقبال صاحب نے جیسا پہلے سوچا تھا اس کے مطابق میں نے کہا۔

"ناصر صاحب نے میرے بیٹے عظیم کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کی حامی بھر لی ہے۔" میں نے سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی اور اپنی بات جاری رکھی "لیکن اس کا کہنا ہے کہ شادی اسی فروری میں کر دی جائے" میں نے چند لمحات رک کر اپنی بات کا اثر دیکھا۔ "دوسری طرف ہماری بیٹی اور آپ کا بیٹا فیروز ایک ہی اکیڈمی میں پڑھتے رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

سلمی چونکی ہوگی۔ ایک غلطی تو میں کر چکا تھا لیکن دوسری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اب حقیقت میں اپنی بیٹی کی محبت کی بھیک مانگنے آیا بیٹھا تھا۔

اب اس کا علی الاعلان ماتم کر کے اپنی رسوائی میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش ہوگیا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ جسے اقبال صاحب نے توڑا۔

"فیروز نے مجھ سے کہا تھا کہ صابر صاحب سے بات کروں، میں نے بات کی، جس پر انہوں نے آپ کو اپنے گھر بلوایا۔ آپ رشتہ دیکھ آئے لیکن اتنے دن گزر گئے آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری طرف لڑکی والے دن طے کرنے کے لیے صابر پر زور ڈال رہے تھے، انہوں نے مجھ سے بات کی یوں ہم دونوں آپ کے پاس آ پہنچے ہیں"

اب کی بار ماجد نے کہا "مجھے تو رشتہ پسند آیا تھا، فیروز بھی اسی پر بضد ہے۔۔لیکن۔۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا میں نے دیکھا سلمی اسے گھور رہی تھی۔

"لیکن......" پروفیسر نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ پریشان نظر آنے لگا۔ جلد بازی میں اس کے منہ سے حقیقت نکل گئی تھی اب اس بات کو جاری رکھنا اس کے لیے مشکل ہوگیا۔ تب سلمی بولی۔

"لیکن ہم اپنے بیٹے کا اتنی دور رشتہ نہیں کرنا چاہتے" وہ رکی مجھے دیکھا اور دوبارہ گویا ہوئی۔ "ہم اتنی جلدی کسی طرح بھی شادی نہیں کرنا چاہتے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے بی اے کر رہی ہے، بھائی نے خود رشتے کا کہا تھا" وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بھائی کا حوالہ دے کر اس نے بتایا تھا کہ اس کا ایک خاندان ہے اور وہ گڑے مردے بھی نہیں اکھاڑنا چاہتی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے دکھ ہی دکھ نظر آیا۔ اسی وقت باہر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ ماجد معذرت کر کے اٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی اس دوران اقبال نے مجھے اور میں نے اقبال کو مایوسی سے دیکھا۔

"صابر صاحب، آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ کی بیٹی مجھے بہت پسند آئی، لیکن میں کچھ مجبوریوں کی وجہ سے یہ رشتہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں دوبارہ تماشا نہیں بننا چاہتی۔ اپنا گھر نہیں اجاڑنا چاہتی۔ اس نے لفظ "دوبارہ" پر خاص طور پر زور دیا۔ میں اسے اپنی بیٹی اور اس کے بیٹے کی محبت کا واسطہ دینا چاہتا تھا۔ اسے کہنا چاہتا تھا کہ ہم ان کو ناکامی سے بچا سکتے ہیں۔ آج یہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کل جب ہمارے والدین کے ہاتھ میں تھا تو انہوں نے ہماری محبت کو سمجھا نہیں تھا۔ آج ہم کو یہ غلطی نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا کیونکہ میرے بولنے سے پہلے سلمی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور رندھی ہوئی آواز میں

کہا۔

''آپ چلے جائیں، بھول جائیں، بیٹی کو سمجھائیں، بیٹیاں کمپرومائیز کر لیتی ہیں۔اسی میں ہی ہماری بھلائی ہے۔اب اس عمر میں، میں تماشا نہیں بننا چاہتی۔''اس وقت ماجد صاحب کے قدموں کی آواز آئی تو سلمیٰ نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کر لیے اور اقبال صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔میں نے اس وقت اقبال صاحب کو دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرانگی تھی۔جیسے وہ سلمیٰ کی باتوں کو معنی پہنانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ماجد خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔میں تو ہمیشہ ہی محروم رہا۔ایسا لگتا ہے محرومیت ہی میرا مقدر تھی۔زندگی کے ہر موڑ پر نہ جانے کہاں سے محرومیت نمودار ہوتی اور مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی تھی۔اب یہ صدمہ میری بیٹی کو بھی سہنا تھا۔میں نے ماضی میں جو کیا تھا اس کا خمیازہ اب بیٹی کو بھرنا تھا۔میں اور اقبال بوجھل دل سے اٹھے،ہم نے ان کو سلام بھی نہیں کیا۔اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ماجد باہر تک چھوڑنے آیا۔بس میں بیٹھ کر میں نے سب باتوں کا تجزیہ کیا۔سلمیٰ حق بجانب لگی۔لیکن میرے سامنے سوال یہ تھا کہ میں اپنی بیٹی کا سامنا کیسے کروں گا۔اقبال صاحب میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔مجھے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر بولے

''صابر کیا سلمیٰ سے آپ پہلے سے واقف تھے۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر سیٹ سے سر لگا دیا۔جیسے سب سمجھ گئے ہوں۔بارش رک چکی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔میں ماضی حال اور مستقبل میں غوطے کھاتا رہا۔ایک رات تھی جب سلمیٰ میرے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار تھی لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔اس نے میری محبت میں پورے گاؤں میں بدنامی سہی تھی۔میں اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔اس نے خود کو کیسے سمجھایا تھا،منوایا تھا۔اور شادی کر لی تھی۔اب میری بیٹی کو میری کرنی۔بھرنی تھی۔کافی دیر بعد اقبال صاحب نے مجھے کہا

''عظمیٰ کو میرے پاس بھیج دینا میں اسے سمجھا دوں گا۔ٹینشن نہ لیں''

باقی کے سفر میں، میں نے اقبال صاحب کو ماضی کے چیدہ چیدہ واقعات سنا دیئے۔رات دس بجے میں گھر پہنچا۔دروازہ عظمیٰ نے کھولا جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔میں نے اس کا ماتھا چوما اور ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔وہ میرے چہرے پر کچھ تلاش کرتی رہی لیکن میں اپنے چہرے پر خول چڑھائے ہوئے تھا۔ساجدہ مصلے پر بیٹھی تھی۔میں بیڈ پر بیٹھا۔عظمیٰ کہنے لگی۔

''ابو منہ ہاتھ دھو لیں۔میں کھانا لاتی ہوں۔''

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔اس وقت ساجدہ نے مصلے کو تہہ کیا اور میرے پاس آ بیٹھی۔اس کے چہرے پر سوال ہی سوال تھے۔لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔خاموشی سے کھانا کھایا۔عظمیٰ اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے ساجدہ کو سب کچھ بتا دیا۔دوسرے دن صبح اقبال صاحب آ گئے۔میں نے انہیں اس کی دعوت دی تھی۔وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جب میں ان سے مل کر اپنے کام پر چلا گیا۔اس رات مجھے ساجدہ نے بتایا کہ اقبال صاحب نے عظمیٰ کو سمجھایا ہے۔کسی حد تک منایا ہے۔امید ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عظمیٰ فیروز کی محبت کو بھول جائے گی۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔چند دن بعد اس نے اپنے بھائی سے کہہ کر اشتہارات بنوائے، محلے میں تقسیم کیے، اور ڈرائنگ روم میں ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔محلے کی لڑکیوں کو پڑھانے لگی۔اس کا مشورہ بھی اقبال صاحب اسے دے کر گئے تھے۔اس سے اگلے سال ہم نے دونوں بہن بھائیوں کی شادی کر دی تھی۔اب ان کی شادی کو پانچ سال ہونے کو ہیں۔آج ہمیں پھر ایک رشتے کی تلاش ہے۔جی ہاں معظم کے لیے۔دعا کیجئے گا۔

●

عمر فاروق ارشد

ادب میں بامعنی طنز و مزاح لکھنا خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے کیونکہ آج کل پھوہڑپن سے لکھے گئے مضامین کو مزاح کا نام دے کر پیش کرنا فیشن بن چکا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس کا خیال رکھتے ہیں۔ نئے افق کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے پاس اس موضوع پر اچھا اور معیاری ادب تخلیق کرنے والے ادیب موجود ہیں ان میں ایک نام عمر فاروق ارشد کا بھی ہے۔

ٹونی فضلو سیریز کی ایک کہانی، انہیں خاندانی ہیرے واپس لانے تھے

دعا نے کمرے میں جھانکا...... ہائے فضلو بھائی' ذرا زحمت فرما کر دادا حضور کے کمرے میں تشریف لے آئیں وہ آپ کو شدت سے یاد فرمارہے ہیں۔'' کی بورڈ پر تیزی سے چلتی ہوئی میری انگلیاں تھم گئیں۔

''خدا خیر کرے' دادا جی کو آج کل ہم کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگے ہیں۔''

دعا ہنس دی۔

''بس جو بھی ہے، آپ جلدی آئیں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو دیکھتے ہیں کیا چکر ہے۔''

دادا حضور صوفے پر پھیلے ہوئے تھے۔ نگائیں خون خوار انداز میں دروازے پر ہی مرکوز تھیں اور لاٹھی کو اضطراری انداز میں ادھر ادھر گھمار ہے تھے۔ میں نے بے بسی سے دعا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرارت کے رنگ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ آج پھر استغاثہ کی طرف سے دادا جی کی عدالت میں کوئی دعویٰ دائر کر دیا گیا ہے۔

''سلام گرینڈ پا......میں نے ان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے لاٹھی گھمائی۔ نشانہ میں تھا مگر جھکائی دے کر بچ گیا۔

''اٹھ حرام خور۔'' وہ گرجے۔

''گرینڈ پا کہہ کر دانہ مت ڈال۔ ادھر میرے سامنے کھڑا ہو جا۔''

دعا بمشکل ہنسی دبائے ہوئے تھی۔ میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کل میں نے تمہیں واقعہ سنایا تھا کہ قائداعظم نے میرے مشورے پر پاکستان حاصل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ سنا ہے تم کہتے پھر رہے ہو کہ دادا جی کی کھوپڑی الٹ گئی ہے۔ کیا ایسے ہی ہے؟'' انہوں نے لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''نہیں گرینڈ پا میں نے تو......'' اب کی بار لاٹھی گھومی اور دو سو واٹ کا بلب میری آنکھوں تلے روشن ہو گیا۔

''دادا کہہ دادا' گرینڈ پا نہیں چلے گا آج سے۔''

''جی دادا جی۔'' میں بڑبڑایا۔

''مطلب تم نے ایسا کہا ہے؟'' لاٹھی فضا میں بلند ہو چکی تھی۔

''نن نہیں میری پوری بات سنیں دادا جی۔'' میں نے تیزی سے کہا مگر ذہن میں فوراً کوئی بہانہ نہیں آسکا۔

''جلدی سنا کیا بات ہے؟'' وہ دہاڑے۔

''وہ دراصل یہ بات ٹونی مجھے کہہ رہا تھا۔'' میرا نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ حسب توقع دادا کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ اوپر سے میرا مظلوم ترین چہرہ انہیں پریشان کر رہا تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں کھسک کر پیچھے ہوتا چلا گیا۔ تاکہ اگر لاٹھی چلے بھی تو بچت ہو جائے۔

انہوں نے دعا کی طرف دیکھا وہ ٹونی کو بلا لائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا۔ ٹونی بے چارے کو شاید دعا سوتے ہوئے اٹھا کر کھینچ لائی تھی۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے سب کے چہرے تک رہا تھا۔

''تو نے شراب پی رکھی ہے مردود؟ کیسے نشئی کی طرح آنکھیں مٹکا رہا ہے۔'' ساتھ ہی وہ لاٹھی برسانا چاہتے تھے مگر ٹونی کی آنکھیں چھپاک سے کھل گئیں۔

''میں سو رہا تھا گرینڈ......''

''گرینڈ پا نہیں کہنا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ وہ فوراً خاموش ہو گیا۔

''ہاں بول شاباش۔'' دادا جی نے لاٹھی پر گرفت مضبوط کی۔

''میں سو رہا تھا دادا جی۔'' وہ بولا۔ دادا جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری مگر مونچھوں تلے دبا گئے۔

''اچھا تو تم نے......'' دادا جی نے ٹونی کو مخاطب کیا۔

''تم نے بولا تھا کہ میری کھوپڑی الٹ گئی ہے؟''

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک مخصوص اشارہ کیا۔

ٹونی بولا۔

''بالکل نہیں دادا جی بلکہ یہ بات تو کل عاقب کہہ رہا تھا ادیس سے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔''

دادا جی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے بارہ بج گئے کیونکہ مجرم ہاتھ آنے کے بجائے پھسلتا جا رہا تھا اگلے ہی لمحے وہ چلائے۔

''ان دونوں خبیثوں کو بھی میرے پاس لاؤ۔''

دعا حکم کی تعمیل میں باہر نکل گئی۔
''یہ سارا چکر اس چڑیل کا چلایا ہوا ہے۔'' ٹونی نے سرگوشی کی۔
''اور مجھے ڈر ہے کہ عاقب بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ منہ پھٹ سا ہے۔''
اتنے میں عاقب چیونگم چباتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔
''یار تم فارغ لوگوں کا پرابلم کیا ہے؟ میرا گیم لاسٹ راؤنڈ میں داخل ہو گیا تھا۔''
دادا جی کی آنکھیں خون خوار انداز میں عاقب کی جانب گھوم گئیں۔
''تیرا گیم آج میں مکمل کردوں گا۔ حرام خور کبھی ڈھنگ کا کام بھی کرلیا کر۔''
''دادا جی!''
''پلیز یار کم ٹو دی پوائنٹ۔'' وہ جماہی لے کر بولا۔
''دادا جی کی لاٹھی اس کا مقدر بنے گی۔'' ٹونی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
خلاف توقع دادا جی لاٹھی کو حرکت دیئے بغیر بولے۔
''تم سب حرام خور ہو سچ سچ بتادو کہ کل ہماری شان میں گستاخی کس نے کی.....؟ جب ہم خود کہہ رہے ہیں کہ ہم ذاتی طور پر جناب قائداعظم کے ساتھ تقاریر کرتے رہے ہیں تو پھر ہمارے بیان کو جھٹلانے کی ہمت کرنے والا کون ہے؟ ہم ہر صورت جان کر رہیں گے۔''
سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دعا ایک طرف کھڑی ہماری بے بسی کو پورے پروٹوکول کے ساتھ انجوائے کررہی تھی۔ دادا جی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
''دعا بیٹا تم کیا کہتی ہو یہ مانیں گے یا نہیں؟''
وہ معصومیت سے بولی۔
''دادا حضور یہ ساری ڈھیٹ آتماؤں کی فوج ہے یہ سزا کے بغیر نہیں مان سکتے۔ ویسے مجھے فضلو بھائی اور ٹونی پر شک ہے۔ آپ کے مزاج کو برہم کرنے والا بیان ان دونوں میں سے کسی نے جاری کیا ہوگا۔''
''او خدایا! میری اس چڑیل سے کیا دشمنی ہے بھلا؟'' ٹونی رونے والا ہو گیا تھا۔ کل اسے بریانی کھلا دیتے تو اچھا تھا اب بھگتو۔'' میں نے ٹونی کو لتاڑا۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔
دادا جی نے لاٹھی کو جھٹکا دیا۔
''کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے تم نے۔ جو بھی بات ہے میرے سامنے کرو۔''
''دادا جی یہ آپ کے خلاف کوئی سازش کررہے ہوں گے۔ ویسے بھی یہ کاٹھ کے الو سازشوں کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' دعا نے موقع دیکھ کر دادا جی کو نیشنل والوں کا مصالحہ لگا دیا۔ دادا جی صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
''دعا بیٹا' تم سب لوگوں کو باہر لے جاؤ' صرف یہ دو گدھے ادھر رہیں۔'' اشارہ مبارک ہماری طرف تھا۔ ٹونی سرگوشی کرنے سے باز نہیں آیا۔
''بھائی جی بس یہ عزت افزائی باقی رہ گئی تھی۔'' میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔
دعا سب کو ہانک کر باہر لے گئی۔ دادا جی دوبارہ بیٹھ گئے۔
''میرے نالائق صاحب زادو غور سے میری بات اپنے بھیجے میں بٹھالو۔'' انہوں نے قدرے نرمی سے بولنا شروع کیا۔
''یہ تمہاری نالائقیاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہیں۔ محلے سے لے کر گاؤں والے' سبھی تمہارے کارناموں سے تنگ ہیں۔ میں صرف پچھلے ایک ہفتے میں تمہارے نمایاں کارناموں کا تذکرہ کروں گا۔ چاچا برکت کی مرغیوں کے انڈے تم نے اڑائے' بشیر کوچوان کے آموں کا باغ ایک رات میں خالی کردیا' مولوی صاحب کو سوتے ہوئے چارپائی سمیت اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا' صرف اس لیے کہ اس نے تم دونوں حرام خوروں کو نماز کا کہا تھا۔ تم دونوں نے مل کر بدنامیوں کا عالمی ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ میں کافی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ......'' وہ ذرا سانس لینے کو رکے اور پھر بات جاری کی۔
''تم دونوں کو کسی معیاری کام میں مصروف کردیا جائے۔ اس طرح تمہاری صلاحیتوں کا امتحان بھی ہو جائے گا جو کہ فی الحال تمہارے اندر نظر نہیں آرہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ فراغت کی وجہ سے تمہارے دماغوں کو جو بخار چڑھا ہوا ہے وہ اتر جائے گا' کیا تمہیں منظور ہے؟'' ٹونی نے پہلو

بدلا۔

''وہ دراصل دادا جی بات یہ ہے کہ آئندہ......''

دادا جی نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی اور کہا ''کوئی صفائی نہیں چلے گی۔ تم دونوں پہلے بھی کئی دفعہ اپنی قینچی جیسی زبان استعمال کر کے مجھے چونا لگا چکے ہو۔ اس بار کسی بہانے کا کوئی چانس نہیں۔''

''جی بہتر دادا حضور۔'' ٹونی نے فرمان برداری سے گردن جھکالی۔

''میں تم دونوں کو ایک خطرناک مہم پر بھیج رہا ہوں۔'' دادا جی بولے ناکام تھو بڑے واپس لے کر آنے سے بہتر ہوگا کہ تمہاری لاشیں اس حویلی میں واپس آئیں۔ میں پورے اہتمام سے ان کی تدفین کا بندوبست کردوں گا۔''

میرا رنگ فق ہوگیا۔ ٹونی نے میری طرف دیکھا۔

''ابے کیا ہوگیا ہے تجھے حوصلہ رکھ۔ دادا جی نے قہقہہ لگایا۔

''تمہاری ڈرامے بازیاں میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اب سن لو کہ کام کیا ہے۔ یہ تمہاری پیدائش کے سانحے سے پہلے کی بات ہے میرے ابا حضور یعنی کہ تمہارے پردادا حضور نے تلوار بازی کے ایک مقابلے میں تین نایاب ہیرے جیتے تھے۔ یہ سفید رنگ کے نایاب اور قیمتی ہیرے تھے اور پوری دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا مگر پھر ہوا کچھ یوں کہ جب میں نے حویلی کا نظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس خوشی میں پھولے نہ سماتے ہوئے پورے علاقے کو پہلوانی کے میدان میں چیلنج کردیا۔ میری صحت سے تو تم واقف ہو۔'' دادا جی نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''اب بھی تم جیسے نئی نسل کے تین چار چوہے پچھاڑ سکتا ہوں مگر خدا کی کرنی ہوئی کہ میں سورت میں آئے ہوئے ایک پہلوان سے ہار گیا۔ مقابلے کا انعام یہ رکھا گیا تھا کہ جیتنے والا مجھ سے منہ مانگی چیز مانگ سکتا ہے اور اس کمبخت نے......وہ ہیرے مانگ لیے۔''

میں اور ٹونی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''مگر دادا جی اس پہلوان کو کیا ہیروں کے متعلق الہام ہوگیا تھا؟'' ٹونی نے پوچھا۔ دادا جی جیسے ماضی میں کھو گئے۔

''اسے میرے کسی دشمن نے بتایا تھا اور پھر ہزاروں کے مجمع کے سامنے مجھے ہیرے دینا پڑے۔''

''اس کا مطلب ہے اگر لوگ نہ ہوتے تو آپ نے مکر جانا تھا؟'' ٹونی نے موقع پاتے ہی چوٹ لگادی۔ دادا جی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''حرام خور اپنی طرف سے اندازے نہ لگایا کر۔ تجھے پتہ ہونا چاہئے میری ایمان داری کا یہ عالم ہے کہ میں نے کبھی چوری کا پانی بھی اپنی زمینوں کو نہیں لگایا۔ بلکہ محکمہ زراعت کے افسروں کو رشوت دے کر باقاعدہ اصولوں کے تحت پانی چوری کرتا ہوں۔'' ٹونی نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''بزرگوار کی ایمانداری تو دیکھو نئی نسل کو ان سے کچھ سیکھنا چاہیے۔'' دادا جی نے یقیناً اس کی سرگوشی سن لی تھی اس لیے لاٹھی کا بھرپور وار اس کے داہنے بازو پر ہوا وہ بلبلا اٹھا۔

''ہائے مر گیا اتنی جلدی نہیں مرنے والے تم' دادا جی دہاڑے' میری بات سن نہیں رہے ہو اور اپنی ہانکے جا رہے ہو۔'' دادا جی نے میری طرف دیکھا۔

''تم نے بھی کچھ کہنا ہے؟'' میں نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی انہوں نے بولنا شروع کیا اور 25 سال گزرنے کے بعد آخر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ پہلوان میرے ہیرے لے کر کہاں گیا ہے۔'' سبحان اللہ' ٹونی بولا بہت فاسٹ انٹیلی جنس سروس ہے۔ دادا جی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ انہوں نے بولنا جاری رکھا۔

''اس پہلوان نے وہ ہیرے وادی خواب نگر کے ایک مقامی نواب کو فروخت کردیئے تھے' میں مسلسل اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ میں اس نواب سے وہ ہیرے اڑا لیتا مگر نواب برطانیہ چلا گیا اور ہیرے بھی ساتھ لے گیا اور اب اطلاعات آئی ہیں کہ وہ واپس پاکستان آچکا ہے لیکن دادا جی اس سارے معاملے میں ہم دونوں کہاں فٹ ہوتے ہیں؟'' ٹونی نے بے چینی سے پوچھا۔ دادا جی مسکرائے اور کہا۔

''ہاں بیٹا اب تم لائن پر آئے ہو' تم دونوں نکلو......وہ ہیرے اس نواب سے واپس لاؤ گے۔''

''ہم دونوں لائیں گے؟'' ٹونی نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں تم دونوں میں فرشتوں کے اجلاس سے خطاب

نہیں کر رہا تم سے ہی مخاطب ہوں۔'' دادا جی نے غصے سے کہا۔

''مگر دادا جی ہم......!'' دادا جی نے لاٹھی گھماتے ہوئے ٹونی کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''اور اگر مگر کی گنجائش نہیں ہے' تم لوگوں کو میں پورا سپورٹ کروں گا۔ جس قسم کا سامان لے جانا چاہو' جیسی گاڑی پسند کرو جتنا خرچہ طلب کرو سب ملے گا لیکن اس حویلی میں واپسی کے لیے تمہارے پاس ہیرے ہونا ضروری ہیں ورنہ تم میرے پوتے نہیں اور میں تمہارا دادا نہیں۔''

''کاش سچ مچ ایسا ہی ہوتا۔'' ٹونی نے آہ بھر کے سرگوشی کی۔

''کیا کہا تم نے؟'' دادا جی چلائے۔

''کک کچھ نہیں میرا مطلب کب جانا ہے؟'' ٹونی پھرتی کے ساتھ بیان بدل گیا۔

''تم کل صبح روانہ ہو جاؤ گے یعنی کہ ناشتے کی میز پر مجھے تمہاری منحوس شکلیں نظر نہ آئیں۔'' دادا جی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اوکے دادا حضور۔'' ٹونی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس خصوصی پنگے میں ڈالنے کے لیے شکریہ قبول فرمائیں۔ چل بھائی تو بھی دادا حضور کا شکریہ ادا کر۔'' اس نے مجھے ٹہوکا دے کر کہا۔ دادا جی نے لاٹھی کو حرکت دی۔

''دفع ہوتے ہو یہاں سے یا میں تمہارا شکریہ دوسری طرح قبول کروں۔''

''یار ایک تو یہ لاٹھی ہر معاملے میں انٹرفیئر کرتی ہے۔'' ٹونی نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

❀......❀......❀......❀

رات کے گیارہ بجے تک ہم نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اپنی تیاری کو حتمی شکل دے دی تھی کیونکہ دادا جی ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے ٹونی نے سفر کے لیے نئے ماڈل کی پوٹھوہار پسند کی تھی یہ اس کی فیورٹ گاڑی تھی۔ جسے ہم دونوں آسانی سے ڈرائیو بھی کر لیتے تھے دیگر ضروری کاموں سے فراغت کے بعد ہم نے دوبارہ دادا جی سے ایک طویل ملاقات کی اور ان سے مطلوبہ نواب صاحب کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرلیں۔ صبح ابھی منہ اندھیرا ہی تھا کہ ہم نے دادا جی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی میں سامان رکھنا شروع کر دیا۔ کھانے پینے کی چیزوں کی ڈبے اور دوسری ضروریات کی اشیا۔ ہم نے ڈگی میں رکھیں۔ ہم نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ ہمیں راستے میں کسی طرح کی کوئی چیز خریدنا نہ پڑے۔ ناشتہ ہم نے اپنے کمرے میں ہی کیا کیونکہ دادا جی نے ناشتے کی میز سے دور رہنے کے آرڈر جاری کیے تھے۔ ٹونی گاڑی کی ونڈ اسکرین صاف کر رہا تھا جب دعا نمودار ہوئی۔

''ویری گڈ ٹونی بھائی' یہ کام آپ کو خوب جچتا ہے۔'' اس نے ٹونی کو چھیڑا۔

''دعا تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''ارے۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''میں نے ایسا کیا کر دیا۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وادی خواب نگر کی سیر کا موقع مل رہا ہے اور وہ بھی بالکل مفت۔''

''سیر کی بچی' تمہیں پتہ ہے کہ ناکامی کی صورت میں ہمارے مرڈر آرڈر پاس ہو چکے ہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''ویری سیڈ'' اس نے افسوس بھری اداکاری کی۔

''مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ میرے پیارے بھائیو میں دکھ کی اس گھڑی میں قدم قدم تمہارے ساتھ ہوں۔'' مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ٹونی اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔

''یار فضلو اس چڑیل سے کہہ دو یہاں سے چلتی پھرتی نظر آئے۔'' دعا نے جواباً ٹونی کو انگوٹھا دکھایا۔

''میری جوتی جاتی ہے یہاں سے' تم گاڑی اسٹارٹ کرو اور کھسک جاؤ خواب نگر کی طرف۔'' میں نے دعا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''چلو غصہ تھوک دو بس ہمارے لیے دعا کرنا کہ کامیاب و کامران ہو کر واپس آئیں۔'' اس نے مسکرا کے سر ہلایا اور چلی گئی۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ٹونی نے حویلی پر الوداعی نظر ڈالی۔

''فضلو یار اس حویلی کو جی بھر کے دیکھ لو شاید ہیروں

والے نواب صاحب کے ہاتھوں فوت ہونا پڑے۔"

"نواب کی ایسی کی تیسی ہیرے تو اسے دینے ہی پڑیں گے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

ٹونی نے غور سے مجھے دیکھا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ۔" میں نے وکٹری کا نشان بنایا۔

"چل پھر دیکھتے ہیں۔" ٹونی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

❁....❁....❁....❁

شام کے سائے پھیلنا شروع ہو چکے تھے جب ہم وادی خواب نگر کی حدود میں داخل ہوئے۔ دن بھر کا سفر تقریباً ٹھیک رہا تھا سوائے ایک دو دفعہ کے، جب ٹونی نے نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر اونگھتے ہوئے ڈرائیونگ کی کوشش کی مگر میری بروقت کی مداخلت نے کسی قسم کا ایڈونچر نہیں ہونے دیا۔

خواب نگر حقیقتاً خوابوں کی وادی تھی ہم تقریباً پون گھنٹہ کی تلاش کے بعد ایک ہوٹل منتخب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی وجہ ٹونی کا یہ اصرار تھا کہ دادا حضور کے مال مفت پر کھل کر عیش کرنی چاہیے اور اس کے لیے ہوٹل اعلیٰ قسم کا ہونا ضروری ہے تاکہ ہم اطمینان بخش طریقے سے اس خطرناک مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ہوٹل کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم وادی خواب نگر کے محل وقوع سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ یہ خوبصورت وادی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک طرف رہائشی مکانات کا طویل سلسلہ تھا درمیان میں ایک خوبصورت سی سڑک کے بعد وسیع و عریض جنگل تھا اور اس جنگل میں کافی رقبے کو کاٹ کر سیاحوں کے لیے ہوٹل اور ریسٹورنٹس وغیرہ بنے ہوئے تھے انہی میں سے ایک ہوٹل ہمیں پسند آیا۔ ٹونی ریسپشنسٹ پر لٹو ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بیچاری اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے مجبور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی جب کہ ٹونی اسی خیال سے مرے جا رہا تھا کہ شاید یہ جلوے اس کے لیے بطور خاص ہیں۔ میں نے اسے کہنی ماری۔

"ٹونی صاحب ہم کمرہ بک کروانا چاہتے ہیں یہ کام پھر کسی وقت کے لیے چھوڑ دیں۔" ریسپشنسٹ نے شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھا ٹونی بری طرح کھسیا گیا۔

"اوہ یس میڈم ہمیں دو وی آئی پی روم درکار ہیں کم از کم ایک ہفتے کے لیے۔" میں چونکا۔

"ابے دو روم کس لیے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مسٹر فضلو الگ الگ کمرے ہوں گے تو ہم زیادہ غور و خوض کے ساتھ اپنا کام کر سکیں گے ورنہ تم میرے خشوع و خضوع کو قتل کرتے رہو گے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"حضور والا میری ناقص عقل کے مطابق مشترکہ کمرہ ہمارے لیے زیادہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔" ٹونی نے غور سے مجھے دیکھا۔

"فضلو جی میں اس مہم کا معزز رکن ہوں بلکہ قائدانہ کردار ادا کر رہا ہوں سو اس طرح میری ماہرانہ رائے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔" وہ ریسپشنسٹ کی طرف گھوما۔

"میڈم پلیز دو وی آئی پی روم عنایت کر دیں۔" میں دانت پیس کر رہ گیا۔ ریسپشنسٹ کمپیوٹر پر تیزی سے انگلیاں چلانے لگی پھر اس کے چہرے پر معذرت خواہانہ تاثرات ابھرے۔

"سوری سر بات دراصل یہ ہے کہ فی الوقت ایک ہی روم دستیاب ہے کل تک دوسرا روم مل جائے گا۔" ٹونی کا منہ بگڑ گیا۔

"کل پھر میری لاش ادھر رکھوا دینا 'سٹوپڈ مینجمنٹ..... نان سنس پروگرامنگ۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ٹونی یار یہ انگلش کہاں سے آ گئی؟" اس نے آنکھ ماری۔

"میں پوری تیاری سے آیا ہوں بیٹا' دعا سے دو چار لفظ سیکھے ہیں۔" ریسپشنسٹ گھبرا گئی تھی میں نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں سسٹر ہم گزارا کر لیں گے۔" میری بات سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

"تھینکس سر روم نمبر 22 یہ لیں چابی۔" میں نے چابی پکڑ لی ٹونی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"فضلو بے وقوفوں کا کوئی آسکر ایوارڈ ہے کیا؟ اگر ہے تو تجھے ملنا چاہیے میں ریسپشنسٹ کو متاثر کرنے کے لیے مرا

جارہا ہوں اور تو نے اسے بھی بہن کے رتبے پر فائز کر دیا۔"
میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا۔
"ٹونی بھیا اس دنیا میں سب بہن بھائی ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

❀....❀....❀....❀

میں ایک گھنٹے سے دادا جی کے دیئے گئے نقشے کے ساتھ سر کھپا رہا تھا اس نقشے میں مطلوبہ نواب صاحب کی حویلی کے بارے میں مکمل رہنمائی موجود تھی میں یہ چاہتا تھا کہ ہمیں ہوٹل سے نکل کر نواب کی حویلی تک جانے کے لیے کسی مقامی بندے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ یہ بعد میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا نقشے کے مطابق نواب کی حویلی خواب نگر کے شمال میں واقع تھی حویلی سے ایک کلو میٹر پیچھے مین روڈ ختم ہو جاتا تھا اور اس سے آگے نواب کا ذاتی جنگل تھا جس کے اندر سے ایک پگڈنڈی حویلی تک جاتی تھی البتہ وہاں کچھ دوسرے عام لوگوں کے گھر بھی تھے زیادہ تر لوگوں کے پاس اپنی بگھیاں تھیں اور یہی ان کا ذریعہ آمد و رفت تھا جدید ٹرانسپورٹ کا یہاں مجھے نام و نشان بھی نہیں ملا تھا ٹونی نے بیڈ پر اوندھے لیٹے ہوئے آواز لگائی۔
"ابے فضلو واش روم کے لیے کیا نیچے جانا پڑے گا' سیکنڈ فلور سے نیچے جاتے ہوئے اگر راستے میں ہی حادثہ ہو گیا تو بچپن کی یاد تازہ ہو جائے گی۔"
"ٹونی ادھر آ کے میری بات سن۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اچھل کر میرے پاس آیا۔
"فضلو میری جان تو اتنا سیریس کیوں ہو گیا ہے؟"
"سیریس ہونے پڑے گا بھائی' ہم جس کام کے لیے آئے ہیں اس کی طرف تم دھیان نہیں دے رہے' تمہیں اپنی عیاشی کی پڑی ہوئی ہے۔" ٹونی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"فضلو کے بچے' میں نے تجھ سے واش روم کا محل وقوع پوچھا ہے' کسی میخانے کا نہیں پوچھ لیا جو تو عیاشی کا ملبہ میرے سر پر ڈال رہا ہے۔ ابھی چائے تک نہیں منگوائی تم نے اور بات عیاشی کی کرتے ہو الو کے پٹھے۔"
"چائے کو چھوڑ ٹونی۔" میں نے کہا۔
"تجھے الائچی والا ٹھنڈا دودھ پلاؤں گا۔ مگر کام کی طرف توجہ بھی دے۔ یہ نقشہ دیکھ اور اس کو سمجھنے کی کوشش کر۔" ٹونی نے نقشے پر نظر ڈالی۔
"یہ جو سرخ رنگ کا نقطہ ہے' بندہ ناچیز کے خیال میں یہ نواب کی حویلی ہے۔"
میں نے سر پکڑ لیا۔
"یار یہ حویلی نہیں ہے' سرخ نشان خطرے کی علامت ہوتا ہے یہ پولیس اسٹیشن ہے جو حویلی کی پچھلی سائیڈ پر ایک گلی چھوڑ کر واقع ہے۔" ٹونی کے دیدے پھیل گئے۔
"فضلو میرے بھائی مجھے گاڑی کی چابی دے دو' میں دادا حضور کے ہاتھوں شہید ہونا چاہتا ہوں' پولیس کی چھترول افورڈ نہیں کر سکتا۔"
میں نے نقشہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"اس لیے میں کہہ رہا ہوں ٹونی کہ کام کی پلاننگ پوری محنت اور حاضر دماغی سے کر لیں۔ دادا جی نے نقشہ اسی مقصد کے لیے دیا ہے کہ ہم اس کام کے متعلق ہر قسم کے خطرات سے آگاہ ہو جائیں اور بعد میں یہ بہانہ مت ہو کہ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ اس نقشے کے مطابق اگر ہم منصوبہ بندی کریں گے تو کامیابی کے ننانوے فیصد چانس روشن ہیں۔" ٹونی نے بغور مجھے دیکھا۔
"یعنی کہ ایک فیصد چانس پولیس کی چھترول کے بھی ہیں فضلو یار پلیز کچھ ایسا کر کہ کامیابی کے چانسز سو فیصد ہوں۔"
"بالکل کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا
"مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میرا ساتھ دو۔"
"ٹھیک ہے یار۔" وہ بولا۔
"اب سے میں تمہارے ساتھ نیک نیتی سے کام کروں گا۔ پکی بات ہے نا؟" میں نے پوچھا۔
"بالکل پکی سمجھو اپلفی لگ گئی ہے بات پر۔ بلکہ فضلو میرا خیال ہے کہ ہم آج ہی کوئی کارروائی شروع کریں زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہو گا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
"میرا پروگرام رات کو موو کرنے کا ہے ابھی تین سے چار گھنٹے ہمارے پاس ہیں۔ ہم آرام سے کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ زبردست۔" ٹونی بولا۔
"فضلو مجھے یہ نقشہ سمجھا دے پھر کچھ سوچتے ہیں۔ ویسے

یہ نقشے مجھے آج تک جغرافیہ کے بڑے بڑے پروفیسر نہیں سمجھا سکے مگر اس وقت زندگی کا سوال ہے شاید بھیجے میں کچھ داخل ہو جائے۔''

''یار یہ اتنا مشکل نہیں ہے میں نے نقشہ ٹیبل پر پھیلا دیا۔ نواب کی حویلی تک ہمارے اس ہوٹل سے دو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ پولیس اسٹیشن کے متعلق میں تمہیں بتا چکا ہوں' حویلی کے آس پاس تقریباً پانچ سے دس گھر مزید ہیں اور وہ سب سفید پوش طبقے کے لوگ ہیں جو اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ حویلی کے مین گیٹ کے ساتھ پندرہ فٹ اونچی چوکی ہے جہاں پر رات کے وقت ایک چوکیدار موجود ہوتا ہے اور وہ مسلح نہیں ہوتا۔ اس کا اصل کام یہ ہے کہ رات کے وقت آوارہ جانور فالسے کے باغ کو نقصان نہ پہنچائیں کیونکہ حویلی کے ساتھ ہی نواب صاحب نے اپنے شوق کے لیے فالسے کے کافی پودے لگا رکھے ہیں جو کہ ایک چھوٹے سے باغ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حویلی میں کوئی سیکورٹی نہیں ہے کیونکہ یہاں چوری چکاری اور ڈکیتی کا تصور نہیں ہے اور......''ٹونی نے میری بات کاٹی۔

''تجھے یہ معلومات کس نے دیں؟''

''مجھے دادا جی نے بریف کیا ہے۔''میں نے جواب دیا۔ ٹونی مسکرایا۔

''مسٹر فضلو اگر دادا حضور کے بقول یہاں امن و امان ہے اور ان لوگوں کا اپنا ایک بھائی چارے کا سسٹم موجود ہے تو پھر پولیس اسٹیشن کی موجودگی کا کیا جواز پیش کیا جائے؟''

''پولیس اسٹیشن خانہ پری کے لیے ہے۔''میں نے کہا۔

''اور وہاں صرف دو اہلکار موجود ہوتے ہیں جن کا روٹی پانی بھی خواب نگر کے لوگ دیتے ہیں۔''ٹونی نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے تم اپنی بات جاری رکھو۔ میں نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی وہ حویلی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ عقب سے ہم داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہاں رسک ہے۔''

''رسک کیوں ہے؟''ٹونی بولا۔

''تمہارے مطابق پولیس اسٹیشن میں صرف دو پولیس والے موجود ہوتے ہیں۔

رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے ایک پولیس والا ہی کافی ہوتا ہے۔''میں نے جواب دیا۔''اور حاصل شدہ معلومات کے مطابق یہ فرض شناس پولیس والے ہیں اپنے تھانے والی پولیس نہ سمجھو۔ ہم حویلی کی دائیں سائیڈ سے اندر کودیں گے فرنٹ پر جو حصہ ہے وہاں پانچ کمرے ہیں اور وہ ملازمین کی رہائش گاہ ہے۔ اس سے ذرا آگے نواب صاحب کی رہائش گاہ اور زنان خانہ وغیرہ ہے سب سے آخر میں عقبی جانب گودام وغیرہ ہیں جہاں مختلف انواع اقسام کی اشیا اور اناج وغیرہ محفوظ کیا جاتا ہے اور ہماری مطلوبہ اشیاء بھی وہیں ہیں۔''ٹونی نے ہاتھ مسلے۔

''پولیس اسٹیشن بھی عقبی جانب ہی ہے ہم سائیڈ سے کود کر بھی عقبی طرف ہی پہنچ جائیں گے۔''

یار پولیس اسٹیشن حویلی سے باہر ایک گلی چھوڑ کر ہے حویلی کے اندر نہیں ہے۔''میں نے تپ کر کہا۔

ٹونی نے ذرا جھک کر نقشے کو دیکھا۔''اور یہ سبز رنگ کا جو بڑا سا نشان ہے یہ تو حویلی کے اندر دکھائی پڑ رہا ہے اس سے دادا حضور نے کچھ ثابت کیا ہے یا نہیں؟''میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

''یہ برگد کا بہت بڑا درخت ہے۔''ٹونی نے سرد آہ بھری۔

''ٹھیک ہے بھائی مگر میرے خیال میں پلان ابھی ادھورا ہے' ہیرے کہاں پڑے ہوں گے کس چیز میں محفوظ ہوں گے اس کا کچھ پتہ ہے کہ نہیں؟ اور سب سے بڑھ کر واپس نکلنے کا تو تم نے کچھ بتایا نہیں؟''

''یہی ضروری چیز ہوتی ہے میں نے سب کچھ طے کر لیا ہے یار۔''میں نے کہا۔

''ہیرے کہاں ہوں گے اس کا کچھ کنفرم دادا جی نے نہیں بتایا نقشے کے مطابق عقبی حصے میں تین کمرے ہیں جن میں سے دو اجناس وغیرہ کے لیے مخصوص ہیں جب کہ ایک میں نواب صاحب نے اپنا جنون جمع کر رکھا ہے۔''ٹونی چونکا۔

''جنون کا کیا مطلب؟''

''جنون سے مراد نواب صاحب کی وہ چیزیں ہیں جو انہوں نے دنیا کے کونے کونے سے بڑی محنت و ریاضت کے بعد اکٹھی کی ہیں۔''میں نے کہا۔

''انہیں ہم نوادرات بھی کہہ سکتے ہیں اور انہی میں

ہمارے ہیرے بھی موجود ہیں ہم رات گیارہ بجے کے بعد حویلی کے اندر انٹری ماریں گے جب کہ ہوٹل سے ہم نو بجے روانہ ہوں گے کیونکہ اس وادی میں لوگ نو بجے کے بعد گھروں میں بند ہو جاتے ہیں اگر اس کے بعد ہم یہاں سے نکلے تو لامحالہ مشکوک ہو جائیں گے کیونکہ ہمیں وہاں تک جانے کے لیے بگھی کی ضرورت ہوگی۔'' ٹونی نے تیوری چڑھائی۔

''بگھی میں کیوں؟ اپنی گاڑی کیا عمران خان کے دھرنے میں چلی گئی ہے۔ ٹونی صاحب۔''

''یہاں کار اور موٹر سائیکل وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بڑے بڑے لوگ بگھیاں استعمال کرتے ہیں ہم کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو معمول سے ہٹ کر ہو اور اس کی وجہ سے ہم یہاں کے لوگوں کی نظروں میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ بن جائیں یہ چیز آگے چل کر ہمارے مقصد میں روڑے اٹکا سکتی ہے جہاں تک واپس نکلنے کا سوال ہے تو اس کے لیے بھی میں نے نقشے کے مطابق ہی منصوبہ بندی کی ہے۔'' ٹونی نے جمائی لی۔

''یار فضلو تو نے نقشے کو زیادہ ہی کولمبس کا درجہ دے دیا ہے کہیں یہ نقشہ ہماری ٹانگیں تڑوانے کا سبب نہ بن جائے۔'' میں ہنس پڑا۔

''نہیں یار جیسا کہ تمہیں پتہ ہے جہاں سائیڈ والی دیوار سے ہم نے اندر کودنا ہے وہاں ایک برگد کا بہت بڑا درخت ہے اسی کو ہم واپسی کے لیے استعمال کریں گے۔''

''اوکے۔ پھر کب نکلنے کا ارادہ ہے۔'' ٹونی نے کہا۔

''ارادہ تو آج کا تھا مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ کل پر رکھ لیں کیونکہ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ پوری وادی گھوم لیں تاکہ کبھی بھاگنا دوڑنا پڑے تو مشکل پیش نہ آئے زبردست آئیڈیا ہے۔'' ٹونی نے واپس بیڈ پر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر فضلو صاحب یہاں واش روم کا پتہ نہیں چل رہا اور جا رہے ہیں نواب صاحب سے ہیرے واپس لینے۔''

''ابے کھوتے واش روم اٹیچڈ ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ٹونی نے بیڈ پر دوسری قلابازی لگائی۔

''فضلو جگر اب تو لگتا ہے واش روم پولیس اسٹیشن کا ہی نصیب ہوگا۔''

❁……❁……❁……❁

یہ دوسرے روز کا قصہ ہے وال کلاک نے جیسے ہی نو بجنے کی اطلاع دی ہم ہوٹل سے نکل پڑے وادی خواب نگر کی سڑکوں پر ابھی قدرے چہل قدمی تھی دور تک سڑک پر پیلے رنگ کی لائٹس نے عجب سا نظارہ قائم رکھا تھا لوگ بگھیوں پر آجا رہے تھے فضا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ٹونی نے رومال سے ناک صاف کی۔

''فضلو یار اک آئیڈیا باہر آنے کو بے چین ہو رہا ہے اگر تیری اجازت ہو تو؟''

''ہاں بول۔'' میں نے کہا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ......'' اس نے ایک بار پھر ناک کو رگڑا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم دادا حضور کی فراہم کردہ گاڑی فروخت کر کے یہاں ایک ہلکا پھلکا سا گھر لے لیں یہ اس سڑک کے پار درختوں میں گھرا ہوا ہو اور پھر تو اپنے ہاتھوں سے میری شادی کر دے زندگی اپنی آرام سے گزر جائے گی۔''

''ٹھیک ہے محترم۔'' میں نے کہا۔

''مگر پھر ذرا سائیڈ پر اپنی قبریں بھی کھدوانا ضروری ہے دادا حضور چھوڑنے والے نہیں۔'' ٹونی نے شرمندہ ہوتے ہوئے سر میں کھجلی کی۔

''یار اس شرلاک ہومز والی مہم سے جان چھڑانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟''

''یہ تیری بھول ہے کہ اس معرکے سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ شہید ہونے یا غازی بننے کے علاوہ ہمارے پاس تیسرا کوئی آپشن موجود ہی نہیں۔'' میں نے ایک بگھی کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بگھی ہمارے پاس آ کے رک گئی ٹونی اسے حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔

''فضلو بابا اس پر بیٹھنا کیسے ہے یہ تو ٹیڑھی ہے کوئی صحیح والی بگھی ڈھونڈ۔''

''یہ ساری ایسے ہی ہوتی ہیں چل بیٹھ۔'' میں نے اسے

آگے دھکیلا۔

''صاحب جی کہاں جانا ہے کوچوان نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

''روشن بازار اتار دینا۔'' آخری نکڑ پر میں نے کہا۔ یہ تھوڑا فاصلہ ثابت ہوا ہم پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچ گئے۔ ٹونی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔

''ابھی سوا نو ہوئے ہیں دو گھنٹے کہاں گزاریں گے۔''

''اس کا بھی انتظام ہے۔'' میں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ڈھابا دیکھ رہے ہو وہاں ہم وقت گزاریں گے اور اس کے ساتھ تیرے پیٹ کا دوزخ بھی بھر جائے گا۔''

''خدا تجھے خوش رکھے۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تیرے سوا اور میرا کون ہے اس دنیا میں؟''

''بس اب زیادہ مسکے نہ لگاؤ۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

ہم نے ایک کونے والی ٹیبل منتخب کی۔ وہاں روشنی کم تھی اور آس پاس لوگ بھی زیادہ نہیں تھے۔ ''یہاں سے نواب کی حویلی کتنی دور ہے؟'' ٹونی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تقریباً تین منٹ کا پیدل سفر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر تو پریشانی والی بات نہیں ہے' یہاں سے دس منٹ پہلے نکل جائیں گے۔'' وہ کرسی پر پھیل گیا۔ اگلا ڈیڑھ گھنٹہ ہم نے خواب نگر کا قہوہ پیتے ہوئے گزارا۔ اس دوران ہوٹل نما ڈھابے میں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اکا دکا افراد بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔'' میں نے ٹونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دلبرداشتہ ہو رہا تھا۔

''فضلو میرے بھائی' تیرا کوئی بڑھئی وغیرہ دوست ہے؟'' میں حیران ہوا۔

''بڑھئی دوست کیا مطلب؟''

''مطلب سیدھا سادا ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''اس بڑھئی دوست سے لکڑی کے تین خوبصورت سے ہیرے تیار کرواتے ہیں اور ایک مخملی ڈبیا میں بند کر کے دادا جی کے پاس لے جاتے ہیں اگر ڈبیا پر سونے کے ورق سے کڑھائی وغیرہ ہو جائے تو زیادہ متاثر کن کام بن جائے گا۔''

''یار ٹونی پلیز فضول باتیں مت.....'' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میری سن تو لے۔ دادا جی کو بول دیں گے کہ نواب صاحب نے اصل ہیرے کسی بینک میں رکھے ہوں اور حویلی میں یہ نقلی رکھے ہیں۔ دادا جی رو دھو کے چپ ہو جائیں گے اللہ اللہ خیر سلا۔'' میں نے دانت پیسے۔

''دیکھ ٹونی اگر صدمے سے تمہارا دماغ چل گیا ہے تو براہ کرم واپس ہوٹل میں چلے جاؤ۔ مگر اس طرح کے بھونڈے منصوبے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ٹونی نے بے چارگی سے مجھے دیکھا۔

''فضلو کیا تجھے لگتا ہے' ہم یہ سب کر لیں گے؟''

''ہمیں کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ صرف دادا جی کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ہماری ماضی کے سارے پاپ دھونے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ٹونی ذرا تصور کرو اگر ہم کامیاب ہو کے واپس جاتے ہیں تو اس کا سب سے بڑا فائدہ تمہیں ہو گا۔''

ٹونی حیران ہوا'' مگر کیسے؟''

میں مسکرایا۔

''تمہارا بہت اہم فائدہ یہ ہے کہ تمہیں دعا کی باتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس کا منہ تو سمجھو تو ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ تم ایک ہیرو کی مانند یوں گھر میں گھوما کرو گے دعا چائے کا کپ اور کھانے کی چنگیر اٹھا کر تمہارے پیچھے رہا کرے گی کیونکہ یہ دادا جی کا حکم ہو گا کہ ہمارے ہیرو کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔'' ٹونی کا منہ کھل گیا۔

''فضلو میری جان' یہ خواب حقیقت میں بدل جائے گا نا؟''

میں نے اس کے سر پر چپت رسید کی۔ ''ضرور حقیقت میں بدلے گا مگر اس کے لیے تمہیں اپنی بزدلی کو بہادری میں بدلنا ہو گا۔''

''فضلو اگر یہ بات ہے تو سمجھ لے کہ ہلاکو خان کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔ آج کے بعد بزدلی کی چڑیا میرے

پاس نہیں پھٹکے گی۔''

''بہت اچھے اب ان نیک ارادوں پر قائم رہنا۔'' میں نے ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم نے چہل قدمی کے انداز میں سڑک پر چلنا شروع کردیا۔ یہ ایک سادہ سی سڑک تھی جو تھوڑا آگے جاکے تین حصوں میں تقسیم ہوجاتی تھی۔ ان تین سڑکوں میں سیدھی نکلنے والی سڑک پر کچھ دیر پاؤں گھسیٹنے کے بعد ہم نواب صاحب کی حویلی کے عین سامنے کھڑے تھے۔ یہ لوکیشن بالکل دادا جی کے فراہم کردہ نقشے کے مطابق تھی۔ ٹونی نے گہری نظروں سے جائزہ لیا۔

''یار اسے حویلی کا نام دینا زیادتی ہے۔ ہم اسے بڑا گھر کہہ سکتے ہیں۔''

''اس میں نواب صاحب رہتے ہیں اس لیے یہ حویلی ہی کہلائے گی۔'' میں نے کہا۔

''اوہو نواب صاحب مغلیہ دور میں جی رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے ہینڈ بیگ سے ایک چاقو نکال کر ٹونی کو پکڑایا۔

''اسے سنبھال لو بوقت ضرورت کام آئے گا۔'' اس نے چاقو پکڑ لیا۔

اب ہمیں گھوم کر دائیں طرف والی دیوار تک جانا ہوگا۔ وہاں سے ہمیں اندر جانا ہے۔''

ٹونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حویلی کے مین گیٹ پر بنی ہوئی چوکی مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فالسے کے پودے تاریکی میں اپنا ہلکا سا ہیولا دکھا رہے تھے۔ ہم عین اس مقام پر آکے رک گئے۔ جہاں اندر کی طرف برگد کا درخت تھا۔ ٹونی نے دیوار کو دیکھا۔

''یار اس کی بلندی زیادہ ہے۔ اندر جانے کا کیا منصوبہ ہے؟''

''منصوبہ ہے بس تم دیکھتے جاؤ'' میں نے پرسوچ انداز میں نظریں دیوار پر جمادیں۔ پہلے جانے والا آسانی میں رہے گا۔ تم میرے کندھے پر سوار ہوکر اندر چھلانگ لگاؤ گے۔ اس کے بعد میں ایک کھونٹی لگا کر رسا اندر پھینکوں گا۔ جسے تم نے برگد کے درخت میں کسی جگہ اچھی طرح پھنسا دینا۔ میں اس کے ذریعے اندر آجاؤں گا۔''

''یعنی کہ قربانی کا پہلا بکرا میں بنوں گا؟'' ٹونی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں واضح سرزنش تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''ٹونی صاحب ہلاکو خان کی روح کدھر گئی؟''

وہ بڑبڑایا۔

''آج شاید پہلی بار ہلاکو خان بے چارہ ذلیل ہوجائے گا۔'' میں نے اس کا کندھا تھپکا۔

''اوئے یار میں ڈر نہیں رہا بس ذرا سا نروس ہوں۔'' میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

''آجاؤ ٹونی' میں تمہیں ذرا سا اوپر اٹھاؤں گا' تم پہلے اندر کا جائزہ لو گے' تمہاری طرف سے گرین سگنل ملتے ہی میں پورا اوپر آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور میرے کندھے پر بیٹھ گیا۔ میں آہستہ سے کھڑا ہوا۔ ٹونی کا سر دیوار تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اندر دیکھا اور بولا۔

''اندر گھپ اندھیرا ہے۔''

''میں چھلانگ لگا رہا ہوں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اوپر آگیا۔

''دیر مت کرو۔'' وہ اندر کی طرف کود گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی طرف سے خاموشی رہی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹونی کی ہلکی سی آواز آئی۔

''فضلو رسا پھینک۔'' میں نے ہینڈ بیگ سے رسا نکالا اور اس کی کھونٹی والا سرا دیوار کے پار پھینک دیا۔ ٹونی نے ذرا دیر بعد آواز دی۔

''فضلو یہ برگد کے درخت میں کہیں بھی فٹ نہیں آرہا اس کی شاخیں بہت بڑی ہیں۔'' میں پریشان ہوا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے دیوار کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

''ٹونی میں یہ ہینڈ بیگ تیری طرف پھینک رہا ہوں۔ اس میں ڈیڑھ سے دو فٹ کی ایک خاصی تگڑی کیل ہے۔ اسے دیوار کے بالکل ساتھ زمین میں گاڑ دو۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے کہا۔

''اس طرف پھولوں کی کیاریاں ہیں' زمین بھی کچھ نرم ہے مگر کیل ٹھونسنے کے لیے کوئی چیز ہونا بھی ضروری ہے۔

بیگ اندر اچھالتے ہوئے کہا۔

ٹونی کو اس کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور پھر اس کی سرگوشی نما آواز ابھری۔

"فضلو آجا' سب ریڈی ہے۔" میں نے رسے کو کھینچ کر مضبوطی کا اندازہ کیا اور چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد دوسری طرف پہنچ گیا۔ ٹونی نے کیل اکھاڑ کر واپس بیگ میں رکھی۔

"کیوں بھئی ہیرو' کیسا رہا میرا کام؟"

"ابھی تک تو بہت عمدہ رہا' آگے دیکھو کیا ہوتا ہے" میں نے بیگ اس سے لیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے' ہم عقبی حصے کے عین سامنے کھڑے ہیں۔" میں مسکرایا۔

"اور ٹونی صاحب! یہاں سے ہی میرا قائدانہ کردار شروع ہوا چاہتا ہے۔ تم میرے پیچھے چلو گے۔"

"اوکے باس۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"ضرورت کے وقت تو گدھا بھی باپ ہوتا ہے۔" میں نے قہقہہ لگایا۔

"یار تم نے بیک وقت مجھے گدھے اور باپ کے رتبے پر فائز کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔" ٹونی نے جواباً مجھے ایک فربہ انداز کی گالی سے نوازا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"ٹونی ہمیں برگد کے درخت کے دائیں جانب پندرہ قدم چلنا ہے وہاں تین کمرے ایک قطار میں بنے ہوں گے۔ درمیانی کمرہ ہمارا مطلوبہ کمرہ ہے۔" میں دروازے کا قفل توڑ کر اندر جاؤں گا۔ جب کہ تم باہر رہ کر مجھے کور کرو گے۔"

"صحیح ہے۔" ٹونی نے ہنکارا ابھرا۔

میں دھیرے قدموں سے آگے بڑھا اور ٹونی مجھ سے چند قدم پیچھے تھا۔ میں نے ہینڈ بیگ سے اسمارٹ ٹارچ نکال کر ہاتھ میں پکڑلی تاکہ اچانک ضرورت پڑنے پر استعمال کی جاسکے۔

یہ حویلی کا سب سے آخری حصہ تھا۔ کافی فاصلے پر حویلی کے فرنٹ والے رہائشی حصے کی روشنیاں ستاروں کی مانند دکھائی پڑ رہی تھیں۔ ہم کمرے کے سامنے جا کر رک گئے۔ تین کمرے بالترتیب ہمارے سامنے تھے۔ میں نے ٹونی کو ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود درمیانی کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ایک سادہ سا کمرہ تھا جس میں پرانی طرز کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ البتہ تالہ کافی بڑا اور مضبوط لگ رہا تھا۔

میں نے بیگ سے ہتھوڑی اور تانبے کا تار نکال کر تالے سے زور آزمائی میں مصروف ہوگیا۔ یہ کام میری توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چند منٹ کی کوششوں کے بعد میرے دانتوں میں پسینہ آ گیا۔ میں نے ٹونی کو پاس بلایا۔

"یار یہ تالا نہیں کھل رہا۔"

اس نے بے چینی سے دروازے پر ہاتھ مارا۔

"دادا جی نے نقشے میں قفل سازی کا کوئی فارمولا نہیں لکھا؟" ٹونی کے انداز پر مجھے غصہ آیا مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ یہ وقت لڑنے کا نہیں تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔

"یار بات سمجھنے کی کوشش کرو' دادا جی نے بتایا تھا کہ پرانے قفل ایک ضرب سے ٹوٹ جائیں گے۔ مگر یہاں کا سناٹا دیکھ کر میں نے پلان تبدیل کیا ہے۔ کیونکہ تالے پر چوٹ لگانے سے کافی شور ہوگا۔"

"اب تو چوٹ لگانی پڑے گی۔" وہ بولا۔ "ورنہ ہم چوہے دان میں پھنس کر رہ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں' تم ذرا چوکنے رہو۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک برگد کے درخت کی طرف سے دھپ کی آواز آئی۔ جیسے کوئی اندر کودا ہو۔ اس کے فوراً بعد مسلسل تین چار آوازیں مزید سنائی دیں۔ میں واپس ٹونی کی طرف پلٹا۔ وہ بھی دہشت زدہ سا کھڑا تھا۔

"فضلو لگتا ہے کچھ لوگ اس طرف سے اندر داخل ہوئے ہیں۔"

"ہاں مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" میں نے اسے ایک بڑے سے پودے کی آڑ میں کھینچتے ہوئے کہا۔ ہم سانس روکے وہاں دبک گئے۔ چند لمحوں کے سناٹے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے کوئی محتاط قدموں سے کمروں کی طرف آرہا ہو۔ ٹونی نے سرگوشی کی۔

"فضلو' یہ ایک سے زیادہ لوگ لگتے ہیں۔ کہیں حویلی کے محافظ نہ ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری پوری توجہ قدموں کی آواز پر تھی۔ کمروں کے پاس پہنچ کر آوازیں تھم گئیں۔ ایک رعب دار آواز گونجی۔

''یہ وہ تین کمرے ہیں' درمیانی کمرے کا تالا توڑ دو۔''

پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ تالا ٹوٹنے کی مخصوص آواز آئی۔

''لو جناب حضرت فضلو صاحب' تالا ٹوٹ گیا ہے۔''

ٹونی نے طنزیہ سرگوشی کی۔ میرا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔ یہ حویلی کے لوگ تو ہرگز نہیں تھے کسی مکان کے مکین اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل نہیں ہوا کرتے۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے کیا یہ بھی ہماری طرح ہی نیک ارادوں کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے پودے کی اوٹ سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ غالباً وہ سب کمروں کے اندر جا چکے تھے۔ ٹونی نے مجھے گردن سے پکڑ کر واپس کھینچا۔

''اپنا تھوبڑا اندر ہی رکھو۔''

''یار مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔ یہ سب چل کیا رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

''تجھے بے چینی نہیں کھجلی ہو رہی ہے' تیری یہ کھجلی پستول کی ایک گولی ہی دور کر سکتی ہے۔'' ٹونی نے غراہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ٹونی کیا ہم ناکام ہو گئے ہیں؟''

وہ چپ رہا۔

میں نے ایک بار پھر باہر جھانکا اور چونک گیا۔ دو آدمی ایک سرخ رنگ کا صندوق اٹھائے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ جب کہ ان کے عقب میں ایک آدمی اور تھا جس کے کندھے پر رائفل جھول رہی تھی۔ انہوں نے صندوق زمین پر پٹخ دیا۔ رائفل والا بولا۔

''اس کے تالے توڑ کر دیکھو۔ اس میں وہ ڈیڑھ فٹ کا مجسمہ ہے شاباش۔''

''جلدی کرو ہمارے پاس ٹائم بالکل نہیں ہے۔''

میری اور ٹونی کی آنکھیں چار ہوئیں۔

''اوہو یہ سارے کارٹون کسی مجسمے کو ڈھونڈنے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔'' ٹونی نے غصیلی سرگوشی کی۔

''جناب مجسمہ مل گیا۔'' کوئی خوشی بھری آواز میں بولا۔

''وری گڈ۔'' رائفل والا ستائشی انداز میں بولا۔

''اس صندوق میں اور کیا کچھ ہے۔ کوئی کام کی چیز ہے تو وہ بھی نکال لو۔''

''جناب یہ سارا صندوق اسی طرح کی پرانی اشیاء سے بھرا ہوا ہے۔'' پہلے والے شخص نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اسے لے چلو یہ چیزیں بھی نیلامی میں رکھ دیں گے۔ وہاں کام آئیں گی۔'' پھر اس نے موبائل فون پر کسی کو اپنی کامیابی کی اطلاع دی۔

''سر ہم مجسمہ لے کر آ رہے ہیں۔ صبح دس بجے تک پہنچ جائیں گے۔ آپ انتظامات پورے رکھیں۔'' وہ دوسری طرف سے بات سننے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مگر سر...... آپ مجھے ایڈریس نوٹ کروائیں' خان ہاؤس' واسا کالونی ڈی بلاک لاہور۔ اس کا مطلب ہے سر نیلامی پرسوں کے بجائے کل ہو گی۔ شام چھ بجے او کے سر بائے۔'' اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھا۔

''ہری اپ دوستو!'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''اب لاہور جانا پڑے گا۔ بس نکلنے کی کرو۔'' وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ہم جیسے خواب سے بیدار ہوئے۔ ٹونی نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

''فضلو جلدی کرو' ہم بھی اپنا کام کریں' میدان صاف ہے۔'' میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''ٹونی میدان کے علاوہ بھی سب کچھ صاف ہے' وہ صندوق لے گئے ہیں اس میں اپنے خاندانی ہیرے تھے۔'' ٹونی صدمے کی کیفیت میں آ گیا۔

''یہ بات تو کس بنیاد پر کہہ رہا ہے فضلو؟''

''دادا جی کے فرمودات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نقشے میں بھی اس بات کی نشاندہی تھی درمیان والے کمرے میں سرخ رنگ کا ایک ہی صندوق ہو گا جس میں ہیروں کے علاوہ بھی کئی قیمتی نوادرات ہوں گے اور دادا جی نے ہدایت کی تھی کہ اپنے ہیروں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہ

لگانا۔‘‘ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔
ٹونی اندھیرے میں گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔
’’قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند۔‘‘
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' اس کی غائب دماغی والی بڑبڑاہٹ جاری رہی۔
’’دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے۔‘‘ میں نے زور سے اسے ہلایا۔
’’ابے کیا ہوگیا ہے تجھے؟‘‘
’’ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔‘‘ اس نے ایک اور بڑبڑاہٹ چھوڑی۔
’’یار ٹونی ہوش کر۔‘‘ میں نے اسے جھنجوڑا۔
’’بہت نکلے میرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے۔‘‘ وہ مصرعہ پورا کر کے ہی رہا۔
’’پریشان مت ہو یار سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔
’’یہاں رکنا بے وقوفی ہے ہمیں جلد از جلد نکلنا ہوگا۔‘‘ اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
’’پتھروں پر چل کے آسکو تو آجاؤ۔ میرے گھر کے سامنے کوئی۔‘‘ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا۔
’’ٹونی خدا کے لیے مجھے ٹینشن مت دو۔ ہمیں ہوٹل پہنچنا ہے۔‘‘
’’فضلو میں پاگل ہو رہا ہوں۔‘‘ وہ بولا۔
’’مجھے لگ رہا ہے کہ میری کھوپڑی کے انفراسٹرکچر میں کچھ ردوبدل ہو رہا ہے جیسے کہ......‘‘
’’اس کیفیت کو آسان لفظوں میں ذہنی توازن کی خرابی کہتے ہیں۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور دادا جی کے پاس اس کا ایک سے بڑھ کر ایک انجکشن موجود ہے۔‘‘
’’خدا تجھے غارت کرے۔‘‘ وہ بولا۔
’’اس انجکشن سے تو موت کا انجکشن بہتر ہے۔‘‘

❁ ❁ ❁ ❁

اگلے دن کی صبح خاصی نکھری تھی۔ رات کے آخری پہر بارش ذرا جم کر ہوئی تھی۔ اس لیے وادی خواب نگر کے در و دیوار اور درخت صاف شفاف دکھائی پڑ رہے تھے۔ ہم نے ڈائننگ ہال میں جانے کے بجائے ناشتہ اپنے روم میں منگوالیا تھا۔ ٹونی نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔
’’فضلو واپسی کا پروگرام کب ہے کیونکہ اب دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔‘‘ میں نے غور طلب نظروں سے اسے دیکھا۔
’’ٹونی اگر میں کہوں کہ وہ ہیرے ابھی بھی ہمیں مل سکتے ہیں تو پھر تیرا کیا خیال ہوگا؟‘‘
’’تیرا دماغ چل گیا ہے۔‘‘ وہ بولا۔
’’یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔‘‘
’’ٹونی تم ضرورت سے زیادہ مایوس ہو رہے ہو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ہم نے صرف ایک موقع گنوایا ہے ہیرے نہیں گنوائے۔ اور وہ کھویا ہوا موقع ہمیں دوبارہ مل سکتا ہے لیکن ذرا محنت کرنا ہوگی۔‘‘
اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔
’’فضلو میں اب مزید کسی ایڈونچر کے موڈ میں نہیں اور دادا جی کے سامنے جا کر اعتراف کرنے والا ہوں کہ ہم ناکام ہوگئے ہیں۔ جو سزا دی جائے وہ منظور ہے۔‘‘
’’ہم نہیں صرف تم ناکام ہوئے ہو۔‘‘ میں نے دہاڑ کر کہا۔
’’کیونکہ ٹونی تم ایک کم ہمت اور بزدل انسان ہو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ واپس دفع ہوجاؤ' میں ناکام جانے والا نہیں ہوں۔‘‘
ٹونی کی آنکھیں پھیل گئیں۔
’’فضلو یہ تم ہو؟ میرے بھائی تمہیں کیا ہوگیا ہے؟‘‘
’’مجھے بھائی مت کہو۔‘‘ میں ایک بار پھر چلایا۔
’’اپنا سامان اٹھاؤ اور چلے جاؤ۔‘‘
وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔
’’یعنی کے ایموشنل بلیک میلنگ ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے جلدی بتا کرنا کیا ہے؟‘‘
میں نے اسے سینے سے لگالیا۔
’’شکر ہے یار میری ایکٹنگ ضائع نہیں ہوئی۔‘‘ وہ مجھ سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔
’’ڈرامے بازی بند کرو اور بتاؤ پلان کیا ہے؟‘‘
’’پلان بتانے کا وقت نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

"دو لفظی بات یہ ہے کہ ہمیں لاہور جانا ہے......"
اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔
"کار پر؟"
"نہیں پیرا شوٹ سے۔" میں نے جواب دیا۔
"ٹونی سوال و جواب بالکل نہیں، سامان باندھو اور نکلنے کی تیاری پکڑو۔" ٹونی اپنے بیگ کی طرف بڑھا۔
"حد ہوگئی ہے یار، زندگی میں آرام نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہم سے اچھا تو کولمبس تھا جس نے بیڈ روم میں بیٹھ کر امریکا دریافت کرلیا۔"
"تجھے یہ مفاد عامہ کی معلومات کہاں سے ملی؟" میں نے پوچھا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔
"مجھے دادا جی نے بتایا تھا جب ایک دن وہ خود کو کولمبس کا کلاس فیلو ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔" ہم نے اپنا سامان اٹھایا۔ ہوٹل کے ریسپشن پر بل پے کیا اور لاہور کی راہ لی۔ البتہ ٹونی جاتے ہوئے بھی استقبالیہ کلرک پر لائن مارنا نہیں بھولا تھا مگر شومئی قسمت کہ شاید اس لائن میں مستقل بنیاد پر کوئی تیکنیکی خرابی چل رہی تھی۔

❀......❀......❀......❀

دوپہر ڈھلنے لگی تھی جب ہم لاہور کی حدود میں داخل ہوئے ٹونی نے گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"نیلامی کا وقت کب ہے۔"
"چھ بجے۔" میں نے جواب دیا۔
"اور شاید رات گئے تک جاری رہے۔"
"میرا خیال ہے کسی ریسٹورنٹ میں کچھ کھا پی لیا جائے۔" وہ بولا۔
"نہیں تم کسی بوتیک کے سامنے گاڑی روکو۔" میں نے کہا۔
اس نے بیک مرر سے مجھے دیکھا۔
"بوتیک پر کیوں......؟"
"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔
اس نے ایک بڑے سے شاپنگ مال کے سامنے بریک لگائے۔
"میرا خیال ہے اس میں تمہارا بوتیک ہوگا۔ میرے

مہکتی کلیاں

▬ جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔

▬

▬ جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہ سکتے اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔
▬ اپنی زندگی کا اصول بنا لیجیے کہ کسی سے بُرا کرنے میں کبھی پہل نہ کریں یقین مانیے آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔
▬ پہلی ملاقات میں کسی شخص کے متعلق رائے قائم مت کریں، کیا معلوم اس وقت اس کا آپ کے ساتھ اچھا بُرا پیش آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔
▬ اپنی رائے ضرور دیں مگر رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے سے گریز کریں۔

نادیہ عباس دیا......موسیٰ خیل

دوستی

❖ دوست پیار کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کے لیے مگر بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار اور دوستوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔
❖ دوست وہ نہیں ہے جو جان دیتا ہو، دوست وہ بھی نہیں جو مسکان دیتا ہو، دوست تو وہ ہے جو پانی میں گرا آنسو پہچان لے۔
❖ دوست کی کوئی بات بُری لگے تو خاموش ہو جاؤ اگر وہ تمہارا دوست ہوا تو سمجھ جائے گا اور اگر نہ سمجھ سکا تو پھر تم سمجھ لینا کہ وہ تمہارا دوست نہیں۔

نبیلہ ملک......چوٹالہ

لیے بھی وہاں سے ایک برگر لیتے آنا۔"
"تم میرے ساتھ تشریف لاؤ۔" میں نے کہا۔
"پھر بتاتا ہوں کہ بوتیک سے کیا ملتا ہے۔"
شاپنگ پلازہ کافی بڑا اور شاندار تھا۔ میں نے گارمنٹس کی ایک شاپ منتخب کی' سیلز مین کاروباری خوش اخلاقی سے مسکراتا ہوا لپکا۔
"جی سر کیا دکھائیں آپ کو۔"
"ہمیں ایسا ڈریس چاہیے کہ جسے پہن کر ہم نو دولت کے تاجر دکھائی دیں۔" میں نے کہا۔
اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔
"سر میں کچھ سمجھا نہیں۔"
میں نے ٹونی کی طرف دیکھا۔
"یار لگتا ہے ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔"
سیلز مین گڑبڑا گیا۔
"آپ پلیز ایک منٹ کے لیے رکیے۔" وہ جلدی سے شاپ کے عقبی حصے میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ واپس آیا۔
"یہ آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ٹونی نے فوراً جوابی مسکراہٹ ارسال کی۔
"زیادہ باچھیں پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا اور سیلز مین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ادھیڑ عمر آدمی واقعی اپنے کام کا ماسٹر تھا۔
اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے یہ توجیہہ پیش کی کہ "ہم یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ ہیں سالانہ فیسٹیول کے موقع پر ہمیں ایک ڈرامے کے لیے اس گیٹ اپ کی ضرورت ہے۔"
اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ٹرائی روم کے قد آدم آئینے میں ہم نے اپنا جائزہ لیا تو دل خوش ہوگیا۔ ہماری شخصیت کا کھلنڈرا پن کہیں غائب ہوگیا تھا اس کی جگہ خوش گوار سی سنجیدگی نے لے لی تھی۔
"اس ماسٹر نے تو ہمیں بندہ بنا دیا ہے۔" ٹونی نے کوٹ کا بٹن درست کرتے ہوئے کہا۔
"میں پہلے ہی بندہ تھا تیرے بارے میں کچھ کنفرم نہیں ہے۔" میں نے کہا اور کاؤنٹر پر ادائیگی کے لیے بڑھ گیا۔

پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے لاہور کی شامیں بڑی سہانی اور حسین ہوتی ہیں۔ چوڑی اور چکنی سڑکوں پر گاڑی بھگانے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ گاڑیوں کا جم غفیر' اندر بیٹھے حسین چہرے' ایسے ہی نظاروں سے آنکھیں سینکتے ہوئے ہم واسا کالونی میں انٹر ہوئے۔ جا بجا ہونے والی نمائش کے متعلق اطلاعی بینرز اور شرکاء کو ویلکم کہنے کے لیے بورڈز آویزاں تھے۔ ہم نے کالونی کے مین گیٹ پر مستعد کھڑے سیکورٹی گارڈ سے نمائش کا پتہ پوچھنا ضروری سمجھا۔ اس نے پیچھے سے آنے والی چند گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لوگ اسی نمائش میں جا رہے ہیں۔
ہم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ آگے جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ سوسائٹی اپر کلاس کے لیے مخصوص ہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم پاکستان سے باہر پیرس کے کسی ٹاؤن میں گھومنے پھرنے آئے ہیں۔ اتنے میں ہمارے آگے والی گاڑیاں ایک بڑی سی کوٹھی کے سامنے پہنچ کے رک گئی جس کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور کافی گہما گہمی تھی۔ وہ گاڑیاں ریورس ہو کر پارکنگ میں چلی گئیں ۔ٹونی نے بھی گاڑی ان کے پیچھے گھسا دی۔
"لو بھئی پہنچ گئے اب اپنے اندر غیر متزلزل قسم کا اعتماد پیدا کرلو۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے ٹونی سے کہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔
"غیر متزلزل میرے خیال میں زلزلے کی آخری قسم ہے۔"
"پتہ نہیں' چلو اندر چلیں۔" میں نے کہا۔
ہم گارڈز کے سیلوٹ کا سر ہلا کر جواب دیتے ہوئے تھوڑا آگے بڑھے تو ایک نفیس سا آدمی ہاتھ میں رجسٹر پکڑے اچانک نازل ہوگیا۔

"Good evening sir your good name please?"

ایک لمحے کے لیے ہم بوکھلا گئے۔ نظریں چار ہوئیں۔ اسی وقت ٹونی کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ اس نے جھپٹ کر فون ریسیو کیا اور ہیلو کہتا ہوا ایک طرف کھسک گیا۔ اب مجھے

ہی سنبھالنا تھا۔ میں نے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات سجالیے۔

''سوری وہ دراصل ان کو ضروری فون آ گیا ہے۔''

''اٹس او کے سر' آپ تو ہیں نا۔'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

مجھے اتنا ہی موقع چاہیے تھا۔ دو دھانسو سے نام چھپاک سے میرے ذہن میں آ گئے میں طفیل شیراز نیازی ہوں' میں نے ذرا جھکتے ہوئے کہا اور وہ میرے دوست۔'' میں نے ٹونی کی طرف اشارہ کیا۔

''انہیں ملک عصمت رانا کہتے ہیں۔'' رجسٹر والے صاحب نے حیرانی سے نظریں اوپر اٹھائیں۔

''ملک عصمت رانا؟''

میں گڑبڑا گیا۔ ٹونی تیزی سے قریب آیا۔

''کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں جناب! '' فلک عصمت رانا' آپ خود سوچیے جب ملک صاحب آ گئے تو پھر رانا صاحب کی گنجائش کہاں رہے گی۔ یہ میرے محترم دوست ہیں اکثر فلک کو ملک میں بدل جاتے ہیں۔'' وہ رجسٹر بند کرتے ہوئے زور سے ہنسا۔

''بہت خوب' نائس ٹو میٹ یو سر...... پلیز آگے ٹرن میں تشریف لے جائیں نمائش شروع ہوئی جاتی ہے۔'' وہ کسی نئے آنے والے مہمان کی طرف بڑھ گیا۔

ٹونی نے میری گدی پر ہاتھ جمایا۔

''ابے بونگے' ملک اور رانا میں سے کسی ایک کے ساتھ تیرا گزارا نہیں ہوتا؟''

''غلطی ہو گئی یار۔'' میں کھسیا گیا۔

ہم لان میں پہنچ چکے تھے۔ چونکہ اندھیرا پھیل چکا تھا اس لیے خوب صورت لائٹس کی روشنی میں لان کسی دلہن کی طرح لگ رہا تھا۔ یہ خاصا وسیع و عریض لان تھا جسے اس طرح سجایا گیا تھا کہ پہلی نظر میں ہی معلوم پڑتا تھا کہ یہ سارا انتظام کسی خاص موقع کے لیے کیا گیا ہے۔ دس سے بارہ قطاروں میں کرسیاں تھیں اور ایک طرف کافی لمبی ٹیبل رکھی گئی تھی۔ آدھے سے زیادہ کرسیاں پر تھیں۔ ہم نے بھی ایک ایک کرسی سنبھال لی۔ وہاں موجود سبھی بڑے لوگ تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''یار ہمیں بھی کسی سے سلام دعا کرنی چاہیے۔'' ٹونی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''سلام دعا بھی ہو جائے گی پہلے اپنے نام ذرا دوبارہ یاد کرلیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے فلک عصمت رانا کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اور تیرا مجھے پتہ نہیں۔''

''میں طفیل شیراز نیازی ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ٹونی نے جواب دیا۔

''اب میں ذرا اگلی لائن میں براجمان اس طبلہ نما شخص سے تعارف کرلوں! مجھے یہی سب سے زیادہ مسکین لگ رہا ہے۔''

''وہ کوئی معزز شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے اظہار خیال کیا۔

''تیرے نزدیک کیا طبلہ بجانے والے معزز نہیں ہوتے؟ وہ مجھے گھور کر بولا۔

''لگتا ہے تم نے کبھی قومی اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی براہ راست نہیں دیکھی۔ میں چپ ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر آواز لگائی۔

''ہائے سر! how are you?''

اس شخص نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔

''ادھر سر' اس طرف۔'' ٹونی بولا۔ وہ ہماری طرف گھوما۔

''یس......؟''

''سر کیسے ہیں آپ؟'' اب کی بار میں نے پہل کی۔

''وہ ذرا حیران ہوا۔

''سوری' آپ کو پہچانا نہیں؟''

''سر ہم بھی آپ کی طرح نمائش دیکھنے آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔

''اچھی بات ہے مگر یہ پتہ نہیں کب شروع کریں گے اب تو بوریت ہو رہی ہے۔''

''ہم بھی بور ہو رہے ہیں سر۔'' ٹونی نے فوراً ہی لمبی سی جماہی برآمد کرلی۔

''ویسے آپ کیا خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''یہ تو دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔'' وہ بولا۔

اسی اثناء میں کچھ ملازم نمودار ہوئے انہوں نے مشروب کے گلاس حاضرین میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ یہ ایک طرح سے ریفریش منٹ تھی جو طویل انتظار کے بدلے میں دی گئی تھی۔

''سر آپ کا نام کیا ہے؟'' ٹونی نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

''سیٹھ صلاح الدین۔'' اس نے مختصر سا جواب دے کر ایک ہی سانس میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور ہماری طرف دیکھ کر ذرا جھینپ گیا۔

''اور دراصل مجھے کافی پیاس لگ رہی تھی۔''

''کوئی بات نہیں سر، سب چلتا ہے۔'' ٹونی نے بھی اپنا گلاس غٹاغٹ خالی کرنا فرض سمجھا۔

''بائی داوے' یہ نمائش کب سے ہوتی آ رہی ہے اور اسے آرگنائز کون کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

سیٹھ نے میری طرف دیکھا۔

''آپ کو نہیں معلوم؟''

''ہم پہلی بار آئے ہیں اور وہ بھی بائے چانس......'' میں نے متانت سے کہا۔

''یہ سال میں دو بار منعقد کی جاتی ہے اور ہر دفعہ مقام مختلف ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''سنگاپور سے آئے دو پاکستانی نژاد بھائی اسے آرگنائز کرتے ہیں۔ اس بار یہ چغتائی صاحب کی کوٹھی پر ہے۔ پچھلی دفعہ کا میزبان بندہ ناچیز تھا۔''

''وری نائس۔'' میں نے کہا۔

''ویسے یہ نمائش ہے یا نیلامی؟''

''یہ نیلامی نما نمائش ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہنس گیا تو پھنس گیا۔'' ٹونی نے سرگوشی کی۔

''یہ سیٹھ اپنے کام آئے گا۔'' ہم باتوں میں مصروف تھے کہ مائیک پر اعلان کیا گیا کہ نمائش کا باقاعدہ آغاز کیا جا رہا ہے۔'' لمبی میز پر شیشے کے باکس سجا دیئے گئے تھے اس کے علاوہ شیشے کی بنی ہوئی خوب صورت الماریاں بھی رکھ دی گئی تھیں۔ ہم سیٹھ صلاح الدین کے ہمراہ اس طرف بڑھ گئے۔

''ان باکسز میں نہایت ہی قیمتی زیورات ہیں۔'' سیٹھ نے پرجوش انداز میں اشارے سے بتایا۔

''اس کا پوری دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ ہر باکس کے اوپر اندر موجود اشیاء کے متعلق پوری معلومات درج ہیں۔''

''واؤ بہت خوب۔'' ٹونی نے منہ سے سیٹی بجائی۔

ہم مختلف چیزوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ سیٹھ صلاح الدین الماریوں والی طرف نکل گیا تھا۔ اچانک حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹ گئیں۔ شیشے کے ایک بڑے باکس میں سرخ رنگ کا صندوق بڑی نفاست سے رکھا ہوا تھا۔ ہم بے تابی سے ادھر لپکے۔ اس پر ایک کاغذ چسپاں تھا۔

''825 قبل مسیح' فرعون مصر بنام چقلا شیان۔''

ٹونی نے قہقہہ لگایا۔

''دیکھ یار' خواب نگر والے بے چارے نواب کا صندوق فرعون کے نام ہو گیا ہے اور فرعون کا نام بھی دیکھ کیسا اعلیٰ رکھا ہے۔''

''مگر اس میں جو نوادرات تھے وہ کدھر گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ صرف خالی صندوق کیش کروانے کے لیے رکھا گیا ہے۔ باقی چیزیں الگ رکھی ہوں گی۔ ان لٹیروں کا شارپ ذہن قابل دید ہے۔ ہم ذرا آگے بڑھے۔ کچھ باکسز میں مورتیاں وغیرہ تھیں جو یقیناً اس صندوق سے ہی نکالی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی دیگر بہت ساری اشیاء تھیں جو پہلی نظر میں ہی قیمتی آثار قدیمہ معلوم پڑتی تھیں۔ ہمیں ہیرے کہیں نظر نہیں آئے۔

''ٹونی ہیرے یہاں نہیں ہیں۔'' مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''ٹونی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ہاں مگر ہم نے شیشے کی الماریوں کو نہیں دیکھا۔'' ہم تیزی سے الماریوں کی طرف گئے۔ یہاں بھی کافی لوگ اندر رکھی اشیاء کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے اور ساتھ میں مختلف قسم کے تبصرے کر رہے تھے۔ یہاں مغلیہ دور سے منسوب تلواریں اور آہنی زرہیں تھیں۔ پیتل کا ایک لوٹا بھی تھا جسے اکبر بادشاہ سے منسوب کیا گیا تھا اور پھر ہمیں ایک

الماری کے نچلے خانے میں ریشم کے کپڑے میں سجائے گئے ہیرے نظر آ گئے۔ ہم نے باہر لگا ہوا لیبل پڑھا۔

"سبحان اللہ۔" ٹونی بے اختیار بول اٹھا۔

"داوا حضور کے ہیرے غوری خاندان کی کسی گمنام ملکہ کے سر منڈھ دیئے گئے ہیں۔" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائی۔ خوش قسمتی سے یہ الماری نسبتاً دوسری الماریوں کے آخر میں تھی۔ ٹونی نے جیب سے بال پین نکالا اور غیر محسوس انداز میں الماری پر لگے ہوئے لیبل کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"فضلو یہ سارے لیبل ہاتھ سے لکھ کر چسپاں کیے گئے ہیں۔ میں کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنا کام کرنے کے لیے ٹائم مل جائے۔ کیونکہ نیلامی شروع ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو ہیرے ہاتھ سے نکل جائیں، کوئی سر پھرا امیر زادہ خرید سکتا ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ لوگوں کی زیادہ دلچسپی موتیوں والے باکسز کی طرف تھی اور وہاں ہجوم لگا ہوا تھا۔

"فضلو تو مجھے ذرا کور دے، میرے سامنے اس طرح کھڑا ہو کہ مجھے تیری اوٹ ہو جائے۔" ٹونی نے آہستگی سے کہا۔

میں نے اس کی بات پر عمل کیا اور اگلے ہی لمحے اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ وہ اب الماری سے دور بھی ہٹ چکا تھا۔ دو آدمی ہماری طرف آ رہے تھے۔

"کام ہو گیا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"چلو سامنے کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔" ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔

"اب تیرا کام شروع ہو گا۔" ٹونی نے کہا۔

"تم نے بجلی کا کنکشن کاٹنا ہے جیسے ہی اندھیرا ہو گا میں کارروائی ڈال دوں گا۔"

"یہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"مگر تم نے بال پین سے الماری پر کیا حرکت کی ہے؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔

سفر

مری تشنہ روح
آج بھی
مانوس آہٹوں
پیار کی ٹھنڈک
محبت کی چاندنی کی تلاش میں
محوِ سفر ہے

نسیم سکینہ صدف (ڈسکہ)

☆☆

خیالِ جدائی

- جدا ہونا اتنا اہم اور میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)
- محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)
- موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)
- جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)
- جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)
- ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

روبی علی ...... سید والا

"یہ حرکت بہت ضروری تھی........ میں نے لیبل کے دونوں طرف بریکٹ ڈال کر ایک عبارت لکھ دی ہے۔ (مصنوعی ہیرے ہیں ان کی اصل نئی دہلی کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ منجانب انتظامیہ)۔"

مجھے ٹونی پر رشک آیا۔

"بہت ہی اعلیٰ اس طرح ہیروں کے نیلام ہونے کا خدشہ کم ہے۔ تب تک ہم اڑا لیں گے۔ اللہ تیری زبان مبارک کرے۔" اس نے کہا۔

"اب ہمیں سیٹھ صلاح الدین کو ڈھونڈنا ہے میں اس سے باتیں کروں گا وہ تیرے کام کی ہوں گی ان باتوں کو نوٹ کر کے کسی بہانے سے الگ ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" میں نے جواب دیا۔

سیٹھ صلاح الدین ہمیں راجہ رنجیت سنگھ کی نام نہاد تلوار والے باکس کے پاس ملا۔ وہ اسے خریدنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ٹونی نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"کہیے سیٹھ صاحب کس کی گردن اڑانے کے ارادے ہیں جو تلوار پر لٹو ہوئے جا رہے ہیں۔"

سیٹھ نے دانت نکالے۔

"ارے نہیں میں تو شغلاً سودا مار رہا تھا۔ لینی کہاں ہے بھلا۔"

"سیٹھ صاحب نمائش بڑی عمدہ ہے۔ انتظامیہ بھی خوب ہے۔" ٹونی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" سیٹھ نے سگار نکال کر سلگا لیا۔

"لائٹنگ بھی کمال کی ہے۔" ٹونی باکس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"مگر سیٹھ صاحب اگر خدا نہ کرے یہاں شارٹ سرکٹ وغیرہ جیسا معاملہ ہو جائے تو سمجھو سب جل کر خاک۔"

سیٹھ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی عقل پر ماتم کر رہا ہو۔

"نہیں یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"جہاں سے ہم انٹر ہوئے ہیں وہاں ٹرانس فارمر سسٹم ہے۔"

"اوہ اچھا زبردست۔" ٹونی نے ہونٹ سکیڑے۔

"سیٹھ صاحب آئیے کوئی مورتی دیکھتے ہیں۔" میرے لیے اشارہ کافی تھا۔

میں غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹتا اور ان سے الگ ہو گیا۔ جہاں الماریاں ختم ہوتی تھیں وہاں ٹینٹ لگا کر عقبی حصہ کو علیحدہ کیا گیا تھا اور یہاں سے ایک چھوٹی سی راہداری مین گیٹ کی طرف جاتی تھی۔ اسی راستے سے گزر کر ہم نمائش والی جگہ پہنچے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں چلتا ہوا لان سے باہر نکل گیا۔ یہاں پریشانی یہ تھی کہ مین گیٹ پر اچھی خاصی سیکورٹی موجود تھی اور بجلی کا کنٹرول سسٹم بھی گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹے سے کیبن میں تھا۔ اگر وہاں گارڈز موجود ہوتے تو سارا منصوبہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ مگر اچھی بات یہ ہوئی کہ سیکورٹی گارڈز کی چوکی گیٹ کے باہر والی سائیڈ پر تھی اور گیٹ بند تھا اندر کی طرف کوئی نہیں تھا البتہ چند مالی نما آدمی وہاں گھومتے پھر رہے تھے۔ وہ کبھی گیٹ کی طرف آ جاتے اور کبھی لان کو نکل جاتے۔ وہ غالباً کچھ نئے پودے لگانے کے متعلق اندازہ لگا رہے تھے۔ میں موبائل پر مصروف ہونے کا تاثر دیتا ہوا دیوار کے ساتھ چلنے لگا۔ وہاں نیم اندھیرا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ لان کی طرف گئے میں جلدی سے کیبن کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر زیرو واٹ کا بلب روشن تھا جس کی مدھم روشنی میں مجھے کافی مشینری پڑی دکھائی دی۔

ایک بڑا سا جنریٹر تھا۔ اس کے علاوہ دیگر آلات تھے۔ دیوار کے ساتھ قد آدم بورڈ نصب تھا۔ میں نے اسے کھولا تو وہاں بے شمار سوئچ دکھائی دیئے۔ یہیں سے پوری کوٹھی میں بجلی سپلائی کی جاتی تھی۔ درمیان میں سرخ رنگ کا ایک بڑا سا سوئچ تھا جس پر جلی حروف میں ایمرجنسی درج تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اسے آف کر دیا۔ کیبن میں ایک دم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔ پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا لان کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک شور مچ گیا تھا۔ کوئی چلایا۔

"حرام خوروں کو دو لاکھ دیئے بھی تھے کہ نمائش کے دوران لائٹ بند نہ کرنا......" یہ شاید نمائش کی انتظامیہ میں

سے کوئی تھا۔

''جنریٹر چالو کرو یار جلدی۔'' ایک اور آواز آئی۔

پھر کوئی تیزی سے مین گیٹ کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر بعد لان سمیت کوٹھی کی لائٹس روشن ہو گئیں۔ کیبن کی طرف جانے والے شخص نے واپس آ کر اعلان کر دیا کہ تکنیکی خرابی کی وجہ سے مین سوئچ ٹرپ کر گیا تھا۔ میں نے سکون کی ایک طویل سانس خارج کی۔ خوش قسمتی سے ان لوگوں کا خیال کسی اور طرف نہیں گیا ورنہ مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ میں نے ٹونی کو تلاش کرنا شروع کیا۔ تب ہی میرے موبائل پر بپ ہوئی۔ اسکرین پر ٹونی کا نمبر تھا۔ میں نے فوراً ریسیو کیا۔

''کہاں ہو تم؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''میں لان میں ہوں تم کدھر ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بڑی ٹیبل کے آخری کونے پر ہوں۔ اس طرف آجاؤ۔'' اس نے جواب دے کر فون بند کر دیا۔

میں وہاں پہنچا تو ٹونی ایک مورتی کے سامنے کھڑا بڑے انہماک سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہاں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ یقیناً وہ جان بوجھ کر اس جگہ کھڑا تھا۔

''کیسا رہا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''سب اچھا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''نکلیں پھر؟'' میں نے کہا۔

''بے وقوف مت بنو۔ سب کے ساتھ نکلیں گے اس طرح گئے تو گیٹ پر تلاشی ہوگی۔'' اسی وقت ایک چیخ نما آواز گونجی۔

''چوری ہو گئی ہے۔ ہیرے غائب ہیں۔''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''لعنت ہو۔'' ٹونی نے دانت پیسے۔ وہاں موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مائیک پر اعلان ہونے لگا۔

''معزز مہمانوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ نمائش میں چوری ہو چکی ہے، ہماری سیکورٹی سب کی تلاشی لینے کی مجاز ہے۔ براہ مہربانی تعاون کیجیے۔'' ٹونی برق رفتاری سے ایک طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے مجھے دیکھا۔

''تم ادھر جاؤ جہاں لوگ جا رہے ہیں میں ابھی آتا ہوں۔''

میں ہیروں کی الماری کی طرف جانے کے لیے مڑا تو راستے میں سیٹھ صلاح الدین نظر آیا۔

''سیٹھ صاحب یہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے اسے پکارا۔

''چوری ہوگئی ہے بھائی' آؤ دیکھتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

ہم دونوں ہیروں والی الماری کے پاس پہنچے تو وہاں ایک ہجوم تھا میں لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا سامنے جا پہنچا۔ ٹونی نے واقعی بڑی مہارت سے نقب لگائی تھی۔ بمشکل دو انچ شیشے کا ٹکڑا نکال کر ہیرے اڑائے گئے تھے۔

''یہ پیشہ ور چور کا کام ہے یہاں سب معزز لوگ ہیں ان میں سے کوئی یہ نہیں کرسکتا۔'' کسی نے تبصرہ کیا۔

''لگتا ہے ایسا ہی ہے۔ مگر تلاشی اب سب کو دینا ہوگی' یہ نمائش کے اصول وضوابط میں شامل ہے۔'' کوئی دوسرا بولا۔

اتنے میں انتظامیہ نے ٹینٹ لگا کر عارضی طور پر ایک خیمہ سا لگا دیا اور مائیک کے ذریعے سب کو بتا دیا کہ ہر شخص فرداً فرداً اندر جا کر تلاشی دے گا تا کہ اس کا وقار مجروح نہ ہو۔'' اس کے بعد اطلاع دینے والے نے سب مہمانوں سے پیشگی کی معذرت کی۔ اور تلاشی کے لیے پہلا نام پکارا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لسٹ تھی جس میں کوٹھی کے اندر داخلے کے وقت نام درج کیے جا رہے تھے اور اس میں ہم نے بھی اپنے فرضی نام لکھوائے تھے۔ جس کا نام پکارا گیا تھا وہ شخص اپنے حلیے سے ہی شرافت و نفاست کا پیکر نظر آتا تھا۔ وہ جھجکتا ہوا خیمے میں داخل ہوا اور کچھ دیر بعد باہر آ گیا۔

وقفے وقفے سے سب کا نام پکارا جا رہا تھا۔ میری نظر ٹونی کی متلاشی تھیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو وہ پسینے میں تر ہو گیا۔ یہ میرے نروس ہونے کی واضح نشانی تھی۔ میں نے رومال سے پسینہ صاف کیا اور خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مائیک پر مسٹر طفیل شیراز نیازی کا نام پکارا گیا۔

میں پروقار انداز میں چلتا ہوا خیمہ نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں سیکورٹی کی وردی میں کچھ لوگ موجود تھے۔ یقیناً وہ نفسیاتی طور پر بھی اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مختلف آلات کے ساتھ میری تلاشی لی گئی اور اس کے بعد ایک آدمی نے ہر جگہ کو ہاتھ سے ٹٹول کر چیک کیا جہاں تک ممکن تھا۔ جس طرح میری تلاشی لی گئی تھی مجھے بالکل بھی امید نہ رہی تھی کہ ٹونی بچ پائے گا۔

میں واپس نکلنے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ سیٹھ صلاح الدین کا نام پکارا گیا۔ میں باہر نکلا تو وہ اندر آ رہا تھا۔ ہم نے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

باہر آ کے میں نے ایک بار پھر ٹونی کو دیکھنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ وہ خیمے سے کچھ فاصلے پر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے کبھی سگریٹ نوشی نہیں کی تھی۔ اتنے میں اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے خود سے دور رہنے کو کہا۔ میں وہیں ایک کرسی ڈھونڈ کر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور میں نے خود کو خاموش تماشائی کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ پریشان کن خیالات کی یلغار ذہن پر اس قدر تھی کہ مجھے اپنی ٹانگیں بے جان محسوس ہو رہی تھیں۔ جب کہ اس کے برعکس ٹونی خاصی بے پروائی سے ایکٹ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے چیکنگ والے خیمے کے پاس آ گیا تھا۔ پھر ایک ساتھ کچھ عجیب اتفاقات ہوئے۔

مائیک میں فلک عصمت رانا کا نام پکارا گیا۔ میں سانس روکے ٹونی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ عجلت بھرے انداز میں خیمے کے اندر داخل ہوا اور عین اسی وقت سیٹھ صلاح الدین باہر آیا۔ ٹونی اس سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگار سیٹھ کی شیروانی سے رگڑ کھا گیا۔ ٹونی نے اس کو تھام لیا اور شاید معذرت کی۔ سیٹھ کے چہرے پر بے تکلفی کے تاثرات تھے۔ اس نے قہقہہ لگا کر کچھ کہا اور ٹونی کے کندھے پر تھپکی دیتا ہوا باہر آ گیا۔ ٹونی اندر جا چکا تھا۔ سیٹھ سیدھا میری طرف آیا۔

''عجیب فضول سا ڈرامہ ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ لوگ ہماری انسلٹ کر رہے ہیں۔ میں اس کلب کا رکن اور سابق میزبان ہوں۔ اندر دل کی بھڑاس نکال کر آیا ہوں۔''

میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''آپ پریشان لگ رہے ہیں'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں سیٹھ صاحب میں کیوں پریشان ہوں گا۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔
''اگر کوئی پریشانی ہے تو وہ باہر جا کر بھاگ جائے گی۔''
وہ بولا۔ میں چونکا۔
''کیا مطلب سیٹھ صاحب؟''
''مطلب یہ کہ ہم فلک صاحب کو شام کے کھانے پر انوائٹ کر چکے ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہم ریسٹورنٹ جائیں گے۔''
''آپ کی نوازش ہے سیٹھ صاحب۔'' میں نے کہا۔
اتنے میں ٹونی خیمے سے باہر آ گیا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔
''سیٹھ صاحب یہ تو بہت بے عزتی کر رہے ہیں۔'' وہ پاس آ کر بولا۔
سیٹھ صاحب نے منہ بنایا۔
''بس بھائی صاحب مجبوری ہے۔'' میں نے سنا ہے کہ گیٹ پر بھی چیکنگ ہوگی؟'' ٹونی نے پوچھا۔
''سنا تو میں نے بھی ہے۔'' سیٹھ نے جواب دیا۔
''مگر میں وی آئی پی گیٹ سے واپس جاؤں گا جو صرف سابق میزبانوں کے لیے مخصوص ہے۔''
''یہ تو اچھا ہوا ورنہ آپ کو بھی تلاشی دینا پڑتی۔ ہماری تو خیر ہے۔'' ٹونی نے آہستہ سے کہا۔
''آپ طنز تو نہیں کر رہے۔'' سیٹھ نے اسے دیکھا۔
''یقین کریں بھائی صاحب اگر اجازت ہوتی تو میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا مگر یہ ہو نہیں سکتا۔''
ٹونی ہنسا۔
''سیٹھ صاحب آپ غلط سمجھے۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ ہم نے آپ کے پلے سے ڈنر بھی تو کرنا ہے''
سیٹھ نے زوردار قہقہہ لگایا۔
''ضرور بھائی صاحب۔ گیٹ کے باہر ملتے ہیں۔ آپ جلدی پہنچو میں بھی آیا۔'' یہ کہہ کر وہ کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا جہاں غالباً کوئی وی آئی پی دروازہ تھا۔ ہم گیٹ کی طرف بڑھے۔
تقریباً سب ہی لوگ وہاں سے نکلنے کی جلدی میں تھے کیونکہ نمائش بدمزگی کا شکار ہو چکی تھی۔ ٹونی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔
''فضلو جگر مجھے پتہ ہے کہ تیرے پیٹ میں بے چینی کے مروڑ اٹھ رہے ہیں مگر ابھی کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہم پبلک پلیس پر ہیں۔'' میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔
گیٹ پر واقعی مخصوص آلات سے چیکنگ کی جا رہی تھی جب تک گارڈ ہماری تلاشی لیتا رہا ٹونی اس کے لتے لینے میں مصروف رہا۔ گارڈ بے چارہ سوری سر سوری سر کی گردان کرتے ہوئے پاگل ہوا جا رہا تھا۔
یقیناً دیگر لوگ بھی اسے صلواتیں سنا کر گئے تھے۔ ہم باہر نکل کر پارکنگ میں پہنچے تو سیٹھ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آواز لگائی۔
''فلک صاحب آپ میرے پیچھے آیئے گا۔''
اچانک مجھے ٹونی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ سیٹھ گاڑی سے باہر نکل آیا۔
''فلک صاحب! سب خیریت تو ہے؟'' ٹونی کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ میرے ہاتھ پاؤں صحیح معنوں میں پھول گئے۔ میں نے بے بسی سے سیٹھ کی طرف دیکھا۔
اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دی اور ٹونی کو شانوں سے تھام لیا۔
''بھائی خدا کے لیے کچھ تو بتایئے۔ آپ نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔''
ٹونی نے ناک کو رومال سے رگڑا۔
''سیٹھ صاحب آپ پریشان مت ہوں بس میرا دادا جی سے پیار ہی بہت تھا اس لیے صدمہ سہا نہیں جا رہا۔''
میں چونکا اور پھر سمجھ گیا ٹونی کسی لمبے چکر میں تھا۔
''کیا ہوا آپ کے دادا جی کو؟'' سیٹھ نے ہمدردی سے پوچھا۔
''وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے سیٹھ صاحب۔'' ٹونی نے ایک ایسی دردناک دھاڑ بلند کی میں سچ مچ دہل کر رہ گیا۔
سیٹھ بے چارہ ہونقوں کی طرح اسے دلاسہ دیئے جا رہا تھا۔ ٹونی نے آنکھیں صاف کیں۔
''ٹھیک ہے سیٹھ صاحب آپ کے ساتھ کھانا ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ زندگی رہی تو پھر کبھی سہی۔ سیٹھ خاصا

جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔
"بھائی صاحب! اگر آپ کہیں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"
"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"
"سیٹھ صاحب آپ کا بہت شکریہ بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔" ٹونی نے کہا اور پھر ڈرامائی انداز میں اپنی گھڑی اتار کر سیٹھ کی طرف بڑھائی۔
"یہ رکھ لیجیے آپ کو میری یاد دلائے گی۔"
سیٹھ کو اتنی جذباتیت کی توقع نہیں تھی۔ اس نے الجھن سے میری طرف دیکھا۔
"رکھ لیں سیٹھ صاحب۔" میں نے بھیگی سی آواز نکالی۔ کیونکہ ٹونی دادا جی کو عالم بالا میں پہنچا چکا تھا۔ اس لیے غم ناک ہونا ضروری تھا۔ سیٹھ نے گھڑی تھام لی۔
ٹونی نے سیٹھ کو سینے سے لگایا۔
"خدا حافظ سیٹھ صاحب ذرا ہمیں گارمنٹس کی اچھی سی شاپ کا پتہ بتا دیں۔ میں آتے ہوئے اپنی شیروانی ہوٹل میں ہی بھول آیا تھا اور اس کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا ہوں۔"
سیٹھ ایک لمحے کو چپ رہا اور پھر ٹونی کو زور سے دبایا۔
"کمال کرتے ہیں بھائی صاحب مجھے نشانی دے دی۔ اب میرا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے ناں۔ لیجیے میری طرف سے نشانی۔"
یہ کہہ کر وہ شیروانی اتارنے لگا۔ ٹونی گڑبڑا گیا۔
"ارے سیٹھ صاحب' بالکل نہیں یہ غلط بات ہے۔" مگر سیٹھ نے شیروانی ٹونی کو پہنا کر دم لیا۔
مجھے لگ رہا تھا ٹونی میں دلیپ کمار کی روح حلول کر گئی ہے لیکن میں اس کی اداکاری کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا اور الجھنوں کے پہاڑ بلند و بالا ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد مزید ایک ایک جپھی ڈال کر سیٹھ رخصت ہوا تو میں پھٹ پڑا۔
"یہ سب کیا چل رہا ہے۔ مجھے تیری بے تکی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔"
ٹونی نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔
"فضلو جگر' سب کچھ بتاتا ہوں' پہلے یہ بتا کہ میری ایکٹنگ کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟"
"بہت ہی بکواس ہے۔ تو مجھے بتا رہا ہے کہ نہیں؟"
"مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔"
"اوہ تیری خیر' خوشی کے موقعوں پر روتے ہی ہیں۔ ہیرے اس شیروانی میں ہیں۔" اس نے شیروانی کو چوم کر کہا۔
مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر سب کچھ یاد آ گیا۔ ٹونی کا سگریٹ سمیت سیٹھ سے ٹکرانا اور پھر گلے لگا کر معذرت کرنا۔ دادا جی کا کریا کرم کر کے جذباتی ماحول بنا کر شیروانی اتروانا۔ ٹونی میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ نوٹ کر رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔
"لگتا ہے فضلو سب کچھ سمجھ گیا۔" اس نے ہنس کر کہا۔
مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کا اظہار کیسے کروں۔ ٹونی نے واقعی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میں نے کہا۔
"ٹونی تم نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اگر سیٹھ اپنی شیروانی کو چیک کر لیتا؟" وہ دھیرے سے مسکرایا۔
"یہ معلومات میں نے سیٹھ صاحب سے اگلوائی تھی وہ تو سگار کی ڈبیا بھی شلوار کی جیب میں رکھتا ہے۔ اور پھر میں نے ہیرے شیروانی کی اندرونی جیب میں ڈالے تھے وہاں کسی کا ہاتھ جلدی نہیں جاتا۔"
میری الجھن برقرار تھی۔ میں نے پوچھا۔
"اگر تلاشی کی باری سیٹھ کے بعد نہ آتی تو پھر؟"
ٹونی نے سر میں کھجلی کی۔
"ہاں یہ میں نے جوا کھیلا تھا اور قسمت ساتھ دے گئی۔ ورنہ پھر کوئی اور راہ نکالنی پڑتی۔"
"بہت خوب۔" میں نے کہا۔
"اور دادا جی کے بجائے کسی دوسرے کو مار دیا ہوتا؟ ان کی قربانی کی کیا ضرورت تھی؟" ٹونی نے آنکھ ماری۔
"یار یہ کام میں نے اپنے احساسات کی تسکین کے لیے کیا تھا' ویسے تو یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو نہیں سکتا۔ تصوراتی مزہ لینے میں کیا حرج ہے۔"
"چلو اب ہیرے تو دکھا دو۔" میں نے کہا۔
اس نے مجھے انگوٹھا دکھایا۔
"بیٹا جی! ہیرے اب حویلی میں جا کر دیکھیں گے۔

ابھی میں نے نہیں دیکھے۔ صرف اٹھا کر جیب میں ڈالے تھے۔ بس تم دعا کرو کہ ہم دونوں غلام بحفاظت بادشاہ سلامت تک پہنچ جائیں۔
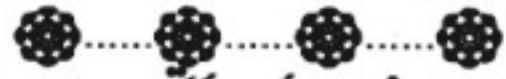
کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی حالانکہ وہاں تقریباً حویلی کے سبھی چھوٹے بڑے موجود تھے۔ دادا جی نے لرزتے ہاتھوں سے ریشم کی پوٹلی کھولی تو ہیرے پھسل کر ان کی ہتھیلی پر آن گرے۔ وہ دیوانگی کے عالم میں ہیروں کو دیکھ رہے تھے اور پھر انہوں نے اپنے ہونٹ ہیروں پر رکھ دیئے۔ چند لمحوں بعد دادا جی نے سر اوپر اٹھایا اور حاضرین پر نظر ڈالی۔

انہوں نے ہمیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

''دادا جی کا شاید ذہنی توازن خوشی سے بگڑ گیا ہے۔'' ٹونی نے اٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ہم دونوں ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے میرا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ دوسری باری ٹونی کی تھی۔ انہوں نے اس کا سر اور ماتھا چوما اور پھر ہمارے ہاتھ پکڑ کر اوپر لہرائے۔

''میرے دونوں پوتے آئندہ سے اس حویلی کے سب سے اول درجے کے پوتے ہیں۔ سب بچے ان کا حکم ماننے کے پابند ہوں گے۔''

''ٹونی بولا' دادا جی ذرا یہ فرمان دوبارہ صادر فرما دیجئے میرا خیال ہے کہ کچھ لوگوں نے سنا نہیں۔''

''میں نے سن لیا ہے۔ بے فکر رہو حیوان نما انسان۔'' دادا جی کے بولنے سے پہلے دعا نے آواز لگائی۔

''لڑکی اپنی زبان بند رکھو۔'' دادا جی دہاڑے۔ میں سہم گیا ٹونی نے میرا ہاتھ دبایا۔

''ایزی ہو جا کاکے..... آج یہ دہاڑ ہمارے لیے نہیں ہے۔''

دعا نے برا سا منہ بنایا۔

''دادا جی آپ ان کو سر پر چڑھا رہے ہیں۔ یہ غلط ہے۔''

دادا جی نے قہر بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''لڑکی تم میرے کاموں میں دخل مت دو اور ہاں گوداموں کی چابیاں ان کے حوالے کردو۔ اب سے یہ دونوں گودام کے نگران ہوں گے۔''

دعا غصے سے اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔

''دادا حضور ہم بھی جائیں۔ تھکاوٹ ہو رہی ہے۔'' ٹونی نے کہا۔

انہوں نے ہمیں پچکارا۔

''ضرور میرے بچوں۔ تم جا کر آرام کرو شام کو ملتے ہیں۔''

ہم کمرے سے باہر نکلے۔ ٹونی نے بازو پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

''ہائے فضلو سب کچھ کتنا حسین ہو گیا ہے۔ گوداموں کی چابیاں...... آہا۔''

پھر اس نے اپنا موبائل فون نکال کر کسی کا نمبر ڈائل کیا۔

''کسے فون کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے فون کان سے ہٹا کر مجھے دیکھا۔

''گندم اور چاول کے ڈیلر کو فون کر رہا ہوں۔ دادا جی نے صرف ماتھا چوم کر ٹرخا دیا ہے۔ ابھی دعا سے چابیاں ملیں گی تو دس پندرہ بوریاں ایمان داری کے ساتھ بیچتے ہیں۔''

''یہ زیادتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ابے زیادہ حاجی نہ بن۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''ٹونی یہ زیادتی ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''دس پندرہ سے کیا بنے گا کم از کم پچاس بوریاں تو ہونی چاہیں۔''

ٹونی کے دیدے پھیل گئے۔

''دھت تیرے کی۔ اس طرح کا فضلو چاہئے مجھے۔ اس سے پہلے کہ ہمارا امیج پہلے والا بن جائے ہمیں اچھا خاصا مال پانی جمع کر لینا چاہئے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو تم۔'' میں نے کہا۔

''دادا جی کے بقول چور چوری سے جائے مگر...... ٹونی نے لقمہ دیا۔

''ہیرا پھیری سے نہ جائے......'' ہمارا قہقہہ دور تک گیا تھا۔

بے زبان لوگ

ناظم بخاری

دنیا اک جنگل سے کم نہیں، جہاں صرف درندے چرند پرند ہی نہیں بلکہ انسان نما جانور بھی بستے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بے زبان جانوروں کو صرف بولنے اور سوچنے کی صلاحیت نہیں دی ہے البتہ انسانوں کو یہ دونوں صفات عطا کر رکھی ہیں ان صلاحیتوں نے انسان کو ضرورت سے زیادہ خطرناک بنادیا ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

ایسے ہی شیطان صفت لوگوں کا قضیہ، جن سے شیطان بھی شرماتا ہے

نو سالہ عابی نے گلی میں جھانکا، اسے شانی کہیں نظر نہیں آیا۔ حالانکہ کل اس نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک اسی وقت اسی گلی میں ہوگا۔ مگر اِس وقت وہ گلی سنسان پڑی ہوئی تھی اور شانی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔

وہ وہیں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ وہ شانی کو ڈھونڈنے کس طرف جائے کہ اچانک اسے چوہدریوں کے پلاٹ کا خیال آیا۔ چوہدریوں کا ایک ایکڑ کا وہ پلاٹ بستی سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جسے بچوں نے اپنے لیے کھیل کا میدان بنا رکھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ہو نہ ہو، وہ اِس وقت چوہدریوں کے پلاٹ میں ہی ہوگا اور ہُوا بھی یہی۔ وہ دس منٹ کا فاصلہ طے کر کے جب چوہدریوں کے پلاٹ پر پہنچا تو شانی اسے سامنے ہی کھیلتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ اس سے چند سال بڑا تھا اور اس سے زیادہ ذہین اور تیز تھا۔ اس نے عابی کے سامنے کئی ایسے حیرت انگیز کام کیے تھے کہ عابی اس کی ذہانت کا معترف ہو گیا تھا۔

''شانی!''

اس نے شانی کو دور سے پکارا۔ شانی نے اس کی طرف دیکھا اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر دیا۔

''یہاں آجاؤ''

وہ قریب پہنچا تو شانی اسے گولیاں کھیلتا ہوا نظر آیا۔ وہ کافی ہشاش بشاش اور خوش نظر آرہا تھا۔

''آج تو اپنی جیب فل گرم ہے یار۔'' اس نے اپنی جیب تھپتھپائی۔

''سالوں کو ایک گولی بھی نہیں جیتنے دی۔ یہاں کوئی مائی کا لعل ایسا نہیں ہے جو آج مجھ سے جیت سکے۔ آج تو لگتا ہے، اپنا لک عروج پر ہے۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''بس ان کے پاس کچھ گولیاں رہ گئی ہیں، یہ جیت لوں تو ان سب سالوں کی جیبیں خالی ہو جائیں گی، پھر کہیں چلتے ہیں۔''

شانی سے دو تین لڑکے کھیل رہے تھے، ان میں ایک اس کا ہم عمر لڑکا ناصر بھی تھا۔ وہ غصے سے بولا۔

''دیکھ شانی، تو کھیل جیت رہا ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ تو ہمیں گالیاں بھی دے۔ جب ہم تمہیں کچھ نہیں کہہ رہے تو تو بھی ہمیں گالیاں مت دے۔''

''دوں گا، سو بار دوں گا۔'' شانی نے چڑاتے ہوئے کہا۔

''جب تم لوگ جیت جاتے ہو تو کیسی کیسی باتیں کرتے ہو۔ اب میں جیت رہا ہوں تو برداشت نہیں ہو رہا کمینو......''

شانی سے ہارنے والوں میں ایک لڑکا قمر بھی تھا۔ وہ تھا تو شانی سے ایک سال چھوٹا، مگر تھا بہت تیز اور جھگڑالو۔ شانی کی جیت سے وہ بھی تپا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

''دیکھ شانی، میں بھی کہہ رہا ہوں کہ گالیاں دینا بند کر دے، نہیں تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''اچھا، تو کیا کرلو گے تم......''

شانی نے اسے ایک اور گالی دی۔

قمر اچانک اٹھا اور اس سے بھڑ گیا۔

''سالے، تو گالی دے گا تو کیا ہمارے منہ میں زبان نہیں ہے، یا ہمارے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں؟ اب دیکھتا ہوں تو کیسے نکالتا ہے گالی۔'' اچانک وہ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو گئے۔ قمر نے شانی کے منہ پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کے ہونٹوں سے لہو رسنے لگا۔ اس نے اپنے منہ میں لہو کا ذائقہ محسوس کر کے نیچے تھوکا اور غصے میں آکر اپنی لات پوری قوت سے اس کے پیٹ میں دے ماری۔

''تیری ماں کی۔۔۔''

اس کے منہ سے بے اختیار ایک گالی نکلی۔

باقی الفاظ درد کی شدت نے اس کے منہ سے چھین لیے۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو کر زمین پر ادھر سے اُدھر لڑھکنے لگا۔ شانی نے ایک بار پھر لہو کا ذائقہ منہ میں محسوس کر کے نیچے تھوکا۔

''کتی کے بچے۔۔۔ جب ہار برداشت نہیں ہوتی تو کھیلتے کیوں ہو؟ بتاؤ مجھے۔۔۔''

اچانک درد سے تڑپتے ہوئے قمر کے ہاتھ ایک بڑا سا پتھر لگا۔ اس وقت تک اس کے درد کی شدت کم ہو گئی تھی۔ وہ احتیاط سے کھڑا ہوا اور پوری قوت سے وہ پتھر شانی کے سَر پر دے مارا۔ اس کے سَر سے لہو کا ایک فوارہ نکلا اور وہ چیخ کر رہ گیا۔

''او میں مر گیا۔۔۔''

دوسرے ہی پل وہ درد سے بے حال ہو کر وہیں زمین

پر گر پڑا۔ اس کے سَر سے لہو نکلتا دیکھ کر قمر اور دوسرے بچے فوراً ہی وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ وہاں صرف عابی رہ گیا۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اِس صورت حال میں کیا کرے؟ شانی اپنے سَر پر ہاتھ رکھے، دَرد سے تڑپ رہا تھا۔ عابی کو اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، اس نے اپنے قدم فوراً ہی شانی کے گھر کی طرف دوڑا دیے۔ چند لمحوں بعد وہ شانی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

☆☆☆

اگر اس بستی کے چند آوارہ اور گنے چنے لوگوں کا شمار کیا جاتا تو عدیل عرف دیلا ان میں سَرفہرست تھا۔

سگریٹ، چرس، شراب، عورتوں کی دلالی، چوری، کبوتر بازی، تاش، سٹہ۔۔۔۔

اِن سب کاموں کا وہ نہ صرف عادی اور ماہر تھا بلکہ وہ اپنے حصے کا رزق انہی کاموں اور جگہوں سے حاصل کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھا۔ اس کا باپ ایک گورنمنٹ اسکول میں چپڑاسی تھا اور ایک مسجد میں پیش امام۔۔۔ اس نے دیلے کو اچھا انسان بنا کر رکھنے میں یا بنانے میں کبھی کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی تھی۔ مگر پتہ نہیں دیلا کیسے اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اور نکلنے کے بعد اِس قدر بگڑ گیا تھا کہ غلام حسین کی جب بھی اس پر نگاہ پڑتی، اس کا دِل دکھ سے جاتا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس سے آخر ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا تھا کہ جس کی سزا کے طور پر اسے دیلے جیسا بیٹا ملا ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ساری زندگی صوم وصلواۃ کا پابند رہا ہے۔ اس نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔

تمام زندگی رزق حلال کمایا اور گھر والوں کو کھلایا ہے اور دیلے پر تو کچھ زیادہ ہی نوازشیں اور توجہ کی ہے۔ تو پھر اس سب کے باوجود وہ کیسے اس کے ہاتھ سے نکل گیا؟ کیسے دنیا کے آوارہ ترین لوگوں میں اپنا نام شمار کرا لیا؟

غلام حسین جتنا اِس بارے میں سوچتا، اس کا اتنا ہی دِل دکھتا۔ کبھی کبھی، انتہائی بے بسی کی حالت میں خدا سے بھی اپنے اس گناہ کے بارے میں سوال کر بیٹھتا، جو شاید کبھی انجانے میں اس سے ہوا ہو اور جس کے نتیجے میں اسے دیلا کے "تحفے" سے نواز دیا گیا ہو۔ دیلا صبح اس کے ساتھ اسکول بھی جاتا تھا اور شام کو مدرسے بھی۔ باپ کی سختی سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھار اس کے ساتھ مسجد بھی چل دیا کرتا تھا، مگر صرف اوپری دِل سے۔ سچے دِل سے اس کے قدم کبھی صداقت کے راستے کی طرف نہیں اُٹھے تھے۔ پتہ نہیں یہ اس کے باپ کی غفلت کا نتیجہ تھا، تقدیر کا لکھا تھا یا کچھ اور کہ دیلا دھیرے دھیرے پڑھائی سے دور اور لوفر گردی کے نزدیک ہوتا گیا۔ وہ بچپن میں گولیاں کھیلتا، پیسے کھیلتا، پتنگ اڑاتا، کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی کاغذ کی تاش کھیلتا اور گلیوں میں، چوک میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اٹھا کر پیتا۔ یہ لت اسے حمید عرف میدے نے لگائی تھی۔ وہ اس کے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا اور اس کے ساتھ، اس کی کلاس میں پڑھتا تھا۔ دونوں کے شوق ایک جیسے تھے سو دونوں آپس میں گہرے دوست بن گئے۔ وہ گلیوں میں، یہاں وہاں سے آدھ جلے، آدھ بجھے سگریٹ کے ٹکڑے جمع کرتے اور قبرستان کے ایک ویران حصے میں چلے جاتے۔ وہاں وہ جی بھر کر موج مستی کرتے۔ اس مخصوص جگہ پر ماچس، میدے نے پہلے سے ہی چھپائی ہوئی ہوتی۔ وہ وہاں سے ماچس اٹھاتے اور وہ ادھ جلے اور بجھے ٹکڑے سلگا کر پینے لگتے۔ کبھی سگریٹ کے یہ ٹکڑے جمع کرنے کی باری میدے کی ہوتی، کبھی دیلے کی۔ انہیں گلیوں میں سگریٹ کے ٹوٹے چنتے دیکھ کر، ایک دو بار چند لوگوں نے انہیں ٹوکا اور سختی سے منع بھی کیا تھا مگر وہ دونوں بھی استاد تھے۔ جب سَرِ عام لوگ انہیں اس کام سے روکنے لگے تو وہ دونوں چھپ کر اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر یہ کام کرنے لگے تھے اور پھر ایک دن اپنے باپ کی پوری سگریٹ کی ڈبیہ اڑا لایا۔ اس دن پہلی بار دیلے کو پتہ چلا تھا کہ سگریٹ پینے کا اصل لطف تو بھرے ہوئے اور مکمل سگریٹ پینے میں ہے، گلیوں سے چنے ہوئے ٹکڑوں میں نہیں۔ جو مزہ ان میں تھا، وہ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کہاں تھا۔ اس نے اس بات کا اظہار میدے سے بھی کر دیا۔

"یار آج تو مزہ آ گیا قسم سے۔ آج کے بعد گلیوں میں اور چوک میں بکھرے ہوئے ٹکڑے چننا بند۔ پئیں گے تو بھری ہوئی سگریٹ، ورنہ نہیں پئیں گے۔"

میدا اس کی بات پر کھل کر ہنسا تھا۔

''اور پیسے کہاں سے آئیں گے؟ تیرے باپ کے گھر سے؟ یہ تو ابا کی سگریٹ ہاتھ لگ گئی تو چرا کر لے آیا، ورنہ روز روز یہ موقع تھوڑا ملے گا اور اب یہ مت کہنا کہ میں روز ہی یہ سگریٹ چرا کر لے آیا کروں۔ اگر ایسا کوئی خیال تیرے ذہن میں آرہا ہے تو اس سے آگے سوچنا بھی مت۔ اگر ابا نے دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں ایسی کوئی بات نہیں سوچ رہا۔ بس اتنا سوچ رہا ہوں کہ اب ہم گلیوں میں سے ٹکڑے چن کر نہیں پئیں گے، خرید کر پئیں گے۔۔۔ مطلب کسی سے منگوا کر پئیں گے۔''

''اور اس کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''اس بارے میں بھی کچھ سوچ لیں گے۔''

اگلے دن جب دیلے کو جیب خرچ ملا تو وہ اس نے میدے کے سامنے کر دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''ہماری عیاشی کے پیسے''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم کسی دکان سے سگریٹ خرید کر لاؤ، اگر کوئی نہ دے تو اپنے ابا کا نام لے لینا کہ اس نے منگوائے ہیں۔ پھر ہم عیاشی کریں گے۔''

میدا اس کی بات سن کر بہت زور سے ہنسا۔

''ان پیسوں میں تو صرف ایک سگریٹ ہی مل سکے گا۔''

دیلے کو مایوسی ہوئی۔

''اچھا۔۔۔ چلو ایک ہی سہی، وہ تو لاؤ۔ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔''

جب تک میدا سگریٹ لینے گیا، دیلے نے لوگوں کی نظروں سے بچ کر، زمین پر پڑے سگریٹ کے کچھ ٹکڑے اپنے قبضے میں کر لیے۔

جب میدا آگیا تو وہ اپنی مخصوص جگہ کی طرف چل دیے۔

ایک مکمل سگریٹ کو دونوں نے آدھا آدھا پیا اور جب سگریٹ ختم ہوگئی تو اپنی تشنگی ''ٹوٹوں'' سے بجھائی۔

اس بار بھی دیلے کو صاف صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جو مزہ مکمل سگریٹ میں تھا، وہ ان ٹکڑوں میں نہیں ہے۔ اس کے دل میں ایک بار پھر اس خواہش نے کروٹ لی کہ کاش انہیں کسی طرح روزانہ ایسے ہی دو چار سگریٹ مل جایا کریں تو کیا بات ہو۔ اگر نہ ملیں تو وہ خود بندوبست کر لیا کریں۔

اپنی اس سوچ سے اس نے میدے کو بھی آگاہ کر دیا کہ وہ خود بھی کہیں نہ کہیں سے پیسوں کا بندوبست کرتا ہے، وہ بھی کرے۔ تاکہ وہ روزانہ اسی طرح عیاشی کر سکیں۔

میدا پہلی بار کی طرح اس بار بھی اس کی بات سن کر مسکرا دیا تھا۔ ''کہیں نا کہیں'' سے دیلے کا کیا مطلب تھا، اس پر بھی اس نے کچھ روشنی ڈالی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خود کہیں سے ہیرا پھیری یا چوری چکاری سے پیسوں کا بندوبست کرتے، ان کی اچانک ملاقات شریف عرف شرفو سے ہوئی۔ اس دن سگریٹ پینے کے دوران میدے کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے اپنے قدم بلا جھجک ساتھ والی کپاس کی فصل کی طرف بڑھا دیے تھے۔ جب وہ کچھ دیر بعد فارغ ہو کر آیا تھا تو اس نے دیلے سے کہا تھا۔

''یار مجھے لگتا ہے، کوئی شخص کپاس کی فصل کے اندر موجود ہے۔''

''وہم ہوگا تیرا۔''

''وہم نہیں ہے یار۔ میں جب پیشاب کر رہا تھا، مجھے یوں لگا، جیسے کچھ فاصلے پر کوئی اور شخص بھی موجود ہے۔ کبھی کبھی وہ حرکت کرتا، پھر رک جاتا، کچھ دیر بعد وہ پھر حرکت کرنے لگتا تھا۔''

''تیرا کیا خیال ہے، اندر کون ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا؟''

''اندر تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ پر مجھے لگتا ہے، اندر والا شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہے، جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کوئی شخص اندر کپاس چن رہا ہے اور وہ بھی چوری۔''

دیلے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''چوری۔۔۔ ارے یہ تو چوہدریوں کے کھیت ہیں۔ بستی میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو یہ جرأت کر سکے۔ یہ صرف تیرا وہم ہے، ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''اچھا، اگر ایسی بات ہے تو میرے ساتھ ذرا دور چل

کے بیٹھ۔ ہم چھپ کے کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ تم اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لینا۔ کچھ دیر بعد اِس کھیت سے ضرور کوئی باہر نکلے گا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے، میں بھی دیکھتا ہوں کہ تیرا اندازہ کتنا درست ہے۔''

وہ دنوں وہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر چھپ گئے اور اپنی نگاہیں سامنے والی کپاس کی فصل پر جمادیں۔ میدے کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دس منٹ بعد انہیں اس فصل سے ایک شخص باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سترہ، اٹھارہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ گو وہاں سے فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر وہ دونوں پھر بھی اسے پہچان نہیں سکے۔

اس شخص نے آہستہ سے فصل سے باہر سر نکال کر ارد گرد دیکھا جب اسے تسلی ہوگئی کہ باہر کوئی نہیں ہے اور میدان صاف ہے تو وہ آرام سے باہر نکل آیا۔

اس کے ایک ہاتھ میں ایک چادر تھی، جس میں چار پانچ کلو کے قریب کپاس بندھی ہوئی تھی۔

میدے کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ دیلا دِل ہی دِل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ میدا فاتحانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اندر کوئی نا کوئی موجود ہے۔ دیکھا، میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔''

''یار یہ تو سچ مچ کوئی چور کا پتر ہے...... جلدی اٹھ، چل کر پکڑتے ہیں سالے کو اور بڑے چوہدری کے حوالے کرتے ہیں۔ کافی انعام ملے گا۔ زیادہ نہیں تو دو چار دن کی عیاشی تو ہو ہی جائے گی۔''

''چلو۔''

وہ دونوں اپنی جگہ سے باہر نکلے اور انہوں نے وہیں سے اسے آواز دی۔

''رک اوئے چور کے پتر! باپ کا مال ہے جو چوری کر کے لے جارہا ہے؟''

شرفو کے اٹھتے ہوئے قدموں میں زنجیر سی پڑگئی۔ اس کا دِل بے اختیار اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ سمجھا کہ اب خیریت نہیں ہے، مگر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے حواس بحال ہوئے۔

اس کے سامنے اس سے بھی کم عمر دو لڑکے موجود تھے، جو اسے کسی طرح بھی زیر نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا خوف کسی قدر دور ہوگیا۔

قریب آتے ہی میدے نے تیکھی آواز میں پوچھا۔ ''اوئے کون ہے تو اور یہ کپاس چرا کر کہاں جا رہا ہے؟''

شرفو اس کے لہجے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔

''بیچنے جا رہا ہوں اور کچھ...؟''

میدے کو اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ اس کے لہجے سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے یہ کپاس چرائی نہ ہو، بلکہ اس کی اپنی ہو۔

اس نے اپنا شک دور کرنا چاہا۔

''یہ کپاس سامنے والی فصل سے چرائی ہے نا تم نے؟''

''ہاں وہیں سے چرائی ہے۔''

ان دونوں کو حیرت ہوئی۔ یہ کیسا انسان ہے، جس نے چوری بھی کی تھی اور مان بھی رہا تھا۔ اگر وہ فصل ان دونوں کی ہوتی تو وہ اسی وقت اس سے بھڑ جاتے اور اس کا وہ حال کرتے کہ وہ یاد رکھتا، مگر یہ فصل اور کپاس کسی اور کی تھی۔

''جانتے ہو تم نے کس کے کھیت میں چوری کی ہے؟''

''جانتا ہوں، یہ چوہدریوں کے کھیت ہیں۔''

ان دونوں کو مزید حیرت ہوئی۔

''اگر کسی دن تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو؟''

شرفو ہنسا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں ہر کام دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کے کرتا ہوں۔''

''اور اگر ہم دونوں نے جا کر بڑے چوہدری کو بتا دیا تو......؟''

شرفو اعتماد سے مسکرایا۔

''پہلی بات یہ کہ وہ تم دونوں کی بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ تم مجھے جانتے نہیں ہو اور تیسری بات یہ کہ تم دونوں ایسا کچھ کرنے والے نہیں ہو۔ کیوں کے میں یہ ''کھٹی'' بیچ کر اس میں سے کچھ پیسے تمہیں بھی دینے والا ہوں تاکہ تم میرا یہ راز ہمیشہ راز ہی رکھ سکو۔''

میدے اور دیلے کو یہ بات پرکشش لگی۔

''یعنی تم ہمیں، اس کپاس میں سے حصہ دو گے؟''

''ہاں بالکل، بس شرط اتنی سی ہے کہ میرا یہ راز، صرف

تم دونوں تک ہی محدود رہے۔"
"تم بے فکر ہو جاؤ۔ یہ راز صرف ہم دونوں تک ہی رہے گا۔"
"اچھا تم میرے ساتھ چلو۔ میرا گھر پاس والی بستی میں ہے۔ میں وہاں کپاس بیچ کر تم دونوں کو تمہارا حصہ دے دوں گا۔"
میدے نے انکار میں سَر ہلایا
"نہیں یار، ہم اتنا دور نہیں جا سکتے، وہ بستی تو بہت دور ہے۔"
"تو پھر اپنا حصہ کیسے لو گے؟"
"تم ایسا کرنا، کل یہیں ہمارا حصہ پہنچا دینا۔"
"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں کل اسی وقت یہاں تمہارا حصہ لے کر آ جاؤں گا۔"
وہ رخصت ہو گیا تو دیلا اور میدا اس کی بہادری پر عش عش کرتے رہے۔
اس شخص میں اتنا حوصلہ تھا کہ اس نے نا صرف چوہدریوں کی فصل میں چوری کرنے کا سوچا تھا، بلکہ کر بھی لی تھی۔
ویسے ان دونوں کو امید نہیں تھی کہ کل وہ وہاں آئے گا، لیکن اگلے دن نا صرف وہ وہاں آیا تھا، بلکہ اپنے ساتھ ان کے حصے کی رقم بھی لایا تھا۔
وہ پہلی ملاقات ہی ان تینوں کی گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔
شرفو نے انہیں بتایا کہ وہ ساتھ والی بستی میں رہتا ہے اور اسی طرح چھوٹی موٹی چوریاں کر کے اپنا گزارا کرتا رہتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہے یا وہ چار پیسے کمانا چاہتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اس سے جو رقم حاصل ہوگی، وہ اس کے تین حصے کریں گے۔
دیلا تو اس کی بات سے کسی حد تک رضا مند ہو گیا تھا، مگر میدے کا دل نہیں بندھا۔
اس نے کہا۔ "نہیں یار، تو جیسے اکیلا کام کر رہا ہے، کرتا رہ۔ ہم میں تجھ جیسی ہمت نہیں ہے اور نہ ہی ہم ایسا کر سکتے ہیں۔"
شرفو ان کی بات پر مسکرا دیا تھا۔

ان تینوں کی اکثر ملاقاتیں وہیں پر ہوتی تھیں۔ اگلی دو چار ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے مشاغل کے بارے میں کافی حد تک جان گئے تھے۔
شرفو کو اِس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ وہ دونوں بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ وہ خود بھی انہی کے مزاج کا بندہ تھا۔
وہ اگلی ملاقات میں ان سے ملنے آیا تو اپنے ساتھ ان کی علیحدہ سے سگریٹ کی دوڈبیہ بھی لیتا آیا، جو اس نے ان دونوں کو تھما دی تھیں اور اپنی ڈبیہ کھول کر ان دونوں کو عیاشی الگ سے کرائی تھی۔
جلد ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح گھل مل گئے تھے اور ان میں گہری دوستی ہو گئی تھی۔
اگلے چند مہینے اسی طرح گزرے تھے۔ بلکہ ایک سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔
میدے اور دیلے کی زندگی صرف انہی دو چار چیزوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔
گولیاں کھیلنا، پیسے کھیلنے، سگریٹ پینا پتنگ اڑانا اور شرفو کے ساتھ، قبرستان کے اس مخصوص حصے میں بیٹھ کر تاش کھیلنا، جو وہ اپنے ساتھ لایا کرتا تھا۔ وہ اب کاغذ کی بنی ہوئی تاش نہیں کھیلتے تھے، بلکہ اصلی تاش سے لطف اندوز ہوتے تھے۔
شرفو نے انہیں بتایا کہ زندگی کا مزہ صرف انہی چند چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں، دنیا میں کرنے اور دیکھنے کے لیے ہیں۔
اور جب ان دونوں نے پوچھا تھا کہ وہ چیزیں کیا ہیں؟ تو اس نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے اخبار کے چند بوسیدہ سے ٹکڑے نکالے اور ان دونوں کے آگے پھیلا دیے۔
ان دونوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔
ان اخبار کے ٹکڑوں پر عورتوں کی نیم برہنہ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔
"یہ... یہ کہاں سے حاصل کیں تم نے؟"
وہ ہنسا۔
"تم لوگ آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔"
"پھر بھی یار..." میدے نے اصرار کیا۔
"بس چھوڑو اِس بات کو، یہ بتاؤ، کیسا لگا یہ تحفہ؟"

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ان دونوں کا سانس ابھی تک اعتدال پر نہیں آیا تھا۔

''زبردست ہے یار، قسم سے۔''

ان دونوں نے بیک وقت کہا۔ان کی تعریف سے شرفو خوش ہو گیا، جیسے اسے اِس تحفے کی قیمت وصول ہو گئی ہو۔ ان دِنوں دیلا چودہ سال کا تھا اور میدا اس سے ایک سال بڑا تھا۔

جب سے ان تینوں کی دوستی ہوئی تھی، ان دونوں نے اسے ایک طرح سے اپنا اُستاد مان لیا تھا۔ وہ اس کے ایک ایک فن کے معترف ہو گئے تھے اور اسے تھوڑی بہت عزت دینے لگے تھے۔ جواباً شرفو بھی ان کا خیال رکھنے لگا تھا۔

اور ان کی کئی ضرورتیں خود ہی پوری کر دیتا تھا۔ خاص کر سگریٹ پانی کی ضرورت۔ پچھلے ایک سال میں وہ روزانہ تو نہیں، البتہ دوسرے تیسرے دن ایک دوسرے سے ایک بار ضرور ملتے تھے اور ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے تھے۔ انہی دنوں، ایک ملاقات میں شرفو نے اُنہیں زندگی کی ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔

اس نے اُنہیں بتایا کہ جنسی تعلق کسے کہتے ہیں، اس میں کتنا لطف ملتا ہے اور وہ کیسے قائم کیا جاتا ہے۔۔۔۔ وہ ایک بار پھر اس کے معترف ہو گئے۔

پچھلے کچھ عرصے سے دیلے اور میدے نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا اور سارا سارا دن اِدھر سے اُدھر آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے۔

شرفو سے ملے، انہیں ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔

کپاس کی فصل دوبارہ آ گئی تھی اور شرفو نے پچھلے سال کی طرح اس سال بھی چوہدریوں کی فصل میں ہاتھ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

مگر اِس بار تقدیر اس کے ساتھ نہیں تھی۔

اس دن دیلا اور میدا ابھی نہیں آئے تھے، ورنہ وہی اکثر فصل سے باہر رہ کر آس پاس نظر رکھتے تھے اور شرفو اندر اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ جب کام پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تو وہ تمام رقم آپس میں بانٹ لیتے تھے۔

اس دن شرفو کو کسی کام کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ پیسے حاصل کرنے کا جو آسان رستہ اسے نظر آیا تھا، وہ چوہدریوں کے کھیت میں سے کپاس چوری کرنے کا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے چوہدری کے منشی، اللہ بخش کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی شخص ان کی فصل میں ہاتھ دکھا رہا ہے اور اس کا ثبوت بھی اسے مل چکا تھا۔ کچھ جگہوں پر کپاس کے بے ثمر بوٹے اس بات کے گواہ تھے۔ اس نے نگرانی شروع کرا دی اور پہلی ہی کوشش میں شرفو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ جس دن دیلے اور میدے کو یہ خبر ملی تھی، ان دونوں کے دِل کی دھڑکن ایک پل کو رک سی گئی تھی۔ اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب شرفو کی خیر نہیں۔ وہ دونوں سچے دِل سے اس کی خیریت کی دعا کرنے لگے تھے، مگر اب شاید دعا کی قبولیت کا وقت نکل چکا تھا۔

اگلے دن شرفو کا جو حال ہوا تھا، وہ پوری بستی نے دیکھا تھا۔ شرفو کی ایسی گت بنائی گئی تھی کہ جو بھی دیکھتا، کانوں کو ہاتھ لگا کر رہ جاتا۔ اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر کالے اور نیلے داغ تھے اور اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔

اس کا توے کی سیاہی سے منہ کالا کر کے، اسے ایک گدھے پر بٹھا کر پوری بستی میں گھمایا گیا تھا اور بتانے والے نے رک رک کر لوگوں کو اس کے جرم سے آگاہ کیا تھا۔ شام کو منشی نے اسے یہ کہہ کر بستی سے نکال باہر کیا تھا کہ آج کے بعد وہ اِس بستی میں یا اس کے آس پاس بھی دوبارہ نظر آیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔

جب شرفو بستی سے جا رہا تھا، بستی کے آدھے لوگ وہاں موجود تھے۔ ان میں دیلا اور میدا بھی تھا۔

انہیں رہ رہ کر اِس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ آج کے بعد ان کی شرفو سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ وہ بہت عجیب حالات میں ان سے ملا تھا۔ ان کے قریب ہوا تھا، ان سے دوستی کی تھی اور ان کو زندگی کی بہت سی چیزوں سے روشناس کرانے کے ساتھ، ان دونوں کو بھی کسی قسم کی پریشانی نہیں آنے دی تھی۔ ان کا نشہ پانی وہی پورا کرتا رہا تھا۔ اب وہ دونوں پتہ نہیں کیسے حالات کے ساتھ چلتے، اپنے اخراجات پورے کرتے؟

شرفو اس بستی سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا اور ان دونوں کو سوچوں کے بھنور میں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔

شرفو جاتے جاتے، اپنی اچھی بری عادتوں کی طرح، چرس کی عادت بھی انہیں لگا گیا تھا۔ جب تک وہ ساتھ

تھے، اس کا بندوبست بھی وہی کرتا تھا۔
اس کے جانے سے وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے کہ اب اس کے بغیر وہ اپنا خرچہ کیسے اُٹھائیں گے؟
گھر والے ان کی فطرت سے واقف ہو چکے تھے اور انہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیتے تھے۔
ان دونوں کو دو وقت کا کھانا مل جاتا تھا، اتنا بھی بہت تھا۔
دیلا اور میدا اب جوان ہو گئے تھے۔
اپنے نشے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لڑکپن کی طرح گلیوں سے سگریٹ کے ٹوٹے چن کر نہیں پی سکتے تھے۔ اور دوسرا اشرفو انہیں جس طرح کی عادات میں مبتلا کر گیا تھا، ان کا گزارا عام حالات میں ہونا مشکل تھا۔
ایک دو دن تک دونوں نے مل کر سوچا کہ اپنے نشے کی عادت سے چھٹکارا پا لیں، یہی ان کے لیے ٹھیک رہے گا، مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ دو دن میں ہی انہیں پتہ چل گیا کہ وہ جن بری عادتوں میں پڑ گئے ہیں، ان سے اب چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہے۔
دونوں نے سوچا کہ وہ ادھر ادھر سے چار پیسے حاصل کر کے اپنے نشے پانی کی ضرورت کو پورا کریں مگر میدے کو باوجود کوشش کے کہیں سے بھی ایک پائی نہیں مل سکی تھی اور دیلے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کے پاس بھی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ جس سے چار پیسے آتے اور وہ اپنی طلب پوری کرتا۔ لے دے کر ایک ماں اور باپ تھا، جن سے کچھ امید کی جا سکتی تھی۔ مگر باپ نے تو اسی وقت سے ہی ہاتھ کھینچ لیا تھا، جب سے اس نے اسکول چھوڑا تھا اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی اپنی آوارہ گردی سے باز نہیں آیا تھا۔ اس سے کچھ مانگنا یا حاصل کرنا بے سود تھا۔
اب صرف ایک ماں ہی تھی، جس سے چار پیسے ملنے کی امید کی جا سکتی تھی۔
وہ ماں تھی، بیٹے کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔
دیلے کو پیسے کے لیے انکار کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔
شروع شروع میں وہ اپنے نشے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ماں سے محبت سے، خوشامد سے اور منت سماجت سے پیسے وصول کرتا رہا اور اپنی نشے کی ضرورت پوری کرتا رہا۔ پر ماں کے پاس بھی کوئی قارون کا خزانہ نہیں تھا، جو تمام زندگی چلتا رہتا۔ اس کے پاس جو تھوڑا بہت پیسہ تھا، جلد ہی ختم ہو گیا۔ گھر میں جو نقدی تھی وہ سب ختم ہو گئی۔ اس گھر میں صرف ایک تولے کا سونے کا ایک سیٹ بچ گیا تھا، جس پر دیلے کی نظر تھی۔ اگر وہ سیٹ اسے مل جاتا تو......
اس نے ماں سے جلد ہی ایک نئی کہانی کہنی شروع کر دی۔
اس نے ماں سے کہا کہ وہ اس نشے کی لعنت میں پڑ کر بہت بری طرح پھنس گیا ہے۔ وہ اس لعنتی شے سے آزاد ہونا چاہتا ہے، مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔
اس کے لیے علاج کی اور بہت سے پیسوں کی ضرورت ہے۔
وہ اگر اسے تندرست دیکھنا چاہتی ہے تو اس کی مدد کرے۔ اسے کہیں نا کہیں سے بہت سے پیسے لا کر دے، تا کہ وہ اپنا علاج کروا کر خود کو سدھار سکے۔ ممتا کی ماری ہوئی ماں کو بے وقوف بنانا اور اس کی سادگی سے کھیلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہر ماں کی طرح دیلے کی ماں نے بھی اس کے لیے بہت اچھے خواب بن رکھے تھے، جن کی تکمیل کی وہ خواہش مند تھی۔
اس بار دیلے کی بات سن کر نجانے کیوں اسے امید ہو چلی تھی کہ خدا خدا ہے، کیا پتہ میدے کے دل میں سچ میں سدھرنے کا خیال آ گیا ہو۔
گھر میں اب ایک تولے کا سونے کا سیٹ بچا ہوا تھا، جو دیلے کی ماں نے اس کی دلہن کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔
وہ سفید پوش لوگ تھے۔ دیلے کی ماں نے اچھے دنوں میں کفایت شعاری کر کے وہ سیٹ بنوایا تھا۔ اب تو ایسا وقت تھا کہ گھر میں دو وقت کا عزت کا کھانا بھی بڑی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔
ماں نے دیلے کی آنکھوں میں نمی اور جھوٹی سچائی کی جھلک دیکھی تو اس نے شوہر سے پوچھے بغیر وہ سونے کا سیٹ اٹھا کر خوش فہم امیدوں کے سہارے دیلے کے حوالے کر دیا۔
وہ سیٹ بیچ کر دیلے کے ہاتھ جو رقم لگی، اس سے اس

کے اور میدے کے دو چار دن بڑے مزے سے گزرے۔
مال ہاتھ میں تھا، یار ساتھ تھا، اور کیا چاہیے تھا؟
وہ تاش کھیلنا تو جوان ہونے سے پہلے ہی سیکھ گیا تھا، مگر پیسے لگا کر تاش کھیلنے کا اتفاق اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔
اس بستی سے ایک کلومیٹر دور، ایک صحرا نما سا، دو سے تین کلومیٹر وسیع قبرستان تھا۔ وہ تھا تو قبرستان، مگر وہاں قبریں نا ہونے کے برابر تھیں۔ البتہ ریت کے کئی چھوٹے بڑے ٹیلے ضرور موجود تھے۔
اس صحرا نما سی جگہ کے سب سے آخری حصے کو، اس بستی کے آوارہ مزاج لوگوں نے اپنے تاش کھیلنے کا اڈا بنا رکھا تھا۔ وہاں بیک وقت، بستی کے کم سے کم آٹھ سے دس افراد موجود رہتے تھے۔ وہ سارا سارا دن وہاں بیٹھ کر تاش کھیلتے، گالیاں نکالتے، بیہودہ مذاق کرتے اور رات ہونے تک واپس بستی میں لوٹ آتے۔
دیلا کئی بار میدے کے ساتھ وہاں پر جا چکا تھا۔ وہ اکثر وہاں کھڑا ان لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی ایک دوسرے سے کی گئی بیہودہ باتیں سنتا رہتا تھا اور شام کو واپس لوٹ آتا تھا۔
اِس دوران کئی بار اس کے دِل میں خیال آیا تھا کہ اگر اس کے پاس چار پیسے ہوں، اور وہ ان بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ کھیلے تو ان سے باآسانی جیت سکتا ہے۔ مگر افسوس ان دنوں اس کے پاس پیسے نا ہونے کے برابر ہوتے تھے۔
ان کا خرچا شرفو اٹھاتا تھا۔ اِس بار سونے کا سیٹ بیچ کر ایک بڑی رقم اس کے ہاتھ کیا آئی، اس کا دِل چاہا کہ وہ قبرستان کے اس آخری حصے میں چلا جائے اور بڑی عمر کے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر، کھل کر تاش کھیلے اور اتنا کھیلے کہ ان سب کی جیبیں خالی کر دے۔ اس نے اپنی اِس سوچ کا اظہار میدے سے کیا تو وہ بھی اِس کی بات سے متفق نظر آیا۔
اگلے دو چار دن دیلے کے ان بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں بسر ہوئے۔
وہ لوگ صرف ایک ایک دو دو روپے کی بازی کھیلتے تھے، اِس سے زیادہ کوئی کھیلنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ دیلے کو بھی مجبوراً اتنی ہی رقم لگانا پڑتی تھی، ورنہ اس کا دل کرتا تھا کہ وہ بڑی رقم لگائے اور بڑا داؤ کھیلے۔
معلوم نہیں اس کا کھیل اچھا تھا یا تقدیر اس کا ساتھ دیتی تھی کہ وہ اکثر بازی جیت جاتا تھا۔
اِس جیت نے اسے اِس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اس سے اچھی تاش کھیلنے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ جس سے بھی تاش کھیلے گا، اسے ہرا دیگا۔ اسے یہ ایک ایک دو دو روپے کی بازیاں کھیلنا پسند نہیں تھا۔ اس کا دِل چاہتا تھا کہ کم سے کم ہر بازی پچاس پچاس یا سو سو روپے کی ہو۔ جس میں سچ میں ہار یا جیت کا مزہ آسکے۔
اس نے اپنی اِس سوچ کا اظہار دوران کھیل کیا تو ایک شخص نے کہا۔
"بیٹا جی، جیب میں زیادہ پیسے مچل رہے ہیں تو چوہدریوں کے ڈیرے پر چلا جا۔ وہاں بڑی بڑی بازیاں ہوتی ہیں۔ ہفتے کی ہفتے محفل جمتی ہے۔ وہاں جتنے مرضی کا داؤ جا کر کھیل..."
اس کی بات دیلے کے دِل کو لگی۔
وہ سچ میں بڑے داؤ کھیلنا چاہتا تھا، جس میں وہ ایک ہی دن میں امیر بن جاتا یا پھر...
اِس بار چوہدریوں کے ڈیرے پر محفل جمی تو وہ بھی وہاں موجود تھا۔ جتنی رقم اس کے پاس موجود تھی، وہ ساری اپنے ساتھ وہاں لے گیا تھا۔
صبح سے لے کر شام تک وہ وہاں کھیلتا رہا تھا اور جب شام کو وہ وہاں سے رخصت ہوا تھا تو اس کی جیب اور ہاتھ دونوں خالی تھے۔
اس کی ساری رقم دوسروں کی جیب میں منتقل ہو چکی تھی۔
اس دن دیلے کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ جوا کسی کا نہ ہوا۔
دیلے کے ساتھ ساری رقم ہار جانے پر میدا بھی رنجیدہ تھا پر اس نے دیلے کو حوصلہ دیا کہ وہ اِس بات پر دِل چھوٹا نہ کرے۔ ہار جیت زندگی کا حصہ ہے، وہ پریشان نہ ہو۔ اگر زندگی نے دوسری بار موقع دیا تو جیت انہی کی ہوگی۔
دو چار دنوں بعد دیلے کی ایک بار پھر وہی حالت تھی، جو ماں سے ایک تولہ سونا کا سیٹ لینے سے قبل تھی۔
جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور نشے کی طلب سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس بار اس نے اپنی ضرورت پوری

کرنے کے لیے ایک اور راستہ اپنایا۔

اس دن، رات کی تاریکی میں اس نے ماں باپ کی نظروں سے بچ کر گھر کی دو چار چیزیں اٹھائیں اور باہر کے ہوئے میدے کو تھما دیں۔

اگلے دن وہ شہر گیا اور وہ چیزیں بیچ کر دو پیسے لے آیا۔

دو چار دن مزید آسانی سے آگے بڑھ گئے تھے۔

گھر کا سامان چوری ہونے کے بعد غلام حسین کو پورا یقین تھا کہ یہ چوری دیلے نے کی ہے یا اپنے کسی یار دوست سے کرائی ہے۔ کوئی باہر کا آدمی اتنی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی دیدہ دلیری سے اس گھر میں آکر چوری کر لیتا۔

اور دوسرا اس گھر میں ایسا کچھ قیمتی سامان بھی نہیں تھا کہ جس کے لیے اتنا رسک لیا جاتا، مگر اس نے یہ بات دیلے سے نہیں کی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ایک تو دیلا یہ بات ماننے سے انکار کر دے گا اور دوسرا اگر وہ یہ بات مان لیتا کہ ہاں اسی نے ہی یہ چوری کی ہے تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتا؟

اگر اس دوران اسے زیادہ غصہ آ گیا اور اس نے اسے گھر سے نکال باہر کیا تو...... مگر یہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ دیلے کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ جیسا بھی تھا، اسے نظروں سے کبھی دور نہ ہونے دیتی۔

سو غلام حسین کے نزدیک سمجھداری اسی میں تھی کہ جو نقصان ہُوا تھا، اس پر صبر کا گھونٹ بھر لیا جاتا اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس بات کو فراموش کیا جاتا۔ وقت گزرتا گیا اور دیلا، میدے کے ساتھ اپنی جوانی برباد کرتا گیا۔

نشے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جب گھر میں کوئی چیز نہ رہی تو اس نے دل بڑا کرتے ہوئے میدے کے ساتھ دوسروں کے گھروں کا راستہ ناپا۔

خوش قسمتی سے ابتدائی چند وارداتوں میں کامیابی نے ان کے قدم چومے اور ان کے حوصلے جوان ہو گئے۔

کبھی کسی کے گھر سے کوئی بکری غائب ہو رہی ہے تو کبھی سائیکل۔ کبھی کسی کے گھر سے کبوتر غائب ہو رہے ہیں تو کہیں سے ریڈیو اور اگر کہیں سے اور کچھ نا ملا تو مرغی پر ہی ہاتھ صاف کر لیا۔

ایک دو وارداتوں تک تو لوگوں کو زیادہ تشویش نہیں ہوئی مگر جب مسلسل یہ چوریاں ہونے لگیں تو نا صرف انہوں نے چور کو پکڑنے کا سوچا، بلکہ اسے پکڑ بھی لیا۔ دیلا اور میدا رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔

لوگوں نے ان دونوں کو پیٹنے اور اچھی طرح ان پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد ان کو چوک میں اُگے کیکر کے درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا کہ جو کوئی بھی انہیں چھڑانے آئے گا، وہ ان کا نقصان پورا کر کے انہیں لے جائے گا۔

یہ خبر دیلے کی ماں تک پہنچی تو اس نے رو رو کر آسمان سُر پر اٹھا لیا تھا اور اپنے کانوں سے چاندی کی بالیاں اتار کر اپنے شوہر کو دے دی تھیں کہ وہ انہیں دے کر دیلے کو چھڑا لائے۔

دیلے کا باپ دِل پر پتھر رکھ کر گیا اور دیلے کو چھڑا لایا۔

ماں نے دیلے کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

مارنے والوں نے تسلی سے اپنے دِل کی حسرت نکالی تھی۔

اس کی ایک آنکھ اور ہونٹ سوجھ گیا تھا اور اس کے پورے وجود پر سیاہ اور نیلے داغ تھے۔

وہ دو دن تک روتی بھی رہی تھی اور ریت گرم کر کے اس کے وجود کی ٹکور بھی کرتی رہی تھی۔

دیلا دو دن بعد کہیں جا کر چلنے کے قابل ہُوا تھا۔

اِس دوران اس کی ماں اسے بار بار اپنے دودھ کا واسطہ دے کر کہتی رہی کہ وہ سارے برے کام چھوڑ کر اچھا انسان بن جائے۔ چوری چکاری اور نشہ پتہ سب چھوڑ دے۔

پورے محلے میں ان کی ایک عزت ہے۔ وہ اگر ان کی عزت کا باعث نہیں بن سکتا تو کم سے کم رسوائی کا باعث بھی نہ بنے۔

دیلے نے ہمیشہ کی طرح ماں کو بہلا کر سدھرنے کا جھوٹا وعدہ کر لیا تھا۔ دو دن بعد وہ گھر سے باہر نکلا اور سیدھا میدے کے پاس پہنچا تو نشے سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ محلے والوں نے اسے دو دن باندھ کر رکھنے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ میدے کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

اس کے پاس صرف چند ایک خالی سگریٹ تھے۔

ان دونوں نے مل کر وہ خالی سگریٹ پیے اور سوچتے رہے کہ بھرے ہوئے سگریٹ کہاں سے اور کیسے حاصل کیے جائیں۔ اب کے چوری کا خیال بھی اپنے دِل میں لانا ٹھیک نہیں تھا۔

پوری بستی نے انہیں وارننگ دی تھی کہ اگر اب وہ دونوں چوری کرتے ہوئے ان کے ہاتھ لگے تو وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

لے دے کر اب ایک ہی رستہ بچتا تھا اور وہ تھا اُدھار۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ انہیں ادھار دے گا کون اور کیوں۔۔۔؟ اور اگر کسی نے اُدھار دے بھی دیا تو وہ اتاریں گے کہاں سے؟

وہ دونوں ہی جسمانی طور پر کمزور تھے۔ گو سترہ، اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے، مگر مزدوری کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔

ایک بار مجبوری کے عالم میں انہوں نے یہ کام بھی کر کے دیکھا تھا، مگر جان نکالنے والا یہ کام انہیں اتنا مشکل لگا تھا کہ وہ شام ہونے سے پہلے پہلے ہی یہ کام چھوڑ کر بھاگ آئے تھے اور ان دونوں نے توبہ کر لی تھی کہ چاہے بھوکے مرنا پڑے، وہ مر جائیں گے مگر کبھی مزدوری نہیں کریں گے۔

ایک بار چرس بیچنے والے خادی نے انہیں دس دس روپے کی اُدھار چرس دی تھی، جسے کیے ہوئے وعدے پر وہ دونوں چکا نہیں پائے تھے۔

پر خادی بھی معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس نے ایک دن تنہائی میں دیلے سے اپنا اُدھار اچھے سے وصول کر لیا تھا اور اس سے کہا تھا۔

''ارے یار۔۔۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تو اپنے مزاج کا بندہ ہے تو بلا ناغہ، روزانہ میرے پاس آ کر اپنا نشہ پانی پورا کر لیا کر، تیرے لیے کسی چیز سے انکار نہیں ہے......''

دیلے کو اُس دن ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہُوا۔

اسے، اس سے پہلے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسی شے بھی ہے، جس سے کام لے کر وہ اپنا نشہ پانی با آسانی پورا کر سکتا ہے۔

خادی اِس معاملے میں اس کا پہلا طلبگار بنا تھا۔

دیلے کو جب بھی نشے کی طلب ہوتی، اس کے قدم خادی کی طرف اٹھ جاتے۔

خادی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر بھی دو چار بھرے ہوئے سگریٹ پلاتا اور دو چار ساتھ بھی کر دیتا۔ جس میں سے وہ کچھ میدے کو جا کر دے دیتا تھا۔

دیلا ان دنوں بڑا خوش تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ خادی سے جو 'دوستی' ہو گئی ہے، یہ اب ہمیشہ برقرار رہے گی۔

اسے اب نشے پانی کی فکر نہیں کرنا پڑے گی، اس کے لیے خادی کا وجود موجود تھا۔۔۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔

صرف پندرہ دنوں بعد ہی خادی کا رخ بدلنے لگا تھا۔

وہ اس کے آنے پر زیادہ سے زیادہ اسے ایک آدھ سگریٹ پلاتا اور رخصت کر دیتا۔ بھرے ہوئے سگریٹ بھی اب اس نے دیلے کے ساتھ کرنے بند کر دیے تھے اور دوسرا اس نے اب دیلے کے وجود سے بھی فائدہ اٹھانا کم کر دیا تھا۔

دیلے کے پوچھنے پر اس نے اسے بتایا تھا کہ روزانہ ایک جیسا کھانا کھا کھا کر من اوب جاتا ہے اور دوسرا زیادہ کھانے سے بدہضمی کا بھی اندیشہ رہتا ہے، لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ...... جب بھوک لگے، تب کھانا کھایا جائے۔

مزید ایک دو ہفتوں بعد وہ ایک بار پھر اسی مقام پر آ کھڑا ہوا تھا، جہاں سے وہ چلا تھا۔ خادی نے اسے یہ کہہ کر اس دن اپنے پاس سے رخصت کر دیا تھا کہ وہ پندرہ دنوں بعد کسی دن اس کے پاس چکر لگا سکتا ہے اور سارا دن اس کے پاس بیٹھ کر پی سکتا ہے۔ مگر پندرہ دنوں سے پہلے وہ اس کے پاس کسی صورت بھی نہ آئے ورنہ...... دیلے کا یہ ذریعہ بھی بالآخر ختم ہو گیا تھا۔

اس دن، دو دن بعد جب وہ گھر سے نکل کر میدے سے ملنے گیا تھا تو وہ رات گئے تک اس سلسلے میں سوچتے اور بات کرتے رہے تھے کہ آخر ایسا کیا کیا جائے کہ جس سے کہیں نہ کہیں سے چار پیسوں کی آمدنی ہو سکے۔

یونہی پیسوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اور آوارہ گردی کرتے ہوئے رات کے دس بج گئے تھے۔

وہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ گاؤں میں آدھی رات کا سا سماں تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں سکون سے سو رہے تھے۔ وہ لوگ جامع مسجد کے پاس گزرے تو اچانک ٹھٹک

کر رک گئے۔ مسجد کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشاں تک نہیں تھا۔ دیلے کے دِل میں بھی بیک وقت وہی خیال آیا، جو میدے کے دل میں آ رہا تھا۔

ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے پر اپنے من کی بات کو ظاہر کیا اور اپنے قدم مسجد کے کمروں کی طرف بڑھا دیے۔

☆☆

شانی کی ماں ابھی ابھی بڑی حویلی سے لوٹی تھی۔ آج چوہدریوں کے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ اسے آنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔

وہ اپنے گھر میں ایک عدد شوہر اور تین عدد بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ سب سے بڑا، چودہ سالہ شانی تھا۔ اس سے دو سال چھوٹی مریم تھی اور اس سے دس سال چھوٹی بانو تھی۔ پورے گھر کی ذمہ داری کوثر کے کاندھوں پر تھی۔ جب سے اس کے شوہر شمشاد عرف شمے کا ایکسڈنٹ ہوا تھا اور وہ اپنی دونوں ٹانگوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، یہ ذمہ داری کوثر کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ جسے وہ تب سے لے کر اب تک اُٹھاتی آئی تھی۔

وہ پچھلے دو سالوں سے بڑی حویلی میں کام کر رہی تھی، جس سے اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ گھر کا گزارا ہو رہا تھا۔ وہ جہاں رہتے تھے، دو کمروں کے اس مکان کی حالت بہت خستہ تھی۔ اچھے وقتوں میں بنایا گیا صرف ایک پکا کمرا تھا، جو توجہ کے قابل تھا۔ دوسرا کمرا کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا، جو کسی وقت بھی اپنا وجود کھو سکتا تھا۔

کوثر سردیوں میں اس کمرے کو باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس گھر میں کبھی اچھے برتنوں کا بھی وجود رہا ہو گا، مگر اِس وقت وہاں بالکل عام سے برتن رہ گئے تھا، جو کھانے پینے کی ضرورت میں کام آتے تھے۔

چھ مرلے پر مشتمل وہ شکستہ سا گھر، مکینوں کی طرح خود اپنے وجود پر شرمسار تھا۔ صحن کی کچی دیواروں پر گارے سے کیا گیا پلاستر جگہ جگہ سے اُکھڑ رہا تھا۔ صحن میں مٹی کے شور سے زمین ابھری ہوئی تھی اور باہر والا دروازہ ایک طرف سے ٹوٹ کر دیوار کے آسرے پر ٹکا ہوا تھا۔ جسے اکثر کاندھے کا زور لگا کر بند کیا جاتا تھا۔ پکے کمرے کے اندر، کچھ پرانے دور کی فلمی اداکاراؤں کی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں، جن میں سے گزرے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ کچھ تصویروں کا رنگ اُڑ چکا تھا اور کچھ تصویریں پھٹ کر آدھی رہ گئی تھیں۔

شما جن دنوں تانگا چلاتا تھا، وہ تصویریں بڑے شوق سے لایا کرتا تھا۔ وہ ان کی صورتوں کے ساتھ کوثر کی صورت ملا کر اس کا مذاق اُڑایا کرتا تھا کہ تصویر والی عورتیں حسین ہیں، کوثر بدصورت ہے۔ حالانکہ ان باتوں میں بالکل سچائی نہیں ہوتی تھی۔

کوثر اس کی یہ باتیں سنتی اور نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

صحن میں ایک طرف، نلکے کے نیچے دو دن کے میلے کچیلے کپڑے اپنے دھونے کے منتظر پڑے تھے۔

شور زدہ صحن کے فرش پر دو سالہ بانو زور زور سے رو رہی تھی، جسے مریم سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر وہ کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ شمے نے کوثر کے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے قہوہ بنانے کا حکم صادر کیا۔ وہ صحن میں لگے بکین کے درخت کے نیچے شاہ جی اور دیلے کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ کوثر نے بانو کے رونے کو نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے ایک میلی کچیلی سی دیگچی میں پانی ڈالا اور اسے چولہے پر رکھ کر آگ جلانے لگی۔ مگر آج آگ کو بھی موت پڑ گئی تھی، جو کسی طور جلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

دوسری طرف بانو رَو رَو کر آسمان سر پر اٹھا رہی تھی۔ کوثر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور آگ جلانے کا کام ایک طرف رکھ کر بانو کے پاس جانے کو اٹھی ہی تھی اچانک اس کے کانوں سے شمے کی آواز ٹکرائی۔

”کتنی دیر ہے کمو! ذرا جلدی کرناں“

کمو، کوثر کا اُلٹا نام تھا، جو شمے نے اسے دیا تھا۔

کوثر کو مخاطب کرنے کے بعد وہ دیلے سے مخاطب ہوا۔ ”آج تو لگتا ہے میرے یار کا لک عروج پر ہے۔ صبح سے چھ بازیاں جیت لی ہیں لگاتار۔ پر لگتا ہے آج شاہ جی کا لک اس سے روٹھا ہوا ہے۔“

دیلا اس کی بات پر ہنسا۔

”لک تو اپنا ہمیشہ ہی عروج پر رہتا ہے، بس کبھی کبھی ساتھ نہیں دے پاتا۔

ساتھ بیٹھے شاہ جی نے گہری سانس لی۔

''لک تو سالا اپنا بھی ہمیشہ عروج پر رہا ہے۔ پر آج لگتا ہے کسی نینا بائی کے کوٹھے پر چلا گیا ہے۔''

اِس بات پر زور کا قہقہہ پڑا۔

شاہ جی زندہ دِل انسان تھا اور اپنی ہار کو کبھی سنجیدہ نہیں لیتا تھا۔ ویسے بھی اسے ہار کی زیادہ پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ پیسے والی آسامی تھی۔

کوثر نے شمے کی طرف دیکھا۔ وہ بکین کے نیچے بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا تاش کھیلتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔

اس نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ پھونکوں سے آگ جلانے لگی۔ اس بار اس کی محنت بیکار نہیں گئی۔

آگ جلانے کے بعد اس نے جلدی سے اپنے قدم بانو کی طرف بڑھا دیے۔

اسے روتا دیکھ کر اس کا کلیجہ کافی دیر سے کٹ رہا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر لائی۔ دودھ کا فیڈر بنا کر اس کے منہ میں دیا اور اسے وہیں کمرے کے فرش پر لٹا دیا۔ وہ دوبارہ چولہے کے پاس آبیٹھی۔

قہوہ تیار ہونے کے بعد اس نے وہ قہوہ پیالوں میں انڈیلا اور ''مہمانوں'' کے پاس جا کر رکھ دیا۔ وہ دوبارہ بانو کا پتہ کرنے کے لیے کمرے میں جانے ہی والی تھی کہ اسے دروازے پر دستک سنائی دی۔

اس کے قدم کمرے میں جانے کی بجائے دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے سامنے عابی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسے جانتی تھی، وہ شانی کا دوست تھا۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خالہ خالہ... وہ جو قمر ہے نا، نیازی کا بیٹا، اس نے ایک پتھر سے شانی کا سَر پھاڑ دیا ہے۔ اس کے سَر سے بہت سا خون نکل رہا ہے۔ آپ جلدی چلو......''

کوثر کا دِل ایک پل کو رک سا گیا۔

''کہاں ہے وہ؟ کیسے ہُوا یہ سب؟''

''وہ چوہدریوں کے پلاٹ میں پڑا ہُوا ہے، آپ جلدی چلو۔ وہاں چل کر سب دیکھ لینا۔''

کوثر نے پلٹ کر ایک نظر گھر کو دیکھا۔

شما تاش کھیلنے میں مصروف تھا اور مریم بانو کو گود میں سلائے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔

اس کی نظریں دوبارہ شوہر کی طرف اٹھیں اور اس کی معذور ٹانگوں پر آکر تھم گئیں۔ اگر شما ٹانگوں سے معذور نہ ہوتا تو وہ خود اسے شانی کو لانے کے لیے بھیجتی مگر وہ تو اِس قابل بھی نہیں تھا کہ کسی کی مدد کے بغیر گھر سے باہر ہی دو قدم نکال سکتا۔ وہ خود دوسروں کا محتاج تھا۔

دو سال پہلے تک وہ بالکل ٹھیک تھا اور ہر جگہ آتا جاتا تھا۔ وہ تانگا چلاتا تھا اور اس کی کمائی سے کوثر اور بچوں کی ہر ضرورت پوری کرتا تھا، مگر افسوس کہ ایک ایکسیڈنٹ میں اسے اپنی دونوں ٹانگوں سے ہاتھ دھونا پڑا

اور اس کے بعد یہ سب ذمہ دری کوثر کے کاندھوں پر آ پڑی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے ذہن میں آئی ہوئی سوچوں کو جھٹکا اور اپنے قدم جلدی سے چوہدریوں کے پلاٹ کی طرف بڑھا دیے۔ معلوم نہیں وہاں شانی کس حال میں پڑا تھا۔

☆☆

ڈیلے کے قدم اچھائی کے ارادے سے شاید ہی کبھی جوانی میں خدا کے گھر کی طرف اُٹھے ہوں مگر برائی کے ارادے سے ضرور اس طرف اٹھ گئے تھے۔ اس کا باپ اس مسجد کا پیش امام تھا۔ مسجد انتظامیہ میں سے شاید کوئی آج دروازوں کو تالا لگانا بھول گیا تھا اور ان دونوں کی ضرورت پوری کرنے کا رستہ کر گیا تھا۔ خدا کے گھر میں چوری کرتے ہوئے ڈیلے کا دِل ایک دفعہ گھبرایا ضرور مگر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ خدا کی ذات بہت بلند ہے، اسے ان باتوں کی پروا نہیں ہے کہ کون اس کے گھر میں عبادت کرنے آتا ہے اور کون چوری۔ یہ صرف انسان ہی ہیں جو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی سوچ رکھتے ہیں اور اتنی سی بات کے لیے آسمان سَر پر اٹھا لیتے ہیں۔ مسجد کے کمروں سے دو عدد پنکھے اتارنے کے بعد ڈیلے نے وہ پنکھے میدے کے حوالے کر دیے۔ وہ اس سے بہتر طریقے سے ان پنکھوں کو غائب کر کے بعد میں آسانی سے کہیں بیچ سکتا تھا۔

اس سے جو رقم حاصل ہوتی، وہ دونوں بعد میں آدھی آدھی بانٹ لیتے۔ پنکھے اُتارنے کے بعد دیلا اپنے رستے ہولیا اور میدا اپنے۔

اگلی صبح یہ خبر سب کے لیے حیرت اور دکھ کا باعث بنی ہوئی تھی کہ کوئی، کل رات خدا کے گھر سے دو عدد پنکھے چوری کر کے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر گیا ہے۔

ایسا واقعہ پہلی بار بستی میں ہُوا تھا۔ لوگ دکھ اور غصے کی حالت میں تھے۔ ان کے بس سے باہر تھا کہ کسی طرح چور کا انہیں پتہ چلے اور وہ اسے مار کر زندہ دفن کر دیں۔ اِس معاملے میں بھی سب سے پہلے دیلے اور میدے پر شک کیا گیا۔

یوں تو بستی میں دو چار اور بھی لوفر، آوارہ اور چور قسم کے لوگ تھے، مگر ان دونوں کا نام ایسا بدنام ہُوا تھا کہ چوری کہیں بھی ہوتی، شک سب سے پہلے انہی پر جاتا۔

دیلے نے ماں اور باپ کے سامنے خدا اور رسول کی قسمیں کھائیں کہ وہ اور میدا اِس بار بے قصور ہیں، یہ چوری انہوں نے نہیں کی۔

باپ کو تو کیا یقین آنا تھا مگر اس کی ماں ایک بار پھر اسکی باتوں میں آگئی اور دیلے کے ساتھ مل کر اس نے خدا، رسول کی قسمیں کھا کر لوگوں کو یقین دلایا کہ اِس بار دیلا بے قصور ہے۔ یہ کام کسی اور کا ہے۔ ساتھ میں اس نے غلام حسین سے بھی کہا کہ وہ بھی لوگوں کو اس بات کی صفائی دے۔

اسے دیلے کی باتوں پر یقین ہوتا تو وہ صفائی دیتا۔ اس نے چُپ چاپ خاموشی اختیار کر لی۔ اگلے دن ایک شخص نے لوگوں کو بتایا کہ کل رات دس بجے جب وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو اس نے دیلے اور میدے کو مسجد کے باہر کھڑا ہُوا دیکھا تھا۔ اِس بیان سے لوگوں کا شک اور بھی پختہ ہو گیا۔

انہوں نے دیلے کی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یا تو کوئی معزز شخص دیلے کی صفائی دے کہ وہ بے قصور ہے، یا پھر دیلے کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اسے پولیس کے حوالے کر سکیں...... میدے کے گھر والوں تک بھی یہ پیغام پہنچ چکا تھا۔ اس کے باپ نے اس کا ہاتھ تھام کر لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور کہا تھا کہ آج کے بعد میدے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ اسے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال رہا ہے۔ وہ اب اسے پولیس کے حوالے کریں یا کسی اور کے، یہ درد سر اب ان کا ہے۔

پولیس کے نام پر میدے کے بھی ہوش اُڑ گئے تھے۔

کچھ دن پہلے بستی کے ایک شخص کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی اور اس کا انہوں نے جو حشر کیا تھا، وہ خود اس نے سب کو آ کر بتایا تھا۔ اس دن سے تھانے اور پولیس کا خوف میدے کے دِل میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اسی دن سوچ لیا تھا کہ اگر کبھی ایسی کوئی نوبت آئی تو وہ مرنا مر جائے گا، مگر تھانے کبھی نہیں جائے گا۔ اب جو اسے لوگوں نے تھانے لے جانے کی بات کی تو اس نے عورتوں کی طرح رَو رَو کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور ماں کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں کہ وہ بے گناہ ہے۔

ساتھ اس نے ماں کو دھمکی دی کہ اگر اسے پولیس کے حوالے کیا گیا تو...... وہ ان کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی خود کشی کر لے گا۔ اس نے اپنی ماں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے باپ کو، اس کی صفائی دینے کے لیے مجبور کرے۔ اگر اس کے باپ نے اس کی صفائی دیدی تو اس کو نجات مل سکتی ہے۔ آدھی رات کو ممتا کی ماری ماں نے غلام حسین کے قدموں پر روتے ہوئے سَر رکھ دیا اور اسے اِس بات پر رضامند کر لیا کہ کل وہ مسجد کی انتظامیہ کے سامنے دیلے کی صفائی دے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس سیدھی سادی عورت نے ساری زندگی اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ اس رات، پہلی بار اس نے غلام حسین سے کچھ مانگا تھا اور غلام حسین اس کی بات ٹال نہیں سکا۔

اگلے دن مسجد انتظامیہ کے سامنے اس نے دیلے کی صفائی میں بیان دے دیا تھا کہ اس بار دیلا بے قصور ہے، یہ کام کسی اور نے کیا ہے اور اس کی اس بات کو مان بھی لیا گیا۔ مگر اِس واقعے کے بعد وہ اکثر چُپ چُپ رہنے لگا۔

اس کا دِل اکثر گواہی دیتا کہ اِس چوری میں دیلے کا کہیں نا کہیں ہاتھ ضرور ہے، مگر اس بات کا اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اسے اکثر خیال آتا کہ اس نے دیلے کے حق میں بیان دے کر اچھا نہیں کیا۔ کیا خبر سچ دیلے نے ہی یہ چوری کی ہو۔ اِس گناہ پر اکثر اس کا دِل پشیمان رہتا اور شک کے سانپ اس کے ذہن میں کلبلاتے

رہتے۔ اسے دیلے کی اس حرکت پر شک تو تھا، مگر یہ شک اس دن یقین میں بدل گیا، جس دن بال بنواتے ہوئے اس کی نظر شیدے نائی کی دکان کی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں جو پنکھا لگا ہوا تھا، اس پر نیا رنگ کیا گیا تھا اور اس کی پرانی صورت تبدیل کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ مگر غلام حسین نے پھر بھی مسجد کے اس پنکھے کو پہچان لیا تھا۔ اس نے شیدے نائی سے جب اس بارے میں تنہائی میں پوچھا تو وہ فوراً ہی مکر گیا۔

''غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو بزرگو۔ یہ پنکھا تو میں تین ماہ پہلے شہر سے لایا تھا۔ یہ وہ پنکھا نہیں ہے، جس پر آپ شک کر رہے ہو۔''

''اچھا میاں، تو ٹھیک ہے پھر، اگر آپ نے سچ نہیں بتانا تو نہ بتائیں۔ میں مسجد کی انتظامیہ سے اپنے شک کا اظہار کر دیتا ہوں، وہ خود آ کر اس بات کی تسلی کر لے گی کہ یہ پنکھا وہی چوری شدہ ہے یا کوئی اور ہے......''

شیدے کی اچانک ہی ساری ہوا نکل گئی۔ اس نے بے اختیار غلام حسین کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بزرگو! غلطی ہو گئی مجھ سے، معاف کر دو مجھے۔ غریب بندہ ہوں جی، چار پیسے کا لالچ کر بیٹھا۔ یہ پنکھا میں نے میدے سے خریدا تھا، ایک ماہ پہلے۔ بہت سستا مل رہا تھا، مجھے ضرورت بھی تھی، سو خرید لیا۔ پنکھے کے پیسے لیتے وقت آپ کا لڑکا بھی ساتھ آیا تھا اس کے اور اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ اسی لیے آپ سے چھپا رہا تھا۔ غریب بندہ ہوں جی، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جی۔ مجھ پر رحم کریں۔''

غلام حسین کے دل پر جیسے پر کسی نے پتھر سا کھینچ مارا تھا۔ اس نے شیدے سے کہا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ بے فکر ہو جائے۔

اس رات، عشاء کی نماز کے بعد وہ بہت دیر تک اپنے اس گناہ پر خدا سے معافی مانگتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برستے رہے تھے۔

جب سے دیلا برے کاموں میں پڑا تھا، اس کے دل میں اس کے لیے بیٹے جیسا کوئی جذبہ نہیں رہ گیا تھا مگر جب سے مسجد میں چوری کی سچائی اسے معلوم ہوئی تھی، اسے دیلے سے بے حد نفرت ہو گئی تھی۔

وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے لاکھ سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود وہ جس طرح برائی کے رستے پر چل نکلا تھا، اس نے غلام حسین کے دل میں ایک چھید سا کر ڈالا تھا۔

غلام حسین جب سے شیدے سے مل کر آیا تھا، اس کی جب بھی دیلے پر نظر پڑتی، اس کے لبوں پر صرف ایک ہی دعا مچل جاتی۔

''میرے مولا! میری آنکھوں کی بینائی چھین لے مجھ سے یا اس شخص سے بہت دور کر دے مجھے۔ میں اس انسان کو ہرگز ہرگز دیکھنا نہیں چاہتا، جو تیرے گھر میں بھی چوری کرنے سے نہیں شرمایا......'' جب شب و روز ہی اس کے لبوں پر یہی دعا رہنے لگی تو ایک دن خدا نے اس کی دعا سن لی۔ اسے دیلے سے دور اور اپنے پاس بلا لیا۔

پورا محلہ اور بستی کے سب لوگ دیلے کے گھر میں کچھ لمحوں کو جمع ہوئے اور پھر وہ سب مل کر اسے اس کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے۔

غلام حسین کے جانے سے اور تو کچھ نہیں ہوا، بس گھر میں کمانے والے اس فرد کی کمی ہو گئی، جس نے اس گھر کی ساری ذمہ داری اٹھائی ہوئی تھی۔ باپ کے جانے کے بعد دیلے کے سر پر گھر کی ذمہ دری تو آن پڑی تھی، مگر وہ اس ذمہ داری کو اٹھانے سے قاصر تھا۔ باپ کے گزرنے سے پہلے، جب وہ آدھی رات کو گھر آتا تھا تو اسے بنا بنایا کھانا مل جاتا تھا اور صبح کا ناشتہ بھی۔ مگر اب...... جب تک گھر میں آٹا اور ضرورت کا سامان موجود رہا، کسی نا کسی طرح پیٹ کا دوزخ بھرتا رہا،

مگر جب سب چیزیں ختم ہو گئیں تو گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ غلام حسین کے سسرال والوں کو جب اس صورت حال کا پتہ چلا کہ ان کی بہن وہاں فاقوں میں وقت گزار رہی ہے تو ایک دن دیلے کا بڑا ماموں آیا اور دیلے کو لعنت ملامت کر کے، اس کی ماں کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔

دیلا اس گھر میں اکیلا ہو کر رہ گیا۔ ماں باپ کے جانے سے اسے اور تو کچھ فرق نہیں پڑا، بس نشہ پانی کے ساتھ ساتھ وہ دو وقت کے کھانے کے لیے بھی پریشان رہنے لگا تھا۔ پہلے یہ پریشانی اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

جس طرح پہلے وہ اپنے نشے پانی کا بندوبست کہیں نہ کہیں سے کرلیا کرتا تھا، اب دو وقت کے کھانے کا بھی کر لیتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ بہت مشکل سے کر پاتا تھا۔

☆☆

سعدیہ عرف سادی کا شمار دنیا کی ان لاکھوں لڑکیوں میں تھا، جو کسی عام سے گھر میں پیدا ہوتی ہیں، عام سے گھر میں پلی بڑھتی ہیں اور جوانی کی دہلیز میں قدم رکھنے کے بعد کسی عام سے گھر میں بیاہ دی جاتی ہیں۔ سادی نے بھی شادی سے پہلے اپنی آنکھوں میں وہی خواب سجا لیے تھے، جو ہر کنواری لڑکی دیکھتی ہے۔ ایک خوبصورت اور خوش اخلاق شوہر، جس کی ایک اچھی تن خواہ والی نوکری بھی ہو۔ ایک اچھا اور خوبصورت گھر، جس میں نوکر اور چاکروں کے ساتھ ضرورت اور سہولت کی ہر شے موجود ہو، اور اگر اس کے ساتھ گھر میں ساس، سسر، دیور اور نند جیسا کوئی رشتہ نہ ہو تو سونے پر سہاگا۔۔۔ مگر افسوس کہ اسے ایسا کچھ نہیں ملا تھا۔ اس کی جس شخص سے شادی ہوئی تھی، وہ عمر میں اس سے پندرہ سال بڑا تھا۔ یعنی تیس سال کا تھا۔ سادی کی سہاگ رات کو جب اس پر نظر پڑی تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی تھی۔ گو وہ خود بھی کوئی حور پری نہیں تھی مگر وسیم تو بالکل ہی گیا گزرا تھا۔ اس کی شکل اپنے نام سے بالکل الٹ تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس حقیقت کو قبول کرلیا اور اپنے دل میں وسیم کے لیے کوئی میل نہیں آنے دیا۔ وسیم کا شمار دنیا کے ان لاکھوں مردوں میں ہوتا تھا، جن کا وجود اس دھرتی پر بوجھ کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

وہ بھی اس بستی کے ان آوارہ ترین لوگوں میں سے ایک تھا، جو قبرستان والے اڈے پر سارا سارا دن تاش کھیلتے، جوا لگاتے، چرس پیتے، اور کبھی کبھار شراب منگوا کر من بہلا لیتے تھے۔

پتہ نہیں سادی کے باپ نے کیا سوچ کر اس کی شادی وسیم سے کردی تھی۔ جس میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی خوبی نہیں تھی۔ وسیم صرف چند ایکڑ زمین کا مالک تھا، جس کی سالانہ، آدھی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے اور آدھی آمدنی وہ عیاشی میں صرف کرتا تھا۔ شاید سادی کے باپ نے بھی ایک بات دیکھ کر اس کا رشتہ وہاں کر دیا تھا کہ اس کی بیٹی اس گھر میں خوش رہے گی۔ یا پھر اسے، اپنے گھر میں مزید دو دو جوان بیٹیوں کی فکر نے وسیم جیسے آوارہ شخص سے بیاہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی اتنی آمدنی نہیں تھی کہ وہ بہت زیادہ جہیز کا بندوبست کرتا۔ البتہ اس سے جو کچھ ہو سکا تھا، اس نے ضرورت کی وہ ساری چیزیں سعدیہ کو جہیز میں دی تھیں۔

اس گھر میں سعدیہ کے ایک دیور کے علاوہ صرف اس کی ساس کا وجود تھا۔

سسر اس کی آمد سے بہت پہلے ہی چل بسا تھا اور نند جیسا کوئی رشتہ اس گھر کے نصیب میں نہیں تھا۔ سادی نے پہلے دن ہی صبر شکر پڑھ کر اس گھر میں تمام عمر گزارنے کا سوچ لیا تھا۔ مگر اس کے اس ارادے میں ناکامی کی دراڑ اس وقت پڑی، جب شادی کے ایک ہفتے بعد ہی وسیم کے چھوٹے بھائی جاوید عرف جیدے نے اس سے وہ حرکت کی، جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ شادی کے بعد اس نے اس گھر کے ہر فرد کا دل جیتنے کے لیے سچے دل سے سب کی خدمت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ کبھی ساس اور دیور کے میلے کپڑے دھو رہی ہے، تو کبھی خشک ہونے کے بعد ان پر استری کر رہی ہے۔ کبھی کھانا بنا کر سب کو ان کے کمرے میں پہنچا رہی ہے تو کبھی صحن میں جھاڑو دے کر کمروں کی صفائی میں لگی ہوئی ہے مگر اس کی ساس تھی کہ جو اس سے کبھی خوش نہیں ہوتی تھی پر سعدیہ کو امید تھی کہ ایک دن وہ ضرور اس کا دل جیت لے گی۔ جیدا وسیم سے پانچ سال چھوٹا اور سادی سے دس سال بڑا تھا۔ سادی جب سے بیاہ کر آئی تھی، اس نے نوٹ کیا تھا کہ جیدا اسے ہر وقت بڑی عجیب سی نظروں سے گھورتا رہتا ہے۔ اسے جیدے کے اس طرح دیکھنے سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا جیدا سے سامنا کم سے کم ہو تاکہ اسے اس کی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر دن میں دو چار بار، نہ چاہنے کے باوجود ایسا ہو جاتا تھا۔ وسیم، جیدا اور اس کی ساس، سب کا کمرا الگ الگ تھا۔ سادی کھانا بنانے کے بعد، اول دن سے ہی سب کا کھانا ان کے کمروں میں جا کر دیتی آئی تھی۔ اس دن بھی وہ رات کا کھانا بنا کر جیدے کے کمرے میں دینے گئی تو جیدے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''بھابی جی۔۔۔ کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو، ہم بھی آخر تمہارے کچھ لگتے ہیں۔۔۔'' سادی کا اچانک ہی دِل گھبرانے لگا۔ جیدا کہتا رہا۔ ''مجھے تو حیرت ہوتی ہے تم پر، کیسے لٹو کی طرح سارا دن ادھر سے اُدھر گھومتی پھرتی ہو۔ کبھی یہ کام کر رہی ہو تو کبھی وہ۔ پتہ نہیں رات کو کیا حالت ہوتی ہوگی تمہاری۔ لاؤ، میں تمہاری ٹانگیں دبا دوں۔''

اس نے سادی کی ٹانگوں کو چھوا ہی تھا کہ وہ تڑپ کر چار پائی سے اٹھی اور دوسرے ہی پل کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا دِل سینے میں بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اس رات جیدے کی آنکھوں میں ہوس کا وہ پیغام پڑھ لیا تھا، جو کوئی عورت کسی بھی مرد کی آنکھوں میں پڑھ لیتی ہے۔ اس کی چھٹی حس کئی دنوں سے اسے اس بات سے آگاہ کر رہی تھی کہ جیدا، کبھی نہ کبھی ایسا ضرور کچھ کرے گا اور بالآخر اس کی چھٹی حس کی پیش گوئی پوری ہو گئی تھی۔ جیدا وسیم کا بھائی تھا اور اس میں بھی وہ تمام خامیاں موجود تھیں، جو وسیم میں تھیں۔ وسیم بھی چرس، شراب اور جوے کے ساتھ ساتھ ہوس کا پجاری تھا اور ساری ساری رات سعدیہ کو مختلف طریقوں سے اذیتیں دے کر تسکین حاصل کرتا رہتا تھا اور جیدے کو بھی وہی تمام ''شوق'' لاحق تھے۔ جیدا اپنے باقی سارے شوق تو باہر سے ہی پورے کر لیتا تھا مگر یہ ہوس کی ضرورت وہ گھر سے پوری کرنا چاہتا تھا۔ سادی پہلے دن سے ہی اس کے من میں اتر گئی تھی اور اس نے اسی دن سے دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن سعدیہ کو ضرور حاصل کرے گا۔ سادی کا جیدے کی اس حرکت سے بہت دِل دکھا تھا۔ وہ پڑھی لکھی بالکل نہیں تھی مگر غلط اور درست کی پہچان اسے ضرور تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے وجود پر صرف اس کے شوہر کا حق ہے، کسی اور کا نہیں۔ اس نے اسی دن سے سوچ لیا تھا کہ وہ آج کے بعد جیدے کے ہوتے ہوئے، اس کے کمرے میں کبھی کھانا رکھنے نہیں جائے گی۔ اس دن کے بعد، جب جیدا گھر سے باہر ہوتا، وہ اس کے کمرے میں جا کر اس کا کھانا ڈھانپ کر رکھ آتی۔ اس واقعے کے صرف تین دن بعد ہی وہ واقعہ پیش آ گیا، جو کہ نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس دن جیدا گھر میں نہیں تھا۔ وہ اس کے گھر میں ہونے اور نا ہونے کے اوقات سے کافی حد تک واقف ہو گئی تھی اور اسی دوران ہی وہ اس کا کھانا اس کے کمرے میں جا کر رکھ آتی تھی۔ اس دن بھی وہ جیدے کا کھانا اس کے کمرے میں رکھنے گئی اور واپس پلٹی ہی تھی کہ اسے جیدا کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ سادی اپنا دِل تھام کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی یا کچھ اور سوچتی، اچانک جیدے نے چند قدم بڑھائے اور سادی کے قریب پہنچ کر، فوراً ہی اس کا چہرہ چوم لیا۔ سادی اپنی جگہ پتھر ہو کر رہ گئی۔

......☆☆......

گودلیے کی ماں اس سے جدا ہو کر بھائی کے ساتھ اس کے گھر آ گئی تھی، مگر وہاں آنے کے بعد ایک دن بھی اس کا وہاں دِل نہیں لگا تھا۔

اسے رہ رہ کر دلیے کی یاد آتی رہی تھی اور اس کا دل بے چین ہوتا رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے پاس بمشکل ایک ہفتہ بتایا ہوگا کہ اس کا دِل دلیے سے ملنے کے لیے مچلنے لگا۔ شوہر کے گزر جانے کے بعد وہی اس کا آسرا رہ گیا تھا۔ وہ اس کے اور کسی کام نہ آتا تو بھی وہ اسے دیکھ کر جی تو سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے اور کچھ نہ سہی کم سے کم آنکھوں کی ٹھنڈک تو تھا۔ جسے دیکھ کر وہ جی سکتی تھی، اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے رہ رہ کر دلیے کی تنہائی کا بھی خیال آتا اور اس کے کھانے پینے کا بھی۔ وہ اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ دلیے کے لیے دو وقت کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا مشکل ہوگا۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ہر ایرے غیرے کا محتاج ہوتا پھرے گا اور یہ بات اسے گوارہ نہیں تھی۔ وہ اس وقت تو بھائی کے کہنے پر اس کے ساتھ آ گئی تھی مگر یہاں آنے کے بعد اس کا دِل ایک پل بھی سکون سے نہیں رہ سکا تھا۔ وہ کچھ دنوں تک تو اپنی بیقراری پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی، مگر جو یہ کام اس کے بس سے باہر ہو گیا تو اس نے ایک دن روتے ہوئے بھائی کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ اس کا بھائی بھی اسی کی طرح نرم دِل انسان تھا۔

اس نے اسی وقت بہن کے آنسو پونچھے اور اسے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ وہیں چھوڑ آیا، جہاں سے ایک ہفتہ پہلے لے کر گیا تھا۔ اپنی بہن کے ساتھ، وہ اپنے گھر سے کچھ من گندم اور گھر کی ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی لے گیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ دیلا ایسا انسان نہیں ہے کہ اپنی ماں

کا بوجھ اٹھا سکے۔

اپنی بہن کا بوجھ انہیں خود اُٹھانا تھا۔ بلکہ اِس کے ساتھ دیلے کا بوجھ بھی اُٹھانا تھا۔ یہی سوچ کر وہ گھر سے کچھ من گندم اور ضرورت کی اور چیزیں اپنے ساتھ لایا تھا، تاکہ اس کی بہن جب تک وہاں رہے، اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس کا اِرادہ تھا کہ جب تک دیلا سدھر نہیں جاتا، وہ ضرورت کی یہ ساری چیزیں، جب جب ختم ہوتی رہیں گی وہاں آ کر پہنچا جایا کرے گا۔ اس دن بھی اپنی بہن کو وہاں چھوڑ کر اس نے ضرورت کا سامان وہاں رکھا اور واپس لوٹ گیا۔ اس دن، دیلا رات گئے گھر لوٹا اور اس نے اپنی ماں کو وہاں موجود پایا تو اس کا دِل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے اس بات کی خوشی نہیں تھی کہ اس کی ماں واپس لوٹ آئی تھی بلکہ اسے اِس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ اس کا ماموں ایک ماہ کے لیے ان کا خرچہ پانی وہاں چھوڑ گیا تھا۔

ماں کے پیچھے اس نے بڑی مشکل سے دن کاٹے تھے۔ نشے پانی کی تو اسے پریشانی تھی ہی تھی، ساتھ میں اسے دو وقت کے کھانے کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ اب جو اس نے گھر میں راشن پانی دیکھا تو اس کا دِل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اور کچھ نہ سہی، کم سے کم دو وقت کے کھانے کی پریشانی تو عارضی طور پر ٹلی تھی۔ دیلے کی ماں وہاں آنے کے بعد اس سے اور بھی زیادہ محبت اور شفقت سے پیش آنے اور اسے برائی کے رستے سے روکنے لگی تھی، مگر دیلا وہ انسان نہیں تھا جو اتنی آسانی سے سیدھا ہو جاتا۔ جب دیلے کی ماں اپنی طرف سے ہر طرح سے اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تو کسی نے اسے دیلے کے شادی کرنے کا مشورہ دیا کہ جب بیوی آئے گی تو یہ خود سیدھا ہو جائے گا۔ یہ بات اس کے دِل کو لگی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اگر دیلا سدھر سکتا ہے تو صرف شادی سے سدھر سکتا ہے۔ صرف بیوی اسے سدھار سکتی ہے، ورنہ وہ اور کسی شے سے سدھرنے والا نہیں ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں آئی تو اس نے اِدھر اُدھر سے دیلے کی دلہن تلاش کرنا شروع کر دی۔ آس پاس، دور پرے کے کچھ رشتے موجود تھے، مگر دیلے کے لیے کوئی گھر بھی رشتہ دینے کو تیار نہ ہوا۔ لے دے کے اس کی نظروں میں صرف ایک ہی گھر رہ گیا تھا اور وہ تھا بھائی کا گھر۔ اس نے روتے ہوئے بڑے بھائی کے سامنے دامن پھیلا کر دیلے کے لیے سکینہ کا رشتہ مانگا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ بہن کی آنکھوں میں آنسو، اسے کسی طور گوارہ نہیں تھے۔ اس نے اس کے آنسو پونچھے اور سکینہ کا ہاتھ اسے تھما دیا۔ سکینہ بہت سلجھی ہوئی، سمجھدار اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ دیلے کی ماں کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ صرف یہی عورت دیلے کی زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ اگلے کچھ دنوں میں سکینہ دلہن بن کر دیلے کی زندگی میں آ گئی تھی۔ دیلے کی ماں کو جب یہ یقین آ گیا کہ کوئی اس کے پیچھے دیلے کو اچھی طرح سنبھالنے والا موجود ہے تو اس نے ایک دن سے آنکھیں بند کیں اور اپنے شوہر کے پاس جا سوئی۔ سکینہ کے آنے کے بعد بھی دیلے کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے ویسے بھی جنسی آسودگی کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ دوسرے مزاج کا بندہ تھا۔ سکینہ جب سے آئی تھی، اس نے اس کے ساتھ ہم بستری کے فرائض بھی صرف چند بار ہی پورے کیے تھے، ورنہ اسے اِس چیز کی زیادہ طلب نہیں ہوتی تھی۔ اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی جیسے پہلے گزرتی تھی۔ اس کا ماموں پہلے بہن کے لیے وہاں دانہ پانی چھوڑ جاتا تھا، اب بیٹی کے لیے لانے لگا تھا۔

ماں کے جانے سے اور سکینہ کے آنے سے دیلے کو صرف اتنا فائدہ ہُوا تھا کہ اسے دو وقت، بغیر کسی مشقت کے کھانا مل جاتا تھا۔ سکینہ کی آمد سے دیلے کو ایک اور فائدہ بھی ہُوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جہیز میں ضرورت کا جو سامان لائی تھی، دیلا اسے بیچ کر اپنا نشہ پانی پورا کر سکتا تھا اور اس نے کیا بھی۔ یہاں تک کہ چوری چھپے ہر شے لے جانے کے بعد اس نے آخر میں سکینہ کے کانوں سے سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی اُتروا لی تھیں۔

اُدھر سکینہ نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ کسی طرح وہ دیلے کو سدھار سکے۔ اِس کوشش میں اس نے دیلے کی ہر بات مانی تھی یہاں تک کہ اسے اپنے کانوں کی بالیاں بھی اُتار کر دے دی تھیں۔ مگر اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ دیلے کو سدھار نہیں سکی تھی اور اب وہ مایوس ہو گئی تھی، اس نے اپنی یہ کوشش ترک کر دی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دیلے کو سدھارنا اس کے بس سے باہر ہے۔ جب سے سکینہ کی جہیز کی چیزوں نے دیلے کا ساتھ

دیا، اس کے اور میدے کے کچھ ہفتے بڑے سکون اور عیاشی میں گزرے اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو وہ دونوں ایک بار پھر اس مقام پر آ کھڑے ہوئے، جہاں وہ پہلے تھے۔ اس دوران وہ دونوں ہمیشہ ایک ہی بات سوچتے رہتے تھے کہ کسی طرح کوئی ایسا آسان اور مستقل کام انہیں مل جائے جس کی آمدنی سے ان کے شب و روز سکون سے گزر سکیں۔ مگر باوجود کوشش کے ایسا کوئی کام ان کے ذہن میں نہیں آ سکا تھا۔

جب سکینہ کے جہیز کی قیمتی چیزیں بھی ختم ہو گئیں تو ایک دن میدے نے دیلے سے کہا۔

''یار اگر تجھے برا نہ لگے تو ایک کام میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ اگر تم وہ کام شروع کر دو تو ہم دونوں کا کام بنتا رہے گا اور ہمیں نشے پانی کے لیے جگہ جگہ لوگوں کے سامنے گڑگڑانا بھی نہیں پڑے گا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں یہ کام خود شروع کرتا۔ مگر یہ کام فی الحال میرے بس میں نہیں ہے، تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔''

دیلے نے جب اس کی بات سنی تو وہ بات اس کے دل کو لگی۔ اسے خیال آیا کہ اسے خود یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ اگر سچ میں میدے کا بتایا ہوا کام شروع ہو جائے تو سچ میں ان کے نشے پانی کا مستقل بندوبست ہو سکتا تھا۔

اس نے میدے سے کہا کہ وہ آج ہی اس سلسلے میں کوشش شروع کرتا ہے۔

......☆☆......

اس کا نام اقبال عرف بالی تھا۔ اقبال مردوں کا نام ہوتا ہے، پر اس کا لڑکی ہو کر یہی نام تھا۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ نے اس کا مردوں والا یہ نام کیوں رکھا تھا؟ اس بات سے شاید وہ خود بھی واقف نہیں تھے۔ بالی کے ماں باپ ایک وکیل صاحب کے ہاں کام کرتے تھے۔ اس کی ماں اندر کے کام کرتی تھی اور اس کا باپ باہر کے۔ بالی بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ وہیں رہتی تھی۔ وکیل صاحب کی صرف ایک بیٹی تھی، جس کا نام انہوں نے ثوبیہ رکھا تھا۔ ثوبیہ، بالی سے صرف چند سال بڑی تھی اور اس نے شہر میں کالج تک تعلیم حاصل کی تھی۔ جب ثوبیہ اور بالی کی پہلی ملاقات ہوئی اور ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو ''بھا'' گئیں۔

ثوبیہ کو وہ چھوٹی موٹی سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اگلی کچھ ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں اور بالی نے ثوبیہ کے دل میں ایک گھر سا بنا لیا۔ وہ یوں کہ وہ ثوبیہ کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھی اور اس کی ہر بات بھاگ بھاگ کر پورا کرتی تھی۔ اس کے لبوں سے نکلی ایسی کوئی بات نہیں تھی، جس کی تعمیل وہ نہ کرتی ہو۔ اگر بالی ثوبیہ کا ہر کہا مانتی تھی تو ثوبیہ بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ اکثر اپنے نئے کپڑے، جو اس نے صرف ایک دو بار ہی پہنے ہوتے، بالی کو دے دیا کرتی اور یہی حال وہ اپنے جوتوں کا کرتی۔ ثوبیہ کی اتنی مہربانی سے بالی کے پاس اتنے کپڑے اور جوتے جمع ہو گئے تھے، جس کا اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بالی پر ثوبیہ کی مہربانی کی ایک وجہ اور بھی تھی، اور وہ یہ تھی کہ بالی اس کے ساتھ اس کے پلنگ پر سوتی تھی۔ اور یہ سلسلہ اس دن سے شروع ہوا تھا، جس دن ثوبیہ اسے پہلی بار شاپنگ کے لیے بازار لے گئی تھی۔ شاپنگ کرتے کرتے صبح سے شام ہو گئی تھی اور جب وہ شام کو لوٹی تھی تو ثوبیہ نے اس سے کہا تھا۔

''یار میں تو آج بہت تھک گئی ہوں۔ صبح سے شام تک چلنا عذاب بن گیا میرے لیے تو تم ایسا کرو، تھوڑی دیر کے لیے میری ٹانگیں دبا دو، میرا تھکن سے بہت برا حال ہے۔۔۔''

بالی کو بھلا کیا انکار ہوتا۔ وہ اسی وقت ہی ثوبیہ کی ٹانگیں دبانے بیٹھ گئی۔ جب وہ ثوبیہ کی ٹانگیں دبا چکی تو اچانک ثوبیہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے ہاتھوں کے پیالوں میں بالی کا چہرہ بھر لیا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے بالی سے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''اور اب مجھے یہاں چومو۔۔۔''

اس نے اپنے ایک رخسار پر انگلی رکھی۔ بالی اس کی اس فرمائش پر ایک پل کو ہچکچائی، پر دوسرے ہی پل اس نے اس خواہش کی بھی تکمیل کر دی۔

''اور اب یہاں بھی۔۔۔''

اس نے اپنے پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں کو چھوا۔ اس بار بھی بالی نے تعمیل حکم کی اور پھر ثوبیہ اسے جہاں جہاں کہتی گئی، بالی وہاں وہاں اپنے ہونٹوں کے نشان ثبت کرتی گئی

یہاں تک کہ۔۔۔۔۔۔صبح جب ثوبیہ بیدار ہوئی تو اس نے بے اختیار بالی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا اور اپنے گلابی لب اس کے رخسار پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"یو آر گریٹ یار! مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم اتنی کمال کی ہو۔ میں آج کے بعد بھی تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں، تم نے تو میرا دل خوش کر دیا۔۔۔" اور اس دن کے بعد ثوبیہ نے واقعی اسے بھی خود سے دور نہیں کیا تھا۔ اس نے وکیل صاحب سے کہہ کر بالی کا ٹھکانا اپنے کمرے میں کرالیا تھا۔ بالی کے ماں باپ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں تھیں اور ان دونوں کا ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا غلط نہیں تھا۔

اس دن کے بعد ثوبیہ جو کھاتی، وہ ہی بالی کو کھلاتی۔ جو پہنتی، وہی اسے پہناتی۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگی تھی۔ ثوبیہ کو صرف چند ہی شوق تھے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، گھومنا، پھرنا، فلمیں دیکھنا، گانے سننا اور ان پر رقص کرنا۔ ثوبیہ کی صحبت میں رہ کر بالی بھی کسی حد تک اسی کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔

اس کے من میں بھی وہ سب شوق سما گئے تھے، جو ثوبیہ کے من میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ اس کے ساتھ وی سی آر پر فلمیں دیکھتی، گانے سنتی اور ثوبیہ کے ساتھ مل کر ان پر رقص کرتی۔

کبھی وہ دونوں مل کر رقص کرتیں تو کبھی اکیلے۔ کبھی ثوبیہ رقص کرتی تو بالی اسے داد دیتی رہتی اور کبھی بالی رقص کرتی تو ثوبیہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔

شروع شروع میں بالی اس فن میں بہت پیچھے تھی۔ وہ پاؤں کہاں ڈالتی، پڑتا کہیں تھا۔ پھر ثوبیہ نے دھیرے دھیرے اسے اس فن کے بھی رموز و اوقاف سے آگاہ کیا تھا، یہاں تک کہ وہ اس فن میں کافی حد تک ماہر ہوگئی تھی۔

بالی ثوبیہ کی قربت میں بہت خوش تھی۔ وہ دیہات کی رہنے والی لڑکی تھی، اسے شہر کی رونقوں اور دنیا کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس کا باپ شہر میں بھی کہیں نوکری کرتا تھا، کبھی کہیں۔ یوں ہی پھرتے پھرتے وہ وکیل صاحب سے ایک دن آملا۔ تقدیر اس پر مہربان تھی۔ وکیل صاحب نے اسے اچھی تنخواہ پر مستقل اپنے پاس رکھ لیا اور اسی کے کہنے پر اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی شہر میں بلا لیا تھا۔ اب وہ تینوں وہاں خوش تھے۔ خاص کر بالی وہاں بہت خوش تھی۔

اسے وہ سب کچھ وہاں دیکھنے اور حاصل کرنے کو ملا تھا، جس کے اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ ثوبیہ اس پر اتنی مہربان تھی، اس کا اتنا خیال رکھتی تھی اور اسے اتنی چیزیں دیتی تھی کہ اگر وہ اسے اپنی جان دینے کو بھی کہتی تو بھی بالی انکار نہ کرتی۔ اس لیے ثوبیہ اسے جب بھی، جو بھی بات کہتی، بالی آنکھیں بند کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاتی۔ ان کے دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک ثوبیہ کی ایک کزن کی شادی کے دن قریب آگئے۔ وہ اس کی شادی میں شرکت کرنے گئی تو اپنے ساتھ بالی کو بھی لیتی گئی۔ اس نے بالی سے کہا تھا کے وہاں ہنسی خوشی کے ماحول میں ناچ گانا بھی ہوگا اور وہاں اسے اپنے فن کو آزمانے کا موقع بھی ملے گا۔ وہاں بہت سے لوگ ہوں گے، جو اسے اور اس کے فن کو داد دیں گے اور اس سے اگلی رات، بڑی رات کو جب رت جگا ہوا تو وہاں عورتیں تو عورتیں، مردوں نے بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے، جن میں واصف بھی تھا۔

ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد، سرخ و سفید رنگت اور مضبوط قد و قامت کا وہ شخص ثوبیہ کے دل میں اتر گیا تھا۔

ثوبیہ کو یہ تو پتہ تھا کہ وہ اس کا دور پرے کا کوئی رشتہ دار ہے، پر کون ہے، کہاں رہتا ہے؟ اس کا اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس نے اسی وقت ہی دل میں ارادہ باندھ لیا کہ وہ جلد ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے، اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی۔ ادھر واصف کے دل میں وہ سانولی سلونی سی لڑکی، بالی بس گئی تھی۔ اس نے بھی ثوبیہ کی طرح دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ جلد ہی بالی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اتنا تو پتہ چل گیا تھا کہ وہ سانولی سلونی سی لڑکی، اس سرخ و سفید لڑکی کے ساتھ آئی ہوئی ہے، جو غالباً اس کی کوئی دور پرے کی رشتہ دار تھی۔ اس نے دل میں ارادہ باندھ لیا کہ وہ سب سے پہلے اس سرخ و سفید سی لڑکی کی طرف اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا اور پھر اس کے ذریعے سے بالی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ بالی یا ثوبیہ کے بارے میں مزید کچھ جان پاتا، اچانک ثوبیہ نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ بھی ثوبیہ کو اتنا ہی جانتا تھا، جتنا ثوبیہ اس کے بارے میں جانتی

تھی۔ ثوبیہ نے جب اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے اِس شرط پر اس کی دوستی کا ہاتھ تھام لیا کہ وہ عنقریب بالی کو بھی اس کے دوستوں کی فہرست میں شامل کرے گی۔ ثوبیہ نے اس سے کہا تھا۔

''ڈونٹ وری یار۔۔۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ میری بہت اچھی اور کمال کی دوست ہے۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتی۔ تم بے فکر ہو جاؤ، میں تمھاری اس سے دوستی کرا دوں گی۔'' اور واصف نے مسکراتے ہوئے اس کی دوستی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ واصف کی قربت کے وہ دن، ثوبیہ کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ اس نے اسے ایسی کھٹی میٹھی لذتوں سے روشناس کیا تھا، اسے وہ مسرتیں دی تھیں، جو بالی بھی اسے نہیں دے پائی تھی۔ ثوبیہ کا خمار واصف کے سر سے اترنے لگا تو اس نے ثوبیہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ ثوبیہ نے کہا۔

''میں آج ہی بالی سے بات کرتی ہوں۔ امید ہے، ہم آج رات کا کھانا ایک ساتھ ہی کہیں کھائیں گے۔''

اس نے بالی کے پاس جا کر واصف کی ایسی تعریف کی کہ بالی اسی وقت ہی اس سے ملنے کو بے چین ہو گئی۔ ثوبیہ نے مزید کہا تھا۔

''یار میں نے ایسا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ ایسا ینگ، خوبصورت اور دلکش انسان۔۔۔ سچ پوچھو تو میں تو پہلی نظر میں ہی اس پر لٹو ہو گئی تھی، مگر میں جب اس سے ملی تو پتہ چلا کہ وہ تو تیرے رقص کا دیوانہ ہے۔ مجھے کہنے لگا، میں نے آج تک ایسا رقص کسی کا نہیں دیکھا۔ قسم سے، ایسا ناچتی ہے وہ، جیسے ایک ایک قدم دِل پر پڑ رہا ہو۔ اس کے سامنے تو مور بھی ناچتے ہوئے شرما جائیں۔ کاش میں ایک بار پھر اسے، صرف اپنے سامنے ناچتا ہوا دیکھ پاتا۔ پتہ نہیں وہ ناچتی ہے یا ہواؤں میں اڑتی ہے۔۔۔۔۔'' بالی، ثوبیہ کے ایک ایک لفظ کے ساتھ خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ آج تک کسی نے اس کی، اس کے رقص کی ایسی تعریف نہیں کی تھی۔ اسے ایسی داد نہیں دی تھی، خاص کر کسی مرد نے۔ گور تجگے کی رات اس نے بھی واصف کو دیکھا تھا۔ وہ بھی مردوں کی ٹولی میں بہت خوب ناچا تھا، مگر اس وقت بالی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اور اب۔۔۔ اب اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ فوراً اڑ کر اس کے سامنے چلی جائے اور وہ جیسا کہے، کرتی جائے۔۔۔ اس نے ثوبیہ سے کہا کہ وہ جب کہے گی، وہ اس کے ساتھ واصف سے ملنے کو چل دے گی۔ اس رات جب وہ تینوں اکٹھے ہوئے اور ثوبیہ نے سب سے پہلے رقص کا آغاز کیا تو اس کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ثوبیہ جب اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی تو وہ بالی سے یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

''اب تم واصف کو اپنا ناچ دکھاؤ، میں ذرا باہر سے ہو کر آتی ہوں۔ واصف تمھارا رقص دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہے۔ وہ تمھارا رقص بھی دیکھتا رہے گا اور تمہیں داد بھی دیتا رہے گا۔ میں دس منٹ میں آئی۔''

بالی نے جب اپنا رقص شروع کیا تو واصف کی نظریں اس کے رقص پر نہیں، اس کے جسم کے نشیب و فراز پر تھیں۔ اس دن بالی اپنے آپ سے غافل ہو کر اتنا ناچی تھی، شاید ہی وہ کبھی اس دن سے پہلے اتنا ناچی ہو۔ پر اس رات، جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو تھکن سے اس کا انگ انگ چور تھا اور وہ بہت دل شکستہ تھی۔ اس نے واصف کے سامنے اپنے وجود کا ہر زاویے سے رقص پیش کیا تھا، اپنے انگ انگ کو بروئے کار لا کر اتنا ناچی تھی کہ خود اسے اپنا ہوش نہیں رہا تھا، مگر اس کے باوجود واصف نے اسے وہ داد نہیں دی تھی، جس کی وہ اپنے دل میں تمنا لے کر گئی تھی۔ بلکہ واصف نے اسے اس داد سے نوازا تھا، جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ شاید واصف اس کے رقص کا نہیں، خود اس کا دیوانہ تھا۔ اس رات کمرے سے نکلنے کے بعد اس نے اپنے من میں عہد کر لیا تھا کہ وہ آج کے بعد کبھی کسی کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کرے گی۔ وہ ثوبیہ کے ساتھ اس کی کزن کی شادی میں بہت خوش خوش گئی تھی، مگر جب لوٹی تو بہت دل شکستہ تھی۔ اسے یہاں زندگی کا ایک اور رخ دیکھنے کو ملا تھا، جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ثوبیہ اور وہ شادی سے لوٹیں تو وکیل صاحب نے آتے ہی ثوبیہ کی ایک اچھے گھرانے میں شادی کر دی تھی اور اس کی شادی کے کچھ عرصے بعد بالی کے ماں باپ کو بھی اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا خیال آیا تھا۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے بھی ایک مناسب سا رشتہ دیکھ کر بالی کے ہاتھ پیلے کر دیے تھے۔ اور وہ وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر پیا گھر سدھار گئی

تھی۔

☆☆......

جب وہ جیدے کے کمرے میں کھانا رکھنے گئی تھی تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جیدا اس وقت کمرے میں آ کر اس کے ساتھ ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے، مگر جیدا نہ صرف کمرے آ چکا تھا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے چہرے کو چومنے کی حرکت بھی کر چکا تھا۔ سادی اچانک تڑپ کر پلٹی اور دوسرے ہی پل وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اس کا دِل اس کے سینے میں پوری قوت سے دھڑک رہا تھا۔ اپنی سانسیں اعتدال پر آنے کے بعد اس نے سوچا کہ بس اب بہت ہوگئی۔ وہ آج ہی اِس سلسلے میں وسیم سے بات کرتی ہے۔ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور یہاں تو۔۔۔۔ رات کو جب وسیم گھر آیا اور سادی کے ساتھ لیٹنے کے بعد وہ اس سے اپنی خواہش کی تکمیل کر چکا تو سادی نے کہا۔

”سنیے جی، مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

وسیم اپنی ضرورت پوری کر چکنے کے بعد اس سے دور ہو کر سونے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے کہا۔

”جو بات کرنی ہے، صبح کرنا۔ مجھے ابھی نیند آ رہی ہے۔“

”نہیں جی، ابھی کی بات ہے۔ آپ سن لیں تھوڑی ذرا۔“ اگر کوئی اور وقت ہوتا اور وہ اِس طرح اس سے بات کرتی تو وہ اسے دو چار گالیوں سے ضرور نوازتا مگر اِس وقت وہ اپنی ساری توانائی صرف کر چکا تھا۔

”اچھا، بول کیا بات ہے؟“ ”وہ جی آپ کا بھائی ہے نا، جاوید بھائی، اس نے مجھ سے۔۔۔۔ بدتمیزی کی ہے۔۔۔ میں ان کے کمرے میں کھانا رکھنے گئی تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور۔۔۔ میرے چہرے کو چوم لیا۔۔۔۔“

”تو کیا ہوگیا؟ تو کون سا چوم لینے سے گھس گئی ہے“

وسیم نے یوں کہا، جیسے یہ کوئی بات ہی نا ہو۔ سادی حیرت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔

”اور ہاں، ایک بات کان کھول کر سن لے“

وسیم نے ایک سگریٹ سلگا کر اپنے لبوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

”میں تیری ساری بات سمجھتا ہوں۔ تو ہم دونوں بھائیوں کو لڑانا چاہتی ہے نا، یہ خیال اپنے دل سے نکال دے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر آج کے بعد تو نے دوبارہ ایسی ویسی کوئی بات کہی تو میں تیرا منہ توڑ کر ہاتھ میں رکھ دوں گا کمینی۔۔۔ اب ایک طرف دفع ہو۔۔۔“

سادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو پیا۔ اس کا خیال تھا کہ وسیم اس کی بات سن کر جیدے کو برا بھلا کہے گا یا کم سے کم اتنا تو ضرور کہے گا کہ وہ جیدے سے بات کرے گا مگر وسیم نے جس طرح اسے جواب دیا تھا، یہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے تھے۔

وسیم کے اِس رویے نے اسے بہت دِل برداشتہ کر دیا تھا۔ اس سے بات کر کے اور کچھ نہ سہی، اسے کم سے کم اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ اسے آج کے بعد وسیم کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کہنی۔ یہاں انصاف تو انصاف اُلٹا اسی کو ہی غلط کہا جا رہا تھا کہ اگر اس نے آج کے بعد ایسی کوئی بات کی تو۔۔۔۔

ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ جیدے کی اِس حرکت کے بارے میں اپنی ساس سے بات کرے مگر دوسرے ہی پل اس نے اپنی اِس سوچ کو جھٹک دیا۔ وہ تو وسیم سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی، اس نے کبھی اس سے ہنس کر بات نہیں کی تھی حالانکہ سادی نے اس کی خدمت کرنے میں کبھی کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی تھی۔ اور سادی کو اُمید تھی کہ ایک نا ایک دن وہ اپنی ساس کا دِل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔ وسیم کی بات سننے کے بعد، اس رات اس نے دِل میں سوچ لیا تھا کہ اگر اسے اِس گھر میں رہنا ہے تو اسے جیدے سے اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی۔ اس دن کے بعد وہ جیدے سے اور محتاط رہنے لگی تھی۔ مگر تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

جس دن جیدے نے سادی کو چوما تھا، اسے امید تھی کہ سادی اس سے سختی سے پیش آئے گی یا کم سے کم وسیم سے اس کی شکایت ضرور کرے گی مگر بقول اس کے، جب ایسا کچھ نہیں ہوا تو اس کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اب اسے جیسے ہی موقع ملتا، وہ دوسروں سے نظر بچا کر، چپکے سے سادی

کے ساتھ کوئی نا کوئی بدتمیزی کر گزرتا۔ سادی اس کی ہر حرکت کڑوا گھونٹ بھر کر برداشت کرتی رہی۔ شاید کسی اچھے وقت کی امید پر مگر اچھا وقت شاید اس کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ کچھ دن بعد وہ اکیلی گھر میں کام کاج کر رہی تھی کہ اچانک جیدا چلا آیا۔ اس نے گھر میں سادی کو اکیلا دیکھا تو اس کے اندر کا شیطان اچانک ہی جاگ اٹھا۔

وہ پچھلے کئی دنوں سے اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ سادی اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی ساس پاس والے کسی گھر میں گئی ہوئی تھی اور وسیم معمول کے مطابق گھر سے باہر تھا۔

سادی اس وقت اپنے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ صفائی کرتے کرتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے کمرے کی چوکھٹ پر جیدا کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسے انتہائی بری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک مکروہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ سادی کو اس کی آنکھوں میں ہوس کی سرخی صاف نظر آئی۔ جیدا اس کی طرف بری نیت سے بڑھا تو اس نے کہا۔

''دیکھیں جاوید بھائی، بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے باہر چلے جائیں۔ اگر آپ نے مجھ سے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو۔۔۔''

''تو کیا کرلوگی؟''

''میں۔۔۔ شور مچا کر پورے محلے کو جمع کرلوں گی۔''

جیدا اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اگر وہ اتنی ہی ہمت والی ہوتی تو کب کا ایسا کر چکی ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔۔۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔ اس نے جونہی اپنے قدم اس کی طرف بڑھائے اور اس کے وجود کو چھوا، سادی نے اچانک ہی چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ جیدا ایک ہاتھ سے اس کے ساتھ دست درازی کرنے لگا اور ایک ہاتھ سے اسے خاموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ سادی جتنے زور سے چیخ اور چلا رہی تھی، اس کی آواز نے اس کی ساس اور محلے کی کچھ عورتوں کو اس گھر میں آنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں پالی بھی تھی۔ پالی کا گھر بھی اسی گلی میں تھا۔ وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ گھر میں ماں اور دوسری عورتوں کی آمد نے جیدے کو سادی سے دور ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس سے امید نہیں تھی کہ سادی نے جس طرح کہا تھا، اس طرح اپنی بات پر عمل بھی شروع کر دے گی۔ پر جب سادی نے اپنی بات پر عمل کیا تو جیدے نے اس کا منہ دبا کر اس کی آواز باہر نہ جانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے گھر میں ماں اور دوسری عورتوں کو دیکھا تو اچانک ہی اپنے بچاؤ کا ایک رستہ سوچ لیا۔ سادی بھاگ کر اپنی ساس کے قریب جا پہنچی۔

''ماں جی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ جیدے بھائی نے۔۔۔ مجھ سے بدتمیزی کی کوشش کی ہے۔۔۔''

سادی کی ساس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے یہاں ایسی کسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ جیدا یہ حرکت نہیں کر سکتا اور اگر جیدے نے ایسی کوئی حرکت کی تھی تو سادی کو کم سے کم یہ بات سب کے سامنے کہنے کی بجائے خود تک محدود رکھنی چاہیے تھی۔ یہ گھر کا معاملہ تھا اور۔۔۔ سادی کی اس بات نے اسے مشتعل کر دیا۔ اس نے ایک ہی پل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے تند لہجے میں کہا۔

''اے لڑکی، منہ سنبھال کر بات کر۔ کیا بکواس کر رہی ہے تو۔۔۔''

جیدا بھی فوراً کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ سادی کی طرف تھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہے تو؟ ایک چوری تو اوپر سے سینہ زوری۔۔۔''

وہ ماں کی طرف پلٹا۔

''اماں، یہ بکواس کر رہی ہے۔ یہ تمہارے کمرے میں بکسے کا تالا توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے موقع پر اسے دیکھ لیا تو اُلٹا مجھے بدنام کرنے کی کوشش کرنے لگی۔''

اس بات پر کسی کو غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ جیدا تو ان کے سامنے وسیم اور سادی کے کمرے سے نکلا تھا، جبکہ اس کی ماں کا کمرہ دوسرا تھا۔ جیدے کی ماں کا پارا، اس کی بات سن کر مزید چڑھ گیا۔ اس نے تاؤ کھائے لہجے میں کہا۔

''بے شرم کہیں کی، شرم نہیں آتی تجھے میرے بچے پر

الزام لگاتے ہوئے؟ حرامزادی۔۔۔"

"خدا کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں" سادی کا لہجہ بھرا گیا۔

"اچھا، تو بڑی حجانی ہے" اس نے اچانک سادی کو بالوں سے پکڑ لیا۔

"تو کیا سمجھتی ہے کہ میں تیری فطرت کو نہیں جانتی۔ میں تیری رگ رگ کو سمجھتی ہوں کمینی۔۔۔ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تو ابھی اور اسی وقت نکل جا میرے گھر۔ میں اس عورت کو ایک پل بھی اپنے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں ہوں، جو اس گھر کی عزت کو مٹی میں ملانے پر تل گئی ہو۔۔۔"

اپنی ساس کی بات سنتے ہی اس نے بھی وہاں سے چلے جانا بہتر سمجھا۔ اسے بھی اس گھر میں، ایک مرد کے نکاح میں رہ کر، دو دو مردوں کو خوش کرنا منظور نہیں تھا۔ اس سے بہتر تو کم سے کم اس کے ماں باپ کا گھر ہوتا، جہاں اس کی عزت تو محفوظ ہوتی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میں بھی اب اس گھر میں ایک پل رہ کر راضی نہیں ہوں، جہاں ایک مرد کے نکاح میں رہ کر دو دو مردوں کو راضی کرنا پڑے۔"

وہ روتی ہوئی اپنے کپڑے باندھ کر کمرے سے نکلی تو اس کی ساس نے کہا۔

"اگر ایک باپ کی ہے تو آج کے بعد اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھنا، ورنہ۔۔۔"

سادی اپنے آنسو پونچھتی، اس کی بات نظر انداز کرتی، بالی کا ہاتھ تھام کر اس کے گھر آ گئی۔

سادی کی ساس، اس سے نمٹنے کے بعد محلے کی عورتوں کے پیچھے پڑ گئی۔

"تم یہاں کیا تماشا دیکھ رہی ہو؟ تمہارا اپنا گھر نہیں ہے کیا۔۔۔ دفع ہو سب اپنے اپنے گھر۔۔۔"

جب ان عورتوں کو وہاں دیکھنے کو کچھ نہ ملا تو وہ بڑبڑاتی ہوئیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ بالی کے گھر آ کر اس نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ بالی کو اس کی بات سن کر بہت دکھ ہوا۔ سادی نے کہا۔

"تم آج ہی میرے ساتھ چل کر مجھے میرے میکے چھوڑ آؤ میں نے بہت برداشت کر لیا ان لوگوں کو، اب ایک دن بھی برداشت نہیں کروں گی۔ میں نے جتنی ان لوگوں کی خدمت کی ہے، اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان کا شکریہ ادا کرتے منہ نا تھکتا اور ایک یہ لوگ ہیں کہ۔۔۔"

سادی کی آواز بھرا گئی۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے مقدر میں ایسا گھر لکھا ہوگا۔۔۔ اس سے بہتر تھا کہ یہاں بیاہنے کی بجائے میرا باپ میرا گلا دبا کر مجھے مار دیتا۔" بالی نے اسے تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ذرا سانس لے لو۔ اپنے آنسو پونچھو، پھر تمہارے میکے چلتے ہیں۔"

ایک گھنٹے بعد، سادی بالی کے ساتھ اپنے میکے آ گئی تھی۔ پر اپنے گھر کی چوکھٹ پار کرنے سے پہلے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں آ کر اس نے غلط کیا ہے۔

ایک ماہ پہلے جب اسکی رخصتی ہو رہی تھی، ہر لڑکی کی ماں کی طرح اس کی ماں نے بھی اسے رخصت کرتے وقت کہا تھا۔

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ بیٹیاں اپنے گھر میں ہی ہنستی بستی اچھی لگتی ہیں۔ اور اچھی بیٹی وہی ہوتی ہے، جو اپنے سسرال والوں کی خدمت کرے اور انہیں خوش رکھے۔ ہر گھر میں اونچ نیچ بھی ہو جاتی ہے اور لڑائی جھگڑا بھی۔ مگر سمجھدار وہی لڑکی ہوتی ہے جو میکے کی بات میکے اور سسرال کی بات سسرال میں رکھے۔ پتر! اگر تجھ پر بھی کوئی ایسا وقت آئے تو تو بھی ایسا ہی کرنا۔ ہم غریبوں کی پریشانیوں میں اضافہ مت کرنا۔۔۔"

اور سادی نے وعدہ تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی مگر اب، جب اس نے اپنے ماں باپ کی چوکھٹ پر قدم رکھا تو اسے یہ ساری باتیں بے اختیار یاد آ ئیں۔ اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے یہاں آ کر ٹھیک نہیں کیا۔ گھر میں اس کی چار چار بہنیں تھیں۔ دو جوان تھیں، دو جوان ہونے کے قریب تھیں۔ اس کا باپ تانگا چلا کر ان کا بوجھ اٹھاتا تھا۔ ایک ماہ پہلے اس نے اس کی شادی کر کے اپنا ایک بوجھ کم کرنے کی

کوشش کی تھی اور اب وہ ایک بار پھر ان پر بوجھ بن کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ اسے اچانک ہی اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں بالی سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور مزید کہا۔

''میں اپنے ماں باپ پر بھر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ کاش مجھے ایک بار پھر سسرال میں رہنے کا موقع مل جائے اور جاوید بھائی مجھ سے دوبارہ وہ بری حرکت نہ کریں تو میں کبھی بھی اس گھر کو نہ چھوڑوں۔۔۔۔۔'' بالی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ سادی کی بے بسی کا خیال کر کے اس کا دل بھر آیا۔

اس نے اسے تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ گھر والوں کو سچائی نہ بتائے۔ وہ گھر جا کر جلد ہی اس کا جیدے والا مسئلہ حل کرنے کی پوری کوشش کرے گی اور اسے یہاں سے دوبارہ واپس لے جائے گی۔

سادی نے اپنی ماں کو سیدھی بات بتانے کی بجائے صرف اتنا کہا کہ اسے ان لوگوں کی یاد آ رہی تھی، سو وہ بالی کو لے کر ان سے ملنے چلی آئی۔ وسیم کو آنے کی فرصت نہیں تھی اس لیے وہ نہیں آیا۔ بالی کے بارے میں اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ اس کی بہت اچھی سہیلی ہے اور اس کے سسرال کے پاس ہی اس کا گھر ہے۔ سادی کی ماں نے اسے بہت سی دعائیں دیں۔ بالی اس کے گھر کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گئی تھی۔

سادی، اس کے پیچھے سوچنے لگی کہ بالی نے کہا تھا، وہ گھر جا

کر اس کا جیدے والا کانٹا نکالنے کی اپنی سی کوشش کرے گی۔ بالی کس طرح اس کا کانٹا نکالے گی؟

کیا یہ اس کے بس کی بات ہے یا پھر۔۔۔۔ اگر دنیا میں خوش قسمت اور بدقسمت انسانوں کو چنا جاتا تو بالی کا نام دونوں فہرست میں دکھائی دیتا۔ اس کا جس شخص سے نکاح ہُوا تھا وہ بہت سیدھا سادہ اور صاف دِل کا انسان تھا۔ بالی کی ساس بھی اسی کے جیسی اچھے دِل کی عورت تھی۔ اس نے بالی کو اسی طرح پیار دیا اور آنکھوں پر رکھا تھا کہ بالی اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت انسان سمجھنے لگی تھی۔ بالی کا شوہر سارا دن محنت مزدوری کر کے جب شام کو گھر لوٹتا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے ہوئے شاپر

ہوتے، جس میں بالی کی پسندیدہ چیزیں ہوتیں۔ بالی اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوئے بغیر نہ رہ پائی کہ اسے اتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے، جو اس کی ہر خواہش اور ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔ مگر یہ خوشیاں اس کے لیے ریت کی دیوار کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ ابھی اس کی شادی کو صرف چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کے ماں باپ کا، وکیل صاحب کے گاڑی میں آتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہُوا اور وہ دونوں ہی وکیل صاحب سمیت خالق کو پیارے ہو گئے۔ بالی کے دِل پر جیسے قیامت گزر گئی۔

اِس کا بہن بھائی جیسا کوئی رشتہ تو تھا نہیں، صرف ایک ماں باپ کا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ابھی وہ اس حادثے سے سنبھل نہیں پائی تھی کہ تقدیر نے ایک اور وار کر دیا۔ ایک دن وقاص مزدوری کرنے شہر گیا تو اس کی لاش واپس آئی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا تھا کہ وہ جس عمارت کی چوتھی منزل پر کام کر رہا تھا، وہاں سے سر کے بل گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اِس بار بالی کا وہ حال تھا، جیسے کسی نے اس کے جسم کی رہی سہی توانائی بھی سلب کر لی ہو۔ وہ اِس بار اِس قدر ٹوٹ کر بکھری تھی کہ اس کا خود کو سنبھالنا دشوار ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے تھے، مگر تقدیر نے ایک خواب بھی پورا ہونے کا اسے وقت نہیں دیا تھا۔ پہلے ماں باپ چھوڑ کر چلے گئے تھا اور اب وقاص، دو ماہ کے عابد کو اس کی گود میں ڈال کر چل دیا تھا۔ وہ پوری دنیا میں بے یارو مددگار ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ ہی کوئی اس کے آگے تھا اور نا ہی کوئی اس کے پیچھے۔ گھر میں ایک وہ تھی اور ایک اس کی، آنکھوں سے کسی حد تک کم دیکھنے والی ساس۔ وقاص جب تک حیات تھا، اسے کچھ نہ کچھ دکھائی دے جاتا تھا مگر اس کے جانے کے بعد تو یوں لگتا تھا، جیسے وہ جاتے جاتے اس کی رہی سہی بینائی بھی اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ گھر میں کمانے والا فرد چل دیا تو یہ ذمہ داری بالی کے کاندھوں پر آ پڑی۔ اسے صرف ایک ہی کام آتا تھا اور وہ تھا رقص۔ مگر یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا کہ جس سے چار پیسے کمائے جا سکتے اور اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو یہ کام کسی شادی بیاہ تک محدود ہوتا۔ جہاں کچھ دیر کو ناچ کر کچھ پیسے کمائے جا سکتے۔

مگر یہ شادی بیاہ بھی تو روز کا کام نہیں تھا۔ یہ خوشی کبھی

کبھی اور کسی کسی گھر میں ہوتی تھی۔ تو کیا وہ اپنا کوٹھا کھول کر بیٹھ جائے؟ یہ کام تو صرف وہاں ہی چل سکتا تھا، مگر دوسرے ہی پل اس نے یہ خیال بھی جھٹک دیا۔ ایک تو وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی اور دوسرا لوگ آج کل کوٹھوں پر رقص دیکھنے نہیں، جسم خریدنے جاتے ہیں اور یہ جسم بیچنے والا کام اسے گوارہ نہیں تھا۔

ایک بار نادانی میں اس نے اپنا وجود ایک شخص کو سونپا تھا، جس

پر اسے آج بھی پچھتاوا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں لاشعوری طور پر شاہد کا خیال چلا آیا۔ شاہد اس کا ہمسایہ تھا اور اس کی دوست فرحانہ کا بھائی تھا۔ جن دنوں وہ بیاہ کر آئی تھی اس کی سب سے پہلے دوستی فرحانہ سے ہوئی تھی۔ اور وہ بھی یوں کہ اس بستی کی ایک شادی میں فرحانہ نے اپنا رقص پیش کیا تھا اور اتنا اچھا پیش کیا تھا کہ بالی اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ اسے بے اختیار ثوبیہ یاد آ گئی تھی۔ اس کے اور ثوبیہ کے رقص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس رات اس نے بھی اپنا رقص پیش کیا تھا اور یوں وہ رات ان کی دوستی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی تھی۔ اس دن کے بعد بالی فرحانہ کے گھر آنے جانے لگی تھی اور وہیں اس نے شاہد کو دیکھا تھا، جو اسے پہلی نظر میں پسند نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی فرحانہ کے گھر جاتی اور اس دوران شاہد وہاں موجود ہوتا تھا تو وہ اسے بہت بری اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا۔

اور ایک بار تو جب گھر میں کوئی نہیں تھا اور بالی فرحانہ سے ملنے گئی تھی تو شاہد نے اس سے تھوڑی سی بدتمیزی بھی کی تھی۔ جواب میں بالی نے اسے ایک کرارا سا تھپڑ جڑا تھا اور وہاں سے چلی آئی تھی۔ اب جو وقاص رخصت ہوا تو شاہد نے ایک بار پھر اپنے قدم بالی کی طرف بڑھا دیے۔ وہ اکثر کسی نہ کسی بہانے سے بالی کی ساس کے پاس آ بیٹھتا اور اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ کبھی کبھار وہ اپنے ساتھ پھل فروٹ اور عابد کے لیے کھلونے بھی لے آتا۔ یہ الگ بات کہ ابھی اس کی عمر ان کھلونوں سے کھیلنے کی نہیں تھی۔ بالی کے ساتھ بھی وہ اب عزت سے پیش آنے لگا تھا۔ بالی کو اس بار وہ پہلے سے بہت بھلا اور بدلا ہوا انسان لگا۔

اس بار شاہد نے خلوص کے ساتھ بالی کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا تو وہ اس کی محبت کو ٹھکرا نہ سکی۔ شاہد نے بالی سے کہا کہ وہ اس سے حقیقتاً سچا پیار کرنے لگا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اس کی باتوں پر بھروسہ ہے تو وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور اگر نہیں ہے تو جھٹک دے۔ بالی کے پاس اس کا ہاتھ تھامنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کا نہ تو کوئی اب آگے رہا تھا اور نہ ہی پیچھے۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں تھا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور وہ اس نے تھام لیا تھا۔ بالآخر شاہد کی محنت رنگ لے آئی اور ایک دن وہ بالی کے ساتھ شاہ جی کو کہہ آیا کہ اگر اس کی غیر موجودی میں بالی جو چیز بھی لینے آئے، وہ اسے دے دیا کرے۔ اس کے پیسے وہ خود ادا کیا کرے گا۔ اس دن کے بعد بالی کو جس شے کی ضرورت ہوتی، وہ شاہد کا نام لے کر شاہ جی کی دکان سے لے آتی۔ دھیرے دھیرے شاہد نے پورے گھر کی ذمہ داری اٹھالی۔ اور پھر ایک دن شاہد نے تنہائی میں اسے اپنے قریب کیا تو بالی نہ چاہنے کے باوجود اسے انکار نہیں کر سکی۔ وہ تیسرا شخص تھا، جو اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اس دن کے بعد وہ تنہائی میں جب چاہتا، جیسے چاہتا، بالی سے بغیر نکاح کے اپنی خواہش کی تکمیل کر لیا کرتا۔ بالی نے اسے ایک دو بار شادی کا کہا تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔

''یار کر لیں گے شادی بھی۔ ہم کون سا بھاگے جا رہے ہیں۔ تم بھی یہیں ہو اور ہم بھی۔ تھوڑی فرصت تو مل جائے، یہ کام بھی کر لیں گے۔۔۔'' مگر شاہد کو کبھی وہ فرصت میسر نہیں آئی، جو اس نے بالی سے کہہ رکھی تھی۔ بالی سے شاہد کے مراسم کا سلسلہ صرف چند ماہ ہی چل سکا تھا۔ جب اس کا بالی سے دِل بھر گیا تو وہ خود ہی دھیرے دھیرے بالی سے پیچھے ہوتا چلا گیا۔ اس نے بالی پر بہت پیسہ اور وقت برباد کر لیا تھا اور بالی سے وہ جس چیز کا وہ طلبگار تھا، اس کو بھی اس نے جی بھر کر حاصل کر لیا تھا۔ اب بالی کے لیے مزید پیسہ اور وقت برباد کرنا اس کے نزدیک ٹھیک نہیں تھا۔ سو دھیرے دھیرے وہ بالی سے دور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے بالی کے پاس آنا ہی ترک کر دیا۔ بالی دو چار دن تک تو اس کا انتظار کرتی رہی تھی، مگر جب وہ کئی دنوں تک نہ آیا اور گھر کی ضرورت کی سب چیزیں ختم ہو گئیں تو اس نے اپنے قدم شاہ جی کی دکان کی

طرف بڑھا دیے۔ وہاں پہنچ کر جب اس نے شاہد کا نام لے کر کچھ سامان لینا چاہا تو شاہ جی نے کہا ”شاہد تو منع کر گیا ہے جی۔ اس نے کہا تھا کہ اب اگر آپ سامان لینے آؤ تو میں آپ کو اُدھار سامان نہ دوں۔ وہ اس کی ادائیگی نہیں کرے گا۔“

بالی کے دِل پر ایک پتھر سا آ لگا۔ لاشعوری طور پر اس کے دِل میں یہ خطرہ موجود رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ شاہد اسے چھوڑ کر چلا جائے گا مگر یہ سب اتنا جلدی ہو جائے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر شاہ جی کی دکان سے واپس پلٹی تو شاہ جی نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

”سنیں جی۔۔۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ آپ لے جائیں، پیسے پھر آ کر دے جانا۔“ وہ شاہ جی کی مہربانی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

جب سے وہ شاہ جی کی دکان پر آ رہی تھی، اس نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ شاہ جی اسے ہمیشہ اس نگاہ سے دیکھتا ہے، جس میں پسندیدگی کے ساتھ ہوس کی لے بھی شامل ہوتی ہے۔ شاہ جی اسے ہمیشہ نگاہوں ہی نگاہوں میں وہ پیغام دینے کی کوشش کرتا، جسے وہ اچھے سے جانتی تھی، مگر اس راہ پر چلنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے شاہد کی باتوں پر اعتبار تھا اور اسے یقین تھا کہ شاہد اسے اپنا لے گا مگر افسوس اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہُوا تھا۔

وہ اس وقت تو شاہ جی کی بات نظر انداز کر کے گھر چلی آئی تھی مگر کچھ گھنٹوں بعد ہی وہ پھر شاہ جی کی دکان پر تھی۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کے پاس شاہ جی سے سامان ادھار لینے کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں تھا۔ شاہ جی اسے اپنے سامنے پا کر اور اس کا مسئلہ سن کر کھل سا اٹھا تھا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ بالی اس سے اُدھار سامان لیتی رہے اور اتنا لیتی رہے کہ اس کے پاس وہ رقم لوٹانے کا کوئی رستہ نہ ہو اور اسے اپنی خواہش کی تکمیل کا رستہ مل سکے۔ اس نے بڑی خوش دلی سے بالی کو اُدھار سامان دے دیا اور اس دن کے بعد بالی اکثر شاہ جی کی دکان سے ضرورت کی چیزیں لینے لگی۔ یہاں تک کہ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ بالی اِس دوران منتظر رہی کہ شاہ جی اس سے اپنے اُدھار کے بدلے اس کے جسم کو پانے کی خواہش کا اظہار کرے گا اور اس کے پاس شاہ جی کو اپنا وجود سونپنے کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں ہوگا، مگر شاہ جی اور طبیعت کا ملک تھا۔ وہ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ بالی پر جب دو ماہ کی اُدھار ہو گئی تب شاہ جی نے اس سے اپنی اُدھار کے کا تقاضہ کیا۔ بالی نے ایک گہری سانس لاتے ہوئے کہا۔

”کل رات کو میرے گھر آ جانا۔ میں تمھارا اُدھار چکا دوں گی“ اور اس رات شاہ جی بالی کے بتائے ہوئے وقت پر اس کے گھر پہنچا تو بالی اس کی منتظر تھی۔ اس نے شاہ جی کا ادھار چکانے کا سوچ لیا تھا۔ جب رات کے پچھلے پہر وہ بالی کے گھر سے نکلا تو وہ اس سے اپنے اُدھار کی پائی پائی وصول کر چکا تھا۔ اگلے دو سے تین ماہ تک بالی اور شاہ جی کے مراسم قائم رہے اور پھر شاہ جی نے بھی اس سے اسی طرح کنارہ کر لیا، جس طرح شاہد کر چکا تھا۔ شاہد کی طرح شاہ جی کے لیے بھی اب بالی میں کوئی کشش نہیں رہ گئی اور بغیر کسی فائدے کے وہ کسی پر ایک روپیہ بھی خرچ کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اگلے کچھ دنوں میں ہی اس نے بالی کے پاس جانا ترک کر دیا۔ اگلی بار وہ شاہ جی کی دکان پر گئی تو شاہ جی نے بڑی بے رخی سے سامان دینے سے صاف انکار کر دیا کہ پہلے پچھلے پیسے دو، پھر آگے سامان ملے گا۔ بالی کو اندازہ تو تھا کہ ایک نا ایک دن یہ وقت ضرور آئے گا۔ شاہ جی بھی اس سے شاہد کی طرح کنارا کشی اختیار کر لے گا، مگر شاہ جی نے جس طرح مروت کو بالائے طاق رکھ کر اس سے تعلق منقطع کیا تھا، اس سے وہ مردوں کی فطرت کو بخوبی سمجھ گئی تھی۔ شاہ جی کی بات سن کر وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب حالات کس طرح کٹیں گے؟

یہ تو اسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی میں اب کوئی وقاص جیسا شخص نہیں آ سکتا۔ جب تک سانسوں کی ڈوری بندھی ہے، اسے اپنا جسم بیچ کر ہی وقت گزارنا تھا مگر اس بار وہ اپنا جسم کسے بیچے گی؟ کون اس کا خریدار بنے گا؟ اسے اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ شاہ جی کی دکان سے اپنی قسمت پر دو آنسو بہا کر واپس لوٹ آئی تھی۔ وہ شاہ جی کے پاس، اس بار یہ سوچ کر گئی تھی کہ سامان کے ساتھ ساتھ وہ اس سے کچھ پیسے بھی لے گی۔ کیوں کے عابد کی طبیعت پچھلے دو دن

سے بہت خراب تھی اور اسے علاج کی ضرورت تھی مگر شاہ جی اسے دوائی کے پیسے تو کیا دیتا، اسے گھر کی ضرورت کا سامان بھی نہیں دیا تھا۔ وہ گھر آئی اور اپنی ساس سے عابد کو لیا تو وہ بخار میں جل رہا تھا۔

وہ اسے اپنی گود میں ڈال کر اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ عابد کو گود میں لیے، اس کی تکلیف کا خیال کرتے ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ اچانک وہاں سعدیہ چلی آئی۔ وہ پچھلے کچھ عرصے میں اس کی دوست بن گئی تھی اور اس کے بالی کے ساتھ بہت اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ اس نے بالی کو روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

''خیر تو ہے، کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟'' سعدیہ کا اپنایت بھرا لہجہ محسوس کرتے ہی اس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔

اس نے روتے ہوئے سعدیہ کو عابد کی بیماری کے بارے میں بتا دیا۔ سعدیہ نے فوراً ہی اپنے کانوں سے چھوٹی چھوٹی سونے کی دو بالیاں اتاریں اور بالی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

''یہ لے جاؤ اور میرے منے کی دوائی لے آؤ۔''

''یہ۔۔۔ یہ میں نہیں لے سکتی۔''

بالی کو خود اندازہ نہیں تھا کہ اس کا لہجہ بہت کمزور ہے۔ سعدیہ نے کہا۔

''میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی۔ یہ یوں سمجھ لو کہ اُدھار ہے۔ جب تمھاری فرصت ہو جائے، مجھے اِس سے اور اچھے بنوا کر دے دینا۔''

اس بار بالی کے لیے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود خدا سے کسی ایسی مدد کی دعا مانگ رہی تھی اور سادی اس کی دعا کے پورا ہونے کا سبب بن کر چلی آئی تھی۔ وہ اس کے جس کڑے وقت میں کام آ رہی تھی، یہ اس کا بہت بڑا احسان تھا اور بالی نے سوچ لیا تھا کہ اگر کوئی وقت آیا اور اسے موقع ملا تو وہ اس کا یہ احسان اتارنے کی اپنی سی پوری کوشش کرے گی اور اب اس کا یہ احسان اُتارنے کا وقت آ گیا تھا۔ اسے سعدیہ کی مدد کرتے ہوئے جیدے کا کانٹا اس کے راستے سے ہٹانا تھا۔ کیسے ہٹانا تھا؟ اس کے بارے میں بھی اس نے سوچ لیا تھا۔

......☆☆......

جیدا بالی کی ہی گلی میں رہتا تھا۔ بالی نے ایک دو دن میں ہی اس کے گھر آنے جانے کا وقت نوٹ کر لیا تھا۔ وہ اکثر اس کے گھر کے سامنے سے گزر کر جاتا تھا۔ اس دن وہ اس کے گھر کے سامنے سے گزرنے لگا تو بالی نے اسے آواز دے کر روک لیا

''اے جیدے بات سن ذرا۔'' جیدے کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے بالی روک کر اپنے پاس بلا بھی سکتی ہے۔

پر آج نہ صرف اس نے اسے روک لیا تھا، بلکہ وہ اسے اپنے پاس بلا بھی رہی تھی۔ جیدا بالی کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا تھا، پر اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ ٹھیک عورت نہیں ہے۔ شوہر کے گزرنے کے بعد وہ غلط رستے پر چل پڑی ہے۔ پہلے اس کے شاہد کیساتھ مراسم تھے، پھر شاہ جی کے بارے میں سننے کو آیا۔۔۔ اور اب پچھلے کچھ دنوں سے اس کے دوست گلو سے اس کے مراسم قائم تھے۔ یہ بات خود گلو نے اسے بتائی تھی اور اس نے کہا تھا کہ اگر اس کا دِل بالی کے لیے مچلتا ہے تو وہ اس کے ساتھ اس کی بات کرا دے گا مگر اس کے لیے تھوڑا بہت خرچہ کرنا پڑے گا۔ خرچے کے نام پر جیدے کی جان جاتی تھی۔ اگر دس بیس کی بات ہوتی تو وہ کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر لیتا، مگر یہاں تو کم سے کم پچاس سو کی بات تھی اور اس کے بعد کہیں جا کر مچھلی جال میں پھنستی۔ سو گلو کی بات سن کر اس نے بالی کو پانے کا خیال دِل سے نکال دیا تھا اور اب وہی بالی اسے بلا رہی تھی۔ بالی کے اِس طرح مخاطب کرنے پر اس کا دِل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ اپنے دِل سنبھالے بالی کے دروازے کے سامنے جا رکا۔

''جی کہیے؟'' اس نے اپنے لہجے میں حد درجہ شرافت سمونے کی کوشش کی۔ بالی کو اس کے لہجے پر بے اختیار ہنسی آ گئی

''یہ ذرا شاہ جی کی دوکان سے مجھے گھی تو لا دو۔ منا بہت رو رہا ہے۔ ورنہ میں خود چلی جاتی۔'' بالی نے اس کی طرف پیسے بڑھائے۔

''رہنے دیں جی، میں لے آتا ہوں۔''

بالی نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ گھی لے کر آیا تو بالی نے اسے سبزی لینے کے لیے بھیج دیا اور جیدا بغیر پیسے لیے

یہ حکم بھی بجا لایا۔ دو چار دنوں میں بالی سے جتنا ہو سکا تھا، اس نے جیدے کی جیب خالی کرانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اب ایک دو دنوں میں ہی وہ اس کی طرف اپنی ہوس کا ہاتھ بڑھائے گا اور ہوا بھی وہی۔ جب اس کی جیب خالی ہوگئی اور اس نے اپنے نزدیک بالی پر کافی پیسے خرچ کر دیے تو ایک دن اس نے بالی کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا، جس کی بالی کو امید تھی۔ بالی نے جیدے سے کہا۔

''دیکھ جیدے، میں تمھاری بات من لیتی ہوں پر میری بھی ایک دو شرطیں ہیں۔''

''مجھے ہر شرط منظور ہے۔''

''پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں جس سے دوستی کرتی ہوں، اس کی کسی اور کے ساتھ دوستی گوارا نہیں کر سکتی۔''

''پر میری تو کسی کے ساتھ بھی دوستی نہیں ہے۔ نہ ہی کسی سے کوئی ایسا سلسلہ ہے۔''

''اور وہ جو سعدیہ سے تم نے حرکت کی تھی۔۔؟''

سعدیہ کے بارے میں سن کر اس نے برا سا منہ بنایا۔

''وہ حرام زادی جھوٹی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی تھی۔''

بالی کو اس کے جھوٹ پر بے حد غصہ آیا۔

''دیکھ جیدے، سعدیہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ میں اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ مر تو سکتی ہے پر کسی پر ایسا الزام لگا کر جھوٹ نہیں بول سکتی۔ البتہ تم ضرور جھوٹ بول رہے ہو اگر تم نے مجھ سے جھوٹ ہی بولنا ہے تو ضرور بولو مگر یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرلوں گی اور اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور آج کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔۔۔ مجھے جھوٹے لوگوں سے نفرت ہے۔۔۔''

جیدا اس کی بات سن کر گھبرا گیا

''اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں وہ میری غلطی تھی۔ اصل میں میرا اس پر دِل آ گیا تھا اور اسی لیے میں اس دن وہ حرکت کر بیٹھا تھا مگر وہ سالی میرے ہاتھ بھی نہیں آئی تھی اور بدنامی بھی مفت میں ہوئی تھی۔۔۔''

''وہ میری دوست ہے تمہیں اسے گالی دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''اچھا۔۔ اب نہیں دوں گا۔''

''تم مجھے اس شرط پر حاصل کر سکتے ہو کہ اب اگر وہ کبھی تمہارے گھر آ گئی تو تم اس کے ساتھ کبھی ایسی حرکت نہیں کرو گے۔۔۔'' جیدے نے وعدہ کرلیا کہ وہ دوبارہ سعدیہ کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کرے گا اور اگر سعدیہ لوٹ آئی تو وہ اسے اپنی بہن کی طرح سمجھے گا۔

''اور میری دوسری شرط۔'' بالی نے کہا۔ ''جب تک تم میرے ساتھ رہو گے، میرے گھر کا خرچا تمہیں اٹھانا پڑے گا۔''

اِس بات پر جیدے کا منہ اُتر گیا۔

''اصل میں، میرے پاس جو کچھ تھا، وہ میں پہلے ہی تمہیں دے چکا ہوں۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ البتہ میری نوکری لگنے والی ہے، جوں ہی مجھے پہلی تنخواہ ملے گی، وہ میں لا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا''

''چلو۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

اس دن کے بعد بالی اور جیدے کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ مراسم قائم ہونے کے بعد وہ اسے اتنی بھائی کہ وہ صبح شام اسی کے گیت گانے لگا۔ بالی کو بھی اِس دوران اندازہ ہو گیا کہ جیدا اتنا بھی برا انسان نہیں ہے، جتنا وہ اسے سمجھتی تھی۔

سعدیہ کو اپنے ماں باپ کے گھر گئے آٹھ، دس دن ہو گئے تھے۔

بالی کا ذہن اس کی طرف ہی اُنکا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے جیدے سے کہا۔

''اب اپنے بھائی کو کہو کہ وہ جا کر سعدیہ کو لے آئے۔ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر گھر برباد نہیں کرتے۔ اگر وہ خود نہیں لے آتے تو میں جا کر سعدیہ کو لے آتی ہوں، پر اِس شرط پر کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔۔'' جیدے کہا۔ ''میں اِس سلسلے میں گھر بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔''

(جاری ہے)

قفس

نسیم سکینہ صدف

خوب صورت نازک جذبوں کی شاعرہ، افسانہ نگار نسیم صدف کی بیشتر کہانیاں نئے افق سمیت دیگر ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں انہیں افسانوں کے علاوہ فکشن اور ایکشن کہانیوں پر بھی خاص دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے عرصہ بعد نئے افق کیلئے قلم اٹھایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اب وہ مستقل نئے افق کے لیے لکھتی رہیں گی۔

باذوق قارئین کے لیے بطورِ خاص

یہ سو فیصد سچا واقعہ ہے اس سے متعلقہ کرداروں کے خاندان عزت دار لوگ ہیں۔ اس لیے کرداروں کے نام اور مقام تبدیل کر کے تحریر کر رہی ہوں۔ اس میں ہم سب کے لیے خصوصاً نوجوان لڑکیوں کے لیے عبرت ہے جو نوجوانی کے رنگین خوابوں میں کھو کر والدین اور بھائیوں کی عزت کو اندھا دھند روند کر من چاہی منزل کی جانب سفر کرتی ہیں۔

ابا جی کی جوانی کی موت نے شمشاد چوہدری کے گھر کے ماحول کو منجمد سناٹوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ایسی چپ اتری تھی ماں پر کہ بس ضرورتاً بات کرتیں ورنہ گھریلو کام کاج کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت میں مگن رہتیں۔ گھر میں لگے پودوں اور درختوں پر صرف پرندوں کے بولنے کی آوازیں آتیں۔ کوئی ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم ہنس بول کے بات کرتا۔

قیام پاکستان کے وقت شمشاد چوہدری کی متاع کل ماں جی اور بڑے بھائی رحمٰن کو ابا جی کے لنگوٹیا یار نند و لال نے خنجر کے پے در پے وار سے اپنے ہی گھر کی دہلیز پر ڈھیر کر دیا۔ گاؤں میں مسلمانوں کے گھروں کو روز آگ لگنے لگی تو اس کے گاؤں میں رہنے کا جواز ہی نہ بچا۔ گاؤں میں جان بچا کر بھاگنے والے قافلے کے ساتھ شمشاد چوہدری بھی نم آنکھوں سے دشمنوں کی نظر سے بچتا بچاتا بھوکا پیاسا راستوں کی صعوبتیں سہتا ہوا لاہور کے کیمپ میں پہنچا جہاں کوئی ہی خوش قسمت خاندان تھا جو مکمل پاکستان پہنچا تھا ورنہ تو ہر کسی کا دکھ دوسرے سے بڑھ کے تھا۔

چار سمت نوحے ہی نوحے تھے ذات برادری امیری وغیرہ سے بھولے بیٹھے تھے۔ بس روٹی کے لالے تھے جو سب کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہیں پر رشتے کے ایک ماموں سے ملاقات ہوگئی جو اپنے خاندان میں صرف ایک بیٹا زندہ لے کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے دونوں ماموں بھانجا گاؤں تامونگی میں آباد ہوگئے۔ ان کے حصے میں کئی مربعے زرخیز زمین آئی تھی جو پہلے ہندوؤں کے قبضہ تھی۔

1947ء میں پاکستان بننے کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب یہ لوگ ذرا سیٹ ہوئے اپنے گھروں میں تو ماموں نے نسرین نامی ایک لاوارث لڑکی سے شمشاد چوہدری کی شادی کروادی جس سے دو بیٹے اورنگزیب اور شاہ زیب اور بیٹیاں اریبا اور شیزا پیدا ہوئیں۔

سب سے بڑا اورنگزیب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا تھا تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب پاکستان لوٹا تو یہاں

رشتے آنے لگے ماں نے چاؤ سے رشتہ کرنا چاہا تو اس نے منع کر دیا کہ میری جاب بھی وہیں ہے اور میں شادی بھی وہیں کروں گا۔

شمشاد چوہدری نے بیٹے کی خوشی میں خوش ہونا مناسب سمجھا اورنگزیب واپس لوٹ گیا اور وہیں کسی گوری سے شادی کر لی۔ وہیں اس کے بچے پلے بڑھے۔ گھر خرچہ البتہ پابندی سے بھجواتا تھا جب کہ اریشہ کی شادی شیخوپورہ میں کسی ملنے والے کے توسط سے ہوئی۔ جہیز کی بیشتر قیمتی چیزیں اورنگزیب نے بھجوائی تھیں مگر سسرال نے قدر نہیں کی۔ اریشہ کو بہت جاہل قسم کا ماحول ملا۔ کچی عمر میں دیکھے گئے خوابوں کے رنگ بھی کچے ہوتے ہیں ناسمجھی کی عمر میں ایسے خواب دیکھنے والی معصوم لڑکیوں کو ان کی بھیانک تعبیر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ سو ان کو پھر عمر بھر بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ جب کبھی وہ تا مونگی آتی اس کے چہرے پر اس کی زندگی کے حالات رقم ہوتے مگر سب مجبور تھے کہ اب وہ دو بچوں کی ماں تھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

شیزا جو گھر میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اسی وجہ سے خودسری ہو گئی تھی عطیہ خالہ اور محمود چاچا برس ہا برس سے سامنے والے گھر میں مقیم تھے دونوں گھرانوں میں محبت یگانگت کا بے مثال رشتہ تھا۔ ہر مشورہ ایک دوسرے سے لیا جاتا جو بھی پکتا ایک دوسرے کو کھلائے بغیر کھایا نہ جاتا۔ عطیہ خالہ اکثر امی سے کہتی۔

''شیزا نے اگلے گھر بھی جانا ہے اسے گھر کے کاموں کی عادت ڈالو۔'' مگر شیزا امی کے کہنے پر بھی کام کاج میں ماں کا ہاتھ نہ بٹاتی۔

عطیہ خالہ کی دو بڑی بیٹیاں تھیں جو اپنی پھوپھی کے گھر گوجرانوالہ شہر میں بیاہی ہوئی تھیں اور بہت خوش تھیں۔ کبھی کبھار ہی میکے رہنے آتیں جب بچوں کی چھٹیاں ہوتیں ایک بیٹا تھا فراز وہ اسلام آباد میں تعلیم کے سلسلے میں اسپتال میں مقیم تھا۔ جب بھی گھر آتا تو دونوں گھروں کی رونقیں جاگ اٹھتیں یا تو وہ شاہ زیب کے پاس ہوتا یا اسے اپنے گھر بلا لیتا۔ ساری رات خوب ہلا گلا ہوتا۔ شاہ زیب گریجویشن کے بعد لوہے کے کارخانے میں باپ کے ساتھ شامل ہو گیا جہاں ایکسل بنتے تھے جو دوسرے شہروں میں جاتے تھے۔

انگلینڈ سے بھائی نے لاڈلی بہن کی فرمائش پر لیپ ٹاپ بھیج دیا تو شیزا کی تو موجیں ہی ہو گئیں۔ فلم کے ہر رومانوی سین میں وہ ہیروئن کی جگہ خود کو محسوس کرتی اور کالج سے آتے ہی اس کے سامنے بیٹھ کر خوابوں کی دنیا میں ایک ہینڈسم سے ہیرو کے ساتھ خوابوں کی دنیا میں نکل پڑتی۔ وہ خود کو ایسا بنا سنوار کر گھر سے نکلتی کہ دیکھنے والوں کی نظریں اس پر ٹھہر ٹھہر جاتیں۔ وہ ایک ایسے رانجھے کی تلاش میں تھی جو فلمی ہیرو کی طرح اس سے محبت کرے۔ انہی دنوں سامنے والے محمود چاچا اور عطیہ خالہ کا بیٹا تعلیم مکمل کرنے کے بعد گھر لوٹ آیا تھا۔

شیزا اپنے دھیان میں گاجر کا حلوہ عطیہ خالہ کو دینے

جارہی تھی کہ کمرے سے نکلتے فراز سے آمنا سامنا ہوگیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت ہو گئے۔ شیزا کو فراز کی شکل میں اپنی تلاش مکمل ہوتی دکھائی دی۔ شیزا کی مسکراتی اور مخمور آنکھوں اور پرکشش چہرے کو دیکھ کر فراز کی نظریں سمت بدلنا بھول گئیں عام معنوں میں محبت ایک بڑا استعارہ ہے۔ علامت اور نسائی ہے پیشن گوئیاں رک جائیں گی علم بھی رک جائے گا مگر محبت کبھی رک نہیں سکتی۔ گزرتے دنوں میں انہیں ادراک ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔

زندگی میں بہت سی مشکلات درپیش تھیں دونوں کی برادری جدا جدا تھی اور ان کا ایک ہونا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ رشتہ کرنے میں دونوں گھرانے قدامت پسندی میں ذات برادری کے پابند تھے نا۔ فراز نے حوصلہ کر کے شیزا سے کہا۔

''چلو ہم نکاح کر لیتے ہیں جب ہمارے گھروں کے حالات ہمارے حق میں موافق ہوں گے تو یہ راز کھول دیا جائے گا قدرت نے انسان سے وابستہ دو نعمتیں عطا کی ہیں اول انسانی جان اور دوسرے انسانی رشتے۔ کہنے کو تو ان نعمتوں کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا لیکن ایک مسئلہ ہے ان کی قدر و قیمت کو محسوس کرنے اور سراہنے کا ایک ہی خانہ ہوتا ہے اگر وہ خانہ بند ہو اور اس پر محبت کے سرکش جذبے کا بھاری ڈھکن رکھ دیا جائے تو پھر خون کے رشتے کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

محبت میں وہ اس قدر جنونی ہو گئے تھے کہ جدائی ان کے لیے موت کے مترادف تھی چند مہینوں سے محمود چاچا فراز کے ویزے کے لیے کوشاں تھے۔ آخر ان کی امید بر آئی اور سعودیہ کا ویزہ مل گیا وہ پاسپورٹ بنوانے میں مصروف ہو گیا اور شیزا کی بے قراری عروج پر تھی انہی دنوں ملنے والوں کے توسط سے ایک رشتہ آیا تو ابا اور امی اس پر غور وخوض کر رہے تھے اور شیزا کی تو جان ہی نکل گئی وہ تو فراز کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا فراز کے ملنے پر اس نے رشتے کا ذکر کیا تو فراز کے دل میں بھی وسوسے اتر آئے کبھی انسانی خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ شاید انسان کے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔

فراز نے شیزا کو سمجھایا کہ سیدھے طریقے سے ہمارا ایک ہونا ناممکن ہے اس کا آخری حل یہی ہے کہ نکاح ہو جائے تو پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔ ہمارے گھروں کے حالات ہمارے حق میں موافق ہوتے ہی ہم گھر والوں کو بتا دیں گے۔ اگر راضی نہ ہوئے تو تمہیں بھی سعودیہ لے جاؤں گا پھر ہم اپنی چھوٹی سی جنت میں خوشیاں کشید کر لیں گے۔ شیزا بھی راضی تھی اور اس کو بھی اسی بات میں بہتری نظر آئی۔ فراز کا یونیورسٹی فیلو ڈسکہ میں رہتا تھا جس کے والدین کوئٹہ شادی پر گئے ہوئے تھے اور وہ اپنی نوکری کی وجہ سے نہیں جا سکا تھا ان کے گھر میں یہ نکاح ہو سکتا تھا شیزا اپنی کالج فیلو دوست اور ہمراز ماہ رخ کو ساتھ لے کر کالج کی بجائے ڈسکہ نسبت روڈ پر واقع مکان میں پہنچ گئی جو ذرا آبادی سے ہٹ کر تھا اور اگر محلے میں ہوتا تو لوگ سو باتیں بناتے۔

''شیزا تم جانتی ہو کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟'' راستے میں ماہ رخ نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم انگاروں پر قدم رکھنے لگی ہو جہاں تم خود تو جلو گی ہی ساتھ اپنے خاندان کی عزت کو آگ کے حوالے کر دو گی۔''

مگر شیزا تو فراز کے عشق کی آگ میں جل رہی تھی اسے اس وقت جلتے انگارے بھی پھول لگ رہے تھے اس نے کسی کی نہیں سنی فراز شیزا کا عروسی جوڑا اور کچھ لوازمات لیے موجود تھا اور ماہ رخ نے اسے دلہن کے روپ میں سجا کر فراز کے پہلو میں بٹھا دیا۔ وہ بھی کالے تھری پیس سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہا تھا مولوی صاحب آ چکے تھے کچھ دوستوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہوا سب کی برگر، پیزا اور کولڈ ڈرنک سے تواضع کی

گئی۔

دوستوں نے چند گھڑیوں کے لیے انہیں تنہائی بخش دی۔ اس چوری چھپے کی تقریب کے فوراً بعد شیزا کو ماہ رخ کے ساتھ گھر بھجوا دیا گیا اور عروسی سامان ماہ رخ کے گھر رکھوا دیا گیا کہ شیزا کے گھر والوں کو بھنک نہ مل جائے شیزا نے اتنا بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا مگر اب اسے ہول اٹھ رہے تھے کہ اس نے غلط کیا یا ٹھیک؟

وہ اپنے آپ کو خود ہی تسلیاں دلا سے دیتی کہ اس نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایسے میں وہ ماں باپ کے حق کو بھول گئی تھی۔ سماج کی زنگ آلود زنجیروں اور بیڑیوں سے خود کو آزاد کر کے ذہن کے دریچوں سے دنیا کا فرسودہ گرد و غبار ہٹا کر بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا اس کے اندر ایک عجیب طرح کی اتھل پتھل جاری رہتی ہے آخر کار امی نے اس کی اداسی کی وجہ دریافت کی۔ تو اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ خوف بھی دامن گیر ہونے لگا تھا ابھی نکاح کو ڈیڑھ ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فراز کا ویزا آ گیا اور وہ پردیس جاتے ہوئے روتی ہوئی شیزا کی آنکھوں میں بہت رنگین سپنے اور وعدے سجا گیا۔ مگر کوئی شیزا سے پوچھتا۔ پل پل کی جدائی کی داستان اس کے دل پر رقم ہو رہی تھی صبح اور شام ایک دوسرے کے تعاقب میں گرد سفر تھے دو تین رشتے آئے مگر شیزا نے پڑھائی کی آڑ میں ٹھکرا دیئے۔ اس بات پر امی بہت ناراض تھیں مگر اریشا نے لاڈ سے بہن کی طرف داری کر دی۔

''ہو جائے گی شادی بھی۔'' اس نے کہا۔ میں نے کون سا سکھ پا لیا ہے شادی کر کے اور امی نے اس کا اداس چہرہ دیکھ کر بات بدل دی۔ شیزا اور فراز مسلسل رابطے میں تھے ایک دن جب اس نے بتایا کہ نکاح نامہ میں ساتھ لے آیا تھا اور اس پر بیوی کا ویزہ بھی میں نے نکلوا لیا ہے اب بس پاسپورٹ کی فکر کرو وہ خوشی سے رو پڑی۔

''میں تم کو ان سب وسوسوں سے دور لے آؤں گا۔'' اس نے شیزا کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اپنی جان بنا کر

رکھوں گا۔

انہی دنوں ماہ رخ کی امی ابو عمرہ کے لیے اپنے پاسپورٹ بنوانے سیالکوٹ جارہے تھے تو ماہ رخ شیزا کو بھی لے گئی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ فراز نے اس کا ویزہ نکلوالیا ہے پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا شیزا کو انگلینڈ سے اس کا بھائی اورنگزیب الگ سے بھی پیسے بھجوایا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے زیادہ پیسے دے کر ارجنٹ پاسپورٹ تیار کروالیا۔ پلاننگ یہ تھی کہ وہ ساری تیاری سے آرہا تھا شیزا کو اپنے ساتھ لے جانے کو۔

اس نے شیزا کو بتایا وہ تاج محل ہوٹل ٹھہرے گا۔ 22 جنوری کو شیزا ہوٹل پہنچے گی کالج ٹائم پر اور وہ اسے لے کر فوراً ایئر پورٹ روانہ ہوجائے گا پھر گھر والے جب تک ڈھونڈیں گے وہ گھر والوں کی دسترس سے دور ہوجائیں گے۔ 21 جنوری کو فراز نے سعودیہ سے ڈسکہ آنا تھا اور 22 جنوری کو شیزا کے تاج محل ہوٹل آنے پر وہ ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوجاتے۔ جہاں شام کی فلائٹ تیار ہوگئی اور پھر ظالم زمانہ ان کے بیچ نہیں آسکے گا۔ وہ بہت خوش تھی۔ سوتے جاگتے اپنے شوہر کو ملنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے امی نے اس کی غیر معمولی خوشی محسوس کرلی۔

''شیزا آج تم بڑی خوش ہو اور یہ نیا جوڑا کیوں پریس کررہی ہو؟'' ماں نے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا خاص بات ہے؟'' اور وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔

''کوئی خاص بات نہیں امی۔'' اس نے سنبھل کر کہا۔

''وہ کل ہمارے کالج میں ایک فنکشن ہے تو اس لیے نیا سوٹ پریس کیا ہے۔ امی شیزا کی بات سن کر مطمئن ہوئی کہ نہیں ان کے چہرے پر تفکر کے آثار ضرور تھے شاید آنے والے وقت کا الہام ان کی چھٹی حس ان کو دے رہی تھی۔

خیر شیزا فراز کی محبت کے حصار میں کھوئی ہوئی تھی کبھی محبت میں اتنی وحشت ہوتی ہے کہ خود محبت بھی سکون نہیں دیتی۔ اتنا تلاطم برپا ہوتا ہے کہ آنکھوں سے لہو امڈ آتا ہے۔ دل جیسے گرداب میں مقید ہوجاتا ہے رات تو جاگتے سوتے گزر رہی گئی کیونکہ فراز ڈسکہ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا۔

اس کے بھائی شاہ زیب کو کچھ دنوں سے اس کی غیر ضروری مصروفیات کی وجہ سے اس پر کچھ شک ہوگیا تھا مگر وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے یہی وجہ تھی کہ جب وہ نہانے باتھ روم میں گئی تو اس کے شولڈر بیگ کو جو ڈریسنگ کے سامنے پڑا تھا۔

شاہ زیب کے چیک کرنے پر اس میں پاسپورٹ اور ایک خط ملا جو اس نے لکھ کر رکھا تھا کہ جاتے ہوئے کمرے کے وسط میں پڑے ٹیبل پر رکھ جاؤں گی کہ مجھے تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کریں میں جائز طریقے سے نکاح کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ جارہی ہوں۔ پاسپورٹ اور خط دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ امی کچن میں ناشتہ تیار کررہی تھیں۔ وہ نہا کر نیا جوڑا پہن کے باتھ روم سے باہر نکل رہی تھی کہ شاہ زیب نے اس کے سینے پر فائر کیا جو سیدھا دل میں لگا اور اس کی بھیانک چیخ نے سب کے دل دہلا دیئے سب کے جمع ہونے تک خون کے فوارے سے فرش لال ہورہا تھا اور اس کی روح فراز سے ملنے کی پیاس میں قفس سے رہائی پاچکی تھی۔ اس کی ماں بکھرے خون اور جوان بیٹی کی لاش دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر صدمے کے مارے وہیں گر گئی۔ باپ کو علم ہوا کہ بھائی نے بہن کو گولی مار کر ہلاک کردیا ہے تو اس نے شاہ زیب کا گریبان تھام لیا مگر شاہ زیب کی زبانی سن کر صورت حال کو دیکھتے ہوئے باپ بھی آلہ قتل سمیت غیرت کے قتل میں تھانہ کلاں ڈسکہ پیش ہوگیا۔

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

الو	صفدر امام
ڈائن	پیغام آفاقی
ناقابل فراموش	محمد خالد جاوید
انجام کی تلاش	احمد نعیم
نائلون میں لپٹی لاش	ماہ جبین صدیقی
میوٹیشن	ڈاکٹر بلند اقبال
درد کی پیمائش	قمر سبزواری
تماشائے اہل کرم	سارا ادریس
یخ میں تپ	کے بی فراق

انو

صفدر امام قادری

آج یونی ورسٹی سے واپسی میں محسوس ہوا کہ پت جھڑ شروع ہو گیا ہے۔ دراصل بڑے شہروں میں رینگتی بھاگتی زندگی کو مہینے اور تاریخیں ہی بانٹتی ہیں۔ کلائی سے چپکی گھڑی سیکنڈ، منٹ اور گھنٹہ بجانے کے ساتھ ساتھ دن اور تاریخیں بھی دے دیتی ہے۔ لال رنگ کی تاریخ چھٹی کی اطلاع ہوتی ہے، تیس، اکتیس کے بدلنے سے یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ ایک مہینہ گزر گیا۔

گاؤں کی طرح موسم کا دخل یہاں کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ ذرا سی سردی کو اونی سوئیٹر، گرم کوٹ اس طرح ختم کر دیتے ہیں کہ جاڑے کا تصور بھی نہیں ہو پاتا۔ پنکھے، ائر کولر، ائر کنڈیشنر کی موجودگی گرمی کو زندگی میں شامل ہونے ہی نہیں دیتی۔ رینی ڈیز نہ جانے کتنی ڈھکی چھپی سواریاں، رین کوٹ میں جیتے لوگ اور ترقی کی اندھی دوڑ میں برق رفتاری دکھانے والی تہذیب کا ساتھ دینے والوں کو کیا معلوم کہ برسات کب آئی اور شیشے کی کھڑکیوں پر دستک دے کر کب لوٹ گئی؟

اگر کوئی محسوس کرتا بھی ہے تو اپنے تئیں، اس کا کوئی اجتماعی نشان یا مفاد دکھائی نہیں دیتا۔ جیسا میں نے آج محسوس کیا کہ پت جھڑ شروع ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی شروع ہوا ہے، کچھ دیر سے ٹھہرا ہوا ہے یا آخری منزل میں ہے، مجھے نہیں معلوم۔ پھر یہ بھی کہ یہ احساس میرا انفرادی ہے جب کہ میرے ساتھ اور لوگ بھی چل رہے تھے۔ یا پتہ نہیں، ان لوگوں نے بھی میری ہی طرح تنہا محسوس کیا ہو۔ جب جاڑے، گرمی، برسات کی ایسی حالت ہے، تب پت جھڑ تو ویسے بھی اپنی چھوٹی دنیا کے ساتھ جیتا ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا گاؤں یاد آتا ہے۔

گھر اور اس کے چاروں طرف بیٹھی تین پیڑھیاں۔۔۔ یہی تعارف ہے جاڑے کے موسم کا۔ کھیت کا سنہرا پن جب کسان کے چہرے پر آجاتا ہے تو بہار کی آمد آمد کا سراغ مل جاتا ہے۔ بوریاں، ٹوکرے لے کر جب بچے بوڑھے گاؤں سے دور دوپہر میں باغیچے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوجاتا ہے کہ پت جھڑ شروع ہو گیا ہے۔

ہاں، تو۔۔۔ آج ساڑھے گیارہ بجے دن میں جب میں شعبے کے دو دوستوں کے ساتھ کلاس کر کے واپس ہو رہا تھا تو اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ میری کتابوں پر ایک پتا گرا۔۔۔ پیلا، سوکھا اور تنہا پتا۔۔۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ پت جھڑ کے موسم سے گزر رہے ہیں ہم لوگ!

سوچتا ہوں، آج لگاتار میں کیوں اس موسم کے لیے اتنا فکر مند ہوں جب کہ میں نے جو موسم دیکھا ہے، وہ محض دو پیڑوں کا موسم تھا اور میں بھی عجیب ہوں۔ بس دو پیڑوں کے موسم کو میں نے پورے پورے موسم کا نام دے دیا۔ پیڑوں کے حالات تو انسانوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں نا؟...... ہمارے یہاں ہر آدمی الگ الگ زندگی جیتا ہے حالاں کہ خاندان، سماج، دیش، فرقہ جیسے الفاظ ہم نے اس الگاؤ کو بھرنے کے لیے ظاہر طور پر گڑھ لیے ہیں۔ پیڑ پودوں کی کسی تہذیب یا ان کی ثقافت یا مستحکم روایت کے بارے میں ہماری کوئی معلومات نہیں، پھر بھی یہ تو دکھائی دے ہی رہا ہے کہ وہ اجتماعی زندگی جیتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں ایک سی کروٹیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے یونی ورسٹی اسٹیڈیم سے نکلنے والی گلی کے کنارے کے ایک پیڑ اور نیشنل ہائی وے کے اوور برج سے نظر آرہے ایک پیڑ پر پت جھڑ کی سوکھی سوکھی رُت دیکھ کر میں نے مان لیا کہ پت جھڑ شروع ہو گیا ہے۔

حالاں کہ اس بڑے شہر میں رہ کر چاہتے ہوئے بھی اس موسم کے لیے کوئی دوسرا ثبوت نہیں دے سکتا۔ پیڑ شہروں

میں کہاں ملیں گے۔ جہاں تک اپنے مزاج کے بارے میں سوچتا ہوں، لگتا ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں میری کوئی خاص دل چسپی کبھی نہیں رہی۔ شاید اس کا سبب اس کے منفی ہونے میں ہی ہو، اس کی ویرانی ہی ہو۔ چاہے جو بھی بات ہو، یہ صحیح ہے کہ اس موسم سے میرا کوئی لگاؤ نہیں رہا اور اسی لیے بہار کی طرح میں نے کبھی بھی اس کا انتظار نہیں کیا، کبھی بھی نہیں۔

سوچتا ہوں، اگر یہاں تم موجود ہوتے تو مجھے تفصیل سے پت جھڑ کی افادیت سمجھاتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی تک میری زندگی میں خزاں کے حالات پیدا ہی نہیں ہوئے ہیں اور جب زندگی میں بالکل خلا کا دور آیا تو اسے بھی میں نے بہار کے انتظار میں بہار یہ رنگ دے دیا تھا۔ تم یہاں رہتے تو ضرور مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ مجھے بھی پت جھڑ میں دل چسپی لینی چاہیے یا اگر کچھ زیادہ موڈ میں ہوتے تو یہ بھی ثابت کرنے لگتے کہ مجھے پت جھڑ میں ہی دل چسپی لینی چاہیے۔ سارے موسموں سے زیادہ پُرکشش یہی موسم ہے۔

تمہاری بھٹکتی روح کو چین نہیں ملے گا۔

سوچتے ہو کہ میں کیوں لگاتار اس موسم پر سوچے جارہا ہوں سمجھتے ہو؟۔۔۔ میں بتاتا ہوں۔ لاشعور سے شعور تک کی یاترا نہیں کر پار ہے، اسی لیے بھٹک جاتے ہو، کچھ پاس پاس، کچھ دور دور۔ غیر موسمی تہذیب نمایندہ ہونا؟ تو موسم سی یگانگت، موسم کی طرح ایک سا روپ کہاں سے پاؤ گے؟

مجھے یہ جو موسم دکھائی دے رہا ہے، دنیا کا موسم۔۔۔ پت جھڑ کا ہے۔ پت جھڑ کا عہد، بھوک اور افلاس کا عہد، ہر پتا سوکھا ہوا، ہر پیڑ ایک فقیر۔ اسی لیے میرے لیے کشش کا مرکز پت جھڑ ہی ہو سکتا ہے۔ اسے سوکھے ہوئے پیلے پتے! لاشعور کی انا یہاں تمھیں روک رہی ہے لیکن ادھوری یاترا ہے، منطق نہیں قبول کرنے کے اپنے مزاج سے تم یہاں ٹھہر نہیں سکتے، اسے دل چسپی سے عاری ثابت کر کے بہار کے سنہرے خوابوں میں ڈوب جانا چاہتے ہو۔

اچھا، تم کیا سوچتے ہو؟ کون سی صورت حال بہتر ہے؟ یہ جو مشین کا دباو روز روز ہماری ذات پر بڑھ رہا ہے اور ہماری آ گہی کی دھار کو مدھم کر رہا ہے۔ یہ جو بڑھ رہی آسائش، آرام اور آدمی آدمی کی تنہائی ہے...... نام نہاد آزادی اور علاحدگی۔۔۔ خود سے بھی آدمی الگ ہوتا جارہا ہے۔۔۔ ایک مکمل خلا...... کنگال ہوتا جارہا ہے آدمی...... یا مشین کے وجود سے قبل ہمارے جو مصائب تھے، آ گہی کا تواتر تھا، فطرت کی محبت اور جبر کو آدمی پورے قُرب سے جیتا تھا، آدمی آدمی کی آزادی کا فقدان تھا، سدا جڑے رہنے کا ایک وعدہ تھا اور ایک عوامی خاندان ہونے کا احساس تھا۔۔۔ اندر سے بھرا بھرا آدمی...... ایک تکمیلیت کا احساس تھا......

مجھے ہر وقت لگتا ہے کہ میں ایک ساتھ دو جسموں میں جیتا ہوں۔ کون سچ ہے، کون جھوٹ، مجھے نہیں معلوم اور میں تڑپ تڑپ اٹھتا ہوں۔ پریشان ہو جاتا ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، ڈپریشن پیریڈ ہے، نیند کی گولیاں کھاؤ اور سو جاؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ آج تک میں اتنا بھی نہیں دیکھ پایا کہ میری کون سی شبیہہ ٹھوس ہے اور کون دھند میں بنی اس کی منعکس صورت۔ اب تک کی صفر حصولیابی کو میں بیماری مان کر سو جاؤں، بے ہوش ہو جاؤں۔ سائنسی عہد کا یہ علاج بھی خوب ہے؟

ہاں، تو تمھارے بیگ پر سوکھا ہوا پتا اور میری یاد!

پت جھڑ کی علامت تو میں بھی ہوں۔ لیکن یاد رکھو، اگر میں خود کو اس پت جھڑ اور غیر موسم سے پرے نہ کر سکا تو آتم داہ کرلوں گا۔ سڑک پر یوں ہی پڑے رہنے کا یا اُڑ کر کسی کی آنکھ سے ٹکرا جانے، کسی کو اپنے سوکھے پن کا احساس کرانے کا یا دن یہ دن ہوتی جارہی احساسات سے عاری تہذیب میں بے وجہ ٹکے رہنے کا بوجھ میں نہیں ڈھو سکتا۔ لیکن ابھی تو میں خود کو منزل کی سمت بڑھتا ہوا مان رہا ہوں اور اسی لیے زندہ بھی ہوں۔ سنگھرش جاری ہے۔

☆☆

ہیلو اُمر

ابا، ابا

کیسے ہو یار؟

بالکل ٹھیک

یہ کیسے ہو گیا؟

مطلب۔

کہ تمھارا حال چال بالکل ٹھیک ہے؟

میں نہیں بتا سکتا

یہ کیا ہے، تمھارے ہاتھوں میں۔۔۔؟

چندی گڑھ سے چٹھی آئی ہے۔

کس۔۔۔کی۔۔۔؟

رنجنا کی۔

کون رنجنا۔۔۔؟ وہی......تو نہیں؟

جی ہاں!

وہ تو تمہاری بہن ہے نا؟

ضرور

تو پھر۔۔۔

کچھ بھی نہیں

لیکن انو، اپنے تعلقات پر تم نے کچھ غور نہیں کیا؟

کیا ہے۔

تو پھر۔

یہی کہ کیا طے کیا۔

کچھ بھی نہیں کر سکا یار۔

تو آخر رنجنا سے تم کیا چاہتے ہو؟

میں خود نہیں بتا سکتا

اور، رنجنا تم سے کیا چاہتی ہے؟

یہ بھی واضح طور سے نہیں کہہ سکتا

تب کیا؟

یہی کہ ہم کچھ بھی نہیں سوچ پا رہے ہیں۔

اپنے تعلقات کے بارے میں

ہاں

پھر بھی ایک دوسرے سے جڑے رہنا چاہتے ہیں

ایسا ہی تو ہے۔

☆☆

کچھ لکھ پڑھ رہے ہو یا نہیں؟
نہیں یار، کچھ خاص ہو نہیں پا رہا ہے
کیوں؟ کیا کچھ بھی نہیں لکھا؟
نہیں، دیکھو نا، ادھر ہی ایک نظم ہوئی ہے
اوہو، تو یہ سنیتا کو معنون ہے، میں بھول ہی گیا تھا۔
کیا؟
یہی، سنیتا کے بارے میں پوچھنا۔ کچھ جاننا۔ تم نے گورکھپور سے ہی ایک خط لکھا تھا جس میں اس کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا تھا۔
نظم پڑھ لو، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔
نہیں یار، میری سمجھ پر، وہ بھی ادبی سمجھ پر اس طرح بھروسہ مت کرو۔
ہاں جی، یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ سچ، یہ نظم تمھیں سمجھ میں آنے سے رہی۔
لیکن یہ بتاؤ، اس کی آنکھوں کا کیا حال ہے؟ پرویز کو تم نے لکھا تھا، بھگوان سے کام نہیں چل پا رہا ہے، تم اپنے اللہ سے دعا کرو، شاید اس کی مہربانی ہو جائے۔ پرویز نے بہت دعائیں کی تھیں۔
خوش ہو جا، اس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔
بہت اچھا یار۔
کچھ اور بتاؤ، اس کے بارے میں۔
وہ پروفیشنل پینٹر ہونے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ ارے، پروفیشنل پینٹر۔۔۔؟
ہاں، اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ کچھ آفر بھی آئے ہیں۔
ارے، بہت بڑی بات ہے۔
میں نے بھی اسے لکھ دیا ہے کہ وہ یہ کام شروع کر دے۔
انو، تب تو مزا آ جائے گا
کیا؟
کمانے والی بیوی جسے مل جائے، اُسے اور کیا چاہیے؟
بند کرو بکواس، امر۔
کیا...... کیا؟
کہنا کیا چاہتے ہو تم......
تو کیا، تم سنیتا سے شادی کرنا نہیں چاہتے؟
میں ایسا نہیں کہہ سکتا ہوں۔
تو۔۔۔
امر، مجھے وہ رات آج بھی نہیں بھولی ہے جب ساری دنیا سو رہی تھی۔ سنیتا میری گود میں بے ہوش پڑی تھی۔ میں اس کی آنکھوں کی پٹیاں بدلتا جا رہا تھا، دوائیں ڈالتا رہا تھا۔ لگتا ہے، وہ میری بیٹی ہے، میں ایک باپ، میں ایک ماں،

اس کو زندہ رکھنے کے مکمل اعتماد کے ساتھ لگا تھا۔ میں نے بھگوان کو قسم دی تھا کہ سورج کے لہو سوکھ گئے ہیں تو کیا ہوا، میری نسوں کا خون تو نہیں سوکھا۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اور آنکھیں بھی بولیں گی پوری زندگی کے ساتھ، جئیں گی پورے جمال کے ساتھ، شاید اسی سے میری زندگی کامیاب ہو جائے، جیسے زندگی کا یہی مقصد ہو......

انو، تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن۔۔۔

لیکن کیا۔۔۔؟

یہی کہ تم اتنا ہی سوچتے ہو؟

کتنا۔۔۔

یہی کہ کیا تم صرف باپ یا ماں ہی ہو سنیتا کے؟

یہ بھی ٹھیک ہی ہے امر، وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اسے ماں باپ کی دعاؤں سے جلایا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں اس سے کچھ علاحدہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

کیا؟

یہ ابھی تک سوچ نہیں پائے

(انو کی ڈائری سے)

جے پرکاش نگر۔۵

ستمبر ۱۹۸۵ء ۱۱

آج کا جو دن گزرا ہے، وہ میرا پچیسواں جنم دن تھا۔ پورے چوبیس برسوں میں جو اکیلا پن بھوگ سکتا تھا، وہ پورا کا پورا آج ایک ساتھ مل گیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ آج سے پورے چوبیس برس پہلے بھی یہی اکیلا پن رہا ہوگا، اس عمر کا اکیلا پن۔ تو میں ایک ایسا آدمی ہوں جو اکیلے پن کے ساتھ ہی جنما ہے اور چوبیس برسوں کے بعد بھی پورا کا پورا اکیلا ہی ہے۔ یعنی کہ میں چوبیس برسوں میں ایک جگہ پر ہی کھڑا ہوں۔ میرے پچیس جنم دنوں کا کوئی مطلب نہیں کہ میں جس نقطے پر جنما تھا، اس سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سفر میں کچھ پیچھے ہی ہٹ گیا ہوں گا۔

تو آخر میری زندگی کیا ہے؟ میری زندگی کیسی ہونی چاہیے؟ پیدا ہونے سے آج تک کی درمیانی مدت میں میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ کچھ بھی نہیں پا سکا، تو پھر یہ کون سی زندگی ہے؟ میں نے جو کچھ بھی زندگی گزاری ہے، وہ بے معنی ہے۔ میری زندگی کا کوئی مطلب نہیں۔ تو پھر مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ تب مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ تو کیا، میں مر جاؤں؟ کیوں کہ بے تکی زندگی سے موت ضرور بہتر ہے۔ مجھے اپنے کمرے میں خود کو پٹرول میں لت پت کر جلا لینا چاہیے۔ میری اب تک کی بے کار زندگی میں ایک کام تو اچھا ہو جائے۔

لیکن زندگی میں کچھ بامعنی نہیں کر پانے کے سبب مر جانا زندگی سے فرار تو نہیں۔ کیا میں آج اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ زندگی سے بھاگ رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ بے تکی زندگی بھی نہیں چاہتا، اپنے سے مرنا بھی پسند نہیں تو آخر میں چاہتا کیا ہوں؟

کیا میں بے ایمان ہو گیا ہوں؟ جب میں یہ قبول کرتا ہوں کہ میری زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے یا زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تو مجھے خود کشی کرنے میں جھجک کیوں ہوتی ہے؟ یا مجھے اس بے معنی زندگی سے اتنا موہ کیوں ہے کہ میں بے ایمانی پر اُتر آیا ہوں۔

چلو، پھر سے ایک بار اپنے آپ کو تلاش لوں۔ خود احتسابی کروں لیکن یہ خود احتسابی میں کر کیسے سکوں گا۔ کیوں کہ خود کے شامل رہتے میرا فیصلہ غیر جانبدارانہ کیسے ہو پائے گا۔ اگر وہ غیر شخصی ہو بھی جاتا ہے تو خود کے ساتھ یہ ناانصافی

ہوگی۔ میں اگر یہ مان لیتا ہوں کہ خود احتسابی کے بعد میں خود کو مجرم تسلیم کرلوں اور اس کی سزا یہ تجویز کروں کہ مجھے مرجانا چاہیے تو دکان سے زہر کیسے لایا جائے؟

یہ کہنے پر کہ مجھے خودکشی کرنا ہے، زہر مل نہیں سکتا۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ تو مجھے بند کمرے میں الیکٹرک شاک کی نذر ہوجانا چاہیے۔ لیکن ایک خیال آتا ہے کہ جب میں مجرم ہوں تو بند کمرے میں کیوں، مجھے تو چوراہے پر ہزاروں کے سامنے سزا ملنی چاہیے۔ لیکن یہاں تو قانون آڑے آجائے گا اور قانون کی خلاف ورزی جرم ہے۔ تو کیا میں ایمان داری سے خودکشی بھی نہیں کرسکتا؟ اور بے ایمانی سے جی نہیں سکتا۔

کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہو کہ میں جینا بھی نہیں چاہتا، مرنا بھی نہیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو سمجھ نہیں پارہا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک اپنی شخصیت کا احتساب نہیں کرپارہا ہوں۔

دیکھو یار، اب تمھیں سیریسلی اپنے کیریر کے بارے میں سوچنا چاہیے؟ کیا سوچ رہے ہو؟

کیا کہتے ہو یار، میں تو ہمیشہ محتاط رہا ہوں اپنے سلسلے میں۔ کیریر ٹھیک کہا تم نے، جانتے ہو، بچپن میں جب لوگ پوچھا کرتے تھے تو سینہ ٹھوک کر کہتا تھا کہ ڈاکٹر بنوں گا اور لوگ میری پیٹھ تھپتھپا دیتے تھے۔ اب کوئی نہیں پوچھتا، بڑا جو ہوگیا ہوں۔ ڈاکٹر نہیں بن سکا۔۔۔ ناکام ہوں نا؟۔۔۔ لیکن آج جب تم پوچھتے ہو، تو دیکھو یار، میں تمھاری طرح آئی۔اے۔ایس۔ نہیں بنوں گا۔ اس لیے کہ گدیریا بن کر جی نہیں سکتا۔ ہاں کبھی محسوس ہوا کہ کچھ سیکھ لیا ہے تو ٹیچر بننا پسند کروں گا۔ رہی روٹی کی بات تو بھائی بائیں ہاتھ میں اتنی روٹی ہو کہ زندگی کی گاڑی چل سکے، زندگی کو کامران بنانے کے لیے زندہ رہ سکوں، بس۔ بغل میں روٹی دبائے، چہرے پر روٹی اُگائے، پاؤں میں روٹی پہنے، گلے تک روٹی ٹھونسے میں دوڑ نہیں سکتا۔ مشین کا آدمی میں بن نہیں سکتا۔ میری زندگی۔۔۔ زندگی ہونے کی شرط بس پوری کرسکے، اتنا ہی مقصد ہے۔

کلیجے پر ہاتھ رکھ کر، ایمان داری سے کہو کہ تمھاری زندگی زندگی بھی ہے یا کہ تم اس طرف سرگرمِ سفر بھی ہو۔ یا تمہیں معلوم بھی ہے کہ تمھارا جیون کیسا ہونا چاہیے۔ کیا تمھیں خود سے ایک انجانا پن نہیں ہے۔ خود سے متعارف ہوسکوں، اپنے امکانات تلاش کر اس سمت بڑھ سکوں، کامیابی ناکامی کی بات نہیں تب سمجھوں گا، زندگی مکمل ہوگئی۔ ہر لمحے کو ایمانداری سے جی سکوں۔ جو لمحہ ہے، اسے پارسا دیکھ سکوں۔

زندگی کے چوبیس برس تو صرف سنسکاروں سے مکتی پانے میں ہی گزار دیا تاکہ سارے پردے ہٹ جائیں۔ جو ہوں، وہ شفاف دکھائی دے۔ اب کھلے آکاش کے نیچے ایک نقطے کی طرح تپسیا کروں گا کہ خود کو خود کے باہر بھی دیکھ سکوں اور دور سورج کی طرف بڑھ سکوں۔ اگر ایک نقطے پر مرتکز نہ ہو پایا تو جینا کیا؟ اگر تپسیا ناکام ہوگئی تو جینا کیا؟

رنجنا، بہن تھی نہیں، اس کا ایک تصوّر تھی۔ اسی لیے اس سے پیار تھا، اس کے لیے تڑپ تھی۔ ٹھیک ٹھیک تو نہیں کہہ سکتا لیکن چاہتا ہوں کہ وہ مجھے چاہتی رہے۔۔۔ شاید ایک تصوّر ہو کر۔ کسی دوسرے کو آج تک اتنا نہیں چاہ سکا۔ اگرچہ فکری طور پر مجھے لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن جذباتی سطح پر مجھے خود پر قابو نہیں رہ پاتا۔ اس کے رہتے میں کسی کا پورا کا پورا نہیں ہوسکتا۔ میرے تمام رشتے داروں، دوستوں اور متعلقین میں اسے ہی فوقیت دیتا ہوں۔ یا میرے آس پاس، پوری دنیا میں کسی کے سامنے میں نہیں رہ جاتا تو وہ وہی ہے۔

سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ میری اس بوالعجبی کی جڑ کہیں بہت بچپن میں ہے۔ میرا اَن کہا وہ کہتی ہے۔ میرا اَن بجھا وہ بوجھتی ہے۔ میں اس کے سامنے اور صرف اس کے سامنے کھلا ہوا ہوں، بالکل عریاں، شفاف اور وہ میرے آرپار دیکھ سکتی ہے۔ لاشعور میں شاید یہ خدشہ ہے کہ کہیں وہ مجھ سے چھوٹ نہ جائے، اس لیے اس کے سامنے اور کھلتا جاتا ہوں، ایک نامعلوم پروسس کے تحت۔ ہر آدمی اندر سے مُڑا، تڑا ہوتا ہے، ٹوٹا ہوتا ہے کہیں نہ کہیں سے کہ میری بے چارگی

محسوس کر کے ہی اگر وہ کہیں جا رہی ہے تو رُک جائے، میرے پاس، سدا سدا کے لیے۔

یہ اچھا نہیں انو، یہ تمھاری بے سمتی، بدصورتی ہے۔ حقایق کی ٹھوس دھرتی پر کھڑے ہو کر سوچو کہ یہ تمھارا کون سا مزاج ہے، جو تمھارا نہیں ہے، اس کے لیے کیوں سوچتے ہو؟ اسی طرح کی سپردگی اگر بعد میں بھی رہی تو بہت دُکھ ہوگا، تمھیں ہی نہیں، اُسے بھی۔ پھر دنیا اور سماج کی بعض قدریں ہیں، معیار ہیں۔ بعض اخلاقی مفروضے ہیں۔ آدمی کو ان تمام معاملوں کو سمجھنا ہوتا ہے ورنہ سماج کا ڈھانچہ ہی بگڑ جائے۔ لولیتا پڑھا ہے تم نے۔۔۔ نہیں تو سنو۔۔۔ اس کے ہیرو کو بچپن میں ایک چیز بہت قریب سے ملتے ملتے رہ گئی تھی اور زندگی بھر اس کے لیے وہ بھٹکتا رہا، جیسے ایک موڑ پر آ کر ٹھہر گئی ہو اُس کی زندگی۔ اور جب وہ اسے ملی، لولیتا، تو اُف میں نہیں کہہ سکتا۔۔۔ اب بھی سنبھل جاؤ دوست تو بلا دی میر نو بوکوف کے لکھنے کا مقصد حل ہو جائے۔ تم ایک شاعر، ایک مصنف ہو، اس لیے بھی، پلیز۔۔۔ سب سے اہم رنجنا کے لیے بھی۔۔۔

نہیں دوست، میرا کچھ ایسا منشا نہیں ہے اور ایسا کچھ دانستہ میں نہیں کرنا چاہتا کہ سماج مجھ پر انگلی اٹھائے۔ لیکن۔۔۔ لیکن میں بالکل مجبور ہوں۔ میں جہاں بالکل گم ہو جاؤں، کھو جاؤں، میری رگیں سمٹ جائیں، سب کچھ بھول جائیں، یہ آج تک کہیں اور نہیں ہو سکا۔ اس کے پاس ہوتا ہوں تو صرف ایک سطح پر جیتا ہوں لیکن دوسروں کے پاس تو بھی بھی رہ کر بھی بالکل دوسری جگہ ہوتا ہوں۔ میں کیا کروں دوست، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ صرف رنجنا ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ میری بہن بھی ہے۔ میں رنجنا کو پیار کرتا ہوں لیکن بہن کے جسم میں رنجنا کی آتما ہے، اسے پیار کرتا ہوں۔ جسم نہیں ہوتا تو میں شاید اسے اس قدر پیار نہیں کر پاتا، آتما ہوتی تب بھی نہیں۔

پرویز کی ڈائری کا ایک ورق

میں نہیں جی سکوں گا پرویز

آج رہ رہ کر یہ جملہ مجھے سنائی دیے جا رہا ہے۔ کل رات سے ہی میرے دماغ میں یہی چند الفاظ گونج رہے ہیں۔ تو کیا ہوگا اُنو کا۔ کیا وہ خودکشی کر ہی لے گا۔ جب سے وہ آیا، بار بار یہی جملہ، یہی تھوڑے الفاظ، ڈراؤنے خوابوں والے حروف، بس اور جاتے جاتے تو میں مر ہی گیا۔ دو بجے رات والی ٹرین میں اُسے بٹھا کر خصتی ہی چاہتا تھا کہ وہ بھبک بھبک کر رونے لگا۔ بار بار وہی جملہ، وہی خوفزدہ سپنے، وہی گنے چنے الفاظ...... میں نہیں جی سکوں گا پرویز،...... میں نے چاہا تھا، اُسے روک لوں لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ کیا میں اسے دو چار دن اور زندہ نہیں رکھ پاؤں گا؟

میرا دوست اُنو اس قدر دکھی ہے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا اور یہ بات میرے لیے بالکل نئی ہے۔ کیوں کہ اسے تو دکھ، درد سب کچھ کو انجوائے کرنے کی عادت سی لگ چکی ہے۔ اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ وہ جی نہیں پائے گا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے لگا کہ اس کے پاس زندہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اصول اور منطق کی سنگین زندگی جیتا ہے اور اب جینے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہے تو وہ ضرور ہی خودکشی کر لے گا۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے پاگل ہی ہو جائے۔ سلفر گروپ کا آدمی وہ یوں بھی ہے۔

اُنو کئی وجہوں سے دکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب اُسے اس کے دوست، آشنا اور اپنے پرائے نہیں سمجھ پائے یا اس میں اتنی قوت نہیں تھی کہ ان لوگوں کے سامنے خود کو واضح کر سکے اور لوگوں میں غلط فہمیاں ہی غلط فہمیاں رہ گئیں تو پھر وہ کیوں جیے۔ اس کے جینے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اپنے اصولوں پر عمل میں وہ اس قدر سخت ہے کہ ایسی صورت حال میں وہ آسانی سے خودکشی کر سکتا ہے۔ کیوں کہ بے ایمانی سے وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ اور اسی لیے وہ ایک ایمان دار موت کو گلے لگا لے گا۔

لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ انو کو زندہ رکھ پانے کا میرا موہ ضرور ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ اُسے باندھ کر رکھ لیا

جائے۔ اُسے کچھ دنوں اور جینے کے لیے حوصلہ مند بنانے کے لیے کوئی لاجک میرے پاس اب رہی نہیں۔۔۔اس لیے مجھے نہ جانے کیوں اس کا یقین ہوگیا ہے کہ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔ جادوست میں نے تجھے آکاش کی امان میں دیا......
جا۔۔۔ الوداع۔

دنکر کی ڈائری سے

(روڈین) ایوان ترگنیف کا لکھا ہوا آج ختم ہوا۔ پاک ناول ہے۔ ایک طرح کے آدمی ہوتے ہیں جن میں تفکر کی قوت ہوتی ہے، علم ہوتا ہے، چھا جانے اور جیت لینے کی قوت ہوتی ہے۔ وہ چاہیں تو دولت مند ہوجائیں، چاہیں تو محبت میں کامیاب ہوجائیں، چاہیں تو شہرت کے میناروں تک پہنچ جائیں، چاہیں تو معمار اعظم بن جائیں مگر آخر تک وہ کچھ بھی نہیں بن پاتے ہیں۔ روڈین وہی آدمی ہے۔

نتالیہ اس پر فریفتہ ہوگئی مگر وہ اسے لے کر بھاگ نہیں سکا۔ ندی کا جو اُس نے منصوبہ بنایا، وہ ناکام ہوگیا۔ آخر کار وہ اسکول میں پڑھانے گیا مگر وہاں سے بھی اُسے بھاگنا پڑا۔ ایسا ہوا کہ وہ قلم سے لکھ کر بھی کوئی کام نہیں کرسکا۔ وہ لفظوں کا استعمال کرتا تھا، نئے محاورے گڑھتا تھا۔ لجھنیف روڈین کے سنتوش کے لیے کہتا ہے۔ بھائی لفظ بھی کارنامے ہی ہوتے ہیں۔ روڈین کہتا ہے...... لیکن میرا ناش تو لفظوں نے ہی کیا ہے۔ لجھنیف کہتا ہے۔ کبھی لڑتے لڑتے تھک جاؤ، تو میرے گھونسلے میں آجانا، افکار کے سبب بھی آدمی اپاہج ہوجاتا ہے۔ مگر ٹھاؤں تو ایسے اپاہج کو بھی چاہیے۔

روڈین فرانس میں انقلاب کے دوران مارا جاتا ہے۔

آج صبح کا اخبار۔

پٹنہ جنکشن کے قریب ریل سے دو ٹکڑے ہوئی ایک لاش پائی گئی ہے۔ لاش کی شناخت نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی جیب سے ایک پرچی بھی ملی ہے۔ جس پر لکھا ہے۔ اگر میں پاگل ہوگیا تو مجھے اس شہر میں بھیج دیا جائے جہاں سب سے بڑا (شہنشاہ) پاگل رہتا ہے۔ یا اگر میں مر گیا تو میری لاش چیل کوؤں کو کھلا دی جائے۔

......☆☆......

ڈائن
پیغام آفاقی

جی، میں نے اپنے ڈاکٹری کے پیشے میں بہت سے لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے۔ جی۔ ان میں چند اموات سے میں کافی متاثر بھی ہوا ہوں۔ جی۔ ان میں سب سے زیادہ ایک ایسی موت سے ہوا کہ وہ شخص تب تک نہیں مرا جب تک بیمار تھا لیکن جیسے ہی میں اس کے اندر کے زہر کو نکال لینے میں کامیاب ہوا ویسے ہی وہ ایک پرسکون حالت میں جا کر سرد ہوگیا۔

یہ کیسے؟

میڈیکل کے طلبا حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

دھیان سے سنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کچھ واقعات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ جب وہ ماضی میں گم ہوجاتے ہیں تو ان کے بطن سے کہانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں اپنے صدموں، اپنی عجیب عجیب سچائیوں اور انکشافات کی وجہ سے انسان کے علم اور اس کے فطری ارتقا میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جب تک وہ اپنے کو منوا نہیں لیتیں کہ وہ سچائیوں کا حصہ ہیں تب تک وہ اپنے دم پر ہمارے اجتماعی شعور میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔

ایسی ہی ایک کہانی اس کے اندر اٹکی ہوئی تھی۔ کہانیاں دبانے سے ختم نہیں ہوجاتیں۔ خبریں دب جاتی ہیں۔ کہانیاں نہیں۔ اسی لیے یہ اخباری رپورٹ ٹائپ کہانی دبی نہیں۔ یہ یہاں، ڈاکٹر نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا،

کانٹے کی طرح موجود رہتی ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ان کو کھلے عام سنا جائے۔ وہ تہذیب یعنی دنیا کی سب سے بڑی عدالت کی وکیل ہوتی ہیں۔ اور انہیں کی قوکالت سے دنیا کے کئی بڑے مہذب ملکوں نے ماضی کی کئی کہانیوں پر افسوس اور شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے کھلے عام پوری دنیا کے سامنے معافی مانگی ہے۔

ڈاکٹر تلخی سے مسکرایا۔ اس مریض کی کہانی بھی ایسی ہی ایک کہانی تھی۔ اس مریض نے مجھے راتوں رات ایک ڈاکٹر سے فلسفی بنا دیا۔ مجھے لکھنا معلوم ہوتا تو میں کہانی کار ہو جاتا۔ اب تم لوگوں نے پوچھا ہے تو سنو کہ میں بھی سنانا چاہتا ہوں۔

میں یہ کہانی تم کو اسی لیے سنا رہا ہوں کہ یہ کہانی منظر عام پر آئے اور اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔ جو تو میں، حکومتیں اور اشخاص اس پر بھی تیار نہ ہوں وہ انسانی نسل کے چہرے پر بدتہذیبی کا بہترین نمونہ ہیں۔ میں نے اس کا علاج کیا تھا۔ میں دوا اور انجکشنوں سے تو اس کو ٹھیک نہیں کر پایا تھا لیکن جیسے ہی میں نے اس کی زہر بھری کہانی چوس کر پی لی وہ ٹھیک ہو گیا تھا اور اسے پہلی بار بغیر کسی انجکشن کے گہری نیند آئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مر گیا اور تب سے اب تک میری نیند ڈسٹرب رہتی ہے۔

تم اپنے تخیل میں اس کہانی کا تصور کرو۔

یہ کولمبو سے شمال کی جانب واقع ایک پاگل خانے کا منظر ہے۔ یہ کہ یہ منظر کتنی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہے یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے لیکن اس منظر میں رفتہ رفتہ کئی ملک شامل ہو گئے ہیں۔

میں نے اس مریض پر ہر ممکن دوا استعمال کر چکا تھا لیکن کسی دوا نے کام نہیں کیا۔ البتہ دوائیں دیتے دیتے میں اپنی گفتگو اور ہمدردی کی وجہ سے اس عرصہ میں اس مریض کے دل کے قریب ضرور ہو گیا تھا اور آخر میں اچانک یہی بات مریض پر اثر کر گئی۔

،وہ لوگ فوج کے تھے، پولیس کے تھے یا قوم پرستوں کا کوئی دستہ تھا؟ میں نے اس سے پوچھا۔

مریض کی گفتگو سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ مریض خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ تم کو کوئی بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے تم کو ہر طرح کی دوا دے کر دیکھ لیا۔ لیکن تم ٹھیک نہیں ہو رہے ہو۔ میں پریشان ہو رہا ہوں۔ اب میرا اپنے آپ پر سے، اپنی صلاحیتوں پر سے بھروسہ اٹھ رہا ہے۔ اور اس کی وجہ تم ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ آخر ہوا کیا تھا۔ میں صرف تم کو ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ اور صرف ڈاکٹر ہوں۔ میں انٹیلی جنس کا کوئی آدمی نہیں ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔

اور پھر وہ ادھیڑ عمر کبڑے جیسا آدمی اچانک اتنی سلجھی ہوئی باتیں کرنے لگا کہ مجھے حیرت ہوئی۔

مریض اب اس منظر کو بیان کر رہا تھا جس کی پرچھائیں میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے اس علاقے کا نام بتایا۔

چلو آگے کی باتیں بتاؤ۔ جگہ تو کوئی بھی ہو سکتی ہے۔

میرا گھر وہیں ایک چوڑی سڑک سے منسلک گھنی آبادی کے بیچ تھا۔ اس دن میں ایک دوسرے شہر اپنی دکان کے لیے کچھ مال خریدنے گیا ہوا تھا۔ کچھ دنوں سے میں بیمار بھی تھا اور موسم خراب ہونے کی وجہ سے مری طبیعت بہت ملول سی ہو رہی تھی پھر بھی مجبوراً جانا پڑا تھا۔ دن دوپہر سے کچھ پہلے اچانک تین چار بکتر بند گاڑیاں اور ایک ٹرک آ کر میرے گھر کے سامنے رکے۔ گاڑیوں کے رکنے کا منظر دیکھتے ہی چاروں طرف سنسنی پھیل گئی، ایک سناٹا سا چھا گیا اور فضا میں موت کی آواز سنائی دینے لگی کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ جب ایسی گاڑیاں آتی تھیں تو کیا ہوتا تھا۔ لوگ چھتوں اور کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھنے لگے۔

گاڑیوں سے کچھ لوگ اترے اور سیدھے میرے گھر کے دروازے پر پہنچے اور دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے دروازہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کھولنے کا حکم دیا۔ میرے گھر کے کسی فرد نے دروازہ کھولا تو وہ لوگ گھر کے اندر گھس آئے۔

پھر ایک ایک کر کے سب کو گھر سے باہر نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بڑے بوڑھے سب کو باہر نکالا گیا۔ عورتیں دروازے تک آئیں تو ایک شخص نے جو گاڑی میں ہی بیٹھا تھا ان کو بھی بلا کر قطار میں کھڑا کرنے کا حکم دیا۔ چند لمحوں بعد دو تین نوجوان گھر کے تین چار چھوٹی عمر کے بچوں کو لے کر باہر آئے جس میں میرا ڈیڑھ سال کا وہ بیٹا بھی تھا جس نے ابھی چند ہی روز پہلے اپنے قدموں پر ملتے ڈولتے چلنا سیکھا تھا۔ انہوں نے بچوں کو لے کر آتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے شخص کے حکم کے لئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہاں، انہیں بھی لاؤ'' اس شخص نے نظر پڑتے ہی حکم دیا۔

ایک اشارے پر گھر کی دیوار کے پاس سب کو کھڑا کر دیا گیا۔

اور دوسرے ہی لمحے گولیوں کی بوچھار سے سب کو ڈھیر کر دیا گیا۔

گاڑی میں آئے لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میں اسٹیشن سے اترا ہی تھا کہ اپنے محلے میں ہوئے اس دل دہلا دینے والے واقعے کے بارے میں سنا۔ مجھے اپنے بھتیجے کی کارستانیوں کا خیال آیا اور دل میں خوف بھی پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو یہ میرے کنبے کے بارے میں نہ ہو۔ باہر نکلا تو تیز ہواؤں کے جھکڑ سے دھول سی اڑ رہی تھی۔ کوئی رکشا دکھائی نہیں دیا تو پیدل ہی تیز تیز چل پڑا۔ راستے میں یہ دیکھ کر میں اور بدحواس ہوا کہ وہی گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہ سب کچھ کھا پی رہے تھے۔ ان میں ایک نے مجھے پہچان لیا اور وہ مجھے پکڑ کر لے گئے۔ گاڑی میں آگے بیٹھے آدمی سے پوچھا گیا کہ مجھے گاڑی میں ڈال لیا جائے کیونکہ وہاں دور تک کافی لوگ تھے اور سب کے سامنے مجھے ختم کرنا شاید انہیں مناسب نہیں لگا۔ لیکن اس آدمی نے ہنستے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔

''نہیں اسے چھوڑ دو۔ بچ گیا تو بچ گیا۔ یہ کہانیاں ڈھوئے گا۔''

گھر پہنچ کر میں نے جو منظر دیکھا اس سے میرے ہوش اڑ گئے تھے اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے گھر کے سامنے پڑی میرے گھر والوں کی لاشوں پر محلے والوں نے چادریں ڈال دی تھیں۔ میں دوڑا قریب پہنچا۔ ایک چھوٹی سی ہلکی چادر میرے نونہال بیٹے کے اوپر بھی پڑی تھی۔ ہوا کے چلنے سے اس کے اوپر کی چادر ایسے ہلی کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کی چادر ہٹائی تو جو دیکھا وہ میرے حافظے پر اب تک نقش ہے۔ اس کے جسم پر پیشانی، منہ، سینے اور ہاتھ پر گولیاں لگی تھیں۔ لوگوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں کئی دنوں تک بے ہوش رہا تھا۔ اب میرے گھر کے افراد میں صرف ایک شخص زندہ بچ گیا تھا اور وہ تھا میرا بھتیجا جو دہشت گردوں کے گروہ میں شامل تھا۔ اور گھر نہیں آتا تھا۔''

''لیکن انہیں تمہارے گھر کے اور لوگوں کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔'' میں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔ لیکن میں پوری بات بتاتا ہوں۔''

اس نے سنجیدگی سے بتانا شروع کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس بار دہشت گردوں کے ایک گروہ نے پولیس کالونی میں گھس کر گولیاں چلائی تھیں۔ پولیس کالونی کی اس فائرنگ میں جو لوگ مرے تھے ان کی تصویریں بہت دلدوز تھیں۔ محکمہ پولیس میں کام کرنے والوں کے اہل کنبہ کو اس طرح سے گولیوں سے بھون ڈالنا۔ انتہائی درندگی تھی۔ نہیں۔ میں غلط کہہ گیا۔ انتہائی انسانیت تھی۔ نہیں میں غلط کہہ گیا۔ معاف کرنا ڈاکٹر مجھے لفظ نہیں مل رہے۔ لیکن میں لفظ کی تلاش میں ہوں اور میں ضرور ڈھونڈ لوں گا۔ میں تب آپ کو بتاؤں گا۔

جی ہاں۔ میرا بھتیجا بھی ان میں شامل تھا۔

ہاں ڈاکٹر وہ لفظ مل گیا۔ انتہائی درجہ کی حب الوطنی تھی۔ نہیں، وہ جو پولیس والوں کے گھر کے افراد کو مارا تھا وہ حب الوطنی نہیں تھی۔ وہ جو میرے گھر والوں کو مارا تھا وہ حب الوطنی تھی۔ دہشت گردوں کے گروہ میں شامل ہونے کے بعد

میرا بھتیجا بھی گھر نہیں آیا۔ گھر والے اس کی وجہ سے پہلے سے ہی خوفزدہ تھے اور ہم سب کو پہلے سے ہی اس کا اندیشہ تھا کیونکہ اب ہر طرف ایسا ہی سننے کو مل رہا تھا۔ پولس کئی بار ہمارے گھر پر چھاپہ مار چکی تھی۔ پولس ایک بار مجھے بھی لے گئی تھی۔ لیکن تب وہ دہشت گردی کے شروع کے دن تھے اور لڑائی دہشت گردوں اور پولیس وفوج کے درمیان ہوتی تھی۔

اس کے بعد پولیس کی گاڑیوں اور ٹھکانوں پر حملے ہونے لگے تھے اور اس کے بعد پولس والوں کی سرکاری رہائش گاہوں پر حملے ہونے لگے۔

اور اس طرح ہوا گرم تر ہونے لگی۔

اب کسی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی پیچیدہ لڑائیوں کا حل کیا ہوسکتا تھا۔ لوگ یہی سوچتے تھے کہ اگر وہ خود پولیس یا فوج میں ہوتے یا سرکار چلا رہے ہوتے تو کیا کرتے۔

یہ جنگ سنگین اور پیچیدہ ہوتی چلی گئی۔ ہوا تیز ہوتے ہوتے بگولوں کی شکل لینے لگی۔ اور ان بگولوں کے رقص میں ایک دن قانون کا دوپٹہ ایک جھونکے سے اڑکر گرد وغبار میں تہس نہس ہوگیا۔

ہوا اتنی تیز ہوئی کہ یہ پہچاننا مشکل ہوگیا سڑک یا گلی میں چلتا ہوا کون سا شخص دہشت گرد تنظیموں سے وابستہ ہے اور کون پولیس کا آدمی ہے۔ کہ جا بجا دہشت گرد پولیس کے یونیفارم میں اور پولس کے لوگ دہشت گردوں کے حلیوں میں گھوم رہے تھے۔

میرے خاندان کے ساتھ ہوئے اس سانحہ کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ پولیس کی انتقامی کارروائی تھی۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ دہشت گرد ہی تھے جنہوں نے پولیس کے خلاف عوام میں نفرت اور غصہ پیدا کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔

سچ پوچھئے تو کافی دنوں تک میں تذبذب میں تھا۔

میں اپنی اسی ذہنی حالت میں ایک دن بھٹکتا بھٹکتا اپنے اس گھر کو دیکھنے چلا گیا تھا جو اب کھنڈر سا ویران ہوگیا تھا۔

میں وہاں دالان میں لکڑی کے تخت پر اپنے گھٹنوں پر سر ٹیکے اپنے پیاروں کو یاد کر رہا تھا کہ میرے دو تین پڑوسی آئے اور انہوں نے مجھے تنبیہ کی کہ میں فوراً وہاں سے غائب ہوجاؤں۔ انہوں نے بہت اداس لہجے میں مجھے بتایا کہ پولیس مجھے ڈھونڈ رہی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چونکہ میرے اندر انتقام کا زہر بھرا ہوا ہے اس لیے میں حقیقتاً ایک خطرناک دہشت گرد بن گیا ہوں۔

جب واقعہ تازہ تھا تب مجھے اتنی تکلیف نہیں تھی جتنی اب اس واقعے کے زہر بن جانے کی وجہ سے ہے۔ وہاں تو سب کچھ برابر ہوگیا لیکن یہاں سب کچھ باقی ہے۔ وہ قہر کا دن میری زندگی کے لمحوں میں تحلیل ہوگیا۔

ڈاکٹر، مجھے چلتے، پھرتے، بیٹھتے ایسا لگتا ہے کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے۔

میں ڈر جاتا ہوں۔

میں نے کئی بار خواب میں دیکھا ہے کہ جیسے زمین اچانک قہقہہ لگا کر مجھے نگل جانا چاہتی ہے۔ لیکن میں ہوا میں پرواز کرکے بچ جاتا ہوں۔

کئی بار تو جب میں اڑتے اڑتے تھک گیا تو مجھے کسی پرندے نے بچا لیا۔

ایک بار میں بادلوں پر جا بیٹھا۔

میں نے محسوس کیا کہ مریض پھر بے قابو ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر مجھے بار بار لگتا ہے کہ میری زمین مجھے پکڑ کر نیچے کھینچ رہی ہے اور مجھے جان سے مار دے گی۔

مریض پھر ہوش میں آنے لگا تھا۔

اس پورے عرصے میں میں ٹھیک سے سو نہیں پایا ہوں۔ میں سوؤں کہاں؟ زمین مجھے سوتے میں نگل لے گی۔ جھٹکے

سے۔اچانک۔میں جانتا ہوں کہ وہ نگل لے گی۔وہ میری جان کی بھوکی ہے۔ڈاکٹر، تم کو پتہ ہے۔ڈائنیں سب سے پہلے اپنے بچوں کی جان لیتی ہیں۔

میں شاید پاگل نہیں ہوں بلکہ نیند نہ آنے کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔تم کیسے میرا علاج کر پاؤ گے۔

اس نے مجھ سے ایسے بات کی جیسے وہ پوری طرح ہوش میں ہو لیکن پھر فوراً ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ اس طرح بات کرنے لگا جیسے وہ ہوش و حواس میں نہیں ہو۔وہ رک رک کر وقفوں کے بعد مجھ سے تخاطب کے انداز میں ہی کہتا رہا۔

ایک دن میں نے اڑتے ہوئے اچانک دیکھا کہ میری ماں کا منہ کھلا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔میں نے ہمت کر کے سیدھے اس کے منہ کے اندر پرواز کی اور اس کی زبان سے بچتا ہوا اس کے حلق کے راستے اس کے پیٹ میں گھس گیا۔وہاں دیکھا میرے گھر والوں کے علاوہ اور بھی ہزاروں نوجوانوں اور بچوں کی ہڈیاں سڑ رہی تھیں۔میں پھڑ پھڑا کر باہر اتنی سرعت سے نکلا کہ اوپر بادلوں پر جا بیٹھا۔

نیچے سے میری ماں مجھے بلا رہی تھی لیکن میں نیچے نہیں اترا۔تب سے یہیں بیٹھا ہوں۔

پھر وہ اچانک کانپنے لگا جیسے موت کے قریب آنے پر کچھ مریضوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

دیکھو۔

اب وہ گھڑیال جیسا منہ کھولے بادلوں تک پہنچ رہی ہے۔

مجھے یہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا۔

ڈاکٹر۔اب میں اڑوں گا۔

اور یہ کہنے کے بعد بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں بازو بالکل چڑیا کے پروں کی طرح تیز تیز حرکت کرنے لگے جیسے وہ پرواز کر رہا ہو۔

یہ اس سے میری آخری گفتگو تھی۔

☆☆

نا قابل فراموش

محمد خالد جاوید

ستمبر کی ایک گھپ اندھیری رات میں جب کہ پاک بھارت جنگ پورے عروج پر تھی۔ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے ساتھ دو معصوم بچوں اور ایک بچی کے ساتھ۔وزیر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر بہاولپور جانے کے لئے ڈری اور سہمی ہوئی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔نا معلوم اس کو کس نے بتا دیا تھا کہ اس علاقے کی نسبت بہاولپور میں جنگ کی شدت کم ہے اور ریتلے ٹیلے ہونے کی وجہ سے کوئی بم گر کر نہیں پھٹتا......ممتا کی ماری ماں اپنی آخری عمر میں ملنے والی اولاد کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا چکی تھی

شہر میں بلیک آؤٹ ہونے کی وجہ سے ریلوے اسٹیشن بھی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا.اس کا خاوند اپنی بیوی اور بچوں کو انتہائی رقت آمیز حالت کے ساتھ اسٹیشن پر چھوڑ کر واپس اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا. کیونکہ اس کے پاس ایک لائسنس یافتہ رائفل تھی۔اس لئے گورنمنٹ نے ایسے تمام لوگوں کی ڈیوٹی رات کو اہم پلوں کی حفاظت پر لگا دی تھی

توپوں اور ٹینکوں کے پھٹنے والے گولوں کی گھن گرج مسلسل فضا کو اور گمبھیر بنا رہی تھی اچانک چھوٹی بچی نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا ہاتھ لگایا تو وہ تیز بخار میں تپ رہی تھی والدہ اور بچے بہت پریشان ہو گئے کہ اس وقت کہاں سے کوئی دوائی لی جائے..اسی اثنا میں تیز سائرن بجنے کی آواز نے ہر طرف مزید خوف و ہراس پھیلا دیا. کیونکہ سائرن

کی آواز کا مطلب تھا کہ دشمن کے جہاز ہمارے علاقے میں گھس گئے ہیں اور آپ سب جلدی سے بنائے گئے مورچوں میں پناہ لے لیں۔

اس عورت نے جھپٹ کر اپنے بچوں کو ساتھ لگا لیا اور لمبے پلیٹ فارم کے آخر پر بنائے گئے عارضی مورچوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ نجانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر وہ منہ کے بل پلیٹ فارم پر گر گئی اور چھوٹی بچی بھی اس کی دسترس سے نکل کر دور جا گری۔ دونوں بچوں نے فوراً اپنی ماں کو دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ شیرنی کی طرح اٹھی اور اپنی بچی کو جھپٹ کر اٹھایا اور بے تحاشا پیار کرنے لگی۔ نجانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی

شاید ممتا کی طاقت

مگر بچی کو اٹھا کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ تو چھوٹے بچے نے اپنے دونوں معصوم ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھنے شروع کر دیئے اور بولا

"امی جان آپ کیوں روتی ہیں؟ میں ہوں نا!

ماں نے کھینچ کر اپنے بیٹے کو ساتھ لگا لیا"۔ جگ جگ جیو میرے لال"

اتنی دیر میں دوبارہ سائرن کی آواز آئی کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو لے کر دوبارہ مسافر خانے میں آ گئی خدا خدا کر کے گاڑی کے آنے کی آواز آئی تو سب مسافروں کی جان میں جان آئی ...... وہ اپنے بچوں کو لے کر پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی میں کوئی خالی ڈبہ تلاش کرتے ہوئے کبھی ادھر۔ کبھی ادھر دوڑ رہی تھی۔ کہ گارڈ کے بتانے پر گاڑی کے آخر میں ایک ڈبے کی طرف بھاگنے لگی جو کہ سول لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ باقی سارے ڈبوں میں فوجی جوان تھے

ڈبے میں زیادہ تعداد مردوں کی تھی اور کچھ عورتیں تھیں.. خدا جانے وہ سب بھی کن حالات میں سفر پر نکلے تھے آمنے سامنے دو لمبی لکڑی کی بینچ نما سیٹوں میں سے ایک پر اس نے اپنی بچی کو لٹا دیا۔ اور دونوں بچوں کو اوپر والی برتھ پر بٹھا دیا.. بچی تیز بخار میں پیاس کی وجہ سے رونے لگی تو۔ آواز سن کر ساتھ والے ڈبے سے ایک فوجی جوان آیا اور پوچھا کہ "بچہ کیوں رو رہا ہے؟

بتانے پر جلدی سے پانی کی ایک سفری بوتل اور ایک ٹیبلٹ لے کر آیا اور نہایت شفقت سے بولا۔

"ماں جی.. ہم بھی آپ کے بیٹے ہیں کوئی بھی مسئلہ ہو تو ہمیں بتائیے گا"

جیتے رہو بیٹا.. خدا آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے"

کچھ دیر بعد گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی.. باہر دیکھنے پر سوائے گھپ اندھیرے کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، محاذ جنگ پر توپوں اور ٹینکوں کی گولہ باری شدت سے جاری تھی جب بھی کوئی گولہ پھٹتا دل دھک دھک کرنے لگتا اور وہ اپنے بچوں کو اپنے ٹوپی برقعے میں یوں سمیٹ لیتی جیسے مرغی خطرہ محسوس کر کے اپنے بچوں کو پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔

ہزاروں عظمتیں ماں کی ممتا پر قربان ہو رہی تھیں

ہزاروں فرشتے ایک ماں کی عظمت کو سلام پیش کر رہے تھے

...... اچانک گاڑی کی رفتار بہت کم ہو گئی...... اور ...... وہ...... رک گئی ...... ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی اسٹیشن آ گیا ہے، مگر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا.. دروازہ کھلا اور ایک مجذوب ٹائپ آدمی، لمبے لمبے بال، لمبی گھنی داڑھی تہبند باندھے ہوئے جس کے اوپر صرف ایک کمبل نما کپڑا دونوں شانوں پر لے رکھا تھا اندر داخل ہوا تو وہ اللہ اللہ کا ذکر کر رہا تھا

کئی مردوں نے از رہ عقیدت اس کو اپنی سیٹ پیش کی مگر وہ دروازے کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا اور اللہ کا ورد

کرتا رہا. چند منٹ بعد ہی گاڑی چل پڑی.. باہر دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی. مکان، درخت وغیرہ ایک ہیولے کی طرح گزرتے جا رہے تھے. ڈبے میں بیٹھے تمام لوگ ایک دوسرے سے بہت ہمدردی سے پیش آ رہے تھے. ایک دوسرے کو گھر سے لائی ہوئی کپڑے میں بندھی روٹیاں اور اچار پیش کرتے اور ایک دوسرے کی ہمت بندھا رہے تھے

وہ عورت کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، جب بھی گاڑی کسی پل پر سے گزرتی تو وہ سوچتی شاید اسی پل پر ان بچوں کا باپ اور میرا خاوند اپنے وطن کی حفاظت کے لئے رائفل تھامے بیٹھا ہوگا

شائد اس سے دوبارہ ملاقات ہو پائے گی یا نہیں؟

وہ گہرے غم واندوہ میں ڈوبی شدید خدشات کی رو میں بہتی ہوئی اپنے بچوں کو بار بار سہلا رہی تھی اور آنسو آنکھوں سے بہہ بہہ کر برقعے میں جذب ہو رہے تھے

گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر رکتی، چلتی. مرید کے اسٹیشن پر رکی تو آنے والے مسافروں سے معلوم ہوا کہ آج دشمن کے جہازوں نے وزیر آباد اور دھونکل کے ریلوے اسٹیشنوں پر بھرپور حملہ کیا ہے اور عمارتوں کو نقصان کے علاوہ بمباری سے کئی سول ملازم شہید ہو گئے ہیں.. خوف کی فضا میں مزید اضافہ ہو گیا

رات کافی بیت چکی تھی جب گاڑی لاہور کے مضافات میں داخل ہو رہی تھی. کہ اچانک. گاڑی رک گئی. دور سے کافی لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو کہ لحظہ بہ لحظہ آخری ڈبے کے قریب آ گئیں.. یکدم دروازہ کھلا.. اور یکے بعد دیگرے کئی فوجی جوان ڈبے میں داخل ہو کر سب لوگوں کی تلاشی لینے لگے، دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے اس مجذوب نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور اٹھ کر دوڑنے لگا مگر جوانوں نے اس کو دبوچ لیا اور ڈبے میں سے بھی ایک مشکوک آدمی کو زدوکوب کرتے ہوئے ساتھ لے گئے.. بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں دشمن ملک کے جاسوس تھے.

اف......خدایا.. خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا

مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ ابھی آگے کیا ہونے والا ہے؟

کافی دیر بعد گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاہور کے اسٹیشن پر پہنچ گئی.

ابھی گاڑی پوری طرح رکی نہ تھی کہ اچانک فضا میں دشمن کے دو طیارے نمودار ہوئے اور آتے ہی مشین گنوں سے حملہ کر دیا.. سب نے چیخنا شروع کر دیا گاڑی کے ساتھ ساتھ جہاز اڑ کر حملہ کر رہے تھے فضا میں آگ کی ایک لمبی قطار نظر آ رہی تھی کہ اسی اثنا میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس کے دونوں بچے اوپر والی برتھ سے نیچے فرش پر آ گرے

ڈبے میں سب لوگ اونچی آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے زندگی اور موت کا کھیل جاری تھا

عورت نے اپنے دونوں بچوں کو سیٹ کے نیچے الٹا لٹا دیا چند ہی لمحوں میں پاک فضائیہ کے طیاروں نے آ کر دشمن کے طیاروں کو گھیر لیا اور سامنے کھلے آسمان میں لڑائی شروع ہو گئی.. گولوں کے پھٹنے سے گاڑی یوں ڈول رہی تھی جیسے کوئی جھولے میں بیٹھا کر زور زور سے جھولا جھلا رہا ہو.

چھوٹے بچے کے گھٹنے فرش پر لگ لگ کر زخمی ہو گئے تو وہ اونچی آواز میں رونے لگا کہ اچانک دو فوجی جوان ڈبے میں داخل ہوئے اور دونوں بچوں کو اٹھا کر اپنے گلے سے یوں لگا لیا جیسے، ماں لگاتی ہے.. اور ماں سے اجازت لے کر ان کو اپنے ڈبے میں لے جا کر ایک موٹے کمبل کے اوپر ان کے کانوں میں روئی ٹھونس دی تا کہ شدید دھماکوں کی آواز سے ان کے کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں اور اوپر بھی ایک ایک کمبل دے دیا

کچھ ہی دیر میں وہ توپ جس کو بعد میں رانی کا خطاب ملا اور اس کو سارے لاہور میں پھولوں کے ہار پہنا کر سلامی دی گئی.. وہ لائی گئی جس نے آتے ہی ایک ہی گولے سے دشمن کے دونوں جہازوں کے پرخچے اڑا دیئے.. دونوں جہاز جلتے ہوئے نیچے زمین پر آ گرے اتنی تیز روشنی ہوی کہ زمین پر چلتی چیونٹی بھی نظر آ رہی تھی

لاہور کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔
صبح نو بجے گاڑی دوبارہ اپنی منزل کو روانہ ہوئی اور شام کو اپنی منزل پر پہنچ گئی.. فوجی جوانوں نے دونوں بچے ماں کے حوالے کیئے تو ڈبے میں لوگوں کی آنکھوں میں خوشی اور تشکر کے آنسو تھے جو اپنے دلیر اور مہربان فوجی بھائیوں کو عقیدت بھری سلامی پیش کررہے تھے...... آج بھی وہ قیامت کے منظر اس کی نگاہوں میں کسی فلم کی طرح محفوظ ہیں جن کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا.

پاک فوج زندہ باد.. پاکستان پائندہ باد
یہ بتانا ضروری نہیں.. کہ وہ بچہ...... میں تھا اور میرے ساتھ میری محترمہ والدہ صاحبہ بڑے بھائی اور چھوٹی ہمشیرہ تھیں۔

......☆☆......

انجام کی تلاش
احمد نعیم

اس وقت میری پیٹھ پہ خوابوں بھرا بستہ تھا۔اس بستے میں ماں باپ کے خواب۔سماج کے خواب اور بہت ساری آرزوؤں کا بوجھ میری پیٹھ پہ لدا ہوا تھا میں ننھے ننھے قدم اٹھاتا ہوا اسکول جارہا تھا کہ...... اچانک...... ایک آواز...... لگاتار میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔
''ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......''
میں نے برگد کی گھنی چھاؤں میں ایک بھیڑ دیکھی...... میرے قدم بھی اس طرف چل پڑے...... میں نے ایک آدمی کو دیکھا۔اُس کے ہاتھوں میں ایک ڈگڈگی تھی۔
وہ ڈگڈگی کو اپنے تجربہ کار ہاتھوں سے گھماتا...... منکا ڈگڈگی کی کھال پر تیزی سے پڑتا۔''ڈوگ......ڈوگ......'' کی آواز ابھرتی۔
اس مداری کے منہ سے لفظ تیزی سے باہر نکلتے جارہے تھے۔
''اے بھائے
گر جائے......صبر ہوجائے گا
جل جائے گا......صبر ہوجائے گا
پر کسی کو دے گا......صبر نہیں ہوئے گا
کسی غریب کے لئے...... آنہ...... دو آنہ...... روپیہ نہیں نکلے گا
لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا اپنے کو
لیکن قسم ہے ای شنکر بھگوان کی...... (اس نے پاس رکھی شنکر بھگوان کی قسم کھائی) جو میرے اس پٹارے میں بند ہے......اس کے لئے تم موٹا موٹا لوگاں کو بھی تماشہ بتائے گا''
وہ بار بار پٹارے کا حوالہ دیتا
آخر اس نے اپنے بوسیدہ پٹارے کے ڈھکن کو جیسے ہی ہٹایا...... ایک ناگ پھن پھیلائے کھڑا ہوگیا
وہ ناگ غصہ سے اپنی لال لال زبان باہر لپلپا رہا تھا
اسے دیکھ کر کئی لوگ پیچھے ہٹ گئے......تو کئی لوگوں نے ہاتھ جوڑ لئے
میں نے پہلی مرتبہ کسی ناگ کو دیکھا تھا......اور پہلی ہی مرتبہ ایک انجانی سی دہشت میرے دل میں بیٹھ گئی...... میں

حیرت سے اس تماشہ کو دیکھ رہا تھا
میری طرح اور بھی لوگ اس تماشہ کو تک رہے تھے...... مداری کبھی کالے ناگ کو پٹارے میں بند کر دیتا پھر اپنے پنجرے میں بند نیولے کو آزاد کر دیتا......
نیولہ جیسے ہی آزاد ہوتا...... وہ مداری کے اردگرد چکر کاٹنے لگتا
مداری کہہ رہا تھا
"مائی باپ ابھی تک آپ لوگوں نے سانپ اور نیولے کی لڑائی نہیں دیکھی ہوگی
لیکن یہ یار خان تم کو بتائے گا
کسی فلم میں نہیں...... یہاں......!!
اس برگد کی گھنی چھاؤں میں
چل جھمورے لگا دے ایک چکر...... جے بولو شنکر بھگوان کی"
مداری کے بیٹے نے پٹارے کو کھول کر سانپ کو اپنے گلے میں مفلر کی طرح لپیٹ کر تماشائیوں کے آگے اپنی ہتھیلی کو پھیلا دیا۔
لوگوں نے آنہ...... دوآنہ...... روپیہ...... اس کی ہتھیلی پر...... تو کسی نے زمین پر پھینک دیا
ڈگڈگی کی آواز اور تیز ہونے لگی
ڈوگ...... ڈوگ...... ڈوگ...... ڈ...... و...... ر...... و...... گ
اس مداری نے میرے ننھے ہاتھوں میں چھپے ہوئے آنے کو بھی لے لیا......
اس وقت میری کل کائنات صرف اسکولی بستہ اور مٹھی میں دبا ہوا ایک آنہ ہی تھا
"چل...... بھائے...... جو دے...... اس کا بھی بھلا
جو نا دے...... اس کا بھی بھلا"
لیکن یہ کیا......؟؟؟
مداری نے سب کی جیبوں اور ہتھیلیوں سے پیسہ نکال کر کھیل ختم کر دیا......
سانپ...... اور...... نیولہ کی لڑائی ہوئی ہی نہیں......!!!
سانپ پٹارے میں بند تھا...... اور نیولہ پنجرہ میں بند ادھر سے ادھر ہو رہا تھا
لوگ پہلے مایوس ہوئے...... اور پھر اپنی اپنی زندگی کی فریم میں داخل ہو گئے
میری آنکھوں میں حیرت پھنسی پھڑ پھڑا رہی تھی
میں کھڑا رہا......
سوچتا رہا......
ارے...... یہ تو ادھورا...... کھیل ہے......؟؟؟؟
اس پل میری سوچ و فکر کی کائنات ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی......
میں پہلی مرتبہ دیر سے اسکول پہنچا......
جناب دینا ناتھ نے میرے ہاتھوں پر دو چھڑیاں ماریں......
میری ہتھیلی سرخ ہو گئی......
دسمبر کی ٹھٹھرتی صبح کی مار کا اثر اتنا نہیں معلوم ہو رہا تھا......
لیکن صدمہ...... اس بات کا تھا کہ مداری نے سانپ اور نیولہ کی لڑائی نہیں بتائی بلکہ وہ میری ہتھیلی میں چھپے ہوئے

ایک آنہ کو بھی لے کر چلا گیا......!!

میری پیٹھ پر......

اب بھی بستہ تھا......

میں تیزی سے اسکول جا رہا تھا

میری نگاہیں دیواروں پر تحریر کیئے گئے نعروں......اقوال......اور بلیک بورڈ کو روانی سے پڑھنے لگی تھں

ہونٹوں پر اسکول کے ترانے اور نظمیں بہہ رہی تھیں

پھر ایک مرتبہ......

''ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......ڈ......ر......و......گ......''

کی آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں

میں پھر اس آواز کی طرف......

اس بھیڑ کی جانب چلا جا رہا تھا

میں نے اپنی مٹھی خوب مضبوطی سے بند کر لی......اور دل ہی دل میں سوچا آج تو ضرور سانپ اور نیولے کی لڑائی ہوگی

لیکن مداری بس ڈگڈگی بجا رہا تھا

اور دوسرے کھیل بتا کر بھیڑ سے ہنسی مذاق کرنے لگا

لوگ بھی ہنسی مذاق کے ساتھ ایک اہم لڑائی کو بھول گئے

لیکن مجھے تو اس لڑائی کا انتظار تھا

جو سانپ اور نیولے میں ہونے والی تھی

میں پھر ٹھگ لیا گیا

اور اتنی دیر سے اسکول پہنچا کہ میرا ہسٹری کا پیریڈ چھوٹ گیا

جناب دینا ناتھ اپنی موٹی سی عینک سے مجھے گھورتے ہوئے دوسری کلاس میں داخل ہو گئے

میں کانپتے قدموں سے کلاس میں داخل ہوا......تو نگاہ بلیک بورڈ میں دھنس کر رہ گئی

بلیک بورڈ پر سفید چاک سے تحریر تھا......

''جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہے

ان کا جغرافیہ بھی انہیں فراموش کر دیتا ہے''

دن کیلنڈر کے خانوں سے پھڑ پھڑا کر ڈسٹ بن میں گر رہے تھے

اب......

بالوں میں چاندی کے تار جگمگا رہے ہیں......

ہڈیاں کمزور پڑ گئی ہیں......

نظریں دھندلا سی گئی ہیں......

کتابوں کے حرف آپس میں گڈمڈ ہونے لگے ہیں......

ایک روز میں اپنے وجود سے جنم لینے والی نسلوں کا ہاتھ پکڑے زیبرا کراسنگ پار کر رہا تھا......کہ پھر وہی آواز ''ڈوگ......ڈوگ......ڈ......ر......و......گ......'' کی آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں۔

قدم بے اختیار پھر اس جانب اٹھنے لگے تھے

میں پھر اس بھیڑ کا حصہ بن گیا
آج بھی مداری اسی طرح راستوں پہ بیٹھا.....رام.....رحیم.....کی قسمیں کھا رہا تھا
آج بھی.....اس کے حلق سے وہی لفظ ابھر رہے تھے
''تو مائی باپ.....سرکار.....
آپ نے دیکھی نہ ہوگی سانپ اور نیولے کی لڑائی
تو پھر دیکھئے.....کون ہارتا ہے.....؟؟
کون جیتتا ہے.....ہے.....؟؟؟
کس میں ہے کتنا دم.....؟؟؟؟''
اس نے پھر ڈگڈگی بجانا شروع کر دیا۔
میں نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا
سب کچھ بدل گیا تھا.....
مداری بھی تبدیل ہو چکے تھے
تماشائی بھی بدل گئے تھے
راستے.....بھی تو.....بدل گئے تھے
لیکن نہ بدلا تو.....مداری کے لبوں سے پھوٹنے والا منتر نہ بدلا تھا
اور نہ ہی ڈگڈگی کی آواز تبدیل ہوئی.....
ڈوگ.....ڈوگ.....ڈوگ.....ڈوگ.....
کوئی بھی فرق تو نہیں آیا تھا.....ان آوازوں میں
''اے بھائے.....گر.....جائے.....گا.....صبر ہو جائے گا
جل جائے گا.....صبر ہو جائے گا
لیکن کسی غریب کو دیگا صبر نہیں ہوگا
ارے.....ارے.....او سیٹھ جاتا کہاں ہے پیشہ کا سن کر.....ارے کبھی میرے سوکھے ہوئے کھیتوں کی بھی طرف برس جا تیرا جاتا کیا ہے''
اس نے اپنے خالی اندر دھنسے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''اوہ.....پیر
ہر بلا کو.....چیر
نواز.....
میرے غریب نواز.....سب کو نواز.....
علی علی عباس.....بھولا بھٹکا مداری کے پاس''
اس نے کئی اور قسمیں کھائیں.....پھر سنہرے وعدوں.....قدموں کا جال بھیڑ کی جانب پھینکا
لوگوں نے پھر اس کی قسمیں.....اس کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے دھرتی پر پیسہ پھینکنا شروع کر دیا
مداری نے پھر ادھورا کھیل بتا کر پیسہ بٹور لیا.....
کھیل ختم ہو گیا
''چلو گھر چلیں بابا.....''

قدم لرز کر رہ گئے......

''کیا''......؟؟؟؟

میں جیسے ہوش میں آ گیا......

''چلو گھر چلیں بابا'' کی آوازیں دل و دماغ میں گردش کرنے لگیں۔

مجھے پھر اپنے لٹ جانے کا شدید احساس ہوا

میں جو 67 برسوں سے اس ادھورے کھیل کو دیکھ رہا ہوں

کیا......؟؟؟؟

میری نسلیں بھی اسی طرح ٹھگی جائیں گی......؟؟؟

ایک مرتبہ پھر میری ہتھیلیاں سرخ ہونے لگیں......لیکن اس مرتبہ میری مٹھیوں میں کئی اور بھی ننھی ننھی سی انگلیاں دبی ہوئی تھیں

ارے......ارے......

یہ کیا

اب تو نیند میں......

شعور......میں......لاشعور......میں

''ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......ڈ......ر......و......گ''

سفید اخبارات کے کالے کالے حرفوں سے بھی

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ

ٹی وی آن کرو......ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ

آفس......دفتر......

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ

انٹرنیٹ......ٹوئیٹر......فیس بک......

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......

ارے......ارے......یہ آوازیں تو اب معتبر لبوں سے بھی پھوٹنے لگی ہیں......

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......

ملاّ کی داڑھی......سے......

پنڈت کی......جھولی......سے بھی

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......

کی آوازیں ابھر رہی ہیں

میں اپنی تھکی بوجھل آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں

گھروں کے در......و دیوار

بچوں کے مہکتے لبوں سے بھی ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......کی آوازیں محسوس ہونے لگی ہیں

مداریوں کی گٹھری سونے......چاندی......کے سکوں سے بھرتی جا رہی ہیں

وقت اور موسم کے ساتھ سانپ اور نیولے کی رنگت تبدیل ہوتی جا رہی ہے

کبھی پنیر......

بھی کھیری......

تو کبھی کچھ......اور......

صدیاں......گذر گئی ہیں......

مگر......!!

سانپ اور نیولے کی لڑائی......

نامکمل......

ادھوری......

پڑی ہے......

آخر......یہ کون سا کھیل ہے......؟

اور

یہ کھیل ہے تو پھر......

یہ مکمل کیوں نہیں ہوتا......؟؟؟؟

کیا......!!!

اس کھیل کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا......؟؟؟؟؟

سوالیہ نشان میری آنکھوں میں اگ آیا ہے

آواز اب بھی آرہی ہے

ڈوگ......ڈوگ......ڈوگ......

☆☆......

نائلون میں لپٹی لاش

ماہ جبین صدیقی

کمرے میں سنہری مہک رچی تھی۔ پیلا ہٹ اترنے کا آج آخری دن تھا یا زردی چڑھنے کا پہلا دن۔ کوئی بات آج تک طے نہ ہوئی تھی تو یہ کیسے ہو جاتی۔ وہ یہ سب سوچتی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کوئی لڑکی ریڈیو کھلا چھوڑ گئی تھی۔ گھٹیا بے ہودہ قسم کے گانے سننے کا لڑکیوں کو کتنا شوق ہے اس نے سوچا۔

''اک بچی جس کی عمر چار سال ہے لال رنگ کی فراک پہنے ہے۔ صرف اپنا نام بتا سکتی ہے۔ گم ہوگئی ہے جن صاحب کو اس کے بارے میں علم ہو۔''

آگے اور جانے کیا کیا تھا۔ وہ کچھ نہ سن سکی۔ ریڈیو سے گانے کے دوران اعلان ہوا اور اسے احساس ہوا کہ اس نے اس دوران گانا کوئی نہیں سنا تھا۔ گانے اس نے پچھلے چار روز سے بھی نہیں سنے تھے جو اس کے قریب ہی ڈھولک پر گائے جا رہے تھے اسے یاد آیا کہ اُسے بچپن ہی سے حادثات اور گمشدگی کی خبروں سے دلچسپی رہی ہے۔

''نائلون کی ملوں میں آگ لگ جانے سے بیشتر آدمی جاں بحق ہوگئے۔ فائر بریگیڈ کے عملے کی غیر ذمہ داری سے زرمبادلہ کے اس نازک وسیلے کے ضائع ہو جانے پر ملکی مفاد کو دھچکا پہنچا ہے''۔

کچھ دیر بعد لڑکیاں آگئیں۔ ہنستی بولتی اور زیور کپڑے جیسے لوازمات کے بارے میں سوچتی اور بآواز بلند انہیں امور پر بحث کرتی۔

''ارے تم یہ کیا فضول سی خبریں سن رہی ہو۔'' حنا نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔
''بی بنو! تمہارے یہ خبریں سننے کے دن نہیں۔'' اور وہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔
ابٹن، خوشبو، تیل اس کے جسم سے اتارا گیا۔ اسے نئے کپڑے پہنائے گئے، جیسے زخموں کو صاف کر کے ان پر اوپر سے پٹی باندھ کر انہیں ٹھیک ہونے چھوڑ دیا جائے اور وہ اندر ہی اندر پکتے جائیں۔ پھر اک روز وہ زخم وہیں اگ جاتے ہیں اور جڑوں کی طرح کھوکھلا کرتے جاتے ہیں۔
آوازیں، شور، بارات، نکاح اور جانے کیا کیا۔۔؟؟
نائیلون کے ریشے جھلس رہے تھے اور ان کے اندر زندگی کراہیں لے رہی تھی لیکن جانے کن ہاتھوں کی غیر ذمہ داری سے اس نازک وسیلے کے ضائع ہو جانے پر کسی مفاد پر کوئی آنچ نہ آئی تھی۔
اور پھر اس کی رخصت کا شور اٹھا۔
اس کے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں اس نے آنکھوں کی طرح کان بھی بند کر لئے۔
اک آنسو اس کی پلکوں پر اٹکا۔
آج اک اور لڑکی لال کپڑے پہنے گم ہو گئی ہے اور وہ صرف اپنا نام بتا سکتی ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ لڑکی کسی کو نہ ملی وہ جیسے گم ہو گئی۔ اس کی ساس بہت خوش ہوئی تھی۔
''ارے کیسی گائے جیسی بھولی ہے مجھے'' وہ ہر آئے گئے سے کہتی۔
''بھئی تم بڑی اچھی بیوی ہو کبھی سستی سی کوئی فرمائش بھی نہیں کرتیں''۔ اس کا شوہر کہتا۔
''ہاں، ہم لڑکیاں ایسی نہ ہوں تو اتنی ارزاں کیوں بکیں ٹکے ٹکے اور ارزاں چیزوں کی تو ویسے بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ وہ گھر میں محض ضرورتاً ہوتی ہیں اور وہ یہ ضرورت مشینی انداز سے جیتے اور نبھاتے گزار رہی ہے۔ اس کا اندر گھن زدہ ہوتا جاتا تھا اور لوگ کہتے تھے نیتا تو کچھ اور خوبصورت ہو گئی ہے۔ پہلے سے کچھ اور نازک۔
وہ یہ جملے سن کر ایک لمحے کو تھم سی جاتی۔
وہ کیسا ہوگا۔۔؟ وہ یہ سب سوچتی۔
''ارے تو کیسے۔'' سامنے سے فرح نے اسے آتے دیکھا اور فرط خوشی سے لپٹ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رک گئے۔
یار دوست بھی تو پرانے زخموں کی طرح ہوتی ہیں اور زخم جیسے کھل رہے تھے۔ سارے ٹانکے ادھڑ رہے تھے اس کا چہرہ دیکھ کر نیتا پھر رو پڑی اسے لگا جیسے وہ بہت دنوں سے کھوئی ہوئی تھی اور آج شناسا چہرہ دیکھ کر رو پڑی۔
''وہ۔۔ کیسا ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔
''چل تیری محبت بھی مفلس کی کٹیا کی طرح رہی۔'' وہ دونوں بیٹھ چکی تھیں۔
''ہاں میرا پیار جھگی کا ہی سہی پر اس میں صوفی کی موجودگی نے اسے ایشور کا مندر بنا دیا ہے''۔
''کفر مت بکو، خدا اور ایشور کو ایک ساتھ لاتی ہو، کچھ خوف کرو'' فرح ویسے ہی کٹر خیالات کی تھی۔
''ایشور کیا ہے؟ خدا لفظوں کا محتاج تو نہیں۔ لفظ ہندو اور مسلمان کبھی نہیں ہوتے۔ لفظ تو خدا کی طرح ہوتے ہیں۔ پاک، بے عیب، جنہیں دھرتی کی اور مٹی کی کوکھ پیدا نہیں کرتی۔ وہ تو آفاقی ہوتے ہیں جیسے آسمان کی نیلاہٹ جیسے سورج کی چھنتی دھوپ، وہ تو پوتر ہیں۔ فاسد ہم ہیں۔ نیتا کے ذہن میں پھر ایک خیال آیا اور اک اور موتی آنکھ سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ جیسے محبت کا موتی ارادی نہیں ہوتا۔ دل کے صفحے پر خود ہی چھلک جاتا ہے۔
''ارے تو رو رہی ہے'' فرح نے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔
دل کے آنسو کون دیکھے؟ جو بلا ارادہ گرے اور دل کے صفحے پر نشان چھوڑ گئے رات اس نے اپنے دل کی تہیں ٹٹولیں

وہ موتی اب بھی یونہی جگمگا رہا تھا۔ تمہاری خوشبو، تمہارا عکس، نیتا پھر بے چین ہونے لگی۔ اچانک اس کے شوہر نے کروٹ بدلی اور خوشبو عکس سایا سب جیسے کچے ریشم کی طرح الجھتے گئے۔

میں نے تو صرف اپنا نام سیکھا تھا۔ میں تو سارے اسم کے در خود پر بند کر آئی تھی پر یہ سب کیا جرم، ضمیر، پشیمانی اس کی پیشانی پر یخ قطرے چمکنے لگے اور اندھیرے میں دل کے داغوں کی طرح لو دے گئے۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آتی سن کر اس کا دھیان لوٹا کہ رات گذر چکی ہے۔ وضو کر کے اس نے جانماز بچھائی اور قرآن کے صفحے پر جھکتی گئی۔

''اور ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں، سو ان کے سر بل رہے ہیں''۔

اک لپکا، اک کوندا پھر ذہن جلا گیا۔ طوق یہ نہیں جو نظر آ رہا ہے طوق تو وہ ہے جو کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔ جو ساری عمر پڑے پڑے جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔

آنسوؤں کے کئی قطرے صفحے پر پھیلتے گئے۔ نیتا نے آہستگی سے قرآن بند کر دیا۔ میں یہاں بھی خیانت کرنے لگی۔ اس نے خود کو ملامت کی۔ پشیمانی کے ڈھیروں قطرے آنسوؤں کی صورت میں آہستہ آہستہ گرتے رہے اور وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔

اس دن کے بعد سے اس نے جیسے بے نقط لفظ بولنے شروع کر دیئے تھے کہ جن کی ادائیگی سے پہلے موزونیت دیکھنی پڑتی ہے کہ کہیں کوئی لفظ منقوط ہو کر بھرم نہ کھول دے۔

زندگی کو وہ دو اور دو چار بناتی جا رہی تھی اور اسی چار کے حساب نے اُسے سخت بنا دیا تھا۔ جیسے ننھے پودے پہاڑی علاقوں میں اُگ آئیں تو کسی پتھر کے نیچے دب کر خود بھی سانس لینا بھول جاتے ہیں اور بہت برس بعد یہ پتھر ہٹانے پر اندر سے ایک اور پودا نما پتھر نکلتا ہے۔ وہ پتھر یوں ہی پودے پر پڑا رہا اور سال اسے یونہی پتھراتے رہے۔

جیسے ایک صوفی کنارے پر تسبیح پڑھ رہا تھا دو گھسیارنیں گھاس بیچ کر شام کو وہاں سے گزریں۔ راستے میں ایک نے دوسری سے پوچھا۔

''اری تو نے آج کتنے کی گھاس بیچی ہے''۔

دوسری بولی ''چار پیسے کی''

''اچھا اب تو بتا کہ تو نے اپنی گھاس کتنے کی فروخت کی؟''

پہلی گھسیارن نے بتایا ''دو پیسے کی'' دوسری نے کہا ''چل جھوٹی'' گھاس تو نے بھی چار ہی پیسے کی بیچی ہے لیکن دو پیسے تو نے اپنے محبوب کو دے دیئے''۔

پہلی گھسیارن ہنسی اور کہنے لگی ''پگلی محبوب کو دینے کا بھی کوئی حساب ہوتا ہے'' یہ سنتے ہی صوفی نے تسبیح ہاتھوں سے کنوئیں میں اچھال دی اور بے حساب ورد شروع کر دیا۔

''آ آ آ...... آج جانے کتنے برس بعد اسے لگا کہ اس نے بھی عمر کی تسبیح ہاتھوں سے زندگی کی نہر میں ڈال دی تھی کہ شماریات کے دکھ الگ ہوتے ہیں۔ وہ شاید سارے دکھوں سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں اسے یاد آتا ہے کہ ایک محفل میں پانچ منٹ کی پانچویں ملاقات پر اس نے نیتا سے کہا تھا کہ ''سال کیا ہوتے ہیں؟ کچھ بھی تو نہیں میرے وہ ساتھی جن کے ساتھ میں پندرہ برس سے رہ رہا ہوں آپ سے آج میں پانچویں مرتبہ ملا ہوں: پانچ ۳ سے ضرب ہو گیا ہے۔''

وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی تھی۔ ان سالوں کی وہ کیسے Numbering کر لے۔ وہ کیسے حساب چکا دے۔ کیسے سودا بے باق کر دے سو اس نے بے حسابی چن لی تھی۔ وہ اُسے کیسے بتاتی کہ آج اتنے ڈھیروں سال اس سے ضرب بھی نہیں ہوتے کہ ضرب بھی تو اعداد سے ہوتا ہے اور اعداد اس نے ہوا میں اچھال دیئے تھے۔

اپنا شہر چھوڑے اس بستی میں گمنامی کی زندگی گزار رہی تھی اپنے بھائی کی شدید بیماری کی خبر سن کر وہ بوکھلا کر روانہ ہوئی۔ شادی کے بعد شاید وہ دوسری مرتبہ اپنے گھر جا رہی تھی۔ ٹرین ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند

کوسوں دور تھی۔ وہ گھر وہ شہر جہاں اس کی آنکھوں نے خاموش دوپہریں سجائی تھیں جہاں خوابوں نے زندگی سے رس بھی لیا تھا۔ کیف بھی پایا تھا جہاں اس رس سے منہ بھی بھر دیا تھا۔

اس نے کافی دیر بعد آنکھیں کھولیں ایک خوبصورت سی عورت اس کے سامنے والی سیٹ پر جانے کب آکر بیٹھ چکی تھی اس کی آنکھیں اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہونٹ دانتوں میں سختی سے بھینچنے کے باوجود آنکھوں سے موتی ڈھلکے پڑ رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے تمہیں'' نیتا نے جیسے اس کے دل کے رخسار چھوئے۔

''میرا شوہر۔'' یہ کہہ کر وہ پھر بے اختیار ہوگئی۔

''کیا ہوا تمہارے شوہر کو''۔

''ان کا انتقال ہو چکا ہے اور اب میں عدت گزارنے میکے جارہی ہوں''۔

''اوہ۔'' نیتا کے ذہن میں اظہار افسوس کے طور پر کوئی جملہ نہ آیا بس اتنا کہہ سکی۔

یہ میرے شوہر کی تصویر اس نے ایک چھوٹے سائز کی تصویر نکال کر سامنے آئی اور جیسے پھر دور ہوتی گئی۔

وہ اس طرح ملے گا ایسے نظر آئے گا۔نہیں......نہیں......نہیں اسے کچھ بھی نظر آتا تھا وہ بھی نہیں جو لیکن کیسی مجبوری ہے وہ رو بھی نہیں سکتی تھی کہ رونے کا حق بھی تو قانونی اور شرعی ہوتا ہے اور اسے یہ دونوں حق حاصل نہ تھے آنسو اس کی پلکوں کا دامن تھام رہے تھے جیسے بہت سارے لوگوں کے درمیان غیر شرعی بچہ سہم کر ماں کا دامن تھام لے اور اس نے منہ پھیر کر آنسوؤں کے بڑھتے ہاتھ جھٹک دیئے۔

''کیا ہوا بہن تمہیں۔'' اس عورت نے اپنا غم بھول کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں آج تمہارے شوہر کی موت پر کچھ یاد آ گیا''۔

''کیا......''

''اپنے شوہر کی موت''

''کب انتقال ہوا تھا ان کا'' اس عورت نے پوچھا۔

''میری شادی والے روز'' نیتا نے آہستہ سے کہا، وہ عورت کچھ نہ سمجھنے والے انداز سے اسے دیکھتی رہی اور دوبارہ سیٹ پر جا بیٹھی۔

گاڑی آہستہ ہو رہی تھی اس کا اسٹیشن بھی قریب آرہا تھا اس نے رسالہ کھول لیا۔ نمایاں حروف میں کوئی واقعہ لکھا تھا۔

سترہویں صدی کا ذکر ہے دکن میں زبردست قحط پڑا۔ ہزاروں لوگ بھوک سے مر گئے۔ گلی کوچے بے گور و کفن لاشوں سے پٹ گئے بھوکے لوگ صبح ہونے سے پہلے مرنے والوں کی لاشیں کھا جاتے تھے۔ اگر یہ لاشیں بھی ناکافی ہوتیں تو لوگ قبروں سے مردے نکال کر کھا جاتے۔ انہی دنوں ایک عورت سڑکوں پر روتی پھرتی تھی۔ کسی نے اس سے رونے کا سبب پوچھا اس نے کہا۔ ''لوگو! ظالم میرے بچوں کو کاٹ کر کھا گئے مجھے ذرا ٹکڑا بھی نہ دیا''۔

گاڑی آہستہ آہستہ اسٹیشن پر پہنچ رہی تھی اسے بس اتنی خبر ہوئی کہ اس کا ذہن ہلکورے لے رہا تھا اور پھر گاڑی رکتے ہی بیسویں صدی کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک عورت ذہنی توازن گنوائے چیختی چلاتی اتر رہی ہے اور ایک ایک کا راستہ روک کر کہتی ہے۔

''لوگو! ظالم میری محبت نوچ کے کھا گئے مجھے ذرا ٹکڑا بھی نہ دیا''۔

......☆☆......

میوٹیشن

ڈاکٹر بلند اقبال

کوئی کچھ بھی کہے مگر سچ تو یہی تھا کہ اس میں علی بخش کا کچھ بھی قصور نہیں تھا وہ تو اور مردوں کی طرح اپنے باپ کے y کروموسوم اور ماں کے x کروموسوم سے مل کر ہی بنا تھا۔ خلیوں کی تقسیم بھی درست تھی اور نیوکلیس کے ملاپ بھی۔ جینز Genes کی ترتیب بھی سہی تھی اور ایلیلز Alleles کی ساخت بھی۔ بس کوئی آوارہ کوانزائیم Enzyme-Co تھا جو عین وقت پر میٹابولزم Metabolism میں حصہ نہ لے سکا اور بنا آواز کے اپنے ارتقاء سے ہی خارج Delete ہو گیا اور علی بخش کے سیکس ہارمونز کے ریسپٹرز Receptors کی شکل بدل گیا۔ اس قیامت کا نہ تو علی بخش کو ہی پتہ چلا اور نہ ہی اس کے باپ مولوی کریم بخش کو۔

پھر محلے میں علی بخش کی پیدائش پر خوب ہی لڈو بٹے، کان میں اذان ہوئی اور پھر رسم مسلمانی۔ مولوی کریم بخش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر خداوند کریم سے رحمتوں کی گڑگڑا کر بھیک مانگی اور پوری عاجزی سے اپنے پیارے بیٹے کو دین کی بھلائی اور خلق خدائی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی ٹھانی۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلے۔ مولوی کریم بخش نے بیٹے کی تربیت میں کوئی بھی کسر نہ چھوڑی۔ پاکیزہ مذہبی ماحول اور اعلیٰ مشرقی تربیت کے اثرات علی بخش کے جملہ کردار میں جھلکتے تھے۔ کردار کے اثرات چہرے مہرے پر بھی جیسے چاند سورج بن کر چمکتے تھے۔ ابھی وہ گیارہ سال ہی کے تھے کہ قرآن پاک حفظ کرلیا اور پھر تبلیغ الٰہی کہ اسرار و رموز سے واقفیت کی غرض سے کبھی باپ کے ساتھ اور کبھی ان کے رفقاء کار کے دامن کو تھام کر دور دراز کے شہروں اور گاؤں کے چکر لگانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد کے ماحول اور تربیت نے کچھ ایسا رنگ جمایا کہ تحریر و تقریر میں بلاغت آتی چلی گئی۔ الفاظ بے تکان لبوں سے نکلتے اور اثرات اس قدر جذباتی شدت اور مذہبی حدت سے بھرے ہوتے کہ سننے والوں پر رقت سی طاری ہو جاتی، دیکھتے ہی دیکھتے ان کے دل تصورِ وحدانیت سے مغلوب ہو جاتے، آنکھیں عشق رسول سے نم ہو جاتیں اور سر رکوع میں خم ہو جاتے۔ جب جب رفقائے کرام نجی محفلوں میں کم عمر بیٹے کی امامت و بلاغت کا تذکرہ مولوی کریم بخش سے کرتے تو ان کی پیشانی خداوند پاک کی بارگاہ میں شکرانے کے لیے سجدہ ریز ہو جاتی اور گڑگڑا کر اس کی رحمتوں پر شکر گزار ہو جاتی۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے علی بخش کا بچپن جوانی کی دہلیز کو چھونے لگا اور پھر ایک رات ان کے قد و کاٹھ نے جوانی کی جو بھرپور انگڑائی لی تو جیسے ادھ موئی کلیوں میں ٹوٹ کر بہار آ گئی۔ اگلی صبح علی بخش حیران نگاہوں سے اپنے بدلتے بدن کے زاویوں کو خلوصِ دل سے تک رہے تھے۔ فجر کی اذان میں ان کی آواز میں وہ کرب تھا کہ کچھ لمحوں کے لیے تو نمازی خداوند کریم سے خود اپنی آوازوں کے لیے بھی کچھ ایسے ہی لطف و کرم کی فریاد کرنے لگے۔

ظہر اور عصر کی نماز علی بخش نے گھر پر ہی ادا کی۔ مولوی کریم بخش نے حیران نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا تو باپ سے نظریں بچا کر اپنی زندگی کا پہلا جھوٹ کہا اور طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کیا۔ آہستہ آہستہ محفلوں اور مذاکروں میں شرکت کم ہونے لگی اگر مجبوراً آنا بھی پڑتا تو آخری قطار میں بیٹھ جاتے اور پھر جلد ہی نظریں بچا کر نکل جاتے۔ خود کو محض اپنے کمرے تک محدود کرنے لگے اپنا زیادہ وقت قرآن شریف کی تلاوت میں گزارتے اور کبھیں تو ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتے اور چپ چاپ آسمان کو تکتے رہتے۔

پھر کچھ ہی دنوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی علی بخش کی چال نسوانی ہوتی چلی گئی اور جسم بے ادبی کی حد تک لباس سے نمایاں ہونے لگا۔ مولوی کریم بخش نے بیٹے کے جسم کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے تو آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور شرم سے زمین میں گڑتی چلی گئیں۔ بہت دنوں تک گفتگو میں دوری برداشت نہ ہوئی اور بالآخر ایک روز بیٹے کے کمرے میں آئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آخر بہت صبر و تحمل کے بعد ایک جملہ ادا کیا 'وہ بڑا رب الجلیل ہے اس کے ہر کام میں مصلحت چھپی ہوتی ہے، مگر کیا تم نے حکیم و طبیب سے بھی کچھ دریافت کیا؟' علی بخش باپ کے سوال پر

شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے اور پھر ان سے نظریں ملائے بغیر ہی زمین کو تکتے ہوئے کہنے لگے۔
''جی ڈاکٹرز کہتے ہیں پیدائش سے قبل ہی خلیوں کی تقسیم میں کچھ بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، کوئی چیز شاید میوٹیشن Mutation ہوتی ہے، اسی کی وجہ سے اور اب علاج ممکن نہیں'' یہ کہہ کر باپ کے پیروں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور سسک سسک کر کہنے لگے۔
''ابا جی! اب میں کیا کروں؟ اب کیسے لوگوں سے نظریں ملاؤں؟ کیسے عبادت کے لیے گھر سے نکلوں؟ مجھ سے سہا نہیں جاتا، خودکشی حرام نہ ہوتی تو کب کا جان دے چکا ہوتا'' باپ نے روتی سرخ خشمگیں نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔
''بیٹے اب شاید تمہارے لیے تبلیغ الٰہی اور امامت مسلمہ کے تمام در بند ہو گئے ہیں، عوام الناس تمہاری بلاغت کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے مگر ہاں، ایک دروازہ شاید ابھی بھی کھلا ہوا ہے، مراقبہ...... کہتے ہیں کہ یہ سکون کا ذریعہ ہے'' یہ کہہ کر مولوی کریم بخش نے روتے ہوئے بیٹے کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور آنسو پونچھتے ہوئے مسجد چلے گئے۔
لفظ ''میوٹیشن'' کسی چمگادڑ کی طرح علی بخش کے دماغ سے چپک گیا تھا۔ وہ جب جب آنکھیں بند کرتے اور مراقبے میں جانے کی ٹھانتے تو بہت سی چمگادڑیں ان کے خیالوں میں اتر آتیں اور پھر چاروں جانب سے انہیں گھیر لیتیں۔ کبھی کبھی تو یہ یلغار اس قدر شدید ہو جاتی کہ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتے اور پھر گہری گہری سانس لیتے۔ انہیں لگتا جیسے سچ مچ کی چمگادڑیں ان کے بدن پر چپک گئی ہیں اور ان کی بوٹیاں نوچ رہی ہیں۔
بالآخر آہستہ آہستہ مراقبے میں وقت بڑھنے لگا۔ چمگادڑیں تو اب بھی نظر آتی تھیں مگر اب ان کی شکلیں بدلنے لگی تھیں۔ اب بھی کبھی وہ جو مراقبے کی نیت سے آنکھیں بند کرتے تو کینسر اور پولیو کے ادھ مرے مریض اور بچے نظر آنے لگتے جو کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر رینگتے ہوتے اور ان کے جسموں پر کہیں کہیں چمگادڑیں چپٹی ہوئی انہیں چاٹ رہی ہوتیں۔ کبھی کبھار جو آنکھیں بند ہوتیں تو انہیں سرسبز و شاداب میدانوں میں بنجر زمینیں نظر آنے لگتیں جن سے لپٹی ہوئی چمگادڑیں زمین کا رس چوس رہی ہوتیں اور کبھی جو آنکھیں بند کرتے تو خیالوں میں طوفانوں کے جھکڑ اور زلزلوں سے ہلتی ہوئی زمین نظر آنے لگتی، جیسے بہت سی چمگادڑیں زمین میں دانت گاڑ کر اسے ہلا رہی ہوتیں اور جب وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو جاتے تو اچانک بہت سارے ہیجڑے انہیں ایک ساتھ روتے اور بین کرتے دکھائی دیتے اور انہیں ایسا لگتا جیسے چمگادڑیں ان کے بدن پر چپکی ہوئی ان کا خون چوس رہی ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا مراقبہ ہوتا جو ان کو سکون بخشتا۔ ہر بار ہی ان کی روح زخمی ہوتی، ہر بار ہی انہیں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔
آخر کار ایک رات تھک ہار کر مراقبے کا خیال چھوڑنے کا ارادہ کر لیا اور ایک آخری مراقبے کی نیت سے جائے نماز پر بیٹھے۔ پہلے قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر آنکھیں بند کر کے پوری یکسوئی سے اپنے رب الجلیل کو یاد کرنے لگے۔ اچانک آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے اور وہ روتے روتے سسکیاں بھرنے لگے اور پھر خود کے جسمانی کرب کے بجائے ساری دنیا کے روحانی کرب کو یاد کرنے لگے۔ اچانک انہیں لگا کہ جیسے ان کے جسم اور روح کا رشتہ کچھ لمحوں کے لیے ٹوٹ سا گیا ہو اور پھر ان کی روح جیسے کائنات کے چاروں اور پھیلے ہوئے آسمانی رنگوں میں تحلیل ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں ان کی نظروں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا جیسے بہت سارے ستارے اور سیارے ان کے گرد ناچ رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے، آپس میں ملتے اور دور ہو جاتے۔ نئے ستاروں کی تقسیم ہوتی چلی جاتی اور کہکشاں نت نئے خوشنما رنگوں سے سجتی چلی جاتی۔ پھر سیارے تقسیم ہونے لگتے اور ان کے نیوکلس آپس میں جڑتے چلے جاتے اور پھر نئی ترتیب بنتی اور پھر روشنی کے جھماکے ہوتے اور نئی نئی ساخت کے سیارے بنتے چلے جاتے۔ اچانک علی بخش کو لگا جیسے کوئی آوارہ عنصر Element اپنی تبدیلیوں میں حصہ نہ لے سکا اور بنا آواز کے اپنے ارتقائی عمل سے خارج Delete ہو گیا۔ علی بخش کو یوں لگا جیسے وہ سیارہ روشن ہوتے ہوتے اچانک تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر اس تاریک سیارے

سے سیاہی روشن کرنوں کی طرح پھوٹنے لگی اور اس شدت سے چاروں طرف پھیلی کہ لمحے بھر کے لیے علی بخش کو سوائے تاریکی کے کچھ نہ نظر آیا اور پھر...... کچھ چمگادڑوں کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں گونجنے لگی۔ پسینے سے شرابور علی بخش نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ دور چھت کے اک کونے میں ایک چمگادڑ الٹی لٹکی ہوئی اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر چیکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

علی بخش نے اپنی بے چین دھڑکنوں پر قابو پایا اور آہستہ سے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر دوبارہ جائے نماز پر بیٹھ گئے اور پھر سجدے میں گر گئے اور روتے ہوئے بڑبڑانے لگے...... تو کیا...... تو کیا رب الکریم یہ زمین بھی؟ کائنات میں میوٹیشن کا نتیجہ ہی ہے؟

......☆☆......

درد کی پیمائش

قمر سبزواری

آصف نے اپنے دونوں قریبی دوستوں بابر اور عبدالصمد کو ہمراہ اہل وعیال اپنے گھر افطار کی دعوت دی ہوئی تھی۔ مہمانوں اور بچوں کو ملا کر شہر کے مضافات میں بنے اس دو بیڈ روم کے فلیٹ میں اس وقت آٹھ افراد تھے۔ تینوں مرد تو آپس میں کافی عرصے سے دوست تھے لیکن ان کی بیویوں کی یہ تیسری یا شاید چوتھی ملاقات تھی۔۔۔ نہ پہلی ملاقات والی اجنبیت اور نہ بہت زیادہ بے تکلفی۔ آصف کی بیوی یاسمین) جس نے فیروزی گوٹے اور دھانی رنگ کے دبکے کے نفیس کام والا شفون کا سفید فراق پہنا ہوا تھا(اُن کی بڑی بیٹی اور بابر کی بیوی کوثر دستر خوان پر افطار کا سامان پروس رہی تھیں جبکہ عبدالصمد کی اہلیہ زیب النساء جو برقعہ اوڑھے تھی سامنے والے کمرے میں بیڈ کے کونے پر بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ روزہ کھلنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی سو ٹی وی پروگرام دیکھنا اور اس پر رائے زنی کرنا وقت گزارنے کا اچھا نسخہ ثابت ہو رہا تھا۔ آصف گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ کر ٹیبل پر کھانے کا سامان ترتیب دے رہا تھا بابر ریموٹ کو ہاتھ میں تھامے ٹانگیں پسار کر اور ایک بازو عبدالصمد کی کمر کے پیچھے سے صوفے پر پھیلائے کبھی کھانے کی ٹیبل اور کبھی حیرت سے آصف کو دیکھ رہا تھا۔ عبدالصمد دونوں دوستوں کے درمیان قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرنے یا سر پر رکھی سفید ٹوپی کو بے دھیانی میں دھیرے دھیرے گھمانے میں مصروف تھا۔ ٹی وی پر آج کے ٹاک شو کا موضوع تھا،......"عورت کی سرزنش۔ اسلامی تناظر"

آصف نے ہنستے ہوئے اپنی بات دہرائی، لیکن یار کرنا پڑ جاتا ہے، تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ بھی زندگی کا حصہ ہے بندہ منافقت کیوں کرے غصہ آتا ہے تو ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔

نہ اس وقت شرافت یاد رہتی ہے نہ مذہب۔ یہ سب ہوش وحواس کی باتیں ہیں اور غصے میں عقل کہاں۔

عبدالصمد نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر طنزیہ سے انداز میں مسکرا کر کہا، ایک حد ہے ناں بھائی اب جانوروں کی طرح کا سلوک تو نہیں کرنا چاہیئے ناں، اگر ضرورت پڑے تو شریعت میں سرزنش اور ایسی ہلکی پھلکی مار کی اجازت ہے جس کی وجہ سے ہڈی نہ ٹوٹے اور گوشت نہ پھٹے۔

ہڈی تو آگ لگا کر جلا دینے سے بھی نہیں ٹوٹتی صمد بھائی اور نہ گوشت پھٹتا ہے۔ گوشت کا ڈونگا ٹیبل پر جماتے ہوئے یاسمین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

عبدالصمد نے دوبارہ زیر لب استغفار دہرائی۔ جبکہ آصف اور بابر ہنس پڑے۔

بابر جو ابھی تک دونوں کی بات اطمینان سے سن رہا تھا بڑے تحمل سے پختہ لہجے میں بولا، ''میں اپنی تعریف خود کرنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن بھائیو میں تو مار پیٹ پر یقین نہیں رکھتا، اور نہ کبھی بیوی کو ہاتھ لگایا ہے، یہ پاس ہے بلا کے پوچھ لو، حرام ہے جو آج تک مارا ہو، عورت کو عزت دو، پیار دو، اس سے بات کرو عورت پر ہاتھ اٹھانا تو نامرد اور جاہل

لوگوں کا کام ہے۔" اس کی بیوی کوثر جو کچن میں پانی کا جگ لینے گئی تھی کچن سے باہر آتے آتے جیسے کچھ اچانک یاد آنے پر واپس مڑ گئی۔

آصف بابر کی یہ بات سُن کر مسکرانے لگا جبکہ عبدالصمد نے ٹی وی کی سکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر غیر ارادی طور پر عدم تائید میں سر ہلانا شروع کر دیا جیسے کہہ رہا ہو بالکل نہ مارنا بھی غیر اسلامی ہے۔

افطاری لگا کر یاسمین اور کوثر بھی بقیہ دس پندرہ منٹ گزارنے کے لئے زیب النساء کے پاس کمرے میں چلی آئیں۔ یاسمین، زیب النساء کے چہرے کا اترا ہوا رنگ دیکھ کر اُسے چمکارتے ہوئے بولی۔ "فیڈ بھی کرتی ہو بچے کو اور اوپر سے روزہ بھی رکھتی ہو تمہاری صحت پہلے ہی کچھ خراب ہے میں تو کہتی ہوں روزہ نہ رکھا کرو، جب صحت نے اجازت دی تو رکھ لینا۔"

"توبہ توبہ، تمہارے بھائی صاحب جان نہ نکال دیں، روزہ شریعت کا صریح حکم ہے، قرآن میں ہے کہ روزہ دین کا ستون ہے بھئی۔۔۔ روزہ کیسے چھوڑ سکتا ہے بندہ۔"

زیب النساء نے ایسے دفاعی انداز میں جواب دیا جیسے یاسمین کے ساتھ خود کو بھی ڈرا رہی ہو۔

ارے کیا بہن، بیماری ضعیفی میں نہیں رکھ سکتا ناں بندہ تو کیا کرے اور پھر خدا تو بڑا غفور الرحیم ہے، خود فرماتا ہے کہ کسی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے تو مسکین کو کھانا کھلا دو، اگر ہم خدا سے بھی آگے۔۔۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

اے ہے، شریعت کے معاملوں میں کیوں بولتی ہو تمہارے بھائی کہتے ہیں شریعت کے معاملے میں عورت کو نہیں بولنا چاہیئے۔

زیب النساء اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

"کیوں جی یاسمین نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

وہ اس لئے کہ عورت ناقص العقل ہے اور شریعت کے احکام میں ایک رتی برابر بھی اگر بھولے سے بھی غلطی ہو گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ملے گی۔" زیب النساء نے ایک عالمہ کی طرح جیسے شریعت کے ایک گہرے راز سے پردہ اٹھایا۔

ہائے توبہ توبہ۔ اچھا چھوڑو رہنے دو، تم جانو اور تمہارا روزہ، لیکن یہ جو بھائی کی پچاس انچ کی توند ہے یہ شریعت کی زد میں نہیں آتی کیا، خود تو روزہ کی حالت میں ریشمی کرتہ پہن کر ٹی وی کے رنگ برنگے اشتہار دیکھ رہے ہیں اور بچوں کے لئے اور تمہارے لیے ٹی وی منع ہے۔۔۔ ٹھہرو میں ابھی بھائی کی خبر لیتی ہوں یاسمین نے ہنستے ہوئے بیڈ سے اٹھنے کی اداکاری کی۔" لیکن زیب النساء کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یاسمین کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولی

"گھر جاتے ہی تیس منٹ ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑا ہونا پڑا ناں مجھے تو میں دوبارہ نہیں آؤں گی یہاں۔"

ارے کیوں، یاسمین حیرت سے بولی۔

بابر کی بیوی کی ہنسی نکل گئی کیا یار یہ۔ کیا سزا ہوئی اسکول کے بچوں کی طرح۔"

زیب النساء نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا یہ لو اور سنو، ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑا ہونا یا کرسی کی طرح ہوا میں بیٹھنا یا دھوپ میں بیٹھ کر گھر کا کام کرنا یہی تو شرعی سزائیں ہیں یا پھر۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

یا پھر۔۔

یاسمین نے چٹکی لے کر اسے چھیڑا۔۔۔ لیکن زیب النساء نے اپنی پشت پر اکٹھے ہو جانے والے اپنے برقعے کے دامن کو دوبارہ درست کرتے ہوئے چہرے پر امڈنے والے کرب اور خجالت کے ملے جلے آثار کو انتہائی کامیابی سے چھپاتے ہوئے بات کو دوسرا رخ دے دیا۔۔

"مجھے خود تو نہیں پتہ پر تمھارے بھائی بتاتے ہیں کہ دوسرا طریقہ پھر پیٹھ اور کولہوں پر چھڑ یا کوئی چپٹی شے جیسے جوتا وغیرہ کا مارنا ہے۔ اس طرح زخم نہیں آتا ناں خاص طور پر چپٹی شے سے اور جسم کے اس مقام کی ہڈی بھی تو مضبوط ہوتی ہے ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔۔۔ ورنہ تو مار پیٹ سے زخم آ سکتا ہے یا خدانخواستہ ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے جو کہ سراسر غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ تو یہ......!"

کوثر نے اس معصوم سی شکل والی کی بات سن کر اس کے کولہوں کی طرف دیکھا۔ تصور میں زیب النساء کو الٹا لیٹ کر مار کھاتے دیکھ کر کوثر کو بے اختیار ہنسی آ گئی جسے اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

"نہیں یار، میں ایک بات بتاؤں تمھیں، یہ مار وار کچھ نہیں ہوتی۔" کوثر ایک لمبی سانس کھینچ کر بولی۔

"کیا مطلب۔" زیب النساء حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

یاسمین بھی متوجہ ہو گی۔

اُسی لمحے کوثر کے سائلنٹ موبائل پر نئے میسج کی روشنی نمودار ہوئی اُس نے بات روک کر میسج پر نظریں دوڑائیں

"بیٹا کوئی بات نہیں اگر بابر بیٹا عید پر بھیجنے کے لئے خوش نہیں ہے تو تم ضد نہ کرنا ورنہ پچھلے سال کی طرح، پتہ ہے ناں، بات بہت دور تک چلی جاتی ہے"

کوثر نے ماں کا میسج پڑھ کر ڈیلیٹ کیا اور موبائل پرس میں پھینک دیا۔

تم کچھ کہہ رہی تھیں، زیب النساء کی حیرت بدستور قائم تھی۔

آں ں ں۔۔۔ نہیں کچھ نہیں، کوثر نے بیڈ کے کنارے پر ٹکے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن ہاتھ سے کریدتے ہوئے کہا

اُس کے پاؤں کا ناخن برسوں سے دکھ رہا تھا پتہ نہیں کیوں ناخن کی ہڈی پہلے سیدھی بڑھتی اور پھر گوشت میں دھنسنے لگتی ٹیڑھے ناخن کے نیچے گوشت اکٹھا ہونے لگتا اور پھر کچھ ہی دنوں میں انگوٹھا ایک دکھتے پھوڑے کی طرح ہو جاتا باہر سے یہ بالکل ٹھیک تھا لیکن جیسے ہی پاؤں کسی شے سے مس ہوتا درد کی ٹیس پورے جسم کو تڑپا دیتی۔ زیب النساء کوثر سے توجہ ہٹا کر یاسمین سے باتوں میں مصروف ہو گئی

کوثر اپنا انگوٹھا چھوڑ کر زیب النساء کے بچے سے کھیلنے لگی۔

وہ کوشش کے باوجود گزشتہ چند دنوں میں پیش آنے والے واقعات کے مناظر اور آوازوں سے پیچھا نہ چھڑا پا رہی تھی۔

"تیرے جیسی عورت کو ناں شادی سے پہلے کچھ عرصہ کسی کوٹھے پر بیٹھنا چاہیئے کچھ نقصان بھی ہوگا ظاہر ہے لیکن کم از کم سلیقہ تو آئے گا ناں، کھانا پکانا تو آ ہی جائے گا۔۔۔ کچھ دن پہلے کھانے میں کچھ دیر ہو جانے کی وجہ سے بابر سے سنی گئی باتیں اس کے تصور میں گونجنے لگیں، ویسے مائنڈ نہ کرنا لیکن اس کی ضرورت تو تمھارے گھر کی سب خواتین کو ہے سب ہی بس سبحان اللہ ہیں۔

وہ کیا کہتے ہیں "چھوٹی بی تو چھوٹی بی بڑی بی سبحان اللہ"۔

خیالوں میں گونجنے والی بابر کی آواز باہر ٹی وی لاؤنج سے اٹھنے والے اس کے قہقہے میں گم ہو گئی۔

یاسمین کو لگا جیسے کوثر بیڈ کے کنارے سے بیٹھے بیٹھے نیچے گر جائے گی اُس نے بے دھیانی میں کوثر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن اسی لمحے کوثر نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ پیچھے کھسکا لیا۔

کوثر کی نظر زیب النساء کی گود میں پڑے بچے کی شرٹ پر بنے دائروں میں الجھ گئی اُس کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر چند دن پہلے کا منظر گھومنے لگا جب وہ بابر کی شرٹ استری کر رہی تھی۔۔

شرٹ کا کالر بھی کم بخت عید سے کچھ دن پہلے ہی جلنا تھا جب وہ ہر ممکن کوشش کر رہی ہوتی ہے کہ کچھ ایسا نہ ہو کہ بابر کو

موقع ملے لیکن مواقع تو جیسے آسمان سے گرتے ہیں جیسے اللہ میاں بابر کا ساتھ دینے کے انتظار میں ہوتے ہیں۔۔ بابر نے شرٹ کا کالر دیکھتے ہی کہا تھا۔

کسی رنڈی کی بیٹی یہ کیا کیا تو نے ،میری فیورٹ شرٹ جلادی، جا جا کر کسی کوٹھے پر بیٹھ جا بلکہ دور کیا جانا ماں کے گھر چلی جا بات تو ایک ہی ہے ناں'

اُس نے اس گالی پر آنسو بہانے کی بجائے ،خود کو مضبوط بنا کر بھر پور احتجاج کا فیصلہ کیا تھا اور کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔۔۔

لیکن جب بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیسری شب وہ بیڈ سے اٹھی اور چھپ کر کچن میں جا کر اُس نے روٹی کا پہلا نوالہ توڑا تھا تو اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو گرنے لگے تھے۔ اُسے بابر کی دی ہوئی گالی سچی لگنے لگی تھی وہ کس قدر مجبور تھی، جس شخص سے وہ اس پوری دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی وہ اُسی کی عزت کرنے اُسی کی تعریف کرنے اور اُسی کا دیا لقمہ کھانے پر مجبور تھی۔''

''کیا ہوا'' یاسمین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا کہاں کھو گئیں۔

''نہیں کچھ بھی تو نہیں'

اللہ اکبر۔۔۔اللہ اکبر

فضاء میں آذان کی آواز گونجنے لگی اور وہ تینوں کمرے سے باہر آ گئیں۔

☆☆

تماشائے اہل کرم

سارا ادریس

صابر نے نقاہت زدہ ہاتھ سے انیسویں بار چہرے پہ بھنبھناتی مکھیاں اڑانے کی کوشش کی اور بیسیویں بار کروٹ بدل کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔ جھونپڑی کے ساتھ والے میدان سے کرکٹ کھیلنے والوں کی آوازیں آنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ شام ڈھلنے میں ابھی وقت تھا۔ اس نے اندازہ لگایا۔ اماں جانے کب آئے گی؟ اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر جھونپڑی میں آنے والی دھوپ سے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔ آنکھیں پھر سے بند ہونے لگیں۔

پچھلے دو ہفتوں سے اسے بخار آ رہا تھا اور وہ کئی دن سے اسی طرح ٹوٹے بان کی چارپائی پہ لیٹا تھا۔ اماں شام سے پہلے آ جایا کرتی تھی۔ آج نہ اماں کا کوئی نشان تھا نہ شام کا۔ بھوک سے اٹھنے والے مروڑ سارے بدن کی تکلیف پہ غالب آنے لگے تھے۔ اماں جانے کہاں رہ گئی؟ اس نے پھر سوچا۔ غنودگی حاوی ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بار پھر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

کہیں دور سے آدمیوں کی بلند آواز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ صابر نے آنکھیں کھولیں۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں مٹی کے چولہے کی طرف رخ کیے اسے اماں کی پشت نظر آئی۔ وہ اسے متوجہ کرنے کے لئے بلند آواز میں کھانسا۔ اماں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ایک رکابی میں سالن ڈالنے لگی۔ ساتھ پڑے لفافے سے ایک روٹی نکال کر وہ اس کی طرف آ گئی۔

"چل اٹھ! یہ روٹی کھا لے۔" اس نے قریب آ کر کہا۔

"اماں چاول نہیں لائی؟" اماں کے ہاتھ میں دبی اکڑی ہوئی روٹی دیکھ کر اس کے گلے میں پھر سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"بیگم صاب کہہ رہی تھی جب پلیں گے دیے دے گی۔ اب کیا تیرے واسطے وہ چاول پکائے گی؟" اماں نے اسے وہی جواب دیا جو پچھلے پانچ دن سے دے رہی تھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر چارپائی پہ بٹھانے کے بعد سالن والی رکابی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بوجھ سے ڈھیلی چارپائی کے بیچوں بیچ ایک گہرا گڑھا بن گیا۔ اگر صابر کا باپ اسے ایک بار مزید کسنے کی کوشش کرتا تو وہ ضرور ٹوٹ جاتی اسلئے اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ رکابی میں پڑا شوربہ اور اس میں تیرتے آلو اس ڈھلوان میں بڑی مشکل سے خود کو رکابی کے کنارے تک سنبھالے ہوئے تھے۔ اس نے اماں کے ہاتھ سے روٹی لے لی۔ روٹی گلے میں پھنستی محسوس ہو رہی تھی مگر خالی پیٹ کی پکار اس درد سے زیادہ تھی۔ تیسرے نوالے پہ اس نے آلو کو مسل کر روٹی میں لپیٹنے کی کوشش کی۔ ہاتھ کے دباؤ سے رکابی ایک طرف مزید جھکی اور سالن چارپائی سے ہوتا ہوا کچی زمین پہ پھیل گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کی جانب دیکھا۔ وہ ملامت بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر سے سر جھکا لیا۔ سامنے چارپائی پہ آلوؤں کے دو ٹکڑے پڑے تھے۔ اس نے انہیں ہاتھ میں اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ رکابی اور روٹی ایک طرف رکھی اور پھر سے لیٹ گیا۔

پتا نہیں آج کرکٹ کھیلنے والے لڑکوں کی آوازیں کیوں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کا ذہن پھر سے باہر کی طرف بھٹکا۔ سر گھما کر اس نے دروازے کی جگہ لٹکے ہوئے میلے کپڑے کی اوٹ سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ سامنے سے اسی کا ہم عمر فرید چلا آ رہا تھا۔ اس نے وہی سیاہ ویسکوٹ پہن رکھی تھی جو وہ بڑے خاص موقعوں پہ پہنا کرتا تھا۔ وہ پردہ ہٹا کر جھونپڑی کے اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ صاف ستھرا تھا۔ کہیں بھی گرد و غبار کا نشان نہیں تھا جو ہفتوں منہ نہ دھونے پہ اس کے چہرے پہ جمی رہتی تھی۔

"او فریدے! آج کدھر کی تیاری ہے؟" اماں نے ہاتھ نچا کر اس کے سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر کی ہی!" وہ آنکھ مٹکا کر مسکرایا۔

"گرونڈ میں کچھ ہو رہا ہے؟" اماں نے پوچھا اور فرید پیٹ پہ دونوں ہاتھ رکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اماں ناسمجھی کے عالم میں اس کی صورت تکتی رہی۔

"اے ایسا کیا کہہ دیا میں نے جو یوں ہنس ہنس پاگل ہو رہا ہے؟" اماں نے تیوری چڑھائی۔

"تو بھی گرونڈ ہی کہتی کہتی مر جائے گی تائی! ہزار بار بتایا ہے گرونڈ نہیں گراؤنڈ! انگریزی کا لفظ ہے انگریزی کا۔ سیکھ لے کچھ تو بھی۔ تیرا ہی بھلا ہے۔" اس نے اپنی علمیت جھاڑی۔

"او جا کام کر! آیا بڑا انگریزی سکھانے۔ اس موئی انگریزی میں نہ تیرا بھلا ہے نہ میرا۔ ہم جیسوں کے بھلے نہیں ہوا کرتے اس سے۔ سارا بھلا بس ان کوٹھیوں والوں کا ہوتا ہے جن سے تو سیکھ سیکھ آتا ہے۔ چل ہٹ! کام کرنے دے۔" اماں نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"نہیں تو نہ سہی۔ جا رہا ہوں میں۔ صابر تو چلے گا؟ خدا قسم! ایسے ایسے کھانے ہوتے ہیں تو نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہونگے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح آج بھی صابر کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر باہر نکل گیا۔ ساتھ والے میدان سے آج کرکٹ کھیلنے کی آوازیں کیوں نہیں آ رہی تھیں صابر سمجھ گیا تھا۔ اس گتھی کو سلجھا لینے پہ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا۔ آج وہاں کوئی تقریب ہونے والی تھی۔ اس خالی میدان میں اکثر ہی ایسی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ فرید ان تقریبات کا لازمی مہمان تھا۔ اپنی واحد ویسکوٹ کو وہ سنڈے بیسٹ کی طرح پہنتا اور کسی نہ کسی طرح عین کھانے کے وقت تقریب میں گھس جاتا۔ وہ اس فن میں طاق تھا اور ایک دو بار کے علاوہ کبھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ صابر کو بھی ساتھ چلنے کو کہتا تھا مگر صابر ڈرپوک تھا، وہ کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

رات چھا گئی تھی۔ صابر کے پیٹ میں پھر سے چوہے ناچنے لگے۔ اس نے کروٹ لے کر چارپائی کا وہ کونہ دیکھا جہاں اس نے روٹی رکھی تھی۔ روٹی اب وہاں نہیں تھی۔ اماں نے اٹھا لی ہوگی۔ اس نے سوچا۔ اگر وہ ذرا احتیاط سے کام

لیتا تو یوں سالن نہ گرتا۔ پچھتاوا ابھرا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ ان دیکھے کھانے ناچنے لگے جن کا ذکر فرید کر رہا تھا۔ بھوک ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ آخر وہ ساری ہمت جمع کر کے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک کونے میں پڑے جستی ٹرنک کا ڈھکن کھول کر اس میں سے اپنا سفید کرتا ڈھونڈنے لگا جو دو سال پہلے اماں کہیں سے لے کر آئی تھی۔ وہ صرف جیب کے قریب تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا اور سامنے دامن پہ دو جگہ دھبے لگے تھے باقی وہ ہر لحاظ سے ٹھیک تھا اور اس کے پاس موجود تمام کپڑوں میں بہترین تھا۔ اس نے کرتا نکال کر پہن لیا۔

"وے! کیا کر رہا ہے تو؟ کرتا کیوں پہنا؟ تو بھی جا رہا ہے اس موئے فرید کے ساتھ؟" پیچھے سے آتی اماں کی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔"

"تجھ سے کہا کاغذ چن لا، تجھ سے اٹھانہ گیا۔ کہا ابے کے ساتھ لکڑی کاٹ لا، تیرا بخار نہ ٹوٹا اور اب اٹھ کر چل پڑا ہے روٹی کھانے! نکھٹو باپ کا نکما پتر۔ میرے تو نصیب جلے ہیں چین کہاں سے پڑے۔" اماں کو واویلا کرتے چھوڑ کر وہ میدان کی طرف نکل گیا۔ معلوم نہیں کھانے کا وقت تھا کہ نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ بھوک سے نکلتی جان بھوک مٹنے کے تصور سے واپس پلٹ آئی تھی۔ وہ شامیانے کے پاس جا پہنچا۔ فرید کا کہیں نشان نہیں تھا۔ داخلی دروازے پہ بڑی بڑی مونچھوں والا گن مین کھڑا تھا۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ موقعے کی تلاش میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ کھڑے کھڑے تھک کر وہ وہیں اندھیرے میں بیٹھ گیا تھا جب اس نے گن مین کو اپنی جگہ چھوڑ کر ایک طرف جاتے دیکھا۔ موقع اچھا تھا اور شاید اس کے بعد نہ آتا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لوگوں کی اوٹ میں ہوتا اندر جا پہنچا۔ قدرت کو شاید اس پہ ترس آ گیا تھا۔ اس کے داخل ہوتے ہی لوگ کھانے کے لئے میزوں کی طرف بڑھنے لگے۔ ہر طرف خوشبوئیں پھیلی تھیں۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک میز پہ پہنچ کر اس نے کھانوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ فرید صحیح کہتا تھا۔ عجیب رنگا رنگ کھانے تھے۔ اسے ان سے سروکار نہیں تھا اسے صرف چاول چاہئے تھے اور چاول اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر پڑے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک پلیٹ میں چاول نکال لئے۔

"کون ہو تم؟" وہ ہاتھ سے پہلا نوالہ منہ تک لے جا رہا تھا جب ایک بھاری ہاتھ نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ اس نے خوف سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں سر پہ اکا دکا بالوں والا ایک آدمی اسے شرربار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پلیٹ میز پہ واپس رکھنے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک زوردار طمانچہ تڑاخ سے اس کے منہ پہ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور سارے چاول اس کے چہرے سے پیروں تک ہر طرف بکھر گئے۔ وہ زمین پہ گرا تھا یا شاید پاتال میں۔ سارے چہرے بلند ہو گئے تھے اور وہ مزید نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔ یکدم ہر شے گھومنے لگی۔ وہ محور تھا، ہر شے محیط!

"حرام خور! کتے! کہاں سے آیا مرا ہے؟ سارے شہر کو باپ کی جاگیر سمجھا ہے؟ جہاں شامیانہ نظر آیا پہنچ گئے! نکالو اسے باہر! تمہیں کس لئے بٹھایا ہے دروازے پر؟ کمینے! لالچی! بھوک ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی۔ سب کی جان کا وبال بنے بیٹھے ہیں ایسے مردود!"

کوئی اس کا بازو پکڑ کر اٹھانے لگا۔ اس کے قدم اپنا بوجھ برداشت نہیں کر پائے۔ حسرت ٹپکاتی آنکھیں پھر سے زمین پہ بکھرے چاولوں پہ جا ٹکی تھیں۔ اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا کوئی شامیانے سے باہر لے آیا تھا اور ایک طرف ڈال کر واپس مڑ گیا تھا۔

"تائی! صابر کہاں ہے؟" فرید نے تائی کو جھونپڑی کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر آواز دی۔

"جہاں بھی ہے تو اس کے پاس بھی پھٹک کر دکھا! تیرا گلا نہ دبایا تو بولنا!" تائی نے آنکھیں نکالیں اور آگے بڑھ گئی۔

وہ بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔
"لے تائی اب کیا کیا میں نے؟" اس نے پوچھا۔
"وہ تو میں تجھے نہیں تیرے ابے کو بتاؤں گی۔" تائی نے کہا اور یونہی چلتی رہی۔
"لے! نہ کوئی بات نہ کچھ صبح ہی صبح ابے کو بتائے گی۔ اب اس طرف کہاں جا رہی ہے؟ گروند کہ گراؤنڈ؟" اس نے بھر دانت نکوسے اور اسی طرح پیچھے چلتا رہا۔

تائی چپ رہی۔ میدان میں پہنچ کے اس نے متلاشی نظریں یہاں سے وہاں دوڑائیں۔ پھر مطلوبہ شے کو پا کر ایک طرف بڑھ گئی۔ وہاں دو آوارہ کتے کھڑے زمین سے کچھ کھا رہے تھے۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکا۔ کتے ایک چیخ بلند کرنے کے بعد ادھر ادھر بھاگ گئے۔ سامنے سالن سے لتھڑے چاولوں کی وہ ڈھیری نمودار ہوگئی جو بچے ہوئے کھانے کی پلیٹیں صاف کر کے لگائی گئی تھی۔ ہر تقریب کے بعد یہ ڈھیری بھی اس میدان کا عام نظارہ تھی۔ وہ آگے بڑھ کر پیروں کے بل زمین پہ بیٹھ گئی۔ اپنی اوڑھنی کا پلو سامنے پھیلایا اور زمین سے چاولوں کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنے پلو پہ ڈالنے لگی۔
اس کو صابر کے حصے کے چاول مل گئے تھے۔

☆☆

بلوچی کہانی
یخ میں تپ
مُنیر احمد بادینی
ترجمہ: کے بی فراق

عزیز بالکل تیار تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ان کو سینٹ جوزف گرلز اسکول سے اپنی صدف کو لینا تھا۔ آج صدف کی آٹھویں جماعت کا نتیجہ نکلنا تھا۔ عزیز نے سوچا صدف پاس ہوگی۔ اس نے اپنے جوتے کے تسمے بھی باندھ دیئے۔ دروازہ مقفل رکھا اور نوکر کے لیئے صرف باورچی خانہ کھلا رکھا کہ صدف کو اسکول کے گیٹ سے لینے کے بعد ڈیڑھ سو میل کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ گاڑی اپنی ذاتی تھی اسی لیئے شام تک پہنچنے کی امید تھی تا کہ نتیجہ کے دوسرے دن کے لئے اپنے علاقہ کو جانا ہو۔ لیکن عزیز کو پتا تھا کہ صدف اپنے پاس ہونے کی خوشی میں کہاں صبر کرتی کہ ماں اور دادی سے قریب ہونا اس کے لئے ناگزیر تھا اسی لیئے وہ آج کل جانے کا پروگرام بناتی جبکہ کل ویسے بھی جمعہ کی چھٹی تھی لیکن خیر۔۔۔

عزیز کو ڈیڑھ سو میل کے سفر کے خیال نے تھوڑا سا خوش رکھا جس طرح گزرے ہوئے دنوں کی پژمردگی اس کے دل و دماغ سے گھٹ رہی ہے اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ اس کے دل میں دھیرے دھیرے بڑی خاموشی سے ایسے پیدا ہو رہا ہے جیسے ساتھ دھند ہی بادِ صرصر اچانک چلنے لگے، اس نے اپنی گھڑی دیکھی کہ ابھی تک ساڑھے نو بجے تھے۔ گھڑی کی سوئی دھیرے دھیرے ہل رہی تھی۔ جبکہ اس نے چاہا کہ یہ تیزی سے حرکت کرے تا کہ وہ اس گھٹن سے دور نکل جائے۔ یہ وہی دن تھے کہ عزیز کو خود پتا نہیں تھا کہ اسے کون سی بیماری لگ گئی ہے۔ اس کا معدہ بالکل ٹھیک تھا۔ رات نیند مکمل ہوگئی تھی، دل اچھی طرح دھڑک رہا تھا، دماغ بھی اچھی طرح کام کر رہا تھا، فکری پریشانیاں بھی اتنی زیادہ نہ تھیں لیکن اسے اپنی ان بہت سی خوبیوں کے باوجود خیال آ رہا تھا کہ دُنیا کے مظاہر کے لئے کسی بھی طرح کی بندش تو نہیں۔
ہر شئے بالکل آزاد ہے، ہر شئے از خود بے ترتیب ہے جس طرح کیمرہ کی ریل کے پردے پر لوگوں کی تصویریں پہلے سے اُلٹی بنتیں تا کہ واش نہ کرنا پڑے یا جیسے بڑی سخت سردی میں گاڑی کے شیشوں کے پیچھے، باہر کی ہر چیز تاریک

دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح اب عزیز کو خیال آرہا تھا کہ اس کے اردگرد ہر شئے تاریک تر، گرد بھری اور بے معنی ہوئی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسکے تندرست بدن پر ہزاروں من بار پڑا ہے۔ وہ اسی بار کی وجہ سے بیمار ہے اور اس کا ظاہر میں تندرست دکھائی دینے والا جسم اصل میں بالکل بیمار ہے۔ کبھی کبھی عزیز سوچتا کہ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے اس کا دم نہ نکل جائے اور یہی سبب تھا کہ وہ کسی بھی جگہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اور کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس اسی حالت میں خوش تھا۔ کچھ دن پہلے ڈاکٹر کے یہاں گیا، ڈاکٹر اس کا دوست تھا، اس کو تسلی دی کہ یہ کچھ بھی نہیں صرف وہم ہے۔ یہ اپنے آپ ہی ٹھیک ہوگا۔ ڈاکٹر نے اس کی تسلی کے لیے اسے کچھ خواب آور دوائیاں کھانے کو کہا لیکن عزیز کو ایسے معلوم ہوا کہ اس کی بیماری ڈاکٹر کی دوائیوں سے بڑی بیماری ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ دنیا کے تمام ڈاکٹر اور حکیم نہیں جانتے کہ اس کی بیماری کیا ہے؟ اور وہ جانتے بھی کیسے؟ کیونکہ اس کی علامتیں جسمانی نہیں بلکہ اس کا تعلق اس کی روح سے تھا۔ اور ڈاکٹر آتما کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں؟ وہ جسم، بدن اور ہڈیوں، رستے ہوئے زخموں کے مواد کو جان سکتے ہیں۔ ان کو روح۔ کے رموں کا کیا پتا؟ پھر وہ یہ بھی سوچتا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ کسی نے گہرا زخم لگا دیا ہو؟ وہ سوچتا کہ میں شاعروں کی طرح اپنی چھوٹی ناکامیوں کو بڑا زخم ظاہر کرنے کو مبالغہ سمجھتا ہوں، اسی لیے میں نہیں مانتا کہ مجھے بھی ایسے زخم لگے ہوں۔ میری زندگی ایک عام سی زندگی ہے۔ بالکل عام سی۔ اس میں محبت کی ناکامی نہیں، زلفوں کی اسیری کا دکھ نہیں۔ میں نے زندگی گزارتے ہوئے شادی کرلی، میرے بچے ہیں، مجھے قوم میں اپنی حیثیت کے مطابق مقام حاصل ہے۔ میں نے کبھی انقلاب کا سپنا نہیں دیکھا۔ کبھی خود کو سیاسی ہیرو نہ بنایا اور نہ ہی ان کا سجدہ کیا۔ میں بھی تنگ دست نہیں رہا ہوں جو کچھ ملتا ہے کھا کر سوجاتا ہوں۔ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق کام کیا۔ ہر وقت کوشش رہتی کہ کوئی میری وجہ سے رنج نہ اٹھائے اور کوئی مجھ سے ناراض نہ ہو اور نہ ہی میں نے کسی کو رنجیدہ کیا۔ مجھے کسی سے دشمنی نہ ہوئی اور نہ ہی کسی کی دشمنی کا شکار ہوا ہوں۔ میں نے زندگی کو اسی طرح بسر کیا اور میری کوشش رہی کہ زندگی کی نعمتوں سے زیادہ توقع نہ رکھوں۔ اسی لیئے میں اپنے خدا، اپنے اردگرد کے لوگوں، اپنے والدین، اپنے بیوی بچوں، اپنے ہم جلیس اور رشتے داروں، سب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے کبھی ناامید نہیں کیا اور میں نے جو چیز بھی مانگی مجھے مل گئی اور اسی لیے میری زندگی ایک کامیاب زندگی رہی، معمولی گناہ، برائی، لالچ، حرص وہوس کے سوا زندگی میں کوئی بڑی غلطی نہ کی۔ جس پر پشیمان ہوں اور میں نے زندگی کی ہر پسندیدہ چیز کا چار قدم آگے بڑھ کر سواگت کرنا مناسب سمجھا پھر اب اس بیماری کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟

کیا میں چالیس سال گزرنے کے بعد اب اس طرح کی بیماری سے دوچار ہوا ہوں کہ کوئی نہیں جانتا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور لوگ بھی عجیب ہیں جو فخر یہ کہتے ہیں کہ وہ زندگی میں کبھی بھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان پر کبھی پژمردگی طاری نہیں ہوئی۔ کبھی پریشانی سے بھینٹ نہ ہوئی اور وہ اتنے منافق ہیں کہ دوسروں کی پریشانیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت ان کی خوشی کا سبب یہی ہے کہ انہیں اپنے جیسا ایک غمگین دوست مل جائے لیکن منافقت دیکھیئے کہ وہ مجھے تسلی دیتے کہ دیکھو! پریشان مت ہونا!.... اور میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ آدمی پتھر تو نہیں ہے؟۔ پریشان تو آدمی ہی ہوتا ہے ہاں، لیکن جیسے میں نے کہا کہ وہ غمگین ہوتے ہیں لیکن نہیں مانتے۔۔ کوئی روٹی کے لیے، کوئی پیٹ کے لیے، کوئی بچے کے لیے، کوئی عورت کے لیے، کوئی دولت کے لیے اور کوئی شہرت کے لیے۔ لیکن میں سوچتا ہوں میری پریشانی کیسی انوکھی ہے کہ اس نے میری ہر چیز کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ یہ دولت کے لیے نہیں ہے۔ شہرت کے لیئے نہیں ہے، روٹی کے لیئے بھی نہیں ہے۔

یہ عجیب طرح کی بیماری اور پریشانی ہے۔ اب میں کس طرح واضح کروں، کیسے دکھاؤں، کیسے کہوں؟ بات یہ نہیں ہے کہ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا لیکن میں اگر کہنا چاہتا ہوں تو لفظ میرا ساتھ نہیں دیتے اور میرے لیے دل میں اپنی بیماری کے بارے میں بتانے کی حسرت رہی مگر شبدوں کے ٹوٹے ہوئے تاروں پر میرے احساسات اکٹھا ہو کر آپ تک

پہنچ نہ سکے، لیکن نہیں۔ میں اپنی بیماری کو از خود جاننا چاہتا ہوں۔ کیا دوسروں کو بتانے سے میرا درد ختم ہو سکتا ہے؟ یا یہ بیماری ختم ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔

جب میں پیدا ہوا تو اسی دن سے یہ بیماری مجھے لگ گئی اور اب یہ بیماری میری موت کے دن تک رہے گی۔ لیکن کوئی اس بیماری کو نہیں مانتا یہ بھی نہیں مانتے کہ وہ کبھی پریشان بھی ہوئے تھے۔ کوئی اگر اتنا بھی نہ مانے پھر وہ اتنی بڑی بیماری کو کیسے مان لے کہ یہ ان کی زندگی کے ساتھ اس کے وجودی رشتے سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب آپ خود کو بے تعلق سمجھیں تو واقعی پریشانی ہوگی؟ لیکن اگر آپ اپنے رشتوں کی بنیادیں تلاش کرنے لگیں تو بھی ضرور پریشان ہوں گے کیونکہ یہ آپ کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں اور ان پر آپ فخر کرتے ہیں۔ یہ بنیادیں کہاں واقع ہیں۔؟ یہ تو کسی بھی جگہ پر استوار نہیں ہیں۔ باہر کی طرف ایک باہم بہتی ہوئی تاریکی ہے اور تاریکی کے پیچھے کیا ہے؟ پھر تاریکی؟ کون جانتا ہے۔ رہنے دیجئے ان باتوں کو۔ جڑوں کو تلاش کرنا، ان کو نام دینا اور خوش ہونا کہ یہ میرا بھائی ہے، وہ میرا باپ ہے، یہ میرا قبیلہ ہے۔ وہ میری قوم ہے۔ یہ میرا ملک ہے۔ یہ سب میری تہذیب اور رسم و رواج کے سرچشمے ہیں۔ یہ میری قوم ہے۔ میں دلیر اور نڈر قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ باقی سب بزدل اور ڈرپوک ہیں۔ مجھے دن کے اُجالے سے کام ہے تو آپ رات کے پروردہ ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اس رشتے کے سامنے ہیچ تو نہیں؟ وہی رشتہ، جس کا نہ سمجھنا میری بیماری کا ایک سبب ہے۔ اس کے سوا مجھے اور کیا بیماری ہے اس کا علاج کون کر سکتا ہے۔ جب میں مر گیا تو کہاں گئے میرے رشتے جن پر میں نے اکثر فخر کیا تھا؟ کیا یہ میرے من کی شانتی کے لیئے نہ تھے؟ مجھے تو پہلے ہی سے ہر چیز کیمرہ کی ریل پر اُلٹی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کو میرے لیے کون سیدھا کرے گا؟ کیا میں چالیس کے پیٹے سے گزر گیا ہوں کہ اب یہ چیزیں میرے دماغ میں آ رہی ہیں۔ پہلے میں اتنی گھٹن زدہ بیماری کیوں نہ دیکھ سکا۔ جواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اے خدا یہ کتنی ہولناک ہے، کرب انگیز ہے کہ میں اس کے گمان سے لرزتا ہوں اور لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ پریشانی کو اپنے لیے بُری علامت سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بچوں کی طرح تسلی دیتے ہیں کہ دیکھو بیٹے مت روؤ، کچھ نہیں ہوگا۔ تم صحت مند آدمی ہو، تم نوجوان ہو، تمہیں زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے، پھر تم اتنی سی چیز سے پریشان ہوتے ہو۔

اسی لیے میں ایسے لوگوں کو کیسے کہہ دوں کہ میری بیماری کیا ہے۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں خاموشی سے اپنی بیماری کو سہہ لوں۔ لیکن مجھ سے سہا نہیں جاتا اور اس کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب میں لوگوں کو اپنے بڑوں پر فخر کرتا ہوا دیکھتا ہوں کہ میں بہادر اور نڈر قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور باقی سب ڈرپوک ہیں۔ میری بیماری شدت اختیار کر جاتی ہے اور میرا دم گھٹنے لگتا ہے جیسے کسی گہری کھائی میں جا رہا ہوں۔

"یا خدا۔"

عزیز، دسمبر کی سردیوں میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس باہر دیکھ رہا تھا کہ چمنی سے دھویں میں تمبا کو کا گمان ہوا اور اوس کی چادر تن گئی، جس طرح اس کے فکر و خیال بھی رُک جائیں۔

دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اسکول کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی پندرہ سالہ بیٹی صدف گیٹ پر اس کے لیے کھڑی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نتیجہ جلدی نکل گیا۔ ادھر کچھ گاڑیاں اور کچھ بچے دکھائی دیئے لیکن صدف کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ فیل ہوگئی۔ عزیز نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ صدف کے لیے دروازہ کو باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا ہوا؟"

صدف کا چہرہ اُترا ہوا تھا وہ کچھ نہ کہہ سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرتے رہے۔ اس کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہو گیا جیسے اسے سخت بخار ہو گیا ہو۔ عزیز نے گاڑی کا رُخ موڑ دیا۔

"فکر نہ کرو، دوسرے سال پھر کوشش کرنا۔" اس نے صدف سے کہا۔

صدف اس طرح رو رہی تھی کہ اس کے جسم کی ساری توانائی ختم ہو رہی تھی۔ اس طرح جیسے گرم دن ہو اور جسم کا پسینہ تیزی سے نکل رہا ہو یا جیسے زمستان کے شفاف دن میں چلتن کی برف بہہ جائے۔ عزیز نے اس کو زیادہ تسلی نہیں دی لیکن اس سے پوچھا۔

"کون سے مضمون میں رہ گئیں؟"

"میتھ میٹکس"

"کتنے نمبروں سے؟"

"دس نمبر سے"

"حیف ہے، سوں پر کہ دس نمبر سے تمہیں فیل کر دیا، لیکن ایسا ہوتا ہے بیٹی، فکر مت کرو، رو مت"

عزیز لٹن روڈ پر جا رہا تھا۔ صدف رو رہی تھی لیکن اس طرح جیسے آنسو خاموش بارش کی طرح بہہ رہے تھے، نہ گرج چمک اور نہ ہوا کا تیز جھکڑ۔

گاڑی کے شیشے بند تھے اور ہیٹر چل رہا تھا۔ صدف پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار عزیز اس کو شیشوں میں سے دیکھتا لیکن عزیز زیادہ تر اس کے چہرے کو نہ دیکھتا کیونکہ یہ معصوم چہرہ آج واقعی ہمدردی کے لائق تھا اور باپ کے لیے اولاد کا اداس چہرہ دیکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی لیے وہ صرف اپنی تسلی کی خاطر اس پر اس طرح نگاہ ڈالتا کہ وہ وہاں آرام سے بیٹھی ہے حالانکہ وہ رو رہی تھی لیکن اس کو سوچتا رہنے دو، وہ رو رہی ہے تو بہتر ہے تاکہ من ہلکا رہے۔ ویسے بھی یہ ایک فطری عمل ہے۔

گاڑی چلتن کے پل پر سے گزرتی ہوئی پہاڑی علاقے میں اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ ایک دو موڑ کے بعد بارش ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر شیشے میں صدف کو دیکھا، ادھر بھی آنسو بہہ رہے ہیں۔ تیز بارش اور سردی نے سامنے کے شیشے کو دھندلا کر دیا کہ آگے بھی کچھ دکھائی نہ دیا۔ وائپر شیشوں کو جیسے ایک دیو کے ہاتھ کی طرح سختی سے گھس رہا تھا۔ کبھی کبھی شیشے اور ربر کے گھسنے سے رگڑ کی سی آواز پیدا ہوتی تھی صرف یہی آواز عزیز، صدف اور بارش کے درمیان ایک رشتے کا نشان تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہر ایک اپنی جگہ پر اکیلا اور تنہا تھا۔

عزیز اپنی سیٹ پر، صدف اپنی جگہ پر اور باہر برستی بارش اپنی جگہ پر۔ عزیز پھر سوچنے لگا۔

"بیماری کو لوگ علامتوں اور نشانیوں سے پہچان لیتے ہیں، پر میری بیماری کی علامت کیا اور نشانی کیا ہے؟ سوا اس کے کہ یہ میرے پورے وجود کو اپنی مٹھی میں اس طرح جکڑے ہوئے ہے جیسے کتا اپنے شکار کو جھپٹ لے۔ میں اس سے خود کو الگ تو نہیں کر سکتا۔ یہ گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس کی ایک ایک ٹھوکر ہڈیوں کو اندر سے پیس ڈالتی ہے۔ آدمی ادھڑتا جاتا ہے۔ پھر ڈھلکتا جاتا ہے۔ کندھے کبڑے ہو جاتے ہیں۔ بال چاندی ہو جاتے ہیں اور وہی گردن جو کبھی اکڑا یا کرتا تھا اب پرانی بندوق کی مانند ادھڑ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو مالیخولیا، ہذیان اور شیزوفرینیا یا کوئی اور دماغی عارضہ کہہ دیں۔ لیکن اس طرح بھی نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل الگ چیز ہے شاید یہ صدف کے آنسوؤں کی طرح ہے۔ بے رنگ و گرم اور تھوڑا سا نمکین لیکن کون جانے۔ میں نے اس کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا، لیکن اب میں ڈر رہا ہوں کہ یہ مجھے ہمیشہ کے لیے ختم نہ کر دے، نگل نہ جائے اور یہ مجھے نگل جائے تو میں کیا ہو جاؤں گا؟ کچھ نہیں ہوں گا؟ کیا ہوگا اگر میں نہ رہوں! میرا نام، میری عزت، میرا علم، میری قوم، میرا قبیلہ، میری ماں، میرا باپ، میرے بچے، میرے دوست اور میرا خاندان اور میرا آپ کے بارے میں اپنا خیال! یہ سب تو ہیں؟ پھر کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ میری یہ بیماری مجھے اس دن سے ہے جب میں نے اس دنیا میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ لیکن پہلے پہل میں نے اسے کمزور سمجھا، خود کو کج فہم ٹھہرایا کہ میں اور ایسا پاگل پن! لیکن میں بڑا ہوتا گیا اور اس کی شدت بھی بڑھتی گئی اور کالج، یونیورسٹی کے زمانے میں میں اتنا ڈر گیا کہ کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ اس طرح جیسے سیلاب

میں ڈوبتا ہوا آدمی اپنا چہرہ اچانک تہ آب دیکھتا ہے۔ ایسے میں خود کو روکتا ہے۔

اب مَیں کہہ نہیں سکتا کیسے؟ لیکن مَیں نے خود کو سنبھالا۔ مَیں ادھڑ کر نیچے گرتا رہا۔ مجھنے کہ میرا نیچے گرنا اسی دن سے شروع ہوا تھا جب مَیں پیدا ہوا اور یہ بیماری بھی جیسے ازل سے میرے ساتھ ہے لیکن میں اس کو مانتا نہیں تھا کیونکہ میرے معاشرے میں ایسی بیماریوں کو پاگل پن کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اسی لیے کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرتا کہ میرے لیے اچھا نہیں ہے۔ پھر بہتر یہی تھا کہ مَیں اسے دل سے نکال دوں۔ اسی لیے میں نے کوشش کی کہ اپنے لیئے نام پیدا کروں۔ قوم میں اپنا مقام بناؤں اور خوشحال ہو جاؤں لیکن جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا کہ ان سب چیزوں کے باوجود مَیں خوش نہیں تھا مجھے کیمرہ کی ریل میں سے ہر شئے اُلٹی دکھائی دیتی تھی اور ان دنوں سے لے کر آج تک مجھے یہی دکھ تھا کہ کوئی میری بیماری کو نہیں سمجھ سکا۔ پھر کیا صدف کے بے رنگ اور نمکین آنسوؤں کی شدت کو مَیں جان سکتا ہوں؟

عزیز نے ایک دو بار صدف کی جانب دیکھا، وہ سو رہی تھی۔ جب اس کا سر اور گردن سیٹ پر تھے۔ اس کے گالوں کی سُرخی ویسی ہی تھی۔ عزیز پھر خیالوں میں گم ہو گیا۔

"خدا کرے وہ اپنے فیل ہونے کو دل سے نکال دے لیکن اتنا رنجیدہ ہونا اس بچی کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ پر کیا ہو سکتا ہے۔ اسے تو فیل ہونا نہیں تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ پاس ہو گی لیکن حساب ایک بلا ہی تو ہے۔ مَیں خود حساب میں کمزور تھا لیکن پاس ہو گیا کل صدف بھی پاس ہو گی۔ وقت گزرتا ہے، پرانے زخم بھرتے ہیں نئے گھاؤ لگتے ہیں۔ مایوسی آتی اور چلی جاتی ہے۔ لیکن اس سے کیا؟

"زندگی اتنی وسیع اور بھاری پتھر کی طرح ہے کہ اس کو نہ میری تڑپ سے اور نہ ہی صدف کے آنسوؤں سے کوئی غرض ہے۔ اس کے باوجود اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر محسوس نہ کروں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ وقت گزر جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ہم آزادی کی اُس نعمت سے محروم ہوں گے۔ جو اس ہولناک بیماری کے بعد پیدا ہو گی لیکن ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم کو اس سے شرم آتی ہے اور ہم اس سے خود کو اس طرح الگ رکھتے ہیں کہ جس طرح طاعون ہو، گرم بخار ہو لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تم اس بیماری سے منکر ہو جاؤ اور آزادی کے تصور میں خود کو خوش رکھو۔ یہ سب اُلٹی تصویروں کا سلسلہ تو نہیں۔؟"

عزیز نے اپنی نظریں واپروں پر جما دیں۔ بارش سڑک پر آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف برس رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آج بادلوں نے ابد تک ٹوٹ کر برسنے کی ٹھانی ہے۔ اس نے سوچا صدف کو کیسے سمجھاؤں کہ فکر مت کرو۔ اس کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا اور اس کے دل کا ٹوٹنا اچھی بات نہیں ہے لیکن کیا ہو سکتا ہے۔؟"

عزیز چاہتا تھا کہ وہ گاڑی کو روک کر اس کی نبض دیکھ لے کہ اس کو بخار تو نہیں ہے لیکن آگے تقریباً ایک کلومیٹر پر کانک کا ہوٹل دکھائی دیا۔ کانک کے ہوٹل کے قریب ہی جب گاڑی رُک گئی تو صدف نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پھر بند کر لیں۔ عزیز نے اس کے گلاب رخساروں پر ہاتھ رکھا تو واقعی اسے بخار تھا اور سخت بخار تھا۔ عزیز نے دروازہ بند کیا تا کہ سرد ہوا نہ لگے وہ پریشان ہوا آخر کرے کیا؟ ہوٹل میں لوگ کرسیوں اور میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت رش تھا کیونکہ کچھ بسیں ابھی چند لمحے پہلے آئی تھیں۔ مسافروں کا ہجوم، سردی اور بارش کی تھکان اور صدف کا بخار عزیز کو زیادہ رنجیدہ کئے ہوئے تھا۔ وہاں ڈاکٹر بھی نہیں تھا جو کچھ بتاتا۔

اس نے دکان سے بسکٹ کا پیکٹ اور کچھ ٹافیاں خرید لیں۔ جونہی گاڑی میں آیا۔ صدف کبھی آنکھیں کھولتی اور بند کرتی۔ اس کا بخار جیسے خاموش بارش کی طرح چاروں طرف پھیل گیا۔ بہتر یہی ہے کہ ساٹھ میل کا سفر جلد از جلد طے کیا جائے۔

اس نے صدف کے ہاتھوں کو تھامنے کے بعد سوچا اور سگریٹ جلا کر پھر روانہ ہوا۔ ٹافی صدف کے ہاتھوں میں ایسے ہی پڑی ہوئی تھی۔ بسکٹ پیکٹ کھلنے کی وجہ سے ایک ایک کر کے گاڑی کی جمپ کے ساتھ ہی سیٹ کے نیچے گر رہے

تھے۔ کہ ان میں ایک دانہ بھی بچ نہ کھا سکی۔ شیخ واصل کی پہاڑی پر برف گرنا شروع ہوئی۔ دھند کی طرح برف گر رہی تھی اور وائپر خراب ہو گیا۔ "پنج پانی" کا میدانی علاقہ برفانی طوفان میں تھا۔ جب گاڑی انگریزوں کے زمانے کی لانڈھی کے قریب رُکی۔ ریلوے کراسنگ سے گزر گئی تو گھوگھو کرتی ہوئی بند ہو گئی۔ عزیز اترا گاڑی کو دیکھا۔ ظاہر میں کچھ ایسی خرابی نہ تھی۔ شاید اوور فلو ہو گیا ہو۔ اس نے ایکسیلیٹر کے بغیر سوچ لگایا لیکن گاڑی اپنی جگہ پر سے کولھو کے بیل کی طرح ہل نہ سکی۔ وہ باہر نکل گیا اور ایک بار پھر بونٹ کھولا اور پھر اس نے کھڑکی کی برف کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بخار کے عالم میں اب وہ سر کو بے ہوشی سے ہلا رہی تھی۔ عزیز نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور پھر آواز دی۔

"صدف"

صدف کچھ نہیں بولی۔ اس کے ہونٹ سرمائی قہر بھری اور برف آلود دن کی سردی میں ٹھٹھر گئے تھے۔

"پانی، پانی اماں، پانی"

عزیز نے دروازہ کھولا اور برف میں خود کو انجن پر جھکایا لیکن نہ اسے انجن کی خرابی کا پتہ تھا اور نہ ہی وہاں انجن اسے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود صدف بخار کی گرمی میں جل رہی تھی۔ اور گاری اسٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے پھر خود کلامی کی۔

یہ مجھے کیا تجربہ ہو رہا ہے۔ کیا میری ہولناک بیماری کے آگے یہ بخار کچھ بھی نہیں۔؟ لیکن یہ کیوں؟ میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے؟ صدف نے اپنے فیل ہونے کو اتنا کیوں محسوس کیا؟ اور میں زندگی کو اتنا کیوں محسوس کر رہا ہوں ویسے بھی آج وہ اپنے فیل ہونے کو دل سے نکال دے اور مجھے زندگی کی اتھاہ میں سے نکال دے۔ زندگی کا تمام تر عمل ایک سپاٹ عمل ہے۔ لیکن چالیس سال کی عمر میں میری فکر مجھے اب اس نئے راستے پر لے جا رہی ہے۔ اس میں مجھے تمام تر اشیاء اُلٹی دِکھ رہی ہیں۔ لیکن نہیں، صدف کا بخار حقیقت ہی تو ہے، وہ جل رہی ہے، بخار میں جل رہی ہے، صدف مر رہی ہے، میں مر رہا ہوں، کائنات مر رہی ہے۔ ہر چیز مر رہی ہے، اس کے وجود کے تجربوں کی معنویت کیا ہے؟ مراد کیا ہے؟۔ پریشانی کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ وہ کون ہے؟ میں کیوں کسی ایک چیز کو بھی اپنا کہہ نہیں سکتا؟ یہاں تک کہ مجھے اپنا آپ بھی بیگانہ دِکھتا ہے؟۔ کیا میری یہ بیماری صدف کی بیماری سے زیادہ خوفناک نہیں ہے؟ صدف کو فیل ہونے پر دُکھ ہوا ہے، مجھے اپنے ہونے پر، صدف کو کس نے فیل کیا، مجھے دُنیا میں کسی نے بھیجا، میری منشاء کے بغیر، خدا۔۔۔ اچھا۔ لیکن یہ سب جاننا چاہتا ہوں۔

فکری رویے اور نظریے اس راز کو اتنی سادگی سے بیان نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہم خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہمیں ایک حد تک لے جاتی ہیں لیکن حقیقت ہے کہاں؟ کون جانتا ہے۔ یہ کیا راز ہے۔ لیکن میں کیوں فکر کروں۔؟"

اس نے گاڑی کو پھر سلیف لگایا اور گاڑی اپنے آپ ہی اسٹارٹ ہو گئی جیسے ایک پُراسرار قوت نے اسے دھکا دیا ہو۔ حالانکہ اس کی اُمید نہ تھی لیکن ہو گئی۔ عزیز نے سوچا، سورج ڈوبنے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔ ٹافیاں ایک ہاتھ میں رکھی تھیں کہ ایک دوسری طرف گر گئیں۔ عزیز نے اپنے آنسو پونچھ لیئے۔ صدف۔ صدف، پکارتا ہوا۔ وہ ایسے کبھی نہ رویا تھا جیسے آج رو رہا تھا، لیکن شاید صدف کے بخار کے لئے ہی نہیں رو رہا تھا بلکہ کسی اور چیز نے اسے رُلایا تھا، اور یہ رونا اس کو اتنی دور لے گیا کہ وہ سب بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔

وہ سوچنے لگا" کیا ہماری آزادی یہی نہیں ہے۔ کہ ہم ہمیشہ کے لیے ان بندھنوں سے خود کو دور لے جائیں، اس طرح کے رونے میں، اسی طرح ایک بخار میں، اسی طرح کی بیماری میں۔ کیونکہ اگر ایسے ہوتا تو ہم ہمیشہ دوسروں کی پریشانیوں پر خوشی کا اظہار کریں اور اپنی پریشانیوں کو چھپائیں اور ہم کبھی آزردہ نہ ہوں بلکہ دوسرے کے بتانے ہی پر خود کو جانیں کہ نہ ہماری پریشانیاں، ہماری اپنی پریشانیاں ہیں نہ بخار اپنا بخار ہے۔ نہ ہماری خوشی ہماری ہے۔ بلکہ یہ سب

کچھ دوسروں کے دیئے ہوئے قرض ہیں کہ ان کو ہم اپنی ملکیت نہیں کہہ سکتے جب ہم اپنے غموں سے ڈرتے ہیں، تو ایسا ہی ہوگا

کیا میری یہ بیماری بیگانگی ہے یا دوسروں کے کہنے پر زندگی گزارنا بیگانگی ہے۔ پاگل نہ ہونا اور ہونے کا فرق شاید یہی ہے۔ جس طرح میری اور صدف کی بیماری میں ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ کون جانتا ہے؟

تھوڑا آگے چلنے کے بعد برف برسنا تھم گئی اور بارش بھی رُک گئی۔ دور پہاڑوں کے درے بادلوں کی دھند میں سے نمودار ہوئے۔ بادل از خود بلندی کی اُور پھیل رہے تھے۔ پہاڑ بھیگتے ہوئے سرسبز اور بہت ہی شفاف دکھائی دے رہے تھے۔

سڑک کے آس پاس بسے لوگ بارش تھمنے کے ساتھ ہی باہر نکل آئے۔ سورج بادلوں میں تحلیل ہوتا ہوا اب ڈوب رہا تھا۔ اس لیئے تاریکی آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھی اس نے گاڑی کی چھوٹی بتیاں جلا لیں۔ شہر پہنچنے پر شاید صدف کا بخار اُتر جائے۔ اس نے سوچا اور صدف کو دیکھا۔ اس نے پیروں پر اپنا کوٹ ڈال رکھا تھا۔ لیکن آنکھیں ابھی تک کھلی نہ تھیں یا خدا! گلاٹی ندی کے پہاڑوں پر بالکل رات پڑ گئی اور اس نے بڑی بتیاں روشن کر دیں۔ اب شیشوں میں اسے صدف دکھائی نہیں دے رہی تھی جب تک اندر کی بتی روشن نہ کرتا۔ پر وہ ہر ساعت بخار دیکھنے میں خود کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیئے گاڑی کو بھگاتا رہا تاکہ تیز رفتار پکڑنے سے منزل کے قریب ہونے کا احساس شدت اختیار کر جائے اور ویسے بھی راستہ کم رہ گیا تھا لیکن ایک دوبارا سے خیال آیا کہ گاڑی کو روک لے اور دیکھے کہ صدف کیسی ہے؟ خدا نہ کرے کہ۔ اسی لیئے اس نے آہستہ آہستہ گاڑی روک لی اور صدف کا بخار دیکھا۔ اس کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ کہاں گیا اس کا بخار؟ کیا وہ زندہ ہے؟ یا خدا! واقعی میری بیماری صدف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ پر اس کا جسم کیوں سرد ہے۔ کیا یہ اس کی موت کی ٹھنڈ تو نہیں ہے۔ یہ سب خیالات اس کے دماغ میں بجلی کی چمک کی طرح نمایاں ہوئے اور اس نے اسی وقت اندر کی بتی روشن کر دی۔ صدف کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"صدف" اس نے پکارا، صدف نے کچھ نہ کہا لیکن وہ خوش ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ اس نے پوچھا" کیا چاہتی ہو؟" حالانکہ وہ وہاں اسے کچھ بھی نہ دے سکتا تھا لیکن باپ کی محبت کے جذبے سے سرشار اس نے پوچھا۔ کیونکہ وہ خوش ہو رہا تھا کہ وہ زندہ تھی اور اس کا بخار اتر گیا تھا۔

"اب پہنچتے ہیں اطمینان رکھو، تمام مسئلوں کو بھلا دو۔ ماں اور دادی اب قریب ہی ہیں۔ تم نے مجھے مفت میں پریشان رکھا" یہ کہتا ہوا عزیز اسے اب بھی ڈانٹنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے خود کو روکا اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ بارش پھر شروع ہو گئی۔ اور اس نے سوچنا شروع کیا۔ کیا میری بیماری بھی اس طرح ختم ہو گی۔ یہ ایک معجزہ ہو گا لیکن اگر ختم ہو گئی تو کیسے ہوئی؟ ہر چیز غیر اہم ہو گئی، خدا کرے ایسے ہی قائم رہے پر مَیں یہ بات جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ش صدف کا بخار دوائی کے بغیر ختم ہوا تو کیسے اور اگر میری بیماری ختم ہو گی تو کیسے ختم ہو گی۔؟

☆☆

خوشبو آنکھیں

سپاس گل

چیونٹی کا توکل

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک چیونٹی سے پوچھا کہ سال بھر میں تیری کتنی روزی ہوتی ہے، اس نے کہا "ایک دانہ۔"

انہوں نے اس کو ایک شیشی میں بند کر دیا اور ایک دانہ ڈال دیا جب سال ختم ہوا تو اسے دیکھا کہ اس نے آدھا دانہ کھایا تھا اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے بیان کیا۔

"پہلے میرا اللہ پر بھروسہ تھا اور اب مجھے خوف اس بات کا ہوا کہ کہیں آپ بھول نہ جائیں۔ اس لیے میں نے آدھا دانا کھایا اور آدھا آئندہ سال کے لیے رہنے دیا۔"

ایک چیونٹی کا اللہ پر اتنا یقین تو پھر انسان کا کیوں نہیں؟

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

اچھی باتیں

○ زندگی میں کچھ کھونا پڑے تو یہ دو لائنیں ہمیشہ یاد رکھنا جو کھویا ہے اس کا غم نہیں جو پایا ہے وہ کسی سے کم نہیں جو نہیں ہے وہ ایک خواب ہے جو ہے وہ لاجواب ہے۔

○ خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔

○ رشتوں کا نہ ہونا اتنا تکلیف کا باعث نہیں بنتا جتنا رشتوں کے ہوتے ہوئے احساس کا مر جانا تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

○ لالچ ختم کر دو دنیا کا کوئی شخص آپ کو دھوکہ نہیں دے گا۔

○ آپ والد صاحب کو تیل کا کنواں اور دوستوں کو لاٹری کی ٹکٹ کی حیثیت دے دیتے ہیں تو ہماری توقعات کے جسم پر کانٹے نکل آتے ہیں اور یہ کانٹے ہمارے تن من کو زخمی کر دیتے ہیں۔

○ قبرستان میں کتنے لوگ دفن ہیں لیکن ان کو کوئی دکھ نہیں کوئی رکاوٹ اور کوئی مشکل نہیں مسائل رکاوٹیں اور پریشانیاں تو صرف اور صرف زندہ لوگوں کو درپیش ہوتی ہیں اور یہی زندگی کی اصل قیمت ہے۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

یاد رکھنے کی باتیں

❖ اگر کسی انسان کی جان لینا قتل کہلاتا ہے اور سوسائٹی کا قانون اس کے لیے سزائے موت تجویز کرتا ہے تو لاکھوں انسانوں کا بے دریغ خون بہانے اور کشتوں کے پشتے لگانے والا درندہ خصلت وحشی آدمی فاتح اور جرنیل کیسے کہلا سکتا ہے۔ (پال رچرڈ)

❖ بھوکا ننگا مزدور جب ظلم اور جبر کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو بڑے بڑے کج کلاہوں کے تاج اس کی ٹھوکروں کی زد میں ہوئے ہیں (رسل)

❖ حد سے زیادہ مخلص نہ بنو دراصل خلوص دو دھاری تلوار ہے خلوص کی تلوار رکھنے والا اکثر خود ہی زخمی ہو جاتا ہے۔ (آندرے مورس)

❖ وہ دل جس میں خلوص کا مقدس جذبہ نہ ہو اس صدف کی مانند ہے جس میں موتی نہ ہو (بائرن)

❖ اگر تو کسی ایک شخص کی بھی تکلیف دور کرے تو یہ کام زیادہ بہتر ہے۔ اگر تو کسی ایک شخص کی بھی تکلیف دور کرے تو یہ کام زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تو حج کو جائے اور راستے کے ہر پڑاؤ پر ایک ایک ہزار رکعت نماز پڑھتا جائے (شیخ سعدی)

ریاض بٹ...... حسن ابدال

وقت

یہ وقت بھی نہ بڑی بے رحم چیز ہے اس کے بدلنے سے ہواؤں کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ منظر بدل جاتے ہیں نظارہ بدل جاتا ہے یہ کمال وقت کو تو حاصل ہے جس زخم سے تکلیف ملتی ہو اس سے ہی تسکین مل رہی ہوتی ہے وقت کی چال کو جو سمجھ سکے ابھی تک ایسی کوئی عقل تخلیق ہی نہیں ہوئی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ وقت بھی وقت پر نہیں آتا وقت کی چال وقت کے ساتھ بھی سمجھ نہیں آتی ہر حال میں ستاتا ہے چپکے سے گزر جاتا ہے یہ وقت ہی تو ہے جو وقت کے بادشاہوں کو بازاروں میں لیے آتا ہے گداگروں سے نظام شاہی چلواتا ہے جب یہ خود کو دہراتا ہے چڑیوں سے باز مرواتا ہے وقت کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے نوک نشتر باعث تسکین بن جاتا ہے یہ ہی تو ہے جو انسان کو بہت رلاتا

ہے اور پھر خود ہی مرہم بن جاتا ہے ہمیشہ سے ہی انسان وقت کا محتاج رہا ہے کبھی بھی کہیں بھی وقت کسی کا محتاج نہ بن سکا ہاں اگر کسی نے اس کی قدر کو پہچان لیا تو وقت نے بھی اس کی قدر کو پہچانا اور پہچانا ایسے کہ اس کا ساتھ دیا اور جس نے وقت کو اہمیت نہ دی وقت نے بھی اس کی قدر و منزلت اندھیروں میں غرق کردی گویا وقت انسان اور انسان وقت ہر حال میں ہمراہی ہوتے ہیں اگر ان دونوں میں اختلاف بڑھ جائے تو نقصان صرف انسان کا ہی ہوتا ہے۔

حسین خواجہ......منچن آباد

وہ عشق جو ہم سے

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے تادیر اسے دہرائیں کیا وہ زہر جو دل میں اتار لیا اب اس کے ناز اٹھائیں کیا پھر آنکھیں لہو سے خالی ہیں یہ شمعیں بجھنے والی ہیں ہم خود بھی کسی کے سوالی ہیں اس بات پہ ہم شرمائیں کیا اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی جب جسم ہی سارا جلتا ہو، پھر دامن دل کو بچائیں کیا ہم نغمہ سرا کچھ غزلوں کے ہم صورت گر کچھ خوابوں کے بے جذبہ شوق سنائیں کیا کوئی خواب نہ ہو تو بتائیں کیا۔

محمد احمد رضا انصاری......کوٹ ادو

چاہت

جب کسی کے لیے بے ضرر دل میں پیار پیدا ہو تو اس کو چاہت کہتے ہیں میں جو ہمیشہ تمہارے ساتھ محو گفتگو ہو جاتا ہو یہ سب میری چاہت کے ہی سبب ہوتا ہے تم مجھے چاہت کی ہر حد تک دیکھ لو نہ میں غلط تھا اور نہ ہی آج ہو یہ چاہت انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہوئی ہے انسان کا اس پر کوئی زور نہیں جذبہ جب تک خود غرضیت سے پاک رہتا ہے تب تک دل صاف رہتا ہے۔

اویس اویسی......رحیم یار خان

ماں کا مقام

والدین میں سے ماں کا مقام بہت بلند ہے
ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔
''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟''
ارشاد ہوا۔''تیری ماں۔''اس نے پھر عرض کی۔
''اس کے بعد کون ہے۔''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''تیری ماں۔''اس شخص نے پھر پوچھا''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد کون ہے''ارشاد ہوا۔
''تیری ماں۔''اس شخص نے تیسری مرتبہ ایک ہی جواب سننے کے بعد پھر کہا''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر کون۔''
''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔''تیرا باپ۔''
مطلب تین حصے ماں کے لیے اور ایک حصہ باپ کے لیے ہے بے شک ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور ماں دنیا کی عظیم ہستی ہے اس کی ہم جتنی بھی خدمت کرلیں کم ہے۔

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

ایک خاص دعا

نئے سال کی آمد پر نیا سال مبارک ہو
میری دعا ہے کہ آپ
سال کے بارہ مہینے خوش رہیں
باون ہفتے مسکراتے رہیں
تین سو پینسٹھ دن اللہ تعالیٰ آپ پر مہربان رہے۔
آٹھ ہزار سات سو چوراسی گھنٹے قسمت آپ کا ساتھ دے
پانچ لاکھ ستائیس ہزار چالیس منٹ کامیابی آپ کے قدم چومے
اور
تین کروڑ سولہ لاکھ بائیس ہزار چار سو سیکنڈ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

برائی اچھائی

برائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ سے نیچے اترنا ایک قدم اٹھاؤ تو باقی قدم اٹھتے چلے جاتے ہیں اور اچھائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ پر چڑھنا ہر قدم پچھلے قدم سے زیادہ مشکل، مگر ہر قدم پر بلندی ملتی ہے۔

نورین لطیف......ٹوبہ ٹیک سنگھ

دوست

دوست ایک ایسا درخت ہے جو صرف دل کی زمین پر اگتا ہے۔ اس کا پانی ''سچائی'' ہے اور اس کا بہترین ساتھی

صبر ہے۔ اس کا سایہ "اعتماد" ہے۔ اس کے پتے "امید" ہے۔ اس کی ٹہنی "چاہت" ہے۔ اس کا تنا "اتفاق" ہے اور اس کا پھل "وفا" ہے۔

غزل عبدالخالق...... فیصل آباد

الف سے اللہ

اللہ کا نام اعلیٰ طریقہ پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر لیا جائے اپنا اثر ضرور رکھتا ہے دنیا میں بعض اشیا ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کا نام لیا جائے اور اس سے اثر نہ ہو خالی نام میں بھی برکت ہے خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے۔

اقرا الیاقت...... حافظ آباد

قیمتی موتی

انسان بھی کتنا نادان ہے زندہ رہنے کے لیے کتنے جتن کرتا ہے کتنوں کو فریب دیتا ہے لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ ایک ہی لمحہ میں اس کو یہ ہنستی مسکراتی اور جگمگاتی دنیا کو چھوڑ دینا ہے۔ صرف ایک ہی سانس کا فاصلہ اس دنیا سے اس دنیا میں، انسان دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اکیلا ہی مرتا ہے تو پھر زندگی اور موت کے درمیانی عرصہ کے لیے اس سہارے کا فریب کس لیے دیا جاتا ہے وہ اکیلا ہی کیوں نہیں جی لیتا۔

عابد محمود...... ملکہ ہانس

اقوال زریں

☆ ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔

☆ زندگی میں دو چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں سانس اور ساتھ۔ سانس ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرتا ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے بار بار مرتا ہے۔

☆ وقت اور پیار دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں وقت ہر کسی کے لیے نہیں ہوتا اور پیار ہر کسی سے نہیں ہوتا۔

☆ نیند اور موت نیند آدھی موت ہے اور موت مکمل نیند۔

☆ وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش نصیب لوگوں کو ملتے ہیں۔ وقت پر سمجھ نہیں آتی اور سمجھ آنے پر وقت نہیں رہتا۔

ثناء ریاض...... منڈی بہاؤالدین

باتوں سے خوشبو آئے

❁ ایمان اس کا نام ہے کہ خدائے واحد کو دل سے پہچانے اور زبان سے اس کا اقرار کرے اور حکم شرع پر عمل کرے۔

❁ خشوع وخضوع کا تعلق دل سے ہے نا کہ ظاہری حرکات سے۔

❁ بدخو کی دوستی سے احتراز لازم ہے کیونکہ وہ اگر بھلائی بھی کرنا چاہتا ہے تو بھی اس سے برائی سرزد ہوجاتی ہے۔

❁ خدا تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو میرے عیوب پر مجھے مطلع فرماتا ہے۔

❁ جب ایک عالم سے لغزش ہوجاتی ہے تو اس سے ایک عالم لغزش میں پڑ جاتا ہے۔

❁ طالب دنیا کو علم پڑھانا، ان کے ہاتھ میں تلوار فروخت کرنا ہے۔

❁ کسی کے خلق پر اس وقت تک اعتبار نہ کرنا جب تک اس کو غصہ میں نہ دیکھ لو۔

❁ جو عیبوں سے آگاہ کرے وہ دوست ہے منہ پر تعریف کرنا گویا ذبح کرنا ہے۔

❁ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔

❁ جب حلال و حرام جمع ہوجائے تو حرام غالب ہوجاتا ہے چاہے وہ تھوڑا سا ہی ہو۔

❁ اگر میں ایسی حالت میں مرجاؤں کہ اپنی محنت اور سعی سے روزی کی تلاش کرتا ہوں تو مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی ہو کر مروں۔

❁ دوزخ سے بچو اگرچہ کے آدھے چھوارے کی بدولت ہو اگر یہ بھی نا ہو تو میٹھی بات ہی سہی۔

سمیر العبیر...... سرگودھا

میری زندگی کا سچ

زندگی کے ہر موڑ پر ہم سے وہی لوگ بچھڑ جاتے ہیں جنہیں ہم اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔

جان سے زیادہ پیارے لوگوں کے بچھڑ جانے سے زندگی رک نہیں جاتی اور نہ ہی سانسیں تھمتی ہیں بلکہ انسان کا دل اور اس کی روح مرجاتی ہے۔

زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ زندہ نہیں ہوتے۔

وہ ہماری طرح روزمرہ کے کام کاج کرتے ہیں مگر ان

کی آنکھیں ویران ہوتی ہیں۔
ان کے لب مسکرانا تک بھول جاتے ہیں' محفلوں سے وہ دور بھاگتے ہیں۔
تنہائیوں کو وہ اپنی بانہوں میں لیے پھرتے ہیں۔
اب کوئی بھی رشتہ دل کو بھاتا نہیں ایمان
کچھ اس طرح ٹوٹا ہے دل اپنوں کی بے رخی سے
ایسے لوگ بنیادی طور پر بہت حساس ہوتے ہیں جو دوسروں کی ذرا سی چوٹ لگنے پر ہی تڑپ جاتے ہیں۔
ٹوٹے ہوئے لوگ ہی دوسروں کا دکھ' درد سمجھ سکتے ہیں' خوشحال لوگوں کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ایمان...... کہروڑ پکا

مختصر مختصر

جو اچھا لگتا ہے اسے غور سے مت دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کوئی برائی نکل آئے۔
جو بُرا لگتا ہے اسے غور سے دیکھو ممکن ہے کوئی اچھائی نظر آجائے۔

امینہ رؤف...... جہلم

اسلام میں سیکیورٹی کا تصور

ایک دفعہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کسی کام سے جا رہے تھے' ایک سیاح کو پتا چلا کہ وہ مسلمانوں کے امیر ہیں تو وہ دیکھ کر بہت حیران ہوا' بھاگا بھاگا آپؓ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔
''آپ مسلمانوں کے امیر ہیں؟''
''آپؓ نے جواب دیا۔'' میں ان کا امیر نہیں بلکہ ان کا محافظ ہوں۔''
سیاح نے پوچھا۔'' آپ اپنے ساتھ حفاظتی دستہ کیوں نہیں رکھتے؟''
آپ نے جواب دیا۔'' عوام کا یہ کام نہیں کہ وہ میری حفاظت کریں یہ تو میرا کام ہے کہ میں ان کی حفاظت کروں۔''

عقیلہ رضی...... فیصل آباد

اقوال زریں

☯ اچھے کے ساتھ اچھے رہو' مگر بُرے کے ساتھ بُرا مت بنو کیونکہ تم پانی سے خون دھو سکتے ہو' مگر خون سے خون نہیں دھو سکتے۔
☯ انسان کو اچھی سوچ پر وہ انعام ملتا ہے جو اسے اچھے اعمال پر بھی نہیں ملتا۔
☯ خوب صورتی کی کمی اخلاق پورا کرسکتا ہے مگر اخلاق کی کمی کو خوب صورتی پورا نہیں کرسکتی۔
☯ زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

عروسہ شہوار رفیع...... کالا گوجراں' جہلم

جواہرات سے قیمتی

⌘ دنیا کی تھکن اتارنے کا سب سے بہترین ذریعہ ذکر ہے۔
⌘ سکون سے رہنا چاہتے ہو تو لوگوں سے وعدے کم کرو۔
⌘ خود پسندی سب سے بڑی تنہائی ہے۔
⌘ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔
⌘ وقت ہر ایک کو آواز دیتا ہے جو شخص یہ آواز نہیں سنتا وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔
⌘ زبان کو شکوے سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

بتول کائنات...... گاؤں عالی

واپسی

اس گردشِ دوراں میں
وقت کے تھال میں عمر کے نجانے کتنے ہی سکے گراتے گراتے
میں اک تیرے لوٹنے کی آس لیے بیٹھی رہی
کتنے ہی چاندی کے تار میرے بالوں میں چمکنے لگے
حالات نے کتنے ہی نقش میری پیشانی پر ثبت کیے
مجھے زندہ رکھا تو اک تیری آس نے
پر......؟
آج تو لوٹا تو بس
یہ کہنے کو کہ میرے پاس
کچھ بچا ہی نہیں
......
تجھ کو دینے کے لیے

روبی علی...... سیدوالا

نوشین اقبال نوشی

غزل

من کا میل مٹا دیتی ہے
خوشبو انگ بسا دیتی ہے
سینہ خیر بنا دیتی ہے
پیر نہیں تھکتے ہیں جس میں
ایسا رقص کرا دیتی ہے
سب رنگوں سے جان چھڑا کر
یار کا رنگ چڑھا دیتی ہے
پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے
اور کسی سے کب ہوتا ہے
یہ "کُن" کہہ دے تب ہوتا ہے
اس کے دم سے سب ہوتا ہے
اس کا مالک رب ہوتا ہے
رمز الف سمجھا دیتی ہے
پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے
اس کی مٹی بھی سونا ہے
اس کا کھونا بھی ہونا ہے
اس کی مستی ہی وکھری ہے
یہ اکھڑ ہے اور اتھری ہے
یہ ہونی پہ آ جائے تو
سو بلھے نچوا دیتی ہے
پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے
اس کے جوگ بجوگ نرالے
یہ کب یار کا بھید اچھالے
مسجد مندر چرچ شوالے
سارے اس کے دیکھے بھالے
آ اس کے ہونے سے ہو جا
اور "بننے" سے جان چھڑا لے
لے سُنیاری در پہ آئی
پریتم کے کنگن بنوا لے
تن کے سب جھگڑے چھڑوا کر
من درشن کروا دیتی ہے
پوچھ رہے ہو بابا لوکا
اور محبت کیا دیتی ہے

شاعر: علی زریون

انتخاب: لیہا سیال آبی...... اسلام آباد

میں کس طرح بتاؤں

میرے وطن میں اب جو حالات ہو رہے ہیں
میں کس طرح بتاؤں کیا عذاب ہو رہے ہیں
پہلے نہیں تھا ایسا میرا وطن اے لوگو
اب ظلم ہی ہر سُو بے حساب ہو رہے ہیں
مائیں تڑپ رہی ہیں بچے بلک رہے ہیں
سایہ نہیں ہے سر پہ نیلام ہو رہے ہیں
اُن بہنوں پہ کیا ہے گزری کوئی تو اُن سے پوچھے
جن کے بھائیوں کے قتل سرِ عام ہو رہے ہیں
جن نوجوانوں کو بننا تھا اِس قوم کا مقدر
اب اُن کی لاشوں سے قبرستان آباد ہو رہے ہیں
جن کے سہاگ اُجڑے اُن کا نہ حال پوچھو
اُن کی ویران آنکھوں میں جو سوال ہو رہے ہیں
کوئی تو آ کر کہہ دے یہ خواب تھا اے لوگو
اِس خواب کو بھلا دو کہ گل شاداب ہو رہے ہیں

شاعرہ: آبروٗ نبیلہ اقبال...... راولپنڈی

غزل

سورج کے اگلنے میں بڑی دیر لگی ہے
اس رات کو ڈھلنے میں بڑی دیر لگی ہے
یہ عشق مری جاں کوئی آسان نہیں تھا
یہ زہر نگلنے میں بڑی دیر لگی ہے
میں اپنے قبیلے کا وہ سردار ہوں جس کو
حالات بدلنے میں بڑی دیر لگی ہے
اب اُس کو مرے پیار کا احساس ہوا ہے
برفوں کو پگھلنے میں بڑی دیر لگی ہے
کچھ اس نے بھی گمراہ کیا ہے مجھے فاخر

کچھ میرے سنبھلنے میں بڑی دیر لگی ہے
سید فاخر رضوی ...... جرمنی

سانحہ کوئٹہ

ساٹھ ان لاشوں کی روحیں ہم سے کرتی ہیں سوال
کون سا وہ جرم تھا جس جرم کی پاداش میں
ہم کو اپنے خون کے دریا میں نہلایا گیا
اور تڑپایا گیا
ہم جو تھے کھلتے ہوئے تازہ گلابوں کی طرح
اب منوں مٹی کے نیچے ہے دیا اپنا وجود
پھر بھی ہم سن سکتے ہیں
اپنی بوڑھی ماؤں کی آہ و بکا اور سسکیاں
بوڑھے باپوں کے دل و جاں کو ہلاتے ہیں بھی
دیکھ سکتے ہیں وہ بچے ہو گئے ہیں جو یتیم
جن کے سر پر ہاتھ رکھنے والا اب کوئی نہیں
وہ دوشیزاؤں کہ جن کے آج اجڑے ہیں سہاگ
ایسی مائیں جن کے اکلوتے سہارے چھن گئے
وہ جو بزدل تھے کمینے اور نا ہنجار تھے
وہ ہمارے ساتھ یونہی برسر پیکار تھے
وہ مسلح لوگ تھے اور ہم نہتے سر بسر
وہ درندہ لوگ تھے اور ہم تھے ان سے بے خبر
کس نے بھیجے کسی نے چھوڑے گرگ ہائے خونخوار
ہو گئے رسوا ہمیشہ کے لیے وہ سارے لوگ
اور ہیں ہم سرخرو اپنے خدا کے سامنے
موت کتوں کی مرے وہ ہم شہادت پا گئے
ہم کو ہے معلوم اب تم سوگ کی حالت میں ہو
آنکھ میں آنسو بھی ہوں گے لب پر ہمارا ذکر بھی
سرزمین پاک کا پرچم رہے گا سرنگوں
اور پھر اک روز سب کچھ بھول جائے گا تمہیں
یہ ہمارے خون کی سرخی، شہادت کا مقام
ایک دن ہو گا یہ سب کچھ بھی سیاست کی نظر
اور پھر اپنی یہ قربانی بھی ہو گی رائیگاں
ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم

اے سال نو

جشن برپا ہے تیری آمد پہ یوں اے سال نو
کھل اٹھی ہیں دل کی کلیاں گل شگفتہ ہوئے
جس قدر تاریک پہلو تھے گزشتہ سال کے
وہ امیدوں کے دلوں سے جگمگا کے رہ گئے
تیرا ہر پل ہو مسرت کی نوید اے سال نو
تیرا ہر دن روز روشن کی طرح براق ہو
تیری ہر شب چودھویں کی رات کا مصداق ہو
ہر کس و ناکس کے لب پر ہے دعا تیرے لیے
تو بہاروں کا امین ہو، پاسبان امن ہو
تو محبت کا پیمبر ہو، پیامی علم ہو
مدتوں سے زندگی کی سانس ہے ترسی ہوئی
ہم سے مل جائیں
ہمیں بھی جان سے پیارے ہیں جو
راہ جن کو دیکھتے
آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
ہاں ...... ملا دے
ہمیں اپنے پیاروں سے
اے سال نو
تمام پاکستانیوں کو سال 2017 مبارک ہو
شاعر: آصف شہزاد
پسند: ملک جواد نواز ...... ڈی آئی خان

غزل

رات بھر جاگنے کو جی چاہتا ہے
یاد ماضی میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے
اس کے ہرجائی پن سے اکتا کر اب تو
اسے بقول جانے کو جی چاہتا ہے
وہ پہلے سے مراسم تو نہیں رہے اب
پھر بھی اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے
شہروں کے ہنگاموں سے تنگ آ کر
ویرانوں میں بس جانے کو جی چاہتا ہے
پھولوں نے اتنے دکھ دیے مجھے
کہ اب کانٹوں سے الجھنے کو جی چاہتا ہے
جام زندگی تلخیوں سے بھر چکا ہے اگر چہ
پھر بھی اسے پیے جانے کو جی چاہتا ہے
نسرین اختر نینا

غزل

دل کے افق میں کوئی ستارہ نہ ملا

شب تنہائی میں جینے کا اشارہ نہ ملا
وہ جو اک ہستی چاہت میں تھی آگے
بڑی آرزو تھی مگر وہ دوبارہ نہ ملا
اس کے سپنوں میں گر خواب میرا مل جائے
عمر بھر ایسا پھر نظارہ نہ ملا
اس نے نبھائے جسے وعدے اس قدر
شب فراق میں ایسا کنارہ نہ ملا
پتھروں کے شہر میں رہنا ہے مشکل بہت
حسن چھوڑ گیا پھر ایسا سہارا نہ ملا
ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

غزل

اتر جاتی ہے دل میں محبت تیر ہوتی ہے
محبت کرنے والوں کی عجب تقدیر ہوتی ہے
جہاں کوئی نہیں ہوتا وہاں میں ٹھوکر کھاتا ہوں
گزر جاتا ہوں آسانی سے جہاں پر بھیڑ ہوتی ہے
میں دل کی بات کرتا ہوں وہ دل پر لے لیتے ہیں
کیوں آخر میرے لفظوں کی الٹ تاثیر ہوتی ہے
وہ جلا کر راکھ بھی کر دیں تو شکوہ کیونکر ہو
یہ دل جسے ثمر کہتے ہو ان کی جاگیر ہوتی ہے
دل ناداں کہتا ہے اب ان کو جا کے کہہ ڈالوں
محبت کیوں قید کرتے ہو یہ عالمگیر ہوتی ہے
وفا تیری بجا لیکن زمانے نے دکھایا ہے
محبت کرنے والی ہر عورت شمشیر ہوتی ہے
فاروق تم پاگل یوں اپنی شاعری پہ فخر کرتے ہو
جیسے یہ غالب ہوتی ہے یا پھر میر ہوتی ہے
عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس

غزل

زخم کھائے ہیں زندگی کی راہوں میں
زیر سایہ پھر سے دل دھڑکتے رہیں گے
کھا کے قسم لوگ بدل جاتے ہیں یہاں
کیا کریں کسی کا اعتبار ہم دیپ بجھاتے رہیں گے
ڈر تھا جس کا وہ بات ہو کے رہ گئی
بدنامیوں کے خوف سے دل جلاتے رہیں گے
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں وفا کوئی بھی نہیں
ہم یوں ہی ورق زندگی کے پلٹتے رہیں گے

بے بسی کا عالم ساتھ اپنے ہے تنہائی جاوید
زیست کے سفر میں خیالات بھٹکتے رہیں گے
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

موسم بدل گئے وہ زمانے بدل گئے
لمحوں میں دوست، برسوں پرانے بدل گئے
دن پھر رہے تھے جو میری محبت کی چھاؤں میں
وہ لوگ دھوپ ڈھلتے ہی ٹھکانے بدل گئے
کل جن کے لفظ لفظ میں محبت تھی پیار تھا
لو آج ان کے لبوں کے ترانے بدل گئے
اک شخص کیا گیا میرا شہر چھوڑ کر
جینے کے سارے ڈھنگ بہانے بدل گئے
اب وہ وہ نہ رہا میں میں نہ رہا
سارے ہی زندگی کے فسانے بدل گئے
محمد احمد رضا انصاری...... کوڈادو

غزل

کہہ اٹھا دل یہ گھبرا کے
یہ کھیل ہیں سارے مایا کے
لگتا ہے زمانہ سمجھا ہے
در بند نہ ہوں گے توبہ کے
فرصت جو ملے سوچے آجر
مزدور گرا کیوں غش کھا کے
کیا رنگ بتاؤں میں تم کو
اس رنگ بدلتی دنیا کے
افسوس نہ سمجھے بات یہ دل
تھک ہار گیا میں سمجھا کے
یہ چھوڑ کے اپنی دنیا کو
کیوں پار چلا ہے دریا کے
رستے میں ٹھکانہ کر لیجیے
اب کیا کیجیے گا گھر جا کے
دیکھو کہ مخالف کتنے ہیں
نیر مجھ تنہا تنہا کے
نیئر رضوی...... لیاقت آباد، کراچی

دسمبر......!

دسمبر کی ہوا کے

ہاتھ اسے سندیسہ بھیجا ہے
پلٹ آنے کا سندیسہ!
اسے رو رو کے حالِ دل
بھی لکھا ہے
لکھا ہے کہ اذیت ہی اذیت ہے
تمہارا ہجر بھی کوئی قیامت ہے
تجھے بیتے دنوں کا واسطہ آ جا
مگر یہ بے وفا بوڑھی
دسمبر کی ہوائیں بھی
کسے معلوم اس تک یہ
مرا سندیس لے جاتی بھی ہوں گی
یا......وہی شائد
مری کیفیتوں سے حالتوں سے
خواہشوں سے حسرتوں سے
باخبر ہو کر
بھی وہ انجان ہی بنتا رہا ہوگا
کسی کا ہو گیا ہوگا
تبھی تو لوٹ کر آتا نہیں ہے

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی......گاؤں بدر مرجان

غزل

عشق ان سے لڑا رہا ہوں میں
اپنی گردن کٹا رہا ہوں میں
داستانِ الم سُنا کر آج
پتھروں کو رُلا رہا ہوں میں
چھپ کے رو لیتا ہوں میں شام و سحر
دردِ دل یوں چھپا رہا ہوں میں
وہ مرے نام سے بھی بھاگیں ہیں
جن کو دل میں بسا رہا ہوں میں
خون سے ان کے ہاتھ رنگیں ہیں
جن سے نظریں ملا رہا ہوں میں
ان کی یاد آ رہی ہے رہ رہ کر
جن کو دل سے بھلا رہا ہوں میں
میری خوش قسمتی تو دیکھو ذرا
ان کو بھی یاد آ رہا ہوں میں
ان کی یادوں پہ اے وسیم حزیں
جان اپنی لٹا رہا ہوں میں
وسیم علی......سعودی عرب

آنکھیں

موسم گل کا سفر آپ کی سندر آنکھیں
بس یہی مانگتی ہیں میری گداگر آنکھیں
میری حسرت کے سفینے کو ڈبویا تھا کبھی
بھول پائیں گی بھلا کیسے سمندر آنکھیں
خون کی ہولی کہیں بم کے دھماکے یارو
دیکھتی رہتی ہیں چپ چاپ یہ منظر آنکھیں
رقص کرتی ہے میرے گھر میں وہی تاریکی
یاد آتی ہے مجھے تیری منور آنکھیں
ڈال دیتی ہیں میری جھولی میں اشکوں کے گلاب
جانے ہر بار یہ تیری سکندر آنکھیں
بس یہی مجھ میں بڑی خامی نظر آتی ہے
فیصلہ کرتی نہیں سوچ سمجھ کر آنکھیں
پیاری کی دے گیا سوغات مجھے وہ رانا
ڈھونڈتی پھرتی ہیں جس شخص کو در در آنکھیں

شاعر: قدیر رانا
انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

سفر کی دھوپ سے آبلہ بناتے چلے
رہ وفا میں نقش پا بناتے چلے
تمہارے ہجر نے شوق کو جلا بخشی
سواد عشق میں قافلہ بناتے چلے
انہیں ہے پہلا سرا یہ تو دوسری جانب
خیال یار کا ہر زاویہ بناتے چلے
طوالت آئے گی رستے میں یہ کسے معلوم
بے چہرگی کو آئینہ بناتے چلیں
بہت سا شور سب کو کہاں سنائی دے
اپنے اسلوب سے اپنی صدا بناتے چلے
ظریف احسن......گلستان جوہر، کراچی

زرین قمر

سمیر احمد فاروقی کوئی عام نوجوان نہیں تھا وہ ماں کے پیٹ سے ذہین پڑھنے کی خداداد صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ خطرے کا احساس اسے وقت سے پہلے ہوجاتا تھا لیکن اس کی سترہویں سالگرہ پر اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا مختلف ہے پھر ایک حادثے نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنی خداداد صلاحیت کو بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ اس کا جینا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا شروع کردیا اور سپرہیرو بن گیا لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جو اسے مارنا چاہتی تھی۔

اس کہانی کے نام، کردار، جگہیں اور واقعات رائٹر کے ذہن کا تخیل ہیں اور کسی سے ان کی مماثلت صرف اتفاقیہ ہوگی۔

"کیا تم نے اسے اپنی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ بتایا؟"

"نہیں یہ میرے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا ہے۔" سمیر نے کہا تو ناصر زیرلب مسکرایا۔ اسی وقت ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی جس کے ہاتھوں میں مشروبات کی ٹرے تھی۔

"آؤ مسز جانس۔" میک نے کہا اور پھر ناصر کی طرف مڑا۔

"ناصر یہ میری بہت اچھی ملازمہ ہے...... یہ چھٹیوں پر تھی...... ابھی آئی ہے...... میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اور اپنے کام کو بھی خوب سمجھتی ہے۔ آپ کے بغیر کہے مشروبات لے کر آئی ہے۔" ناصر نے کہا۔

"ہاں! اسے معلوم ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔" میک نے جواب دیا۔ ملازمہ نے سب کو الگ الگ مشروبات پیش کئے تھے۔ اسی وقت ہال کا دروازہ کھلا اور پرانے فیشن کے لباس میں ملبوس ایک شخص ہال میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں پرانے طرز کا ساز تھا اور وہ اسے بجانے لگا میک حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ شخص غائب ہوگیا تھا۔ میک نے سوالیہ نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا۔

"سمیر! یہ سب کیا تھا؟ میرے پاس کوئی ایسا شخص نہیں ہے؟" میک نے کہا۔

"یہ ایک خواب تھا...... ایسا خواب جو ہم جاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔" سمیر نے کہا۔

"یہ تمہاری حرکت تھی......؟" میک نے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل یہ میری اور تمہاری ملی جلی کوشش تھی۔" سمیر نے جواب دیا۔

"میں نے پائپر مین کا تصور کیا اور یہ تصوراتی تصویر تمہارے دماغ کو بھیج دی اور تم اسے تصوراتی خواب کی طرح جاگتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔"

"لیکن وہ حقیقت میں یہاں تھا...... میں اسے دیکھ سکتا تھا...... سن سکتا تھا؟" میک نے کہا۔

"کبھی تم نے سچے خواب دیکھے ہیں؟" میک نے پوچھا۔

"ہاں!...... ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔"

"اسی طرح تم جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھ سکتے ہو۔"

"کیا یہ تمہاری صلاحیتوں میں سے ایک ہے؟"

"ہاں! دراصل یہ کچھ مشکل ہے لیکن میں اس پر قادر ہوں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم چاہو تو لوگوں کے ذہن کو فریز کر سکتے ہو یا ان کے دماغ میں جھانک سکتے ہو یا انہیں ایسی چیزیں دکھا سکتے ہو جو بظاہر موجود نہ ہوں؟"

"ہاں! تم یہ بھی کر سکتے ہو؟"

"تم کسی کے ساتھ بھی ایسا کر سکتے ہو؟"

"ہاں! بس اس کے ساتھ تمہاری آنکھوں کا رابطہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں جتنی دیر انہیں دیکھتا ہوں گا تو میں انہیں اپنے سحر میں گرفتار رکھ سکتا ہوں۔ اس کمرے کے باہر بھی۔"

"حیرت انگیز۔" میک نے اپنی کرسی پر پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری صلاحیتوں کو عقل مندی سے استعمال کریں تو ہمارے اور MIS بلیک آپریشن کے درمیان کھیل کا میدان بالکل تبدیل ہو جائے گا۔ بس ہمیں ان سے کسی حدتک قریب رہنا ہوگا۔" میک نے کہا۔

"اور مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں ایک بامقصد کام کر رہا ہوں۔" سمیر نے کہا اور اسی لمحے مسز جانس دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"کھانا تیار ہے جناب۔" اس نے کہا تو میک نے مسز جانس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا تم حقیقت ہو؟" اس نے کہا۔

"معافی چاہتی ہوں جناب؟" مسز جانس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور کمرے میں موجود سب لوگ ہنسنے لگے۔

"کوئی بات نہیں مسز جانس۔ میں مذاق کر رہا تھا۔" میک نے ہنستے ہوئے کہا۔ مسز جانس اثبات میں سر ہلاتی وہاں سے رخصت ہوگئی تھیں۔

"کھانے کے بعد سمیر میں تمہیں ان لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں جن کے ساتھ ہمارا واسطہ ہے ان میں سے ایک اعلیٰ شخصیت جس کا تعلق MIS بلیک آپریشن سے ہے وہ گرینڈن ویسٹ ہے اور وہ گورنمنٹ کا آدمی ہے جس کا رابطہ لارڈ میلڈن سے ہے اور ہمارے پرائم منسٹر اور لارڈ

میلڈن کے درمیان رابطہ کا واحد ذریعہ ہے۔"

"کیا آپ مجھے ان کی پہچان کرواسکتے ہو؟"

"مینڈلسن تو نیوز کے شعبے سے متعلق ہے اس کے متعلق معلومات ملنا بہت آسان ہے لیکن ویسٹ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہ کر کام کرتا ہے اور شہرت سے گھبراتا ہے لیکن میرے پاس ایک DVD ہے MIS کی ایک کانفرنس کی ویڈیو ہے جو میں نے اپنی ریٹائرمنٹ سے کچھ پہلے ہی اٹینڈ کی تھی اس کی ایک کاپی میرے پاس ہے۔"

"کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے؟" میک نے سمیر سے پوچھا۔

"اگر تم ایک بار کسی کے دماغ سے رابطہ کرلو اور پھر وہ رابطہ کیسے توڑتے ہو کیا تم چوبیس گھنٹے اس کے دماغ میں گھسے رہتے ہو؟"

"میرے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے جب چاہوں رابطہ توڑ سکتا ہوں جب چاہوں جوڑ سکتا ہوں لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے کہ اگر تم میرے ذہن سے رابطہ رکھو گے تو مجھے شاور لیتے ہوئے اور میرے بیڈ پر بھی دیکھ سکتے ہو؟" میک نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے...... میری اپنی بھی حدود ہیں میں وہ پار نہیں کرتا۔" سمیر نے کہا۔ کمرے میں موجود کیرین اور ناصر بھی اس کی بات پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ پھر کیرین اور ناصر اپنے کمرے میں چلے گئے اور سمیر میک کے ساتھ اس کے اسٹڈی روم میں آگیا تھا تاکہ مطلوبہ DVD دیکھ سکے۔

میک نے DVD پلیئر میں ایک کیسٹ لگائی تھی اور سمیر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا پھر DVD پلے کرکے خود بھی سمیر کے برابر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسکرین پر جو امیج ابھرا تھا ایک کانفرنس روم کا تھا جس میں لوگ کرسیوں کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے تھے اور ایک شخص کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر ایک چارٹ لگا ہوا تھا وہ شخص لوگوں سے باتیں کررہا تھا۔

"یہ جو شخص سامنے کھڑا نظر آرہا ہے یہ گرینڈن ویسٹ ہے یہ اب MIS بلیک آپریشن کا ڈائریکٹر ہے جب یہ ریکارڈنگ کی گئی اس وقت یہ MIS کے ایک سیکشن کا انچارج تھا جس کا تعلق دہشت گردی ختم کرنے سے تھا۔"

میک نے کہا اور ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا انہوں نے وہ ویڈیو پندرہ منٹ تک دیکھی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے سمیر؟" میک نے پوچھا۔

"کیونکہ میڈیلسن زیادہ فعال ہے میرا خیال ہے کہ میں اس کے ذریعے ویسٹ تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں۔" سمیر نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا میرا خیال ہے کہ یہ دونوں مل کر کسی نئے پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ ہمیں ان پر نظر رکھنا ہوگی اور پتہ کرنا ہوگا کہ کیا کرنے والے ہیں۔" میک نے کہا۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔" سمیر نے کہا۔

"اگلے ہفتے لندن میں BBC پر میڈیلسن کا انٹرویو آنے والا ہے میرے پاس اس پروگرام کے پاس ہیں میرا خیال ہے اس پروگرام میں شرکت کی جائے۔ میں تمہیں پروگرام میں ایسی جگہ پر سیٹ دلوادوں گا جہاں تمہارا میڈیلسن کے ساتھ eye contact ممکن ہو۔ یہ اچھا موقع ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔" میک نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے...... میں اس خیال سے متفق ہوں۔" سمیر نے کہا۔

"لندن میں میرا اپنا فلیٹ موجود ہے ہم وہیں قیام کریں گے۔ ناصر اور کیرین ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔" میک نے سمیر کو بتایا۔ اس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اگلے ہفتے پروگرام سے پہلے پہلے وہ لندن میں واقع میک کے فلیٹ میں پہنچ چکے تھے اور پروگرام کے دن سمیر میک کے ساتھ بی بی سی اسٹیشن پہنچ گیا تھا جہاں میک نے پروگرام کے دوران اسے ایسی بہترین جگہ دلوائی تھی کہ وہ میڈیلسن کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ میک بھی پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا اس نے ایک ہیڈسیٹ پہنا ہوا تھا جس میں مائیکروفون بھی لگا ہوا تھا اس نے اس کانگشن کمرے میں موجود ایمپلی فائر سے کردیا تھا۔

"خواتین وحضرات مہربانی کر کے میری طرف متوجہ ہوں۔" اس نے کہا پھر چند لمحوں کے بعد اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"میرا نام جارج اون ہے میں اسٹوڈیو مینیجر ہوں چند ہی لمحوں میں ہمارا پروگرام "کوئس ٹائم" کی ریکارڈنگ شروع ہونے والی ہے......اس سے پہلے ہم تھوڑی سی ریہرسل کر رہے ہیں تاکہ ہم اپنے آلات چیک کر لیں اس کے بعد ریکارڈنگ کا باقاعدہ آغاز کریں گے...... ریکارڈنگ کے دوران کوئی وقفہ نہیں ہوگا چنانچہ نہ کوئی باہر سے اندر آئے گا اور نہ اندر سے باہر جا سکے گا۔"

پروگرام کا آغاز ہوتے ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ پروگرام مینیجر کے اشارے پر ایک شخص نے اٹھ کر میڈیلسن سے سوال کیا تھا اور میڈیلسن کے جواب دینے کے بعد اگلا سوال ہونے تک کے وقفے میں سمیر میڈیلسن کے دماغ میں پہنچ چکا تھا اور میڈیلسن کو ٹرانس میں لے کر MIS آپریشن کا لفظ دہرایا تھا اور اس کے ساتھ ہی میڈیلسن کے دماغ نے کام شروع کر دیا تھا اس کے ذہن کے پردے پر ایک منظر کسی خواب کی طرح چلنے لگا تھا۔

"وہ ایک کار میں بیٹھا پرائم منسٹر ہاؤس کی طرف جا رہا تھا اسے پرائم منسٹر نے ہی بلایا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ کار رکتے ہی اسے ایک ملازمہ ایک بڑے ہال میں لے گئی تھی جہاں پرائم منسٹر اس کے منتظر تھے۔

"گڈ مارننگ جارج۔" پرائم منسٹر نے کہا......"بیٹھو۔" وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ملازمہ واپس چلی گئی۔

"جارج ایک بڑھتے ہوئے مسئلے نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔" پرائم منسٹر نے کہا۔

"ہم دہشت گردی کے خلاف جو اقدامات کر رہے ہیں اس میں ہمیں مشکلات پیش آ رہی ہیں ملکی سطح پر بھی اور پارلیمنٹ میں بھی اور ملک میں جگہ جگہ احتجاج کیا جا رہا ہے اس کے علاوہ مڈل ایسٹ میں بھی ہمیں اپنے ملٹری آپریشن میں جو حمایت حاصل تھی اسے ہم کھوتے جا رہے ہیں۔"

"میں آپ کی بات سے متفق ہوں جناب پرائم منسٹر۔ ہم جو اپنے لوگوں کے دماغوں اور دلوں پر راج کرتے تھے اب وہ اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔" میڈیلسن نے کہا۔

"پہلے نیویارک میں حملے ہوئے اور اب یہاں لندن میں ہوئے اس کی وجہ سے لوگوں میں ہماری مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔" پرائم منسٹر نے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے ہم جتنا دہشت گردوں سے لڑتے ہیں لوگوں میں اپنی مقبولیت کھوتے جا رہے ہیں لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں ہمارے فوجی کیوں مر رہے ہیں یوں لگتا ہے لوگ بھول گئے ہیں کہ ہم نے اس جنگ میں حصہ کیوں لیا تھا۔"

"جارج میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں دہشت گردی کے خلاف پالیسیوں پر نظر ثانی کرو اور اگر کہیں کوئی کمی ہے تو اسے درست کرو کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟" پرائم منسٹر نے کہا۔

"جی ہاں! جناب مجھے یقین ہے کہ میں یہ معاملہ اچھی طرح ہینڈل کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہمیشہ کی طرح میں چیک نہیں کروں گا کہ کس طرح کام کر رہے ہو مجھے بس ان معاملات کو درست ہوتے ہوئے دیکھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے پرائم منسٹر آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔" میڈیلسن نے کہا۔

"گڈ لک جارج۔" پرائم منسٹر نے کہا اور میڈیلسن واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں دوسرا منظر ابھرا تھا اس نے اپنے آفس پہنچ کر گرلینڈ ویسٹ سے رابطہ کیا تھا اور اس کے ساتھ اس سلسلے میں ایک میٹنگ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ویسٹ نے اسے دو دن بعد کا وقت دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی سمیر میڈیلسن کے ذہن سے نکل گیا تھا اور میڈیلسن نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ کمرے میں موجود دوسرا شخص اس سے اگلا سوال کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پروگرام ختم ہو گیا تھا اور سمیر کو اپنے کام کی معلومات حاصل ہو گئی تھیں واپسی پر میک اور ناصر کے پوچھنے پر اس نے انہیں مختصر سی معلومات دی تھیں کہ اس نے میڈیلسن کے ذہن میں کیا دیکھا۔

"میڈیلسن کو ہائی اتھارٹی کی طرف سے احکامات دیئے گئے ہیں کہ وہ ملک میں لوگوں کی رائے کو حکم رانوں کے حق میں استوار کرے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں

جن سے لوگ یہ سمجھ سکیں کہ مڈل ایسٹ میں ہمارے فوجی آپریشن عوام کے حق میں ہیں کیونکہ عوام یہاں دہشت گردی کا نشانہ بن رہے ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''گویا اب پھر MIS آپریشن کا ہیڈ پریس اس کے ساتھ کام کر چکا ہوں لیکن میں نے بھی اس کو پسند نہیں کیا۔'' میک نے بتایا۔

''اب میڈیلسن اس سے ملنے والا ہے دو دن بعد..... لیکن کہاں؟ یہ نہیں معلوم۔'' سمیر نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ایک بار اور میڈیلسن کے دماغ کو پڑھنا ہوگا تاکہ ویسٹ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں پتہ کیا جاسکے۔'' میک نے کہا۔

''ہاں یہ ضروری ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

فلیٹ پر پہنچنے کے بعد میک نے ناصر اور سمیر کو اپنے ایک اور دوست اور شریک کار کے بارے میں بتایا تھا۔

''میرا خیال ہے اگر تم راجر سے مل لو تو تمہیں کافی مدد مل سکتی ہے۔'' میک نے کہا۔

''راجر کو بھی میں MIS کے زمانے سے جانتا ہوں۔ آج کل وہ لندن میں کنٹرول روم چلا رہا تھا اور ہمارے مشن کا حصہ ہے اور یہ کام کیرین کرے گی وہ بھی کل یہاں آئے گی اور تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر راجر سے ملوائے گی۔''

''ناصر میرے ساتھ ہوگا؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں! تم اسے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ راجر تمہیں آرگنائزیشن کا کارڈ بھی بنا کر دے گا اور اس کے بارے میں تمہیں بتا دے گا۔'' میک نے کہا پھر وہ رخصت ہوگیا تھا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح کیرین فلیٹ پر پہنچ گئی تھی اس نے آتے ہی ناصر اور سمیر کے لیے ناشتہ بنایا تھا جس کا سامان وہ ساتھ ہی لائی تھی۔ سمیر نے اندازہ لگایا کہ میک نے اب تک ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا ناشتہ کے دوران کیرین نے سمیر کو بتایا کہ آج وہ اسے لندن کے کچھ مقامات کی سیر بھی کرائے گی اور راجر کا آفس بھی دکھائے گی۔''

''ٹھیک ہے یہی ہماری بھی پلاننگ تھی۔'' سمیر نے کہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کیرین کے ساتھ شہر کی سیر کے لیے روانہ ہوگئے تھے سمیر نے کیرین کو میڈیلسن کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''ہاں..... ہر کوئی جانتا ہے کہ میڈیلسن گورنمنٹ کے لیے معاملات طے کرتا ہے دوسری پارٹیوں کے ساتھ۔''

''گویا وہ گورنمنٹ فکسر ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں! اور اس کام کے لیے مشہور ہے۔'' کیرین نے جواب دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تینوں بلڈنگ سے نکل گئے تھے اور لندن کے ٹاور ہل ٹیوب اسٹیشن پہنچ گئے تھے جہاں سے انہیں ویسٹ منسٹر تک پہنچنے کے لیے ٹرین لینا تھی وہ چلتے ہوئے ایبنگڈن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے پارلیمنٹ ہاؤس کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور ہارس فلری روڈ کی طرف مڑ گئے تھے۔ تب کیرین نے اشارہ کر کے انہیں MIS آپریشن کا ہیڈ کوارٹر دکھایا تھا۔ وہ سڑک کے ایک جانب ہی بڑی سی عمارت تھی اور راجر کیرن کا آفس بلڈنگ کے ایک حصے میں تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ماڈرن ٹیکنالوجی سے متعلق لوگوں کو مہنگے شہروں میں ملازمت اور رہائش دینا ممکن نہیں تھا اور راجر کیرن کو یہاں کچھ ایسے آفس مل گئے تھے جنہیں ان کی کمپنیوں نے کسی وجہ سے استقبال نہیں کیا تھا اور وہ راجر کو سستے میں مل گئے تھے اور وہ گورنمنٹ کے لیے عام لوگوں تک کی معلومات فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

وہ تینوں بلڈنگ میں داخل ہونے کے بعد لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچے تھے جہاں راجر کے آفس تھے۔ کیرین نے راجر کے سوئیٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے اپنا کارڈ استعمال کیا تھا اور آفس کے بیرونی حصے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ایک استقبالیہ کلرک نے کیرین کو خوش آمدید کہا تھا۔

''ہیلو میری کیسی ہو؟ آج ہمارے ساتھ دو مہمان ہیں سمیر احمد فاروقی اور یہ ناصر محمود۔ ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔'' کیرین نے کہا۔

''میں میری روبن ہوں۔'' میری نے ان سے اپنا تعارف کروایا۔ ''آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میری نے کہا اس وقت راجر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آ گیا۔

"یہ لوگ ہمارے ساتھ اہم کام میں حصہ لیں گے میرا یہی خیال ہے تم ان کے بیج اور کی کارڈ بنا دو۔"

"اچھا مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے میں ان دونوں کو تمہاری حفاظت میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

کیرین نے ہنستے ہوئے کہا اور آفس سے باہر چلی گئی اس کے ساتھ ہی میری کھڑی ہوگئی تھی اور اس نے ان دونوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے باری باری ایک ایک تصویر بنالی تھی۔

"یہ لیں یہ vistors bages ہیں۔" اس نے دو بیج ناصر اور سمیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ استعمال کر سکتے ہیں جب تک کہ آپ کے بیجز نہیں بن جاتے۔" پھر اس نے باری باری وہ بیجز ان دونوں کی شرٹ پر لگا دیئے تھے۔

"آپ کے کارڈ اور بیجز تقریباً آدھے گھنٹے میں بن جائیں گے۔" میری نے کہا اور پھر راجر ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنے آفس میں لے گیا۔

راجر کے آفس میں اس کی میز بہت بڑی تھی جس کے پیچھے ایک بڑی سی executive chair تھی اور اس کی پشت پر بڑی سی کھڑکی جس سے روشنی کمرے میں آرہی تھی اور وہاں سے آدھے شہر کا منظر نظر آتا تھا۔ سارے آفس میں گہرے رنگ کی فلورنگ ہوئی تھی اور ایک دیوار پوری ایک کیس سے بھری ہوئی تھی۔ جس میں سیکڑوں کتابیں تھیں۔ پھر راجر نے اپنے ڈریسنگ کی ایک دراز سے ایک چابی نکالی تھی اور اسی دراز میں لگے ایک تالے میں گھمائی تھی اس کے ساتھ ہی ایک آواز ہوئی تھی اور بک شیلف آہستگی سے ایک طرف کھسک گیا دیوار پر بہت سے ٹی وی اسکرین نظر آرہے تھے۔ اس کے ساتھ کمپیوٹر مانیٹرز تھے۔ کی بورڈ تھے۔ اور دوسرے ورک بینرز تھے اور اس کے ساتھ ایک لمبی سی میز تھی اور اس کے ساتھ ہی تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں بہت کچھ ہوتا ہے...... بہت کچھ...... یہ ہمارا کنٹرول سینٹر ہے۔" راجر نے کہا اور دیوار پر لگا ایک سرخ بٹن دبا دیا اور سامنے لگے سارے اسکرین آن ہوگئے۔ ان پر مختلف سڑکوں کے مناظر نظر آرہے تھے اور کمپیوٹر اسکرین پر ایک لوگو بنا ہوا تھا جس میں ایک شطرنج کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ جس کے درمیان میں شطرنج کا ایک پیادہ کھڑا تھا ناصر نے دھیان سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہی لوگو اس بیج پر بھی بنا ہوا ہے جو میری نے انہیں دیا ہے اس کا مطلب ہے کہ یہ راجر کی آئی ڈی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" راجر نے ناصر سے پوچھا۔

"زبردست!" ناصر نے کہا تب ہی راجر نے انہیں بیٹھنے کے لیے دو کرسیاں پیش کیں۔

"آؤ بیٹھو! میں تمہیں ایک معلوماتی سفر کرواتا ہوں۔"

راجر نے کہا اور خود ایک بڑے کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھ گیا۔ ناصر اور سمیر بھی بیٹھ گئے تھے۔

"یہاں پر لندن میں چلنے والا سارا ٹریفک دیکھا جاسکتا ہے۔" راجر نے کمپیوٹر اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم کلوز سرکٹ کیمرے کی مدد سے سگنل موصول کرتے ہیں جو مختلف بلڈنگوں پر اور دوسری جگہوں پر لگے ہوئے ہیں اور ان کمپیوٹرز کی مدد سے کیمروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔" راجر نے کہا اور اپنی شرٹ سے اپنا بیج اتار کر اس پر لکھا ہوا بار کوڈ ایک ویب کیم کے لینس کے سامنے سے اسکین کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ایک اور ڈیوائس پر رکھ دیا۔

"یہ فنگر پرنٹ شناخت کے لیے ہے۔" ناصر نے پوچھا۔

"ہاں۔" راجر نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی UK کا ایک نقشہ راجر کے سامنے موجود مونیٹر پر نظر آنے لگا اس نے نقشے کے ایک حصے پر کلک کیا اور برمنگھم کا علاقہ نظر آنے لگا جس میں جگہ جگہ انگوٹھے کے نشانات مختلف جگہوں کو ظاہر کر رہے تھے پھر راجر نے ایک اور انگوٹھے کے نشان پر کلک کیا تو فل امیج اسکرین پر نمودار ہوگیا۔

"یہاں ہمیشہ بہت رش ہوتا ہے۔ راجر نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا نظام ہے۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں اسی طرح ہم ٹرینوں کو اور دوسری جگہوں کو بھی مانیٹر کر سکتے ہیں دراصل ہم ویب سے مدد لیتے ہیں جہاں سے تمام معلومات اور تصویریں ہمیں ملتی ہیں۔" راجر نے کہا۔

"بس ہمیں کچھ سوفٹ ویئر استعمال کرنے پڑتے

ہیں۔"

"ایک اور خصوصیت ہے اس سسٹم کی۔" راجر نے کہا

"وہ کیا؟" ناصر نے پوچھا اور راجر پھر کمپیوٹر کی طرف مڑ گیا۔

"میکس لینڈ روڈ۔" اس نے کہا اور دوسرے ہی لمحے کمپیوٹر اسکرین پر میک کی گاڑی کی تصویر سامنے آ گئی جو فورٹ ولیم ریلوے اسٹیشن پر کار پارکنگ میں کھڑی تھی۔

"آٹو میٹک نمبر پلیٹ پہچان کا سسٹم۔" ناصر نے زیر لب کہا۔

"ہاں اسی طرح یہ چیزوں کو بھی پہچان سکتا ہے۔" راجر نے کہا اور پھر اس نے کئی کیز ایک ساتھ دبائی تھیں اور دس سیکنڈ بعد مونیٹر پر کیرین ناصر اور سمیر کی تصویر ابھر آئی تھی جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"آٹو میٹک چہرہ پہچاننے کا سسٹم؟" سمیر نے کہا

"کسی کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں۔" ناصر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس سسٹم کے تحت ہم تخریب کاروں کو بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔" سمیر نے کہا تھا اور مسکرانے لگا تھا۔

"چلو اب اس پروجیکٹ پر بات کرتے ہیں جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔" راجر نے کہا۔

"کل رات کے ٹی وی پروگرام میں میڈ یلین کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میک نے مجھے بتا دیا ہے اور اب سمیر تمہیں ضرورت ہے دوبارہ میڈ یلن سے دماغی رابطہ کرنے کی اور اس کے لیے تمہیں آئی کنٹیکٹ کرنا ضروری ہے اور وہ تب ہی ہو سکتا ہے جب تم اس کے سامنے موجود ہو جیسے کل بی بی سی کے ٹی وی پروگرام میں تھے۔

"اس کے لیے میں تمہیں موقع فراہم کر سکتا ہوں ہمارے اہم گورنمنٹ دفاتر میں صفائی کے لیے جو عملہ رکھا جاتا ہے کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انگریزی بولنے والا نہ ہو ایسا سیکورٹی کے خیال سے کیا جاتا ہے میرے کلائنٹس میں ایک ایسی کلنگ کمپنی ہے جو مینڈیلسز بلڈنگ میں صفائی کا کام کرواتی ہیں تمام صفائی کرنے والے اسپیشل ہیں جو بالکل انگلش سے واقف نہیں جو ہر منگل کی شام کو اس بلڈنگ میں صفائی کا کام کرتے ہیں میں ان میں تمہیں شامل کروا سکتا ہوں اور تم ان کے ساتھ اندر جا سکتے ہو آگے تمہارا کام ہے۔" راجر نے کہا۔

"اور اگر مجھے اپنے کام کا موقع نہ مل سکا تو؟" سمیر نے پوچھا۔

"تو تم اس کے آفس کی صفائی کر کے آ جانا۔" راجر نے ہنستے ہوئے مذاق کیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آؤ اب باقی گفتگو میرے دوسرے آفس میں ہوگی۔" اس نے کہا اور بٹن دبا کر پھر بک شیلف کو اپنی جگہ پر کر دیا تمام اسکرین ٹی وی اور سارا سامان دوبارہ اس شیلف کے پیچھے غائب ہو گئے تھے اور راجر دوسرے کمرے میں آ گیا تھا ناصر اور سمیر بھی اس کے ساتھ تھے اسی وقت راجر کی سیکرٹری میری نے آ کر اطلاع دی تھی کہ میک آیا ہے اسے بھی راجر نے وہیں بلوا لیا تھا اور اسے بھی میڈ یلین کے بارے میں نئے منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔

"تم سمجھتے ہو کہ منگل کی شام کو میڈ یلین اپنے آفس میں ہوگا؟" میک نے پوچھا۔

"وہ ہمیشہ رات دیر تک کام کرتا ہے چنانچہ وہ یقیناً وہاں ہوگا۔" راجر نے کہا۔

"اور صفائی عملے کا یونیفارم کہاں سے آئے گا؟" میک نے پوچھا۔

"وہ سب سفید اوور کوٹ پہنتے ہیں جس پر کمپنی کا لوگو بنا ہوتا ہے ماریا یہ معاملہ سنبھال لے گی میں سمیر کو منگل کی شام میڈ یلین کے آفس لے جاؤں گا۔" راجر نے کہا۔

"ماریا کون ہے؟" میک نے پوچھا۔

"وہ وہاں کام کرنے والوں کی سپروائزر ہے میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں وہ ہماری مدد کر دے گی۔"

"ٹھیک ہے پھر تم منگل کی شام یعنی کل شام ساڑھے چار بجے سمیر کو اس کے فلیٹ سے لو گے۔" میک نے کہا۔

"ٹھیک ہے سمیر کل شام ساڑھے چار بجے تم تیار رہنا۔" راجر نے سمیر سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ لوگ اس کے آفس سے نکل گئے تھے۔

"سمیر میں تمہیں فلیٹ پر چھوڑ دوں گا اور ناصر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا وہ شاید تمہارے پاس دیر سے واپس آئے میں نے کیرین سے کہہ دیا ہے وہ تمہارے لیے رات

کے کھانے کا بندوبست کردے گی۔'' مِیک نے کہا پھر اس نے سمیر کو فلیٹ پر چھوڑ دیا تھا اور ناصر کو اپنے ساتھ لے گیا تھا سمیر سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی اور سمیر نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا کیرین ہاتھ میں دو شاپرز لیے سامنے کھڑی تھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جیسے جگنو چمک رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آ رہی ہو؟'' سمیر نے پوچھا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا کیرین اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتی سیدھی کچن میں چلی گئی تھی اور سمیر بھی اس کے پیچھے تھا۔

''میں نے پوچھا کس بات پر اتنی خوش نظر آ رہی ہو؟'' سمیر نے ایک سوال دہرایا تو کیرین نے شاپرز کچن میں رکھی کھانے کی میز پر رکھا اور آگے بڑھ کر سمیر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' سمیر تیزی سے پیچھے ہٹا تو کیرین ہنسنے لگی۔

''آج تم کیسی حرکتیں کر رہی ہو؟'' سمیر نے حیرت سے کہا۔

''تم کیسے ذہنوں میں جھانکنے والے ماہر ہو...... تمہیں اپنی صلاحیتوں پر بڑا ناز ہے؟'' کیرین نے کہا۔

''ہاں تو پھر؟''

''تمہیں دعویٰ ہے کہ تم دوسروں کے دل کا حال جان جاتے ہو؟''

''ہاں اور یہ درست ہے۔''

''تو پھر ہمیں آج ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کتنے دن ہو گئے تمہیں میرے دل کی آواز سنائی نہیں دی؟'' اس نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا اور ایک بار پھر سمیر کی طرف بڑھی سمیر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

''شاید پہلے کبھی کسی لڑکی سے واسطہ نہیں پڑا۔'' کیرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم چاہتی کیا ہو؟ مِیک نے کہا تھا کہ تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو گی؟''

''وہ تو میں ساتھ لائی ہوں...... ابھی تیار کرتی ہوں لیکن تم......'' کیرین بات کرتے کرتے رک گئی اور سمیر کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو یا سمجھنا نہیں چاہتے؟'' اس نے کریدتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

'......آج بہت بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو' سمیر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں ایک پروگرام کے تحت ملے ہیں اور کام کر رہے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''یہ تم کہہ سکتے ہو...... کیونکہ تم بے حس ہو...... تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہے کہ میں...... تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''میرے لیے یہ خبر عجیب ہے۔''

''کیوں ایک لڑکی کا ایک لڑکے کو پسند کرنا عجیب کیسے ہو گیا یہ تو قانون فطرت ہے انسانوں کو محبت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور مرد اور عورت کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا یا محبت کرنا ایک فطری عمل ہے۔'' کیرین نے فلسفہ پیش کیا۔

''یہ تم کہہ سکتی ہو...... لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں سمجھا جاتا...... تم جانتی ہو میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں مسلمان ہوں ہمارے ملک اور مذہب میں غیر عورت کے ساتھ بے تکلفی پسند نہیں کی جاتی میں یہاں جس کام سے آیا ہوں اسے مکمل کر کے واپس چلا جاؤں گا۔''

''یہ بتاؤ کیا تمہیں بالکل بھی احساس نہیں ہوا کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہوں؟''

''میں اتنا انجان بھی نہیں ہوں میں سب سمجھتا ہوں لیکن میری کچھ حدود ہیں جنہیں میں پار نہیں کر سکتا۔''

''تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی...... چلو آؤ کچن میں میری مدد کرو۔'' کیرین نے موضوع بدل دیا اور شاپرز میں سے چیزیں نکالنے لگی۔

''تمہارے والدین میرا مطلب ہے وہ پاکستان میں کہاں رہتے ہیں؟'' کیرین نے پوچھا۔

''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔'' سمیر نے اداسی سے کہا۔

''کوئی اور بہن بھائی؟''

''نہیں میرے والدین نے بہت محبت سے پرورش کیا

تھا میں انہیں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔''

''والدین میں تم زیادہ کسے چاہتے تھے والدہ کو یا والد کو؟''

''میرے لیے دونوں ہی اہم تھے لیکن والدہ کے ساتھ زیادہ بے تکلف تھا وہ میری سالگرہ پر اپنے ہاتھ سے میرے لیے کیک بناتی تھیں۔'' سمیر نے کہا اور اسے وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس کے والدین کا انتقال ہوا تھا اس کی والدہ کیک ہی بناتے ہوئے حادثے کا شکار ہوئی تھیں وہ اداس ہو گیا اور کچن سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا کچھ دیر بعد کیرین بھی وہاں آ گئی تھی۔

''مجھے افسوس ہے میں نے تمہیں اداس کر دیا سمیر شاید کوئی پچھلا ناخوشگوار واقعہ یاد آ گیا تمہیں؟''

''ہاں اب اس ذکر کو چھوڑ دو۔''

''چلو ٹھیک ہے کھانے کے بعد ہم باہر گھومنے جائیں گے میں تمہیں یہاں کی مشہور اور خوبصورت جگہیں دکھاؤں گی۔'' کیرین نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سمیر نے جواب دیا پھر وہ کھانا بنانے میں اس کی مدد کرنے لگا تھا۔

''تم نے میڈیلین کے دماغ میں پہنچ کر اسے کیسا پایا؟'' کیرین نے اس بار اس سے کوئی ذاتی سوال پوچھنے سے گریز کیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اتنا ہی کام کر رہا ہے جتنا اس کے سپرد حکومت کی طرف سے کر دیا جاتا ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''اور اب اس کے ذمہ وزیراعظم نے کیا کام لگایا ہوگا؟'' کیرین نے تجسس سے پوچھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اسے ملک میں جگہ جگہ کچھ ایسے کام کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہوگی جس سے یہاں کے عوام براہ راست متاثر ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''جگہ جگہ دھماکے کروائے جا سکتے ہیں یا ایسے حادثات جو سنگین نوعیت کے ہوں جن میں لوگوں کا جانی اور مالی نقصان ہو۔''

''لیکن بھلا حکومت اپنے ہی عوام کے نقصان کے لئے کیسے کام کرے گی اسے تو لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عوام کی فلاح و بہبود کے ایسے کام کرتی ہے جس سے اسے عوام کی حمایت حاصل ہو تم تو الٹا ہی کچھ کہہ رہے ہو میں یہ بات نہیں مان سکتی کوئی احمق ہی ہوگا جو اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارے گا۔''

''کیرین...... آج کل بہت سے ملکوں میں الٹی پالیسی بھی چل رہی ہے یہ اپنی حکومت کو استحکام دینے کے لیے خود ہی اپنے ملک میں ہنگامے کرواتے ہیں اور پھر اس کا الزام دہشت گردوں پر لگاتے ہیں پھر ان کا مقابلہ مصنوعی کروایا جاتا ہے اور عوام کو دکھایا جاتا ہے کہ حکومت اور فوج ان کے دشمنوں سے مقابلہ کر رہی ہے ان کی حفاظت کے لیے برسرپیکار ہے چنانچہ انہیں عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔''

''لیکن ان کے عوام کو کیا پرابلم ہے جو یہاں یہ کام کروانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں؟''

''تمہیں پتہ ہے یہاں کی افواج کو مختلف اسلامی ممالک میں آپریشن کے لیے بھیجا جاتا ہے برسوں سے ان کے فوجی وہاں جنگیں لڑ رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں مارے جا رہے ہیں اب عوام نے کہنا شروع کیا ہے کہ یہ ہماری جنگ نہیں ہے تو ہم کیوں لڑیں ہماری فوجوں کو واپس بلایا جائے چنانچہ انہیں خاموش کرنے کے لیے بھی تو یقین دلانا ہے کہ ہماری فوجوں کا ان ملکوں میں جنگ کرنا ہماری عوام کے حق میں ہے چنانچہ یہاں حادثے کروا کر ان اسلامی ممالک پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے دہشت گرد یہ کارروائیاں کر رہے ہیں اور یہاں کے ممالک کے عوام کی جانوں کو ان سے خطرہ ہے چنانچہ ان کے خلاف آپریشن ضروری ہے۔'' سمیر نے وضاحت کی۔

''لیکن کیا صرف یہی ایک وجہ ہے ان ممالک میں آپریشن کرنے کی کیونکہ خود حالات خراب کرنے کے بعد اگر ان پر جھوٹا الزام لگا کر چڑھائی کی جاتی ہے تو ان ممالک کو کیا وجہ بتائی جاتی ہے؟''

''یہی جو یہاں کے عوام کو بتائی جاتی ہے کہ وہاں کے دہشت گرد یہاں سرگرم ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''بس یہی وجہ ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سیاسی عزائم بھی؟''

''کیرین تم سب کچھ میرے منہ سے ہی کیوں سننا چاہتی ہو؟ تم ایک رائٹر ہو ایک پبلشنگ کمپنی کے لیے کام کرتی ہو تم نے کافی اخبارات رسائل اور کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اب تو دنیا جان گئی ہے کہ یہ سب ڈرامہ ہے دراصل یہ جنگ دنیا میں اپنا تسلط قائم کرنے اور دوسرے چھوٹے اور کمزور ممالک کے قدرتی ذخائر پر قبضہ کرنے کی جنگ ہیں جو مختلف ممالک میں مختلف ڈھنگوں سے لڑی جارہی ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''تو تم پوری دنیا میں لڑی جانے والی جنگ کو اکیلے کیسے ختم کرسکتے ہو؟''

''جب میں یہاں آیا تو مجھے اس مسئلے کی سنگینی کا اتنا احساس نہیں تھا لیکن اب آہستہ آہستہ اس کی گرہیں مجھ پر کھلتی جارہی ہیں لیکن جو معاملات میرے سپرد کیئے گئے ہیں ان کو تو میں نیک نیتی سے حاصل کرسکتا ہوں اور اپنی حد تک مخلص رہ کر کام کرسکتا ہوں جب کہ میری طرح سوچنے والے میرے ساتھ ہیں۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''یعنی؟ تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے؟''

''میرا اشارہ میک کی طرف ہے جو بلیک آپریشن کا حصہ ہونے کے باوجود ان کے گھناؤنے عزائم کو نہیں جانتا تھا اور جب اسے احساس ہوا کہ وہاں کچھ غلط ہو رہا ہے تو اس نے وہ ملازمت چھوڑ دی اور اس کے ساتھ اس کے کئی ساتھیوں نے بھی ملازمت چھوڑ دی اور پھر انہوں نے مجھے منتخب کیا اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے کیونکہ میرا تعلق بھی ایسے ہی ایک ملک سے ہے جو ان سامراجی آقاؤں کے عتاب کا شکار ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''مجھے بھی احساس نہیں تھا کہ معاملہ اتنا سنگین ہوسکتا ہے میں بھی صرف یہی سمجھتی تھی کہ ہمارے ملک میں ہونے والے حادثات کی روک تھام کرنا ہی مقصد ہے۔'' کیرین نے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ جو تمہاری حکومت کھیل کھیل رہی ہے وہ جائز ہے؟''

''دیکھو سمیر میں اپنی حکومت کی نہیں اپنے ملک کی وفادار ہوں اس کی سلامتی کو خطرہ ہو میں نہیں دیکھ سکتی اور کوئی بھی محب وطن یہ برداشت نہیں کرسکتا لیکن جو تم بتا رہے ہو کہ کس طرح منفی انداز میں کام کیا جاتا ہے میں اس کی بھی حمایت نہیں کروں گی میں اس سلسلے میں میک اور تمہارا ساتھ دوں گی۔'' کیرین نے کہا۔

''اور میرا مقصد بھی کسی کو بلاوجہ بدنام کرنا نہیں ابھی میں نے کچھ ایسی باتیں نوٹ کی ہیں جن سے یہ نتائج اخذ کیئے ہیں لیکن میں انہیں درست ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور گواہ ڈھونڈوں گا یونہی ہوا میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا وقت ثابت کردے گا میں درست ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

''مجھے تم سے اتفاق ہے سمیر میں یونہی تو تمہیں پسند نہیں کرتی تمہاری سچائی اور خلوص دیکھ کر میں بہت ہی متاثر ہوئی ہوں تم مجھے کوئی اہمیت نہیں دیتے ورنہ میں تو ......'' کیرین نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سمیر نے اسے بات پوری کرنے کے لیے مجبور بھی نہیں کیا وہ جانتا تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا وہ ابھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اور جس کام سے یہاں آیا تھا وہی مکمل کرنا چاہتا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کیرین کے ساتھ شہر کی مشہور جگہیں دیکھنے نکل گیا تھا کیرین نے اسے خاص طور پر لندن کا میوزیم دکھایا تھا جہاں انواع واقسام کے نوادرات موجود تھے پھر تفریحی مقامات اور تاریخی عمارتیں حکومت کے اہم دفاتر دکھائے تھے اور آخر میں وہ ضد کرکے اسے تھیٹر لے گئی تھی جہاں ایک بہت ہی خوبصورت ڈرامہ پیش کیا جارہا تھا۔

رات گئے ان کی واپسی ہوئی تھی جب وہ کیرین کو اس کے فلیٹ پر چھوڑتا ہوا اپنے فلیٹ پہنچا تو ناصر وہاں پہنچ چکا تھا۔

''تم کب آئے؟'' اس نے ناصر سے پوچھا۔

''بس ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی میک مجھے چھوڑ کر گیا ہے آج اس نے مجھے اپنی کتابوں کا کلیکشن دکھایا اس کے پاس بہت اچھی کتابیں ہیں اور ہر موضوع پر ہیں۔'' ناصر نے تعریفی انداز میں کہا۔

''ہاں وہ خود بھی تو رائٹر ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''تم اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے کس نتیجے پر پہنچے ہو؟'' ناصر نے کہا۔

''ابھی تو صرف ابتداء ہے ابھی بہت کام باقی ہے ناصر..... آج میک نے اس موضوع پر تم سے کوئی بات

کی؟'' سمیر نے ناصر کو ٹٹولا۔

''اس کا خیال ہے کہ اس کام میں کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں جن کا ذہن تم پڑھ کر انہیں بے نقاب کر سکتے ہو ورنہ اوپر سے تو سب ہی نے ملک کی وفاداری کے لبادے اوڑھے ہوئے ہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''ہاں اسی سلسلے میں کل میرولیٹ سے ملنے جاؤں گا یہ ایسی ملاقات ہوگی جس کا علم اسے نہیں ہوگا میں بھیس بدل کر یہ کام کروں گا۔''

''ہاں میں جانتا ہوں تم میڈیلین کی طرح اس کے ذہن میں پہنچ کر کچھ راز جاننے کی کوشش کرو گے۔''

''ہاں دیکھو کس حد تک کامیابی ہوگی میرے علم کے مطابق آج اس کی ملاقات میڈیلین سے ہوئی ہوگی اور آج کی ملاقات میں ان دونوں کے درمیان کیا طے پایا ہوگا وہ مجھے پتہ کرنا ہے......کل شام چار بجے اس کام کے لیے روانہ ہونا ہے راجر مجھے لینے آئے گا۔'' سمیر نے بتایا۔

''اللہ تعالیٰ ہی ہماری مدد کرنے والا ہے یہاں ہم کسی کو بھی نہیں جانتے۔'' ناصر نے کہا۔

''سب ٹھیک ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ تم فکر مت کرو ہمارے ارادے نیک ہیں اور ہم ایسی برائی کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں جس نے کئی ملکوں میں مصیبت ڈھائی ہوئی ہے اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔'' سمیر نے پریقین لہجے میں کہا پھر وہ ناصر کو آج کیرین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی تفصیل بتاتا رہا تھا جس میں ناصر نے بھی دلچسپی لی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ کیرین بھی ہماری ہم خیال ہے۔''

''ہاں وہ بھی چاہتی ہے کہ تخریب کار عناصر بے نقاب ہو جائیں۔''

دوسرے روز شام چار بجے راجر سمیر کو لینے آ گیا تھا وہ سفید رنگ کی ایک بڑی وین میں آیا تھا اور سمیر کو نیچے ہی سے کال کر کے آنے کو کہا تھا سمیر تیار تھا اور اس کا انتظار ہی کر رہا تھا چنانچہ وہ نیچے آ کر اس کی وین میں بیٹھ گیا تھا۔

''پہلے ہم کلیننگ کمپنی کے آفس جائیں گے۔'' راجر نے کہا۔ ''اور اس کے بعد جیسے ماریا کہے گی ویسے کرنا ہوگا۔''

''ماریا تمہیں ایک یونیفارم دے گی اور پھر ہم میڈیلین کے آفس جائیں گے ماریا ہمارے پیچھے ہی اپنی کار میں آ رہی ہوگی اور وہی تمہیں آفس میں لے جائے گی میں باہر انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے وہ سٹی کنٹریکٹ کلنگ کمپنی ہے نا تم نے پہلے بتایا تھا۔'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' راجر نے کہا اور وین آگے بڑھا دی راستے میں سفر کے دوران ان کے درمیان زیادہ باتیں نہیں ہوئی تھیں کلینگ کمپنی پہنچ کر راجر نے سمیر کو ماریا سے ملوایا تھا۔

''یہ میرا دوست سمیر ہے۔''

''اوہ مجھے خوشی ہوئی مل کر راجر تم میرے دوست ہو تو تمہارے دوست بھی میرے دوست ہیں۔'' ماریا نے خوش دلی سے کہا۔

''ماریا جیسا کہ میں نے تم سے بات کی تھی کہ صرف آج شام کے لیے تمہیں اس کو میڈیلین کے آفس میں بھیجنا ہے کیا انتظامات مکمل ہیں؟''

''ہاں میں نے سب انتظام کر لیا ہے میں نے ایک ملازم پیڈرو کو آج چھٹی دے دی ہے جو شام کی شفٹ میں کام کرتا ہے۔'' ماریا نے کہا اور اس کی طرف ایک پیکٹ بڑھایا اس میں یونیفارم ہے تم برابر کے کمرے میں جا کر یہ کپڑے بدل لو۔'' ماریا نے کہا اور سمیر وہ پیکٹ لے کر کمرے میں چلا گیا چند لمحوں بعد وہ باہر آیا تو اس نے وائٹ کلر کا اوور آل پہنا ہوا تھا جس پر سٹی کنٹریکٹ کلینرز کا لوگو بنا ہوا تھا اور پیڈرو کا نام بھی لکھا تھا۔

''پرفیکٹ۔'' ماریا نے کہا۔

''یہ تو تم پر بالکل ٹھیک آیا ہے۔''

''ہاں اب چلیں؟'' راجر نے ماریا سے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے تم سمیر کے ساتھ چلو میں پیچھے آتی ہوں۔'' ماریا نے کہا پھر راجر اپنی وین میں سمیر کے ساتھ میڈیلین کے آفس کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

''میڈیلین کے آفس کے قریب پہنچ کر اس نے وین روک دی تھی اور ماریا کا انتظار کرنے لگا تھا پھر چند ہی لمحوں میں وائٹ کلر کی منی بس ان کی وین کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی جس پر سٹی کلینرنگ کمپنی کا لوگو بنا ہوا تھا جس میں آٹھ کلینرز بیٹھے ہوئے تھے ان سب نے بھی سفید اوور آل

پہنے ہوئے تھے ماریا ان کے ساتھ گاڑی سے اتری تھی اور انہیں لے کر بلڈنگ میں داخل ہوگئی تھی پھر دس منٹ بعد وہ واپس آئی تھی اسے دیکھ کر راجر کار سے باہر آ گیا تھا پھر اس نے سمیر کو ماریا کے ساتھ روانہ کردیا تھا۔

بلڈنگ میں داخل ہونے کے بعد ماریا نے سمیر کے ساتھ لفٹ میں قدم رکھا تھا اور چوتھی منزل کا بٹن دبا دیا تھا۔

''میں نہیں جانتی کہ تمہیں کیا کرنا ہے لیکن جاؤ تمہاری کلینز ٹرالی سامنے والے کمرے میں ہے تم اپنا کام کرکے واپس اسی لفٹ سے نیچے آ جانا وہاں میں تمہاری منتظر ہوں گی۔'' ماریا نے کہا پھر لفٹ رکنے کے بعد اس نے میڈیلین کے آفس کی طرف اشارہ کرکے اسے بتایا تھا کہ وہ میڈیلین کا آفس ہے۔

''دروازے پر اس کا نام بھی لکھا ہے اس کے کمرے سے کچرے کا ڈبہ لانا تمہارا کام ہے اور سارے لکڑی کے فرنیچر کو ڈسٹر سے صاف کرنا ہے بالکل ایسے جیسے تم احتیاط اور توجہ سے اپنا کمرہ صاف کررہے ہو۔'' ماریا نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا اور وہ لفٹ سے باہر آ گیا ماریا لفٹ ہی میں رہی تھی اور واپس نیچے چلی گئی تھی سمیر نے بتائی ہوئی جگہ سے کچرے کا ڈبہ لیا تھا اور ڈسٹر اٹھا کر میڈیلین کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''پیڈرومونیور۔'' سمیر نے کہا۔

''آجاؤ۔'' کمرے کے اندر سے ایک بھاری آواز آئی اور سمیر اندر داخل ہوگیا کمرے میں میڈیلین کی کرسی خالی تھی وہ کھڑکی کے قریب ایک لیدر کی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا جسے وہ پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ لکھتا بھی جارہا تھا وہ مکمل طور پر اپنے کام میں منہمک تھا جیسے اسے سمیر کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ سمیر نے ردی کی ٹوکری اٹھائی تھی اور اس کے کمرے سے باہر لاکر ڈسٹ بن میں کچرا ڈالا تھا اور خالی ردی کی ٹوکری واپس کمرے میں لے گیا تھا جسے اس نے میڈیلین کے ڈیسک کے قریب رکھ دیا تھا اور پھر ڈسٹر سے فرنیچر کی صفائی کرنے لگا تھا اس نے ایسے کی ورڈز سوچنا شروع کردیئے تھے جنہیں وہ میڈیلین کے دماغ میں جاکر کہتا تو میڈیلین گرینڈ ویسٹ کے بارے میں سوچنے لگتا پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

''گرینڈ ویسٹ نیا منصوبہ دہشت گردی ملاقات۔'' اس نے یہ الفاظ میڈیلین کے ذہن میں ڈالنا شروع کردیئے تھے اور میڈیلین کے ذہن میں ایک منظر ابھرنے لگا تھا یہ اس کی ویسٹ سے ہونے والی ایک روز پہلے کی ملاقات کا منظر تھا۔

''تمہارے لیے ایک نیا کام ہے جس کی مجھے ہدایت کی گئی ہے وہ ویسٹ کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا اس کی یہ ملاقات ویسٹ سے شہر کے ایک ریستوران میں ہوئی تھی وہ ایسی ملاقاتوں کے لیے ایسے ہی پبلک مقامات کا انتخاب کرتے تھے۔

''ہوں......کرنا کیا ہے؟'' ویسٹ نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''ہمیشہ کی طرح کسی پبلک مقام پر ایک دھماکا کرنا اور لوگوں کی توجہ اس طرف کروانا کہ ہمارے ملک میں غیر ملکی یہ کارروائیاں کررہے ہیں اور ہماری حکومت ان سے مقابلہ کررہی ہے تاکہ لوگوں کی رائے حکومت کے حق میں استوار ہو۔'' میڈیلین نے کہا۔

''لیکن خیال رکھا جائے کہ اس دھماکے میں ہمارے عوام کی جانیں محفوظ رہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''ٹھیک ہے ہوجائے گا۔'' ویسٹ نے بے پرواہی سے کہا۔

''بہت ذمہ داری سے کام کرنا ہے۔''

''تمہارے پاس سارے انتظامات ہیں؟'' میڈیلین نے پوچھا۔

''مجھے آگے جواب دینا ہوگا۔''

''ہاں یہ میرا کام ہے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ویسٹ نے کہا۔

''رقم؟'' اس نے مزید سوال کیا تھا لیکن رقم کی مالیت نہیں بتائی تھی کہ کتنی رقم کی بات ہورہی ہے یوں لگتا ہے کہ وہ پہلے سے طے ہوچکی ہے اور دونوں کو علم ہے۔

''وہ تم تک پہنچ جائے گی اس کی فکر مت کرو جیسے ہی کام پورا ہوگا رقم تمہیں مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے حادثے کی اطلاع تمہیں دھماکا ہونے پر

خود مل جائے گی۔''

''دیکھواس کی خاص ہدایت ہے کہ عوام کا جانی نقصان نہ ہو.....تم کوئی بلڈنگ اڑا سکتے ہو۔'' میڈیلین نے کہا جس پر ویسٹ نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور پھر وہ دونوں ملاقات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

سمیر بھی میڈیلین کے ذہن سے نکل کر کمرے سے نکل گیا تھا اور اس کے بعد بھی میڈیلین ٹرانس سے باہر آ گیا تھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کے ذہن سے اہم راز چرا لیا گیا ہے اس کے علاوہ سمیر نے ردی کی ٹوکری سے کچھ اہم کاغذات بھی ڈھونڈ کر نکالے تھے۔ جنہیں وہ فلیٹ جا کر دیکھنا چاہتا تھا وہ میڈیلین کے آفس سے نکلنے کے بعد سیدھا لفٹ سے نیچے آیا تھا جہاں ماریا اس کی منتظر تھی پھر وہ بلڈنگ سے باہر آ کر راجر کی وین میں بیٹھ گیا۔ اس کے اندر ہی اس نے کپڑے تبدیل کر کے ماریا کو یونیفارم واپس کر دیا تھا یونیفارم واپس کرنے سے پہلے وہ اوور کوٹ کی جیب سے وہ کاغذ نکالنا نہیں بھولا تھا جو اس نے ردی کی ٹوکری سے نکالے تھے راجر اسے سیدھا اپنے آفس لے گیا تھا جہاں پہلے سے کیپٹن ناصر میک اور میری موجود تھے جہاں اس نے انہیں مختصراً معلومات دی تھیں جو اسے میڈیلین کے ذہن سے ملی تھیں۔

''گویا اب بھی ہمیں یہ نہیں معلوم کہ دھماکے کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا جائے گا؟'' میک نے کہا اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''یہ بھی پتہ لگ جائے گا میک۔'' سمیر نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ ویسٹ نے اپنی باتوں میں بگ باس کا ذکر کیا تھا اور سمیر اسے جانتا تھا اسے یاد آیا کہ لندن آنے پر اس کی ملاقات جان ساؤتھ کے علاقے میں مائیکل سے ہوئی تھی جس کی بیوی کو بگ باس نے قید میں رکھا ہوا تھا اور مائیکل سے مختلف جگہوں پر دھماکے کرواتا تھا اور سمیر نے مائیکل اور اس کی بیوی کو اس کے چنگل سے چھڑایا تھا بلکہ اس کے منصوبے کو بھی ناکام کر دیا تھا اور دھماکا خیز مواد ضائع کر دیا تھا لیکن اس نے اس واقعے کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا وہ اسے راز ہی رکھنا چاہتا تھا۔ سمیر کے تفصیلات بتانے کے بعد بہت سے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے تھے

اور سب اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔

''بگ باس کون ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''بگ باس بم بنانے کا ماہر وہ موبائل سے کنٹرول ہونے والے بم بنانے میں ماہر ہے اور ان کے ذریعے جگہ جگہ دھماکے بھی کروا سکتا ہے اسے کافی عرصہ پہلے گرفتار کیا گیا تھا اور سات سال قید کی سزا ہوئی تھی۔'' راجر نے کہا۔

''اس کا اور ویسٹ کا کیا تعلق ہے؟'' میک نے پوچھا۔

''جب وہ سزا پوری کر کے آزاد ہوا تو ویسٹ نے اس سے رابطہ کیا وہ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔'' راجر نے جواب دیا۔

''تو وہ اب MIS بیک آپریشن کے لیے کام کر رہا ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' راجر نے کہا۔

''کیا تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں..... میرے کمپیوٹر ریکارڈ میں ضرور ہو گی۔'' راجر نے کہا اور پھر میری کی ذمہ داری لگائی کہ وہ ریکارڈ سے تصویر نکال کر دکھائے جو اس نے چند ہی لمحوں میں کمپیوٹر مانیٹر پر لگا دی اور تصویر دیکھ کر سمیر کا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ وہی بگ باس تھا جس سے سمیر کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ وہ حملہ کرنے والے ہیں کسی ایسی جگہ جو پبلک مقام ہو جیسے ریلوے لائن کوئی پل کوئی بڑی عمارت اور وہ چاہتے ہیں کہ عوام کی جان نہ جائے اس کا مطلب ہے کسی ایسے وقت کا انتخاب جب وہاں لوگ نہ ہوں یا کم تعداد میں ہوں۔'' سمیر سوچنے کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سمیر اور ناصر راجر کے آفس سے رخصت ہو گئے تھے اور فلیٹ پر آ کر کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔

''آج رات کی تمہاری پرفارمنس اچھی ہے سمیر ہم تقریباً مجرموں تک پہنچ گئے ہیں جو ملک میں افراتفری اور ہنگاموں کے ذمہ دار ہیں۔'' سمیر سے ناصر نے کہا تو سمیر مسکرانے لگا۔

''اب ہمیں بگ باس کا پتہ لگانا ہو گا۔'' ناصر نے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ بہت ضروری ہے۔'' سمیر نے کہا وہ دل میں

خوش ہو رہا تھا کہ وہ بگ باس کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا تھا اور اس کی ذہن میں بھی جا چکا تھا اور یہ کام ضرورت پڑنے پر دوبارہ بھی کر سکتا تھا کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ناصر سونے چلا گیا تھا تب سمیر نے اپنی پتلون کی جیب سے وہ تڑے مڑے کاغذ نکالے جو میڈیلین کے آفس سے لایا تھا اور ان کی شکنیں دور کر کے انہیں پھیلا کر اپنے سامنے میز پر رکھتا گیا تھا۔ پھر اس نے باری باری اٹھا کر انہیں پڑھا تھا ان کاغذ کے ٹکڑوں پر عجیب تحریریں تھیں کسی پر ادھورے سائنسی فارمولے لکھے ہوئے تھے کسی پر رقمیں لکھی تھیں اور کسی پر کچھ جملے تھے جو بالکل بے معنی سے تھے سائنسی فارمولوں کو دیکھ کر تو وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ بم بنانے کے فارمولے ہیں اور میڈیلین بھی اس کا ماہر ہو سکتا ہے لیکن باقی کاغذوں میں لکھے ہوئے جملے اسے الجھن میں ڈال رہے تھے کیونکہ کہیں کہیں کچھ مشہور شخصیات کے نام بھی لکھے ہوئے تھے کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد سمیر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جہاں تک بگ باس کا تعلق ہے چونکہ اسے بگ باس کا ٹھکانہ پتا ہے چنانچہ اسے خود ہی اس کے ذہن کو ٹٹولنا چاہئے اور اس کیس کے متعلق معلومات لینا چاہئیں اس نے یہ کام اگلے دن کے لیے چھوڑ دیا تھا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

اگلی صبح اس کی آنکھ آٹھ بجے کھل گئی تھی اس نے ناصر کے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا تھا اور پھر خود ناشتہ کر کے فلیٹ سے نکل گیا تھا اس کا رخ جان ساؤتھ کے اس علاقے کی طرف تھا جہاں بگ باس کا بڑا قحبہ خانہ موجود تھا وہاں پہنچ کر وہ سیدھا قحبہ خانے میں نہیں گیا تھا جب کہ اسے وہاں داخل ہونے کا کوڈ ورڈ یاد تھا لیکن کچھ دیر وہ دور سے جائزہ لینا چاہتا تھا اور یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ بگ باس اندر موجود ہے یا نہیں اس کے لیے اس نے سڑک کے دوسری جانب واقع ایک چھوٹے ریستوران کا انتخاب کیا تھا جہاں سے وہ قحبہ خانے کے داخلی دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا وہ ریستوران میں جا کر ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا تھا جس کی کھڑکی سے اسے قحبہ خانے کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اس کی توجہ ایک شخص کی طرف ہو گئی وہ لمبے قد اور تندرست جسم کا مالک شخص تھا اس کے چہرے پر داڑھی تھی اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا اور سر پر ہیٹ تھا جو خاصی حد تک چہرے پر جھکا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سمیر کو حیرت تھی کہ اس شخص کی پوری توجہ سمیر کی طرف تھی اور وہ بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا سمیر کبھی اس کی طرف دیکھتا اور کبھی کھڑکی سے باہر اس کی توجہ قحبہ خانے کے دروازے پر ہوتی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔'' کسی نے کہا تو سمیر نے چونک کر دیکھا اب وہ اجنبی اس کی میز کے قریب ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

''جی ضرور۔'' سمیر نے جواب دیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شخص اس سے کیا چاہتا ہے۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کچھ عرصہ پہلے ہم لوگ ملے تھے۔'' اجنبی نے کہا اور سمیر اسے بغور دیکھنے لگا وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا سمیر کی یادداشت بہت تیز تھی وہ ایک بار کسی سے مل لیتا تو برسوں بعد بھی اسے ہزاروں میں شناخت کر لیتا تھا لیکن اس کا حلیہ کافی تبدیل ہو چکا تھا وہ اس کی شناخت اس کی آنکھوں سے کرنا چاہتا تھا جو سیاہ چشموں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔

''ذرا اپنے گلاسز اتارو۔'' سمیر نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا اور اس شخص نے ایک لمحے کے لیے گلاسز اتارے۔

''مائیکل۔'' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہارا تو حلیہ ہی بہت تبدیل ہو چکا ہے یہ داڑھی کب رکھی تم تو کلین شیو تھے؟''

''بس جب تم نے بگ باس سے جان چھڑائی اس کے بعد زندہ رہنے کے لیے یہ سب کرنا تو ضروری تھا ورنہ تو وہ ظالم بگ باس مجھے زمین کی سات تہوں کے اندر سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو اس کے آس پاس پھٹکنا بھی نہیں چاہئے اگر پہچان لئے گئے تو بہت بری طرح مارے جاؤ گے وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' سمیر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا ہے جھوٹا سفاک قاتل پیسے کا لالچی کون سا عیب ہے جو اس میں نہیں ہے اس نے ایک لمبے عرصے تک مجھے استعمال کیا میں جس اذیت سے

گزرا ہوں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"یہ حماقت ہے تم اس کے چنگل سے آزاد ہوگئے تھے یہاں سے کہیں دور چلے جاتے اور ایک نئی زندگی کی ابتدا کرتے واپس آنا تمہاری حماقت ہے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو کیونکہ تم تصویر کا ایک رخ دیکھ رہے ہو تمہیں پتہ ہے اس نے میری بیوی مارتھا کو قید رکھا اس کے لیے اس نے خطرناک ڈرگز کا سہارا لیا اسے زیادہ وقت مدہوش رکھا جاتا تھا وہ ان ڈرگز کی عادی ہوگئی ہے میں اس کا علاج کروا رہا ہوں لیکن میں بگ باس سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔" مائیکل نے کہا تو سمیر اسے بغور دیکھنے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ مائیکل اس وقت انتقام کی آگ میں جل رہا ہے وہ بگ باس سے انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے اور سمیر کو بھی اس وقت ایسے مخلص لوگوں کی ضرورت تھی جو مشن کے آخری مرحلے میں اس کے ساتھی ہوں اور وفادار ہوں بظاہر تو وہ میک کے لیے کام کر رہا تھا لیکن دراصل وہ اپنے ملک سے بدنامی کا یہ داغ مٹانا چاہتا تھا کہ مسلمان دہشت گرد دنیا کے مختلف حصوں میں خودکش حملے یا دہشت گرد حملے کر رہے ہیں جو سراسر غلط تھا۔ ہمارا اسلام ہمیں اس کی تعلیم نہیں دیتا اور اسے اپنے ملک اور اپنے مذہب کو سچ ثابت کرنا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ UK میں موجود کچھ ایسے مقامی لوگوں کو بھی بے نقاب کرنا چاہتا تھا جو بظاہر ہر ملک میں امن کے لیے کام کر رہے تھے لیکن ان کا مقصد کچھ اور تھا وہ خود ہی ہنگامے بھی کروا رہے تھے اور خود ہی ان کا سدباب بھی کر رہے تھے اس طرح وہ دہری چال چل رہے تھے اس کام میں انہوں نے بہت سے لوگوں کو آلہ کار بنایا ہوا تھا اور بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے مسلمانوں پر تسلط قائم کرنے اور انہیں کمزور اور بدنام کرنے کی سازش کی جا رہی تھی۔ سمیر نے سوچتے سوچتے مائیکل کی طرف دیکھا۔

"میرا ساتھ دو گے؟" مائیکل اس سوال پر چونک گیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"میں آج پھر بگ باس کی تلاش میں ہوں وہ جو کام تم سے کروایا کرتا تھا آج خود کرنے جا رہا ہے اس کے لیے وہ بھاری رقم بھی لے گا اور ہونے والے حادثے میں نہ جانے کتنا نقصان ہوجائے گا۔"

"میں تم سے کوئی تفصیل نہیں پوچھوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں ایک دردمند دل ہے کیونکہ تم نے میری بیوی اور میری جس طرح مدد کی تھی بے لوث ہو کر ایسے کوئی نہیں کرتا مجھ پر ایک تو تمہارا قرض ہے اور دوسرے میں خود بگ باس سے بدلہ بھی لینا چاہتا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔

"پھر تم یہ بھی جاننا چاہو گے کہ میرا طریقہ کار کیا ہوگا؟"

"ہاں ظاہر ہے تب ہی میں اندازہ کرسکوں گا کہ میں تمہارے پلان میں کہاں فٹ آتا ہوں۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ جو بم یا مواد وہ دھماکوں کے لیے استعمال کرتا تھا وہ اس کے پاس کہاں سے آتے تھے؟"

"نہیں میں یہ نہیں جانتا مجھے تو بیگ تیار ملتا تھا بس مجھے بم کو ٹائمر سے کنکٹ کر کے اسے کسی خاص مقام پر رکھنا ہوتا تھا۔" مائیکل نے کہا۔

"میں بگ باس کے انتظار میں یہاں بیٹھا ہوں تاکہ وہ آجائے تو میں اپنا کام شروع کروں۔" سمیر نے کہا۔

"وہ تو آچکا ہے...... اندر قحبہ خانے میں موجود ہے جب تم یہاں آئے تھے اس سے کچھ ہی دیر پہلے وہ آیا تھا۔"

"اچھا تم کچھ دیر خاموش بیٹھو۔" سمیر نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں اس نے بگ باس کا تصور کیا اور اس کے دماغ میں پہنچ گیا اسے کسی بھی شخص سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کے لیے صرف پہلی بار آنکھوں کے رابطے کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے پھر وہ اس کی سوچوں سے اس کی کسی بھی بارے میں یادیں چرا سکتا تھا اسے معمول بنا کر اس سے کوئی کام کروا سکتا تھا اور اسے تخلیاتی یا تصوراتی دنیا میں محو کرسکتا تھا یہ اس کی خداداد صلاحیتوں کا حصہ تھا جن میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

بگ باس کے ذہن میں پہنچ کر اس نے چند الفاظ دہرائے۔

"گرینڈ ویسٹ...... خودکش دھماکا...... ملنے والی رقم...... مقام۔" ان الفاظ کے بگ باس کی یادداشت میں جاتے ہی اس کے ذہن نے کام شروع کردیا تھا اور وہ ویسٹ سے ہونے والی اپنی ملاقات کے بارے میں

سوچنے لگا تھا جو کل رات ہی ہوئی تھی چند ہی لمحوں میں سمیر کو ساری مطلوبہ انفارمیشن مل گئی تھی اور وہ بگ باس کے ذہن سے نکل آیا تھا اور آنکھیں کھول دی تھیں پھر وہ بغور مائیکل کو دیکھنے لگا تھا۔

''مائیکل کام خطرناک ہے۔''

''پروانہیں...... میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں پہلے تو میں مارتھا کی وجہ سے خاموش تھا کیونکہ وہ اس کے قبضے میں تھی لیکن تمہاری مہربانی سے اب میں آزاد ہوں۔''

''میرے ساتھ میرا ایک ساتھی بھی ہوگا...... ہم تینوں مل کر یہ کام کریں گے میرے ساتھ یہاں کے کچھ اور لوگ بھی ہیں لیکن میں اپنے طور پر کام کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''کل بگ باس اپنے ایک آدمی کو دھماکا خیز مواد لینے برمنگھم کے علاقے میں بھیجے گا میں چاہتا ہوں کہ جب اس کا آدمی اس مواد کو حاصل کرلے تو ہم اسے ناکارہ بنادیں اور ضائع کردیں۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''

''تم کل صبح مجھے اسی جگہ ملنا میں تمہیں باقی تفصیل کل بتاؤں گا بگ باس کا آدمی برمنگھم کے علاقے میں رات کو جائے گا لیکن تم اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہنچ جانا میں باقی باتیں کل بتاؤں گا۔''

''لیکن تمہیں ساری معلومات یہاں بیٹھے بیٹھے کیسے مل گئیں؟''

''یہ میرا ایک راز ہے اسے راز ہی رہنے دو۔'' سمیر نے کہا تو مائیکل ہنس پڑا لیکن وہ حیران تھا پھر دوسری صبح ملنے کا وعدہ کرکے وہ دونوں اپنی اپنی سمت روانہ ہوگئے تھے جب سمیر فلیٹ پر پہنچا تو ناصر جاگ چکا تھا اور اس کا انتظار کررہا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے دو بار میک کا فون آچکا ہے وہ تمہیں بلا رہا ہے راجر کے آفس میں کیرین بھی وہاں پر ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''کیوں خیریت؟'' سمیر نے پوچھا۔

''خیریت! کیا مطلب تمہیں پتہ تو ہے کہ ہم کس کیس پر کام کررہے ہیں اس سلسلے میں ہی بلایا ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔

''یہ سب لوگ احمق ہیں ناصر۔''

''کیوں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ناصر نے پوچھا۔

''چلو ابھی تو راجر کے آفس چلتے ہیں بعد میں آکر تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔'' سمیر نے کہا پھر وہ ناصر کے ساتھ راجر کے آفس پہنچا تھا یہاں ان کا بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا۔

''ارے بھئی سمیر تم کہاں تھے کئی بار تمہارے لیے ناصر کو فون کیا ایک تو تم اپنے پاس فون بھی نہیں رکھتے ہو۔'' راجر نے سمیر کو دیکھتے ہی کہا۔

''میں ذرا ہوا کھانے کے لیے نکل گیا تھا فلیٹ میں بند رہتے رہتے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آؤ دیکھو ہم نے کچھ پیش رفت کی ہے۔'' راجر نے کہا اور اپنے کمرے میں لگے کمپیوٹر کو آن کردیا جس پر بگ باس کا قحبہ خانہ نظر آرہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' سمیر نے ان جان بن کر سوال کیا۔

''یہ بگ باس کا قحبہ خانہ ہے ہم نے کل رات یہی کام کیا ہے کہ مختلف کلوز سرکٹ ٹی وی کیمروں اور کمپیوٹر کی معلومات کی مدد سے بگ باس کے اس ٹھکانے کا پتہ لگایا ہے وہ خفیہ طور پر یہاں رہتا ہے اور یہاں داخل ہونے کے لیے کوڈ ورڈ استعمال ہوتا ہے جو ابھی ہمیں نہیں معلوم لیکن جلد ہی پتہ چل جائے گا۔'' راجر نے کہا۔

''گڈ اچھی پرفارمنس ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''اب تم کیا کہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ میں اور ناصر اپنے طور پر کام کریں ہمارا طریقہ کار مختلف ہے چنانچہ ہم اپنے طریقے سے بگ باس کو گھیرتے ہیں اور آپ اپنے طریقے سے کام کریں لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے اس طرح سے کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے آج میک نہیں آیا میں اس سے بات کرکے تمہیں بتاتا ہوں۔'' راجر نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر ہم فلیٹ پر ہی تمہارا انتظار کریں گے۔'' سمیر نے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں تمہیں کال کرکے بتادوں گا۔'' راجر نے کہا۔

جواب دیا۔ پھر سمیر اور ناصر واپس فلیٹ پہنچ گئے تھے۔

''یہ تم نے کیا کیا؟'' ناصر نے فلیٹ پہنچتے ہی سمیر سے سوال کر دیا۔

''میں نے کیا کیا؟''

''یہی کہ ان کا ساتھ دینے کے بجائے تم الگ رہ کر کام کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں اگر میک اس پر راضی ہو گیا تو...... یہ طریقہ ہمارے لیے بہتر ہوگا اس طرح ہم بہت سی مشکلات سے بچ جائیں گے اور زیادہ تیزی سے اس مسئلے کو حل کر سکیں گے۔'' سمیر نے کہا تو ناصر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''دیکھو کل رات سے اب تک وہ صرف بگ باس کے قحبہ خانے کا پتہ چلا سکے ہیں ابھی انہیں اس تک پہنچنا ہے یہ پتہ کرنا ہوگا کہ ویسٹ اس سے کب ملاقات کرے گا کیا معاملہ طے پائے گا کتنی رقم خرچ ہوگی بہت سے سوالات ہیں۔''

''ہاں تو یہ سب تو ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔

''میں یہ سب معلوم کر چکا ہوں...... میں صبح چہل قدمی کرنے نہیں گیا تھا یہی معلومات جمع کرنے گیا تھا۔''

''باہر سڑکوں پر معلومات پڑی نہیں ملتیں کھل کے بتاؤ سمیر۔''

''بھئی دیکھو اتفاق سے میں بگ باس کو اور اس کے ٹھکانے کو پہلے سے جانتا تھا جب اس کا ذکر میرے سامنے آیا تو میں نے سوچا کہ چونکہ ویسٹ کو میڈیلین نے ایک ہفتہ کا وقت دیا ہے تو ظاہر ہے کہ ویسٹ آج کل ہی میں بگ باس سے ملے گا تاکہ اسے یہ کام سونپ سکے پھر بگ باس کو بھی کچھ وقت درکار ہوگا اس کام کے انتظامات کرنے کے لیے تو کام تو پھر تیزی سے ہی ہونا تھا نا...... کل رات ویسٹ بگ باس سے مل چکا اور اسے اس کام کی ذمہ داری دے چکا۔''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا اور یہ اطلاع درست بھی ہے؟''

''ناصر تم جانتے ہو کہ میں کنفرم کیے بغیر بات نہیں کرتا یہ معلومات میں نے خود بگ باس ہی سے لی ہیں۔'' سمیر نے کہا پھر اس نے مائیکل کے بارے میں ناصر کو پوری کہانی بتائی تھی کہ کس طرح وہ اس سے ملا اور اس کی بیوی کو بگ باس کے چنگل سے آزاد کروایا اور آج کیسے اچانک مائیکل پھر اسے مل گیا اور اس نے بگ باس کے دماغ میں گھس کر ویسٹ سے ملاقات کی ساری تفصیل معلوم کر لی۔

''بہت خوب سمیر تم نے تو کمال کر دیا لیکن تم نے میک اور راجر کو اس بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا؟''

''ناصر تم جانتے ہو وقتی طور پر وہ لوگ چاہے ہم پر کتنا بھی بھروسہ ظاہر کریں لیکن درحقیقت وہ ہم پر بھروسہ نہیں کرتے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ جو ہر حادثے اور کسی بھی سنگین واقعے کا الزام مسلمانوں پر لگا دیتے ہیں اس میں کس حد تک سچائی ہے یا وہ ہمارا نام صرف ہمیں بدنام کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس کے پیچھے ان کے کچھ اور مقاصد ہیں۔'' سمیر نے تفصیل سے ناصر کو سمجھایا۔

''لیکن ہمیں انہوں نے اپنا کام کرنے کے لیے بلایا انہیں شاید ہمارا الگ رہ کر کام کرنا پسند نہ آئے؟''

''میرا خیال ہے انہیں اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔'' سمیر نے کہا اسی وقت فلیٹ کے فون کی گھنٹی بجی اور ناصر نے فون اٹھایا۔

''ہیلو!'' اس نے کہا اور پھر توجہ سے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے فون رکھ دیا تھا۔

''تمہارا اندازہ درست تھا میک نے اجازت دے دی ہے اس نے کہا ہے سمیر اور ناصر جس طرح چاہے انہیں کام کرنے دیا جائے بس اسے خاطر خواہ نتائج حاصل ہونا چاہئیں اور وہ لوگ اپنے مانیٹرنگ سسٹم کی بدولت ہم سے تعلق قائم رکھیں گے اور پل پل ہمیں بگ باس کی نئی چالوں سے باخبر رکھیں گے۔'' ناصر نے بتایا تو سمیر ہنسنے لگا۔

''تم کیوں ہنس رہے ہو سمیر؟ میک کا آئیڈیا تو اچھا ہے۔''

''ہاں! میک کی حد تک یہ آئیڈیا اچھا ہے...... تمہیں پتہ ہے ابھی میک نے بگ باس کا اس شہر میں ٹھکانہ پتہ کیا ہے بس...... اب وہ اپنے طریقے سے سی سی کیمروں، کمپیوٹروں اور اپنی جدید مشینوں کے ذریعے اس کے اگلے منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا اور پھر

ان سے نمٹنے کا منصوبہ بنائے گا۔ جب کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں اس سے پہلے کہ وہ بگ باس تک پہنچے میں اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ چکا ہوں گا۔'' سمیر نے عجیب غراہیت کے ساتھ کہا۔

''وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہے۔ وہ ہمیشہ ہم سے چوہے بلی کا کھیل نہیں کھیل سکتے مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہاں ہونے والے خودکش واقعات میں مسلمان ملوث نہیں بس ان کو بدنام کیا جارہا ہے۔''

''اب تمہارا کیا منصوبہ ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''آج رات بگ باس خود برمنگھم کے ساحلی علاقے میں جائے گا اور دھما کا خیز مواد لے کر آئے گا اب دیکھنا ہے کہ اس سامان کی سپلائی اسے کون فراہم کرتا ہے وہ کل صبح اس بارودی مواد سے بم ترتیب دے کر اسے ریموٹ سے منسلک کرے گا اور ناشتہ کرنے کے بعد اس کو پلانٹ کرے گا۔'' ناصر نے بتایا۔

''تم نے مائیکل پر بھروسہ کرلیا؟ تم جانتے ہو کہ وہ پہلے اس کے لیے کام کرتا رہا ہے اور اس کا آدمی ہے وہ تمہارا وفادار نہیں ہوسکتا۔''

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں...... میں نے اسے اچھی طرح چیک کرلیا ہے اس کا ذہن پڑھ لیا ہے وہ میرا تابع دار بن چکا ہے اور میرے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''مائیکل مجھے اطلاع دے گا کہ بگ باس نے دھما کا خیز مواد حاصل کرلیا ہے اور یہ بھی کہ اسے یہ مواد کس نے اور کیسے پہنچایا ہے وہ فون پر اطلاع دے گا پھر تمہارا کام شروع ہوگا ناصر۔ میں بگ باس سے ذہنی طور پر رابطے میں رہوں گا اور تمہیں ہدایت دیتا رہوں گا ہمارا کام کل صبح سے شروع ہوگا ہم آرام سے یہاں بیٹھے ہوں گے لیکن جاگ رہے ہوں گے اور مائیکل کے فون کا انتظار کر رہے ہوں گے ویسے بھی جس وقت چاہوں مائیکل یا بگ باس کے ذہن میں جا کر معلومات لیتا رہوں گا۔'' ناصر نے تفصیل بتائی۔

''یہ تمہارا منصوبہ تو بہت عمدہ ہے سمیر۔''

''ہاں! اب اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب بھی کردے یہ دعا کرو۔'' سمیر نے کہا پھر وہ چونک کر ناصر کی طرف مڑا تھا۔

''ابھی فون پر تمہاری راجر سے بات ہوئی تھی تو اس نے اس کیس کے سلسلے میں کوئی نئی معلومات حاصل کی ہیں؟''

''نہیں! انہیں جس قحبہ خانے کے بارے میں علم ہوا ہے اس طرف انہوں نے کچھ سیکورٹی اہلکاروں کو روانہ کیا ہے تاکہ بگ باس کے خلاف کوئی کارروائی کرسکیں۔''

''اس طرح تو وہ ہوشیار ہوجائے گا اور اپنا منصوبہ بدل دے گا۔'' سمیر نے کہا۔

''پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''کچھ نہیں...... میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہوسکتا ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''اب تم بالکل ریلیکس ہوجاؤ۔'' سمیر نے ناصر کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''بگ باس کسی پر بھروسہ نہیں کر رہا اس لیے وہ دھما کا خیز مواد لینے خود جائے گا اور وہ دوپہر کے بعد اس کام کے لیے روانہ ہوگا ہمارے پاس ابھی تین گھنٹے ہیں تب تک ہم آرام سے لنچ کریں گے اور ٹی وی دیکھیں گے۔'' سمیر نے کہا تو ناصر اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا وہ حیران تھا کہ سمیر کتنا پرسکون تھا اور اسے اپنی ذہن بینی پر کتنا بھروسہ تھا پھر سمیر اور ناصر نے مل کر لنچ تیار کیا تھا اور اپنی اپنی پلیٹ لے کر ٹی وی کے سامنے آبیٹھے تھے جس پر خبریں نشر ہورہی تھیں۔

''سمیر...... میں دیکھ رہا ہوں جب تم ڈریم سینٹر آئے تھے تب سے اور اب تک تم میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں پہلے تم ایک ڈرے سہمے نوجوان تھے۔ لیکن اب ماشاء اللہ تم میں اعتماد آتا جارہا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں! میں نے اور بھی کئی تبدیلیاں محسوس کی ہیں جو عمر کے ساتھ شاید مجھ میں آرہی ہیں۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''مثلاً؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا مگر یوں سمجھ لو کہ میرے بچپن میں جو سیاہ پوش شخص مجھے نظر آتا تھا اور مجھے مارنا چاہتا تھا اور جس نے میرے والدین کو مار دیا وہ ایک بات بالکل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

درست کہتا تھا۔''
''وہ کیا؟''
''وہ کہتا تھا کہ میں بڑا ہو کر شیطان بن جاؤں گا ایسا شخص جس میں بے پناہ طاقت اور پوشیدہ صلاحیتیں ہوں گی اور میں لوگوں کے لیے خطرہ بن جاؤں گا لیکن میں لوگوں کے لیے بلکہ تخریب کار لوگوں اور منفی کام کرنے والے گروہوں کے لیے تباہی بن جاؤں گا اسے مجھ سے یہی خطرہ تھا کہ مستقبل میں میں ایسے تخریب کار لوگوں اور گروہوں کے لیے مصیبت کھڑی کردوں گا اور اسی سے وہ خوف زدہ تھا اور مجھے کئی بار مارنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن میرے بجائے میرے والدین اس کا شکار ہوگئے...... ناصر! مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا میں اسے نہیں چھوڑوں گا اپنے والدین کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔''
''لیکن تم تو ذہن پڑھنے کی صلاحیت بچپن سے رکھتے ہو تم نے اپنے بارے میں اس کا ذہن نہیں پڑھا؟''
''میری اور اس کی ملاقات بہت کم اور بہت مختصر ہوئی اور اس عرصے میں اس نے اپنے ذہن کو لاک کیا ہوا تھا اس کے دماغ میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ سمیر نے کہا پھر وہ یک دم چونکا تھا کیونکہ ٹی وی پر آتی خبروں میں دکھایا جا رہا تھا کچھ سیکورٹی فورسز کی گاڑیاں شہر کی سڑکوں پر بھاگی جا رہی تھیں یہ سی سی کیمروں کا کمال تھا اور خبر یہ تھی کہ شاید شہر میں کوئی ایمر جنسی ہوگئی ہے چنانچہ یہ گاڑیاں بڑی تعداد میں سڑکوں پر گشت کر رہی ہیں۔
''یہ کیا حماقت ہے؟ ایسے تو بگ باس الرٹ ہو جائے گا۔'' سمیر نے کہا۔
''بلکہ ہو چکا ہوگا۔''
''یہ ممکن ہے کہ وہ اپنا پلان بدل دے؟'' ناصر نے خدشہ ظاہر کیا۔
''میں اس کے ذہن میں پہنچ کر پتہ لگاتا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور اپنی پلیٹ میز پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں دوسرے ہی لمحے وہ بگ باس کے ذہن میں پہنچ چکا تھا لیکن بگ باس قحبہ خانے میں اپنے مخصوص خفیہ کمرے میں ہونے کے بجائے ایک تفریحی مقام پر تھا کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہرا بھرا پارک تھا جس میں بچے کھیل رہے تھے۔ بگ باس کے چہرے پر میک اپ تھا۔ اس نے حلیہ بدل لیا تھا اب صاف شفاف چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور سر پر بڑا چیک دار اسکارف چہرے تک لٹکا ہوا تھا اس نے ایک سفید چوغا پہنا ہوا تھا۔ اور اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے وہ کوئی حبشی عرب نظر آ رہا تھا سمیر نے اس کے ذہن کو ٹٹولا۔
''منصوبہ میں تبدیلی...... بم کا حصول...... بم کی پے منٹ......''
سمیر نے جیسے ہی بگ باس کے دماغ میں یہ سوال ڈالے تھے ان کے جواب آنے لگے تھے اور بگ باس سوچنے لگا تھا کہ اسے لندن سے باہر جا کر ایک ساحلی مضافاتی علاقے ویلس میں دھماکا خیز مواد کا بیگ وصول کرنا ہے جو اسے ایک آئرش شخص پہنچائے گا جس سے وہ ہمیشہ ایسے سودے کرتا رہا ہے اس نے اس سپلائی کی ادائیگی بھی کچھ دیر پہلے بینک سے کردی تھی۔ ویسٹ نے تیس ہزار پاؤنڈ دیئے تھے اور یہ آدھی رقم تھی باقی رقم کام ہونے کے بعد ملنا تھی اور یہ حملہ کنگز کراس اسٹیشن پر واقع شمالی سرنگ میں کیا جانا تھا اس کے لیے ہدایات تھیں کہ کوئی موت نہ ہو لیکن حملہ ایسا ہو کہ لوگوں میں دہشت پھیل جائے اور اس حملے کے لیے اتوار کا دن دیا گیا تھا۔
''ناصر! ہمیں بگ باس کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے اور ہماری اس پر پوری نظر ہے وہ دھماکہ خیز مواد آج رات دس بجے ویلز کے علاقے مغرب کی طرف واقع آئرش سی کے ساحل سے وصول کرے گا جو اس کے لیے آئرلینڈ سے لایا جائے گا ابھی تک تو اس کا ارادہ ہے کہ وہ وصول کیا جانے والا بیگ لے کر اپنے گھر جائے گا لیکن ممکن ہے کہ وہ ارادہ تبدیل کردے تمہیں اس کے پیچھے جانا ہے کیونکہ مائیکل کی ذمہ داری میں نے صرف وہاں تک لگائی تھی جہاں وہ بیگ وصول کرے گا لیکن اس کے آگے سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے پھر تم اس پر نظر رکھو گے اور موقع دیکھ کر اس بیگ میں موجود مواد کو ناکارہ بناؤ گے نہ ہی میک چاہتا ہے کہ یہاں کوئی بھی بم دھماکہ ہو اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اس منصوبے کو ناکام بنانا ہے اور اس کے کرداروں کو انجام تک پہنچانا ہے تاکہ یہ کھیل ہمیشہ کے

لیے ختم ہو سکے۔'' سمیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے' یہاں سے ویلز تک کا سفر دو گھنٹے کا ہے میرا خیال ہے میں رات آٹھ بجے روانہ ہو جاؤں گا وہاں مائیکل بھی ہوگا؟''

''تمہیں مائیکل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ تمہارے لیے اجنبی ہے اور تمہیں اس کے لیے ویسے بھی موقع پر موجود لوگوں سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں بس اپنے کام سے کام رکھنا اور لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچنا۔'' سمیر نے کہا اور اسی وقت فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی ناصر نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اس وقت کیرین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''میں نے سوچا کہ تم لوگوں کا حال پتہ کروں تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''اوہ کیرین اچھا ہوا تم آ گئیں کیوں نہ تم یہاں میرے ساتھ ٹی وی دیکھو اور رات کے کھانے کا کچھ انتظام کر دو۔'' سمیر نے کہا۔

''ہاں میں اسی لیے آئی ہوں۔''

''راجر کے آفس میں کیا چل رہا ہے؟'' میک وہیں ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں وہ لوگ بگ باس کی کار کے تعاقب میں لگے تھے لیکن آخر میں اس میں سے کوئی اور شخص نکلا بگ باس کہاں غائب ہو گیا ہے پتہ ہی نہیں چل رہا۔'' کیرین نے کہا۔

''تم لوگوں نے غلطی کی کہ ٹی وی پر سیکورٹی فورسز کی گاڑیوں کو ایکشن میں دکھا دیا۔ بگ باس نے بھی خبر دیکھ لی ہوگی اور ہوشیار ہو گیا ہوگا۔'' ناصر نے کہا تو سمیر نے اسے تنبیہ نظروں سے دیکھا کہ وہ مزید منہ نہ کھولے چنانچہ ناصر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

''ہاں ہو سکتا ہے...... ویسے ان لوگوں نے قحبہ خانے کی سیکورٹی بڑھا دی ہے۔'' کیرین نے بتایا۔

''ٹھیک ہے...... کبھی نہ کبھی تو وہاں آئے گا وہ اس کا ٹھکانہ ہے۔'' سمیر نے کہا پھر وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا کیرین ناصر سے باتیں کرتی رہی تھی اور پھر رات کا کھانا تیار کر کے وہ چلی گئی تھی۔

رات آٹھ بجے ناصر تیار ہو کر فلیٹ سے نکل گیا تھا اور ایک کرائے کی ٹیکسی لے کر ویلز کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا تھا اس کے نکلنے کے بعد سمیر نے فلیٹ کے فون سے مائیکل کو فون کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی بگ باس دھماکہ خیز مواد کا بیگ وصول کرے اور وہاں سے روانہ ہو جائے تو وہ اس کے پاس جان ساؤتھ کے فلیٹ میں آ جائے اس نے مائیکل کو فلیٹ کا پتہ بھی سمجھا دیا تھا اس کا اندازہ تھا کہ اگر صحیح وقت پر بگ باس نے ڈیلیوری وصول کر لی تو ناصر بھی اسے فون کر کے بتا دے گا اور مائیکل بارہ بجے رات تک اس کے پاس پہنچ جائے گا اور سمیر اسے آئندہ کے لیے مزید ہدایت دے گا۔

پھر ہوا بھی یہی تھا ٹھیک سوا دس بجے ناصر کی کال آئی تھی اس نے بتایا تھا کہ بگ باس نے ایک بیگ ایک لانچ والے سے لیا ہے اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ سمیر نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی طرح اس کا پیچھا کرے لیکن اس طرح کہ بگ باس کو شبہ نہ ہو اس کے بعد ساڑھے بارہ بجے تک مائیکل فلیٹ پر سمیر کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''مائیکل! تم نے بہت ہمت سے کام کیا اور بہادری کا ثبوت دیا ہے اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو لیکن کل شام ٹھیک چھ بجے تمہیں کنگز کراس ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں پہنچنا ہے میں بھی وہیں موجود ہوں گا تم اسٹیشن پر کسی حبشی کے بہروپ میں موجود رہنا وہ وہیں شمالی سرنگ میں ہی بم فٹ کرے گا۔ کل اتوار ہے اور اسے یہ دھماکا آدھی رات تک کرنا ہے۔'' سمیر نے کہا اور مائیکل نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا وہ اس کی خفیہ ذہنی صلاحیتوں کی داد دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں وقت مقرر پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔'' مائیکل نے کہا اور فوراً ہی رخصت ہو گیا کیونکہ سمیر بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی فلیٹ میں موجودگی کا کسی کو بھی پتہ چلے اور میک اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

اتوار کی صبح نو بجے ناصر کا فون آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ بگ باس اس حبشی عرب والے لباس میں ہے لیکن وہ اپنے گھر نہیں گیا ہے بلکہ ایک مضافاتی علاقے کے چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لے کر رات گزاری ہے چنانچہ ناصر نے

بھی یہی کیا ہے اور وہ بھی ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا ہے اور بگ باس کے نیچے آنے کا انتظار کر رہا ہے جو ابھی اپنے کمرے سے نہیں نکلا ہے۔

''ٹھیک ہے تم سکون سے وہیں رکو...... ویسے تو بگ باس شام چھے بجے کنگز کراس ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں شمالی سرنگ میں بم فٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کا ارادہ بدل بھی سکتا ہے چنانچہ تم اس کے ساتھ لگے رہو تاکہ کسی تبدیلی کی صورت میں مجھے آگاہ کر سکو مائیکل سے میں نے کہہ دیا ہے وہ چھ بجے شام تک وہاں پہنچ جائے گا اور ایک حبشی کے حلیے میں ہوگا اور ہم تینوں مل کر یقیناً اس بگ باس کو ناکام بنا دیں گے۔'' سمیر نے کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

دوپہر کے قریب سمیر نے میک کو فون کیا تھا جو راجر کے آفس میں موجود تھا ابھی تک بگ باس کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

آج اتوار ہے اور ویسٹ اور بگ باس کی ملاقات کو ایک ہفتہ پورا ہو گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ بم دھماکا آج یا کل تک ہو جانا چاہیے تمہارا کیا خیال ہے میک۔'' سمیر نے کہا۔

''ہاں! ہم سب پریشان ہیں سمجھ نہیں آ رہا کہ اس نے کس جگہ کا انتخاب کیا ہوگا کہ جہاں زیادہ نقصان بھی ہو اور انسانی جان بھی نہ جائے؟'' میک نے جواب دیا۔

''تم تو یہاں کے شہری ہو تمام جگہوں سے واقف ہو تم بتاؤ کہ ایسی کونسی جگہ ہو سکتی ہے؟''

''کوئی خالی اہم عمارت' ایئر پورٹ' کوئی ریلوے اسٹیشن جس وقت گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہو رہی ہو۔'' میک نے کئی جگہوں کے نام لیے۔

''میرا خیال ہے تمام مقامات پر کچھ نہ کچھ سیکورٹی لگوا دو تاکہ کہیں بھی شبہ ہو تو کارروائی کی جا سکے میں بھی تھوڑی دیر میں آفس آتا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور فون بند کر دیا وہ چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ان کا کام کس حد تک آگے بڑھا ہے اس کا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی فلیٹ میں آ جائے گا یا پھر راجر کے آفس ہی سے کنگز کراس کے لیے روانہ ہو جائے گا۔

پھر جب سمیر تیار ہو کر راجر کے آفس پہنچا تھا تو شہر کے مختلف اہم مقامات پر سیکورٹی لگ چکی تھی راجر کے اندرونی آفس میں موجود LCD کی دیوار روشن تھی اور اسکرینز پر شہر کے مختلف علاقوں کے مناظر بدلتے جا رہے تھے۔

''آؤ سمیر! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' میک نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''میں بھی فلیٹ میں اکیلا بور ہو رہا تھا ناصر تو لندن گھومنے نکل گیا ہے۔'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

راجر میز پر لگے مختلف بٹن دبا رہا تھا اور اسکرین پر مناظر بدلتے جا رہے تھے۔

''میک تم کل سے یہاں ہی ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہاں! ہم اسکرینز پر نظر رکھے ہوئے ہیں اس کے علاوہ سیکورٹی کے اداروں سے بھی رابطے میں ہیں تاکہ اگر ذرا سی بھی کوئی اہم اطلاع ملے تو فوراً ایکشن شروع کر دیں۔

''ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا پھر وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا تھا اور ساڑھے پانچ بجے شام وہاں سے فلیٹ جانے کا کہہ کر اٹھ گیا تھا۔

راجر کے دفتر سے نکلنے کے بعد سمیر نے ایک کرائے کی ٹیکسی لی تھی اور کنگ کراس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا تھا ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچا تھا ٹیکسی سے اترتے ہی اس کی نظر مائیکل پر پڑی تھی جس نے ایک حبشی کا بہترین میک اپ کیا ہوا تھا اس سے کچھ فاصلے پر ناصر ایک بینچ پر بیٹھا بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا ناصر کی وہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ بگ باس وہیں کہیں موجود تھا کیونکہ ناصر ہدایت کے مطابق سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ سمیر نے کسی سے بھی بات نہیں کی تھی اور شمالی سرنگ کی طرف بڑھ گیا تھا چار بجے کی ٹرین آ کر جا چکی تھی۔

اسٹیشن پر اس وقت زیادہ رش نہیں تھا اور سرنگ تو سنسان تھی وہاں دور دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سمیر سوچنے لگا کہ بگ باس سرنگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا جو ایک موڑ کاٹنے کے بعد تھا۔ سمیر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا بگ باس کا پروگرام تھا کہ وہ بم نصب کر کے وہاں سے میلوں دور چلا جائے گا اور موبائل کے ذریعے دھماکا کرے گا تاکہ خود محفوظ رہ سکے۔ یہ جاننے کے بعد سمیر بگ

باس کے ذہن سے نکل آیا تھا اب وہ آہستہ آہستہ اس موڑ کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے پیچھے بگ باس موجود تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے مائیکل بھی سرنگ میں داخل ہو رہا تھا۔

سمیر نے جیسے ہی موڑ پار کیا تھا اس کی نظر بگ باس پر پڑی تھی وہ اب بھی اس لمبے چوغے میں ملبوس تھا اور چیک دار رومال سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ سمیر کو دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا شاید وہ اپنا کام بھی مکمل کر چکا تھا۔ سمیر نے تیزی سے اس پر چھلانگ لگائی تھی اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا تھا بگ باس اس کے نیچے سے تیزی سے نکلا تھا لیکن جب تک سمیر اس کے جبڑے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر چکا تھا۔ بگ باس نے جیب سے ریوالور نکال کر سمیر کا نشانہ لیا تھا اور بے آواز فائر کر دیا تھا۔ گولی سمیر کے قریب سے گزر گئی تھی تب تک مائیکل وہاں پہنچ گیا تھا اور بگ باس کے سر پر شدید ضرب لگائی تھی لیکن بگ باس پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا وہ تیزی سے سرنگ سے باہر نکل بھاگا تھا۔

''مائیکل اپنا فون دو۔'' سمیر نے کہا اور مائیکل نے اپنا موبائل سمیر کی طرف بڑھا دیا سمیر نے فوراً ہی میک کا نمبر ملایا تھا۔

''میک میں اس وقت کنگز کراس ریلوے اسٹیشن کی شمال سرنگ میں موجود ہوں جہاں بگ باس نے دھماکا خیز مواد جو تقریباً سو پونڈ کا ہے نصب کیا ہے اور وہ یہاں سے بھاگ نکلا ہے تم فوراً سیکورٹی فورسز کو بھیجو۔'' سمیر نے کہا۔

''ہم آ رہے ہیں۔'' میک نے کہا اس وقت اسے حیرت تو تھی کہ سمیر وہاں کیسے پہنچ گیا لیکن زیادہ سوالات کا وقت نہیں تھا میک نے جلدی سے صورت حال راجر کو بتائی تھی اس نے اسکرین پر کنگز کراس اسٹیشن کے سی سی کیمروں سے رابطہ قائم کیا تھا اور وہاں کے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے اتنی دیر میں میک نے سیکورٹی فورسز کی اس علاقے میں موجود مختلف موبائلز کو فون کر کے الرٹ کر دیا تھا اور وہ وہاں کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔

بیس منٹ کے بعد میک سمیر کے پاس کنگز کراس پہنچا تھا تو بگ باس جا چکا تھا اور میک کے ساتھ آنے والے بم ڈسپوزل کے افراد بم ناکارہ بنانے میں مصروف ہو گئے تھے تھوڑے ہی فاصلے پر سمیر ناصر اور مائیکل کھڑے تھے جن سے میک باتوں میں مصروف تھا۔

''سمیر تم نے تو کمال کر دیا...... ہم تو ابھی بگ باس کو ڈھونڈ ہی رہے تھے اور تم نے تو...... بھئی کمال ہو گیا۔'' میک نے بات ادھوری چھوڑ کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم دہشت گردوں کا خاتمہ کرنے والے ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

''تم نے دیکھا میک بگ باس نے کیا حلیہ بنایا ہوا تھا وہ یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ اگر پکڑا جائے تو الزام فوراً کسی عرب باشندے پر لگ جائے۔''

''ہاں میں سمجھتا ہوں اور میرا خدشہ درست تھا۔'' میک نے کہا۔ اسی وقت ایک سیاہ رنگ کی کار آ کر رکی جس میں کیرین اور راجر باہر آئے اور انہوں نے بھی آگے بڑھ کر سمیر سے ہاتھ ملائے تھے اور اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''تمہاری مدد سے اتنی جلدی بگ باس تک رسائی ہو گئی اور ہم ایک بڑے نقصان سے بچ گئے۔'' میک نے کہا۔

''اگر سرنگ میں دھماکا ہو جاتا تو اس کو دوبارہ بنانے میں ایک ماہ لگ سکتا تھا۔''

''اس کامیابی پر آج رات میری طرف سے آپ سب لوگوں کے لیے شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جائے گا۔'' راجر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اور یہ پارٹی کہاں ہو گی؟'' کیرین نے پوچھا۔

''میک کے فلیٹ پر جہاں سمیر اور ناصر ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' ناصر نے ہنستے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁ ❁

خلیل کامران نے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے کار کے ڈیش بورڈ کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ کار نے شہر کی سڑکوں پر ایک اور تیز رفتار ٹرن لیا تھا اور خلیل کامران پریشان ہو گیا تھا۔

''سمیر خدا کے لیے کار آہستہ چلاؤ یہ کوئی فوجی مشق نہیں ہو رہی ہے۔'' خلیل کامران نے کہا اور سمیر ہنسنے لگا۔

''آپ جب میری کار میں بیٹھیں تو ذرا دل تھام کر بیٹھا کریں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اسے لندن سے واپس آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور خلیل کامران لندن

پروجیکٹ کی کامیابی سے اتنا خوش ہوا تھا کہ اس نے سمیر کو بہترین قسم کی کار انعام میں دی تھی اور وہ اس کی تمام صلاحیتوں کا معترف تھا اسے سمیر سے مستقبل میں بہت امیدیں تھیں آج وہ اسے اپنے ساتھ اسی لیے لایا تھا کہ ایک ذمہ داری اسے سونپنا چاہتا تھا۔

''یہ کار بلٹ پروف ضرور ہے لیکن یہ کوئی ٹینک نہیں ہے اور اس سے پہلے کہ اس تیز رفتاری سے میری طبیعت خراب ہو جائے رفتار کم کرلو۔'' خلیل کامران نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سمیر نے ہنستے ہوئے کار کو فورتھ گیئر میں ڈال دیا تھا کار نے اگلا ٹرن کاٹا تھا اور پھر سمیر نے اسے تھرڈ گیئر میں ڈال دیا تھا اور خلیل کامران نے ڈیش بورڈ چھوڑ دیا تھا اور سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''اب ٹھیک ہے۔'' سمیر نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی تیز کار نہیں چلائی۔'' خلیل کامران نے کہا اور سمیر نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا جنہیں خلیل کامران نے محسوس کرلیا۔

''خدا کے لیے اپنی آنکھیں روڈ پر رکھو۔'' اس نے سمیر سے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ تیز رفتاری کے باوجود میری ڈرائیونگ محفوظ ہوتی ہے ہمیں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟'' جواب میں خلیل کامران صرف مسکرا دیا۔

''لو اب ٹھیک ہے؟'' سمیر نے کہا اب وہ کبھی روڈ کی طرف اور کبھی خلیل کامران کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں بس ٹھیک ہے۔ تم مجھے ریلوے اسٹیشن لے جا رہے ہو اور اس میں تیز رفتاری دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن خلیل کامران یہ مت بھولیں کہ آپ کو قتل کی دھمکی مل چکی ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''دیکھو سمیر ابھی ہم میری بیٹی عالیہ کو لینے جا رہے ہیں۔'' خلیل کامران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''خلیل کامران ہمیں اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''اس میں بات کرنے کے لیے ایسا کیا ہے؟ ٹھیک ہے دھمکی ملی ہے لیکن ہم تیار ہیں ہم نے اپنے انتظامات کرلیے ہیں کیا وہ کامیاب ہو سکتے ہیں؟''

''لیکن پھر بھی۔''

''تم تیار ہو؟ ہماری سیکورٹی ٹیم تیار ہے؟'' خلیل کامران نے پوچھا۔

''کیا تم تیار ہو خلیل کامران؟'' سمیر نے پوچھا۔

سمیر کے سوال کے بعد خلیل کامران نے ایک گہری سانس لی تھی ایسی ہی سانس جس نے اس کی قسمت میں جو بھی لکھا ہے اسے قبول کرلیا ہے اسے اپنی صورت حال کا اندازہ تھا حالات شاید اس کے حق میں نہیں تھے اسے ایک بڑی دہشت گرد جماعت کی طرف سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔

جب سے اس نے ڈریم سینٹر کا انتظام سنبھالا تھا اس کا واسطہ بہت سے دشمنوں سے پڑا تھا جنہیں اس نے اپنی ٹیم کی مدد سے ناکام بنا دیا تھا لیکن ایک دہشت گرد تنظیم جسے ایک ماڈرن تخریب کار جیکی چلاتا تھا۔ اس کی دشمن ہوگئی تھی وہ شہر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ دہشت گردی اور طاقت سے یہاں کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور اس کے تمام ذرائع کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے خلیل کامران پچھلے دس سال سے ان سے مقابلہ کر رہا تھا اور وہ پولیس کی مدد کر رہا تھا شہر جنگ کا میدان بن گیا تھا اور ان دہشت گردوں کے خلاف ایک مضبوط مقابلہ کرنے والے کی ضرورت تھی اور اب خلیل کامران نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ یہ ذمہ داری سمیر کے سپرد کردے گا۔

وہ ڈی سی او ڈریم سینٹر آرگنائزیشن میں اس کی کارکردگی سے متاثر ہوا تھا اس کے ذہن میں اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے جس کام کا آغاز کیا ہے سمیر اس کو بخوبی انجام تک پہنچائے گا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اب نوجوان نہیں تھا اور یہ لڑائی اس کی طاقت سے باہر تھی اس کا دشمن بھی یہ جانتا تھا۔

''سمیر میں تھک چکا ہوں اب تمہاری باری ہے میں مزید خوف میں زندگی نہیں گزار سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں جب وقت آئے گا تو مجھے اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی تم یہاں اس کام کو ختم کرنے کے لیے موجود ہوگے۔'' خلیل نے کہہ دیا جو سمیر کو پہلے سے

پتہ تھا وہ اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔
''یہ کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔'' سمیر نے کہا اور کار کو ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ ایریا میں کھڑا کردیا جس کے چاروں طرف لوہے کی زنجیر لگی ہوئی تھی وہ دونوں کچھ دیر کے لیے اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

''عالیہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اور میری تم سے درخواست ہے کہ تم اسے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتانا۔'' خلیل کامران نے کہا اور سمیر نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ کار سے باہر نکل گیا تھا خلیل کامران نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''وعدہ کرو اگر مجھے کچھ ہوگیا تو......''
''خلیل کامران کیا بات ہے کیا کچھ ہونے والا ہے؟'' سمیر نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میری بات دھیان سے سنو اگر کچھ ہوجاتا ہے تو وعدہ کرو کہ تم صرف تم ہر حال میں عالیہ کی حفاظت کرو گے۔''

''ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں۔'' سمیر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور خلیل کامران کو یقین ہوگیا کہ سمیر کے الفاظ میں سچائی ہے وہ جانتا تھا کہ سمیر جب کسی کام کے کرنے کا بیڑہ اٹھاتا ہے تو اسے بہترین طریقے سے کامیابی تک پہنچاتا ہے اسے اس پر یقین تھا اور اس نے سمیر کو ایک ایسی ذمہ داری بخش دی تھی جس سے وہ آنکھیں نہیں چرا سکتا تھا کیونکہ خلیل کامران نے بھی اسے سہارا دیا تھا اور وہ خلیل کامران کی عزت اپنے باپ کی طرح کرتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلیل کامران کے بغیر اس کی زندگی کیا ہوگی۔ اس نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ خلیل کامران کو خطروں سے دور رکھے لیکن خلیل کامران بھی بزدلوں کی طرح چھپ کر کام کرنے کا عادی نہیں تھا یہ اس کا اسٹائل تھا۔

خلیل کامران نے کار کی ایک خفیہ دراز سے ایک ریوالور نکالا تھا اس کا میگزین چیک کیا اس کی سیفٹی آن کی اور اس ریوالور کو اپنی کمر کے گرد لگے ہولسٹر میں لگالیا تھا پھر وہ سمیر کی طرف مڑا تھا سمیر اس کے ارادے بھانپ گیا تھا۔

''میں ابھی آیا۔'' خلیل کامران نے کہا سمیر پر آشکار ہوچکا تھا کہ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔

''تم کہاں جارہے ہو؟'' سمیر نے وضاحت چاہی تاکہ اس کے اندازے کی تصدیق ہوسکے۔

''میں کار سے باہر جارہا ہوں۔'' خلیل کامران نے کہا۔

''نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے یہاں تمہیں خطرہ ہوسکتا ہے۔'' لیکن سمیر کے منع کرنے کے باوجود خلیل کامران کار سے باہر نکل چکا تھا سمیر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''تم نے مجھ سے تمہیں اپنی کار میں یہاں لانے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ یہ بلٹ پروف ہے اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم کار ہی میں رہو گے اور میں تمہاری بیٹی کو ریسیو کرکے کار میں لے آؤں گا۔'' سمیر نے غصے سے کہا۔

''نہیں میں جاؤں گا تم یہیں میرا انتظار کرو۔'' خلیل کامران نے کہا پھر وہ سمیر کی طرف مڑا تھا اور اس کے کاندھوں پر اپنی دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا تھا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی باپ اپنے سر پھرے بیٹے کو نصیحت کررہا ہو۔

''میں نہیں چاہتا کہ جب میری بیٹی ٹرین سے اترے تو کوئی مجھے اسے خوش آمدید کرنے سے روکے۔''

''لیکن ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر کچھ ہوگیا؟ بہت خطرہ ہے۔'' سمیر نے کہا لیکن اسے اپنے الفاظ بے معنی لگ رہے تھے وہ جانتا تھا کہ خلیل کامران کو یہ بتانا کہ اسے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے ایسا ہی ہے جیسے ایک بہترین نشانہ باز کو یہ بتانا کہ اسے صحیح نشانہ کیسے لگانا چاہیے یہ باتیں صرف وقت ضائع کرنے کی تھیں لیکن اسے کوشش تو کرنا تھی۔

''تم جانتے ہو سمیر میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں جیت نہیں سکتا۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں مجھے کرلینے دو۔'' خلیل کامران کے لہجے میں شدید بے بسی تھی سمیر ایک آہ بھر کے پیچھے ہٹ گیا۔

''ٹھیک ہے لیکن میرے قریب رہنے کی کوشش کرنا میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہاں ہمارے لیے بہت خطرہ ہے میں نے وعدہ کیا ہے تو میں عالیہ کی حفاظت کروں گا اس کے لیے فکر مندمت ہونا۔ ٹھیک ہے؟'' سمیر نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔"خلیل کامران نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

پھر انہوں نے اسٹیشن کے داخلی راستے پر آگے بڑھنا شروع کردیا تھا۔ سمیر نے خلیل کامران کو رکا ہوا تھا اور چابکدستی سے اطراف کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا اور کسی بھی مشکوک حرکت کو نوٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا بظاہر کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ خطرہ ہے۔

"تمہیں پتہ ہے سمیر جب وقت پڑتا ہے تو تم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے ہو۔"خلیل کامران نے کہا۔ وہ ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوگئے تھے۔

"یہ سب میں نے بہترین استاد سے سیکھا ہے۔"سمیر کا اشارہ خلیل کامران ہی کی طرف تھا اور خلیل کامران کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اسٹیشن ایک چھوٹے سے کمرے اور ایک چھوٹے ملحقہ آفس پر مشتمل تھا ٹرین آنے ہی والی تھی سمیر کی نظریں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"بس ٹرین آنے ہی والی ہے۔"خلیل کامران نے کہا۔

❁ ❁ ❁ ❁

عالیہ خلیل کامران ٹرین کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی وہ چالیس میل کا سفر طے کر کے اپنے گھر اپنے والوں سے ملنے آرہی تھی وہ کالج میں فرسٹ ایئر نفسیات کی اسٹوڈنٹ تھی اور پہلی چھٹیاں گزارنے دو ہفتے کے لیے آرہی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی اس نے اسکول کا امتحان غیر معمولی نمبروں سے پاس کیا تھا اس نے اپنی زندگی کا بہت کم حصہ اپنے شہر میں گزارا تھا جب وہ بچی تھی تو اس کے والد نے اسے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کردیا تھا اس کی والدہ فوت ہوچکی تھیں۔ کالج میں بھی وہ کالج کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ خلیل کامران اکثر اسے شہر کی خطروں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور اسے سمجھاتا تھا کہ اس کا ہاسٹل میں رہنا ہی بہتر ہے وہ اسے شہر سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا اور عالیہ کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ جب شہر میں اتنا خطرہ ہے تو وہ خود وہاں کیوں رہتا ہے۔

اچانک ٹرین کی سیٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا اسٹیشن قریب آگیا تھا اور لوگ اپنا اپنا سامان جمع کررہے تھے ٹرین کی رفتار دھیمی ہوتے ہی عالیہ کا دل سینے سے تیزی سے دھڑکنے لگا تھا وہ اپنے والد سے ملنے کے لیے بے چین تھی اور مزید انتظار نہیں کرسکتی تھی اس کی بات اپنے والد سے فون پر اور ای میل پر ہوتی رہتی تھی لیکن آمنے سامنے اس کی ملاقات ان سے بہت عرصے بعد ہورہی تھی اور اسے امید تھی کہ اگلے دو ہفتے اس کے لیے یادگار ثابت ہونے والے تھے وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اس نے اپنا سامان اٹھایا اور اپنی جینز کی بیک پاکٹ کو چیک کیا اس کا چاقو وہاں موجود تھا جو وہ اپنے ساتھ رکھتی تھی یہ بھی خلیل کامران کی ہدایت تھی وہ اس سلسلے میں اپنے والد کی شکر گزار تھی جنہوں نے اسے سکھایا تھا کہ اسے اپنی حفاظت کیسے کرنا ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁

"اوہ...... وہ دیکھ وہ رہی کیا تم اسے دیکھ سکتے ہو؟"خلیل کامران نے سمیر سے کہا وہ ایک نوجوان لڑکی کی طرف اشارہ کررہا تھا جو ٹرین کے ایک ڈبے کے دروازے کے پائیدان پر کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال اس کے شانوں پر پڑے ہوا سے لہرا رہے تھے سرخ وسفید چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی اور شرارت کے جذبات مچل رہے تھے سمیر کی نظریں بے ساختہ ادھر اٹھ گئیں وہ نہایت خوب صورت تھی۔ اس نے بلو کلر کی جینز اور اس پر کریم کلر کی ڈھیلی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی پھر سمیر نے جلد ہی اس پر سے نظریں ہٹالی تھیں وہ ایک براؤن سوٹ کیس اور جیکٹ اٹھائے ہوئے تھی وہ اس کے اندازے سے زیادہ خوبصورت تھی۔

سمیر ویٹنگ روم کی طرف دیکھ رہا تھا تو اس کی نظر ایک مشکوک شخص پر پڑی اس شخص کو اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تقریباً چھ فٹ لمبا شخص تھا اور ایک کونے میں کھڑا تھا بظاہر وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا اس نے ایک بڑا سا اوورکوٹ پہنا ہوا تھا آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا تھا اور سر پر ایک بیس بال والی ٹوپی تھی جو خاصی آگے جھکی ہوئی تھی جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ سمیر کو اندازہ ہوگیا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے اس نے ایک مشکوک شخص کو پہچاننے میں دیر کردی تھی وہ ابھی بلڈنگ میں داخل ہوا تھا اور اس کا ہاتھ اس کے اوورکوٹ کی جیب میں تھا جیب کا ابھار بتا رہا تھا کہ اس کا

ہاتھ جیب میں موجود ہینڈ گن پر تھا سمیر تیزی سے خلیل کامران کی طرف مڑا جو عالیہ کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا سمیر کی نظر اس کے ساتھ ہی دو اور افراد پر پڑی جو مین انٹرنس کے پاس موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

''ہمیں فوراً یہاں سے چلنا چاہئے۔'' سمیر نے خلیل کامران سے کہا اور اس کی آواز سے ہی خلیل کامران نے خطرہ کا اندازہ لگا لیا پھر اس نے اطراف کا جائزہ لیا تھا تو اسے بھی اندازہ ہوا کہ وہ خطرے میں ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے وہ اور گن مین ویٹنگ روم کے قریب نظر آئے ان لوگوں نے کونے میں کھڑے چھ فٹ آدمی کی طرف آہستہ سے اثبات میں اشارہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی خلیل کامران اور سمیر نے اپنے ہتھیار بھی نکال لیے تھے اور اپنے پیچھے چھپا لیے تھے وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا لیڈر کیا کرتا ہے اس نے اپنی گن نکال کر ہوا میں لہرائی تھی اور سمیر نے فوراً ہی اس کا نشانہ لے کر اسٹیشن کے اندر موجود لوگوں کو خطرے کا سگنل دیا تھا۔

''جھک جاؤ۔'' وہ چیخا اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ہوائی فائر کیا تھا اور اسٹیشن میں موجود لوگ چیخیں مارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے بہت سے لوگ فرش پر بیٹھ گئے تھے کچھ نے خوف سے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے تھے اور کچھ رینگتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''جاؤ تم جاؤ۔'' سمیر نے چیخ کر خلیل کامران سے کہا لیکن خلیل کامران جمع میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا تھا سمیر نے اس کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے ایک بار پھر سے پکارا۔

''میں نے اسے دیکھ لیا ہے میں لاتا ہوں تم کار میں بیٹھو۔'' وہ چیخا اور اچانک دونوں کی نظریں ملیں خلیل کامران جانتا تھا کہ سمیر کے بس میں جو ہے وہ کر رہا ہے۔

''وہ بہت سارے ہیں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' خلیل کامران نے کہا۔

''تم جاؤ۔'' سمیر نے چیخ کر کہا اور اسی وقت اس نے دشمن کو اپنے طریقے سے زیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''نہیں میں نہیں جا سکتا۔'' خلیل کامران نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ سمیر کو ہر حال میں محفوظ رہنا چاہئے۔ سمیر تیزی سے آگے بھاگتا چلا گیا تھا جیکی گروہ کے افراد یک لخت ہر طرف نظر آنے لگے تھے۔

وہ اسٹیشن کے ہر کونے سے دو دو اور تین تین کی ٹکڑیوں میں نکل رہے تھے اگر سمیر عام آدمی کی طرح ان کا مقابلہ کرتا تو ہرگز بھی ان پر قابو نہیں پا سکتا تھا اس نے ایک ایک کر کے ان افراد کے ذہنوں پر قبضہ کرنا شروع کیا جس کے ذہن میں وہ جاتا اسے اپنے دوسرے ساتھی کو نشانہ بنانے کا حکم دے دیتا اور اس کا معمول بننے والا شخص اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دیتا چند لمحے تو یہ صورت حال کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ گروہ کے افراد جو خلیل کامران کو ٹھکانے لگانے آئے تھے اچانک ایک دوسرے کو کیوں مارنے لگے ہیں لیکن جب تک یہ صورت حال گروہ کے افراد کی سمجھ میں آتی تھی دیر ہو چکی تھی ان کے آدھے لوگ مارے جا چکے تھے۔

سمیر انہیں اپنا معمول بنا کر نا صرف انہیں ایک دوسرے سے ختم کروا رہا تھا بلکہ بجلی کی تیزی سے وہ کام ہو جانے پر اپنے معمول کے ذہن سے نکلتے ہوئے اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتا تھا وہ بار بار پینترے بدل بدل کر حملے کر رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چھلاوہ وہاں آ گیا ہو خلیل کامران کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور وہ بھی اپنا دفاع کر رہا تھا جب کہ عالیہ چند لمحوں کے لیے حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

''مائی گاڈ۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اس کے ڈیڈی نے اسے سمیر کی غائبانہ صلاحیتوں کے بارے میں بتایا تو تھا لیکن وہ صرف ان کا تصور کر سکتی تھی اس نے کبھی سمیر کو ایکشن میں نہیں دیکھا تھا۔

''آپ جھک جائیں۔'' اچانک عالیہ اپنے ڈیڈی کی طرف مڑ کر چیخی کیونکہ ایک شخص خلیل کامران کے پیچھے موجود تھا جو اس کا نشانہ لے رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا عالیہ کے پستول کی گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی اور وہ ڈھیر ہو گیا تھا پھر عالیہ کو اسٹیشن کے بیرونی دروازے کی طرف سے دو افراد اور آتے دکھائی دیئے تھے انہوں نے بھی گنیں تانی ہوئی تھیں اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ان میں سے ایک کو سمیر نے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی چھلانگیں مارتا ہوا دوسرے دشمنوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب کہ عالیہ نے دوسرے شخص کو نشانہ بنایا تھا۔

''تم جیت نہیں سکتے۔'' اچانک جیکی گروہ کے افراد میں سے ایک نے کہا۔

''ہم تعداد میں تم سے زیادہ ہیں۔'' اسی لمحے سمیر اس کے سر پر پہنچ کر ایک گولی اس کی کھوپڑی میں اتار چکا تھا۔

''یو سن آف بچ۔'' سمیر نے پھنکارنے والے انداز میں کہا اس کے چہرے کی سختی اور آواز کی پھنکار سن کر عالیہ ایک لمحے کے لیے سہم گئی تھی سمیر مستعدی سے لڑ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ڈی سی او کا مستقبل ہے وہ چاہتا تھا کہ اس موقع پر بھی چیزیں اسی طرح ہوں جیسے کہ وقت کا تقاضا ہے سمیر نے اندازہ کیا کہ چار افراد ان کی طرف بڑھ رہے ہیں پھر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

سمیر نے ان کے لیڈر کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کیا تھا جو اس کے گھٹنے کے اوپر لگا تھا اور وہ فرش پر گر گیا تھا پھر اس سے پہلے کہ زمین پر گرنے والا شخص ان پر فائر کرتا سمیر نے فضا میں کسی چھوٹی سی چیز کو اڑتے ہوئے دیکھا وہ سامنے والے گن مین کی طرف گئی تھی وہ چمک رہی تھی اور اس کی رفتار تیز تھی سمیر کو اس چیز کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکا تھا جب تک وہ گن مین کی کلائی میں پیوست نہیں ہو گئی تھی وہ ایک چمک دار چاقو تھا اس کا پھل تین انچ کا تھا گن مین کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی زخمی کلائی پکڑ لی تھی اس کی کلائی سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا سمیر کی نظر اسی لمحے عالیہ پر پڑی جو قریب ہی کھڑی تھی اور زخمی ہونے والے کو حقارت سے دیکھ کر سر ہلا رہی تھی۔

سمیر حیران تھا اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا ایک اٹھارہ سال کی عام شہری لڑکی کس طرح ایک تربیت یافتہ شخص کو نشانہ بنا سکتی تھی یہ ناممکن تھا اس نے خلیل کامران کی طرف دیکھا اس پر حملہ کرنے والے دو افراد فرش پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ خلیل کامران نے انہیں فائر کر کے زخمی کر دیا تھا اسی لمحے دو اور حملہ آور اسٹیشن میں داخل ہوئے وہ فائر کر رہے تھے ایک گولی سمیر کے بازو میں لگی۔

''اوہ میرے خدا۔'' سمیر نے کہا پھر اس نے اپنی خدا داد صلاحیت کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا اور سامنے کھڑے حملہ آوروں کے لیڈر کے دماغ میں پہنچ گیا اس کے ساتھ ہی لیڈر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر فائرنگ کرنے کا اشارہ کیا تھا اور اس کے ساتھی جہاں تھے وہیں رک گئے تھے اور حیرت سے اپنے لیڈر کو دیکھ رہے تھے جس کا دماغ اب سمیر کے کنٹرول میں تھا سمیر کے بازو سے خون بہہ رہا تھا اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنا بازو پکڑا ہوا تھا اسی وقت اس کی نظر خلیل کامران پر پڑی جو کچھ فاصلے پر فرش پر پڑا تھا عالیہ اس کی طرف بڑھی اور سمیر کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا خلیل کامران کو گولیاں لگی تھیں اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سمیر لیڈر کے دماغ سے نکل گیا اور اس کے ایسا کرتے ہی لیڈر حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورت حال کیسے بدل گئی تھی۔

''کمانڈر۔'' دہشت گردوں کے لیڈر نے خلیل کامران کو مخاطب کیا۔

''تم وہ جنگ لڑ رہے ہو جو تم جیت نہیں سکتے۔''

''بس اب بند کرو۔'' سمیر نے کہا اسی وقت پولیس کے دستے اسٹیشن میں داخل ہو گئے اور دہشت گردوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور ان میں سے کئی بھاگ کھڑے ہوئے جب کہ کئی پکڑے گئے۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ اس کام کے لیے مجھے کتنے پیسے ملے ہیں۔'' لیڈر نے کہا۔

''میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہیں تباہ کر دوں گا۔'' سمیر نے کہا۔

''شاید' لیکن ابھی تو میں نے تمہیں تباہ کر دیا ہے۔'' لیڈر نے خلیل کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا پولیس کے افسران قریب آ رہے تھے۔

''ہمارا کام یہاں ختم ہو گیا نکلو۔'' لیڈر نے کہا۔ پولیس کے افراد قریب آ رہے تھے لیکن ان کے موقع پر پہنچنے سے پہلے ہی لیڈر اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے نکل گیا تھا سمیر اس وقت اس کے پیچھے جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا وہ بھی زخمی تھا اور خلیل کامران بھی' سمیر تیزی سے اس کی طرف بڑھا عالیہ بھی خلیل کامران پر جھکی ہوئی تھی جس نے اپنے سینے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا سمیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ ہٹا کر اس کی شرٹ کھولی جس پر خون لگا ہوا تھا۔

''خلیل خلیل آنکھیں کھولو۔'' سمیر نے کہا اس کی نظریں خلیل کے سینے پر گولی کے نشان پر جمی ہوئی تھیں۔

''اوہ خلیل تم نے اپنی بلٹ پروف کیوں نہیں پہنی تھی؟'' سمیر نے کراہتے ہوئے کہا۔

''میں تھک چکا ہوں۔'' خلیل کامران نے نحیف آواز میں کہا۔

''ایمبولینس کو بلاؤ۔'' سمیر نے تیزی سے کہا اور عالیہ رونے لگی۔

''اب بہت دیر ہوچکی ہے۔'' خلیل کامران نے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' عالیہ روتے ہوئے چیخی اور سمیر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''وہ ایک جان لیوا شاٹ تھا۔'' سمیر نے عالیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا وہ اب تک ایسا کہنے سے خود کو روکے ہوئے تھا وہ جانتا تھا کہ عالیہ کا رونا اسے بھی رونے پر مجبور کردے گا اور وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔

''عالیہ۔'' خلیل کامران نہایت نحیف آواز میں بولا اور عالیہ اس کے قریب ہوگئی۔

''سنو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' خلیل کامران نے کہا۔

''نہیں...... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی...... میں۔''

''تم رہ سکتی ہو......'' اس کے والد نے نرمی سے کہا سمیر اسے افسردہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم سمیر سے ملی ہو؟ اب یہ ڈی سی او کا کمانڈر ہے۔ یہ میرے لیے میرے بیٹے کی طرح ہے یہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ میری پیاری بیٹی...... تم اکیلی نہیں ہو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سب کچھ...... میں تم سے...... پیار کرتا ہوں۔'' خلیل کامران نے کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی سمیر نے اس کی آنکھیں بند کردیں اور اسے لٹا دیا اور خود پیچھے ہوکر بیٹھ گیا اور اپنے کمانڈر کے زندگی سے عاری جسم کو دیکھنے لگا۔

''ڈیڈی...... نہیں ڈیڈی......'' عالیہ رونے لگی وہ خلیل کامران کے جسم سے چمٹ گئی تھی اور زور زور سے رو رہی تھی سمیر نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور اس نے عالیہ کو خلیل کامران کے بے جان جسم سے الگ کیا اور عالیہ اس کے بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔

''مجھے افسوس ہے میں یہ غم بانٹ نہیں سکتا۔'' سمیر آپ ہی آپ بڑبڑایا وہ خلیل کامران کے جسم کو دیکھ رہا تھا۔

''میرے دوست میرے، ہمدرد خدا تمہیں سکون نصیب کرے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا وہ خلیل کامران کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس نے سمیر کے لیے جتنا کیا تھا اس کا بدلہ شاید وہ کبھی نہیں دے سکتا تھا لیکن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ عالیہ کی حفاظت ہمیشہ کرے گا۔

❀......❀......❀......❀
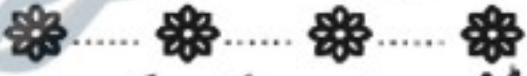
ریلوے اسٹیشن سے سمیر عالیہ کو لے کر سیدھا ڈریم سینٹر پہنچا تھا اس کے بازو میں گولی لگی تھی اور خون بہہ کر آستین پر جم گیا تھا ڈریم سینٹر میں وہ سب سے پہلے ناصر محمود سے ملا تھا اور اس کو ساری صورت حال سمجھائی تھی پھر عالیہ کو اس کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ ڈاکٹر طلحہ سے ملا تھا جو خلیل کامران کے پرانے ساتھیوں میں سے تھے انہیں حادثے کی اطلاع ہوچکی تھی انہوں نے سمیر کے بازو سے گولی نکال کر اس کی بینڈیج کردی تھی۔

''اگر ضرورت ہو تو میں پرسکون کرنے والی کچھ ٹیبلٹس تمہیں دے دوں؟'' ڈاکٹر طلحہ نے پوچھا۔

''نہیں...... ٹھیک ہے۔'' سمیر نے اپنی شرٹ کی خون آلود آستین درست کرتے ہوئے کہا اور اپنی جیکٹ لے کر ان کے کمرے سے نکلنے لگا تو انہوں نے اسے روکا۔

''سمیر تم جانتے ہو کہ جب سے خلیل کامران نے اس ڈریم سینٹر کی بنیاد رکھی تھی میں ان کے ساتھ تھا اور ایک حقیقت جو ان کے چند قریبی ساتھی ہی جانتے ہیں کہ وہ زندگی میں صرف دو چیزوں سے محبت کرتے تھے ایک تو ڈریم سینٹر اور دوسری ان کی بیٹی عالیہ۔''

''جی میں جانتا ہوں۔'' سمیر نے مختصر سا جواب دیا۔

''جب سے انہیں جیکی گروپ کی طرف سے دھمکیاں ملنا شروع ہوئی تھیں انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے والے ہیں یا یوں کہہ لو کہ وہ چند دنوں کے مہمان ہیں۔ انہیں جن حالات کا سامنا تھا انہیں روکنا ممکن نہیں تھا بہرحال وہ لوگ کبھی نہ کبھی ان تک پہنچ ہی جاتے چاہے تم کچھ بھی کرتے اور دیکھو شہر میں کیا ہو رہا ہے کیسے حالات ہیں کتنے لوگ ان کا نشانہ بن رہے ہیں۔''

''جی۔'' سمیر نے کہا۔
''خلیل کامران تم پر بہت اعتماد کرتے تھے اور انہوں نے اپنی دونوں قیمتی چیزیں ڈریم سینٹر اور عالیہ تمہارے حوالے کردی ہیں۔ ان کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے تھے یہ بات یاد رکھنا اب ان کے دشمن تمہارے دشمن ہوں گے اب وہ تمہیں چیلنج کریں گے۔ انہیں کامیاب مت ہونے دینا وہ اس ادارے کو کمانڈ نہیں کریں گے۔ تمہیں اس کی کمانڈ کرنا ہے۔ مخالفتوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑسکتا ہے اور خود کو مضبوط اور اس عہدے کے قابل اور موقع شناس ثابت کرنا ہے۔'' ڈاکٹر طلحہ نے سمجھایا۔
''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ڈاکٹر۔'' سمیر نے کہا اور ان سے ہاتھ ملا کر ان کے کمرے سے نکل گیا پھر اس نے ناصر محمود سے تفصیلی بات بعد میں کرنے کا کہہ کر عالیہ کو ساتھ لیا تھا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔
ڈریم سینٹر سے نکل کر وہ ایک کچی پکی سڑک پر اپنی کار ڈرائیو کر رہا تھا عالیہ بالکل خاموش تھی وہ ابھی تک صدمے سے نہیں نکل سکی تھی کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گھنے جنگل میں آ گیا تھا یہ گھر بھی اسے خلیل کامران نے ہی دیا تھا وہ خاصا محفوظ تھا گھنے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا اور اسے روڈ سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا کچھ دور جانے کے بعد سامنے ایک آٹھ فٹ اونچا گیٹ نظر آیا جس کے دونوں اطراف میں ایک بہت موٹی اور دس فٹ اونچی دیوار بنی تھی جو اس عمارت کے چاروں اطراف تھی جس میں سمیر کی رہائش تھی۔
سمیر نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اسے آن کیا اور اس سے چار ہندسوں والا ایک نمبر ڈائل کیا چند ہی سیکنڈ بعد ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ گیٹ کھل گیا تھا سمیر اس گیٹ سے کار گزارتا ہوا آگے نکل گیا جیسے ہی کار گیٹ سے آگے بڑھی گیٹ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ سمیر نے آگے جا کر دائیں جانب کار موڑی تھی اور ایک بہترین موڈرن ڈرائیووے میں داخل ہو گیا تھا وہ کار کو سیدھا ڈرائیو کرتا ہوا گیراج تک لے گیا تھا جو انہیں گھر کے نیچے تہہ خانے میں لے گیا تھا یہ گھر تین منزلہ بنا ہوا تھا اور کچھ ہی عرصے پہلے خلیل کامران نے اسے دیا تھا۔
عالیہ حیرت سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی شاید اس نے بھی یہ جگہ پہلی بار دیکھی تھی یہ گہرے پتھر کی اینٹوں سے بنی ہوئی خوبصورت عمارت تھی جس کی دوسری منزل کی بالکنی باہر کی جانب کھلتی تھی اور عمارت میں بڑی بڑی کشادہ کھڑکیاں تھیں کار جیسے ہی گیراج میں داخل ہوئی تھی سمیر نے اپنے سیل فون پر ایک اور کی کوڈ ڈائل کیا تھا اور گیراج کا اندرونی دروازہ کھل گیا تھا۔
''اوہ تمہاری سیکورٹی کا تو بہت خیال رکھا گیا ہے۔'' عالیہ نے حیرت سے کہا سمیر اس دروازے سے کار آگے لیتا چلا گیا تھا۔
''ہاں لیکن یہ ہماری ضرورت کا حصہ ہے عیاشی نہیں۔'' سمیر نے جواب دیا۔
انڈر گراؤنڈ گیراج میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو اس کی چھت میں لگے کم روشنی والے بلبوں سے آ رہی تھی گیراج کا سائز اتنا بڑا تھا کہ اس میں بیک وقت چھ گاڑیاں آسکتی تھیں اس کی ایک دیوار پر کچھ ہتھیار لگے ہوئے تھے جن میں رائفلز شاٹ گنز پستولز چاقو تھے اور کچھ ہتھیار ایک شیشے کی الماری میں رکھے نظر آ رہے تھے جو دیوار میں بنی تھی اس کے سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو عالیہ کے اندازے کے مطابق بیسمنٹ میں کھلتا تھا۔
''کیا یہ میرے ڈیڈی کی کار ہے؟'' عالیہ نے پوچھا اس کا اشارہ وہاں پہلے سے کھڑی ایک کار کی طرف تھا۔
''ہاں یہ ان ہی کی ہے۔'' سمیر نے اس کار کے برابر اپنی کار کھڑی کرتے ہوئے کہا۔
''ان کا خیال تھا کہ انہیں یہ کار کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ کر جانا چاہیے۔''
''اس کا کیا مطلب ہے؟'' سمیر نے کہا تو عالیہ نے اسے چونک کر دیکھا۔
''اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے پوچھا لیکن سمیر نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔
''چلو اندر چلو۔'' سمیر نے کہا۔
''کمانڈر۔'' عالیہ نے اسے مخاطب کرنے کے لیے پہلی بار یہ لفظ استعمال کیا۔
''مجھے صرف سمیر کہو۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے سمیر۔'' عالیہ نے جواب دیا اور اس کے

پیچھے آگے بڑھتی رہی سمیر نے دروازہ کھولا تھا اور وہاں کچھ سیڑھیاں موجود تھیں جو نیچے جا رہی تھیں۔

''آؤ ادھر سے چلو۔'' سمیر نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا عالیہ نے اس کی تقلید کی تھی پھر سمیر نے پیچھے مڑ کر دروازہ بند کیا تھا اور اس کی کراہ نکل گئی تھی بازو کے زخم میں تکلیف بڑھ گئی تھی فوراً ہی عالیہ نے سہارا دینے کے لیے اسے پکڑا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

''سوری۔'' سمیر نے کہا اسے احساس ہوا کہ نادانستہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے عالیہ کے ہاتھ اس کے سینے پر تھے اور عالیہ کے جسم پر موجود پرفیوم کی خوشبو اسے مسحور کر رہی تھی۔

''اوہ میرے خدا'' اس نے دل میں سوچا شاید وہ عالیہ سے متاثر ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے کچھ صنف نازک سے اتنا قریب نہیں ہوا تھا اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور عالیہ سے دور ہٹ گیا پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا تھا اسے تھکن کا احساس ہو رہا تھا عالیہ بالکل خاموش تھی اس نے کچھ نہیں بولا تھا بس خاموشی سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

پھر سمیر نے ایک دروازہ کھولا تھا جو ایک لیونگ روم میں کھلا تھا وہاں ایک عنابی رنگ کا بڑا لیدر کا صوفہ موجود تھا کرسیاں تھیں ایک سمت الماری تھی جس میں بہت سی کتابیں رکھی تھیں دیوار پر ایل سی ڈی لگی تھی اور ایک میز پر چند گلاس اور جگ رکھا تھا عالیہ نے کمرے کا معائنہ کیا کچھ سیڑھیاں دوسری منزل پر جا رہی تھیں اس کمرے کے ساتھ ہی ایک بڑا ہال موجود تھا اور سیدھے ہاتھ پر کچن موجود تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں سے میرے والد کی رہائش گاہ بھی زیادہ دور نہیں ہوگی۔'' عالیہ نے کہا۔

''وہ یہاں سے تقریباً ڈھائی میل مشرق کی جانب ہے۔'' سمیر نے کہا عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کمرے میں خاموشی تھی اور عالیہ کے چہرے پر پریشانی سمیر اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہی ہوگی ابھی اس کے ڈیڈی قتل ہوئے تھے اب کچھ ہی دیر بعد وہ ایک اجنبی کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھی جسے وہ اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی سمیر کو جب بھی کوئی شکل پیش آتی تھی تو اسے معلوم ہوتا

تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے لیکن کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ اپنے گھر میں تنہا ہونا اور اس کے آرام اور حفاظت کا خیال رکھنا یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

''ارے تم بیٹھو اگر کچھ پینا چاہو تو......'' سمیر نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہوں ں ں......؟ ہاں۔'' عالیہ اپنے خیالات سے چونکی۔

''تم ٹھیک تو ہونا؟'' وہ ابھی تک صدمے میں تھی وہ کار میں بھی خاموش بیٹھی رہی تھی اور اب بھی جیسے گنگ سی تھی لیکن وہ اپنے تجربے سے کہہ سکتا تھا کہ جب اس کو کچھ وقت گزر جائے گا تو اسے اس دکھ کا احساس اور شدید ہو جائے گا وہ اتنے سال گزرنے کے باوجود اپنے والدین کی موت کو نہیں بھولا تھا وہ دل ہی دل میں عالیہ کے لیے دعا کر رہا تھا کہ اسے اس صدمے سے کوئی نقصان نہ پہنچے ماں باپ کا بچھڑنا کچھ معمولی بات نہیں تھی پھر جس طرح غیر متوقع طور پر خلیل کامران کی موت ہوئی تھی وہ عالیہ کے لیے ایک اچانک صدمہ تھا جس کے لیے اس کا ذہن پہلے سے تیار نہیں تھا۔ سمیر اپنی جگہ سے اٹھا اور فریج کی طرف بڑھ گیا اس کے بازو میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی تھی اور منہ سے سسکی کی آواز نکلی تھی اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر طلحہ کی پرسکون کر دینے والی گولیوں کی آفر قبول کر لینی چاہئے تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ کار ڈرائیو کر کے یہاں تک نہیں لا سکتا تھا اس نے فرج سے کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں نکالیں اور جیسے ہی انہیں میز پر رکھا اس کے فون کی بیل بجنے لگی۔

''ہیلو میں ناصر ہوں۔'' دوسری طرف سے ناصر محمود بول رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارا زخم اتنا گہرا ہے ابھی ڈاکٹر طلحہ نے مجھے بتایا ہے۔''

''یہ معمولی زخم ہے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''میں خود دیکھنا چاہتا ہوں مجھے اندر آنے دو۔'' ناصر محمود نے کہا اور سمیر نے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اسے گیٹ کے قریب ناصر کی موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی تھی سمیر لیونگ روم سے گزر کر بیرونی دروازے کی

طرف بڑھا دروازے کے قریب پن پیڈ لگا تھا اس نے گیٹ کھولنے کے لیے access Code کو پنچ کیا اور سیکورٹی کیمرہ کی طرف دیکھا ناصر اپنی بائیک کو بیرونی دروازے کے قریب لا رہا تھا۔

''ناصر محمود ہے۔'' سمیر نے عالیہ کو بتایا۔

''خیریت لینے آیا ہے پریشان ہو رہا تھا۔'' سمیر کی بات پر عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور سمیر نے دروازہ کھول دیا تھا ناصر اندر آ گیا تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اتنا گہرا زخم آیا ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔ ''چلو مجھے دکھاؤ۔'' اس نے سمیر کا ہاتھ تھام کر اسے کچن کی طرف لے جاتے ہوئے کہا کچن میں جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا تھا اور اپنے ساتھ لایا ہوا بیگ کھولا تھا۔

''عالیہ بہت خوبصورت ہے۔'' ناصر محمود نے بیگ کھولتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

''بس کرو ناصر۔'' سمیر نے موضوع بدلنے کا اشارہ دیا۔

''کیوں تمہیں نہیں لگتا وہ واقعی حسین ہے۔'' ناصر نے پھر کہا۔

''یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے ناصر۔'' سمیر نے کہا اور ناصر نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''تم اسے پسند کرتے ہو۔'' ناصر نے پھر کہا۔

''ناصر تم کیسی باتیں کر رہے ہو چلو اپنا کام کرو۔'' سمیر نے کہا اور ناصر ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے بازو کے زخم کی پٹی کھولی تھی اور اس کا معائنہ کرنے لگا تھا۔

''تم مجھے بتاؤ گے کہ تم نے سکون آور دوا لینے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔'' سمیر نے مختصر جواب دیا۔

''لڑکی کی حفاظت کرنے کے لیے؟'' ناصر نے پوچھا وہ زخم پر کوئی دوا لگاتا جا رہا تھا جس سے سمیر کو تکلیف ہو رہی تھی۔

''ہاں۔'' سمیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تمہارا پروگرام کیا ہے؟ کیا ساری عمر اسے یہاں رکھ کر حفاظت کرو گے؟'' ناصر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''اگلے اڑتالیس گھنٹے تک وہ یہاں رہے گی تاکہ میں اس کا صدمہ بانٹ سکوں جب وہ پرسکون ہو جائے گی تو جا سکتی ہے۔''

''اور اس کے بعد؟...... کیا تم مجھے آرڈر کرو گے کہ میں خلیل کامران کی رہائش گاہ پر اس کے لیے بہترین سیکورٹی کا انتظام کروں؟'' ناصر نے پوچھا کیونکہ اب وہ خلیل کامران کی طرح سمیر کا اسسٹنٹ تھا۔

''ظاہر ہے میں یہی چاہوں گا کہ اسے جیکی گروپ سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ وہ اس جنگ کا حصہ بن گئی ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''تم سمجھتے ہو کہ تم اس صورت حال پر قابو پا لو گے؟ میرا مطلب عالیہ کے صدمے سے ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں میں یہ کر لوں گا کیونکہ میں نے خلیل کامران سے یہ وعدہ کیا ہے۔'' سمیر نے کہا اور ناصر نے اس کی طرف افسردگی سے دیکھا سمیر جانتا تھا کہ اسے بھی خلیل کامران کی موت کا اتنا ہی دکھ تھا جتنا سمیر اور عالیہ کو بلکہ ڈریم سینٹر کے ہر فرد کو ہی صدمہ پہنچا تھا یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ چند گھنٹے پہلے خلیل کامران اور میں کار میں بیٹھے ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اب...... سب کچھ ختم ہو چکا ہے...... خلیل کامران ہم میں نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم کو چھوڑ گیا ہے۔''

''ہاں یہ احساس بہت تکلیف دہ ہے ہم اسے بھول نہیں سکیں گے۔'' ناصر محمود نے اپنا کام ختم کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ دیر آرام کر لینا...... یہ ضروری ہے۔'' ناصر محمود نے بیگ میں چیزیں رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ناصر۔''

''ٹھیک ہے کل بات کریں گے۔'' ناصر نے اٹھتے ہوئے کہا پھر وہ واپس چلا گیا تھا اور جب سمیر واپس لیونگ روم میں آیا تھا تو عالیہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا وہ سگریٹ پی رہی تھی۔

''تم اسموکنگ کرتی ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کبھی کبھی۔'' عالیہ نے اداسی سے کہا اس نے سگریٹ کا پیکٹ سمیر کی طرف بڑھا دیا تھا اور سمیر نے بھی اپنے لیے

ایک سگریٹ سلگا لیا تھا وہ عالیہ کی آنکھوں میں موجود اداسی کو محسوس کر سکتا تھا وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔
''تم ٹھیک ہو؟'' عالیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہاں! عالیہ تمہیں یہاں کم از کم اڑتالیس گھنٹے تک یہاں رہنا ہوگا یہ صرف احتیاط کے طور پر ہے۔'' سمیر نے کہا۔
''کیا تم سمجھتے ہو مجھے نشانہ بنایا جا سکتا ہے؟'' اچانک عالیہ نے پوچھا۔
''ہاں اس کا امکان ہے۔'' سمیر نے کہا۔
''میرے والد کی وجہ سے؟''
''نہیں وہ اس لیے کہ تم اس لڑائی کا حصہ بن گئی تھیں۔'' سمیر نے کہا وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس کا شک درست ہے کہ عالیہ نے خنجر مار کر جیکی کو زخمی کیا تھا وہ دیکھ تو نہیں سکا تھا لیکن عالیہ کے اس وقت کے تاثرات کو دیکھ کر اس کا اندازہ یہی تھا۔
''ہوں......'' جواب میں عالیہ نے بس اتنا ہی ردعمل دکھایا تھا۔
''کیوں! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ تم لڑائی کا حصہ نہیں بنی تھیں؟'' سمیر نے کہا۔
''تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری زندگی بچانے والی میں ہی ہوں؟ تو ہاں تمہارا شک درست ہے۔'' عالیہ نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔
''اب تم پوچھو گے کہ میں نے اپنے والد کی مدد کرنے کے بجائے تمہاری مدد کیوں کی؟'' عالیہ نے اس کے بولنے سے پہلے ہی سوال کر دیا تو سمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔
''ظاہر ہے اگر میں ایسا نہیں کرتی تو تم مر جاتے اور میرے والد کے ایک دشمن کو ختم کرنے سے میرے والد کا مشن پورا نہیں ہو سکتا تھا لیکن تمہیں بچانے سے پورا ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے تمہاری زندگی بچائی۔''
''تم ایک عام شہری ہو لیکن سوچتی تربیت یافتہ فائٹرز کی طرح ہو۔'' سمیر نے کہا۔
''یہ میرے ڈیڈی کا کمال ہے۔'' عالیہ نے کہا۔
''کیا انہوں نے تمہیں یہ سب سکھایا ہے؟''
''ہاں کچھ چیزیں جو میری حفاظت کے لیے ضروری ہیں اپنا دفاع کرنے کے لیے...... تم تو جانتے ہو گے؟'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس وقت سمیر اس کے ذہن تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ حقیقت جان سکے جو عالیہ اس سے چھپا رہی تھی وہ اسے آدھی بات بتا رہی تھی اور اس نے سمیر کے لیے اپنا ذہن بھی آزاد نہیں چھوڑا تھا وہ اس کے ذہن میں نہیں جھانک سکتا تھا۔
''اور چاقو بازی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' سمیر نے اسے کریدا۔
''ہاں میں نے اس کی تربیت کی بھی کچھ کلاسس لی تھیں۔'' عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔
''تم نے جو بے خطا نشانہ لگایا تھا وہ صرف چند کلاسس لینے سے نہیں آتا۔'' سمیر نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔
''ویل...... میں نہیں جانتی بس یوں سمجھ لو کہ مجھ میں اس کام کے کرنے کی قدرتی پھرتی موجود ہے شاید۔''
''ہوں' گویا یہ تمہاری قدرتی صلاحیت ہے۔'' سمیر نے کہا بھلا اس سے بہتر اس چیز کو کون جان سکتا تھا۔ سمیر نے اب تک اپنی زندگی میں اس کام کا ماہر ایک ہی شخص دیکھا تھا اور وہ سجاد علی تھا اور بہت پھرتیلا تھا۔
''میرے والد کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟'' عالیہ نے پوچھا۔
''مجھے چند ہی ہفتے پہلے پتہ چلا تھا کہ جیکی گروپ کی طرف سے انہیں دھمکیاں مل رہی تھیں۔'' سمیر نے کہا۔
''وہ انہیں کیوں مارنا چاہتے تھے؟'' عالیہ نے پوچھا اسے اپنے اندر دکھ اور غصہ کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اور خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اسے اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہئے تھے اور وہ سمیر سے لڑ کر وہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔
''اگر تمہیں پتہ تھا کہ انہیں دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں اور ان کی جان کو خطرہ ہے تو ان کی حفاظت کے لیے زیادہ لوگ کیوں نہیں رکھے گئے؟''
''یہ خلیل کامران کو پسند نہیں تھا' میرا یقین کرو میں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی بھی۔''
''میں یہ جاننے کا حق رکھتی ہوں میرے ڈیڈی کو کیوں

قتل کیا گیا؟'' عالیہ نے کہا۔

''لیکن میں اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا عالیہ۔''

''حالانکہ تم حقیقت جانتے ہو۔'' عالیہ نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ جس پر سمیر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ یہ سیکھنے میں گزارا تھا کہ کون سی انفارمیشن کس کو کب اور کہاں دینا ہے وہ اس کام کا ماہر بن چکا تھا اور یہ وہی صورت حال تھی جب اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسے عالیہ کو کتنی انفارمیشن دینی ہے جب کہ عالیہ اس وقت صرف سچ سننا چاہتی تھی اور سمیر کے خیال میں بعض اوقات جھوٹ پر یقین کرنا بہتر ہوتا ہے بجائے سچ برداشت کرنا زیادہ تکلیف دہ ہوسکتا تھا اور یہ ایسی ہی صورت حال تھی جہاں اسے ڈریم سینٹر کے مفادات کا خیال رکھنے کے لیے بہت سی باتیں عالیہ سے چھپانا تھیں۔

''مجھے صرف اتنا بتادو کہ کمانڈر جو راز تمہارے سینے میں ہے کیا وہ تمہیں راتوں کو جاگتے رہنے پر مجبور کرتا ہے؟'' عالیہ نے نئے ڈھنگ سے سوال کیا اور سمیر نے اس کی طرف دیکھا۔

''کبھی کبھی۔'' سمیر نے مبہم جواب دیا اور عالیہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اس نے سمیر سے مزید سوال کرنے کا ارادہ ترک کردیا تھا وہ جان گئی تھی کہ سمیر مضبوط اعصاب اور مضبوط ارادوں والا شخص ہے وہ جب کوئی فیصلہ کرلے تو اسے اس فیصلے سے ہٹایا نہیں جاسکتا اور اس نے عالیہ کو کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا تو اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''لیکن یہ تو حقیقت ہے ناکہ جس شخص کی گولی سے میرے ڈیڈی مارے گئے وہ جیکی گروپ سے تعلق رکھتا تھا؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''کلی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا یوں لگتا ہے کوئی کنٹریکٹ کیا گیا تھا وہ شخص ڈائریکٹ جیکی کے لیے کام نہیں کرتا..... لیکن میں پتہ لگاؤں گا کہ وہ کون ہے؟''

''لیکن اس کا تعلق جیکی گروپ سے ہے؟'' عالیہ نے کہا لیکن سمیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا یہ رویہ کیوں ہے؟ میرے ڈیڈی تمہارے لیے بھی والد کی طرح تھے ان کی موت کا جتنا افسوس مجھے ہے تمہیں بھی ہوگا؟''

''ہاں مجھے ان کی موت کا افسوس ہے لیکن یہ صرف میری ذات کی حد تک ہے لیکن جہاں سے ڈی سی او کے اصول شروع ہوتے ہیں وہاں میں مجبور ہوں میں کچھ حقائق تم سے شیئر نہیں کرسکتا۔''

''کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ تم میری کیفیت دیکھ کر بھی مجھے حقیقت نہیں بتاسکتے ہو؟''

''میں جو کررہا ہوں وہ میرے لیے آسان نہیں ہے عالیہ۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''تم اس وقت جو کچھ محسوس کررہی ہو وہ وقت کا تقاضا ہے اس کے لیے میں تمہیں قصوروار نہیں کہوں گا میں بھی ایسا ہی محسوس کررہا ہوں لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے رویوں کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے میں اپنے لوگوں کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے لڑنے کے لیے نہیں کہہ سکتا میرے ادارے کا ایک مقصد ہے یہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے کسی انفرادی شخص کے لیے نہیں ہاں وہ بہت سے باصلاحیت لوگوں کی خدمات ضرور لیتا ہے۔'' سمیر نے کہا اسی وقت پھر سیل فون کی بیل ہوئی۔

''ہیلو! نہیں..... نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے..... تمہاری حفاظت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی میں اس کی اجازت نہیں دوں گا..... کیا..... ہاں میں جانتا ہوں..... ہم پھر بات کریں گے۔'' سمیر نے کہہ کر فون عالیہ کو دے دیا تھا۔

''کمال کامران۔'' سمیر نے عالیہ کو بتایا۔

''میرے انکل؟''

''ہاں۔'' سمیر نے کہا وہ جانتا تھا کہ کمال، خلیل کامران کا بھائی ہے اور وہ بھی ڈریم سینٹر سے تعلق رکھتا ہے اس کی بھی شدید خواہش تھی کہ خلیل کامران کے بعد وہ اس سینٹر کا کمانڈر بنے لیکن خلیل کامران نے اسے اس قابل نہیں سمجھا تھا اور یہ ذمہ داری سمیر کے سپرد کی تھی وہ بھی خلیل کامران کی طرح انہی پہاڑوں میں ایک دور دراز گھر میں رہتا تھا اب خلیل کامران کی موت کے بعد شاید وہ اس سینٹر میں پھر اثر ورسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

❀ ❀ ❀ ❀

اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بہت بھاری ہورہا تھا عالیہ کو سمیر کے گھر سے آئے ہوئے دو دن ہوگئے تھے وہ اپنے والد کے گھر میں آگئی تھی اور وہاں چار سیکورٹی گارڈز کا

اضافہ کردیا گیا تھا لیکن اس گھر سے اس کے والد کی یادیں وابستہ تھیں اس نے گھڑی کی طرف دیکھا بارہ بجنے والے تھے اور اس سے اس کے کمال انکل ملنے کے لیے آنے والے تھے آج اس کے والد کی آخری رسومات ادا کی جانے والی تھیں وہ جیسے ہی بستر سے اٹھی چند تصویریں اس کے بیڈ سے پھسل کر نیچے گر گئیں وہ بھول ہی گئی تھی کہ کل رات اپنے والد کی تصویریں دیکھتے دیکھتے وہ سو گئی تھی وہ ان کی ساری تصویریں دیکھ چکی تھی لیکن اس کے ذہن سے ان کا وہ تصور محو نہیں ہو رہا تھا جب اس نے انہیں ریلوے اسٹیشن میں خون سے نہائے ہوئے دیکھا تھا۔

کچھ ہی دیر میں سمیر اسے لینے آ گیا تھا یہ اس کا ہی آئیڈیا تھا کہ عالیہ اس کے ساتھ اپنے ڈیڈی کی آخری رسومات ادا کرنے قبرستان جائے گی۔ یہ بھی سمیر نے عالیہ کے بہت زیادہ اصرار پر کیا تھا ورنہ اس کی مرضی نہیں تھی کہ عالیہ وہاں جائے۔

''ایک بار پھر سوچ لو وہاں خطرہ ہو سکتا ہے۔'' سمیر نے اسے آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں جانتی ہوں لیکن میں بچی نہیں ہوں میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔'' عالیہ نے کہا۔

''اور دشمن کے خوف سے میں یہ نہیں کر سکتی کہ اپنے والد کی آخری رسومات میں شرکت نہ کروں۔'' اس نے بے باکی سے کہا اسی لمحے کمال کامران بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور سمیر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم یہاں مت آنا۔ تم جانتے ہو خلیل کامران کے بعد تم ان کے نشانے پر ہو وہ تمہارے بھی اسی طرح دشمن ہیں جیسے خلیل کامران کے تھے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی آخری رسومات میں بھی شرکت نہ کروں اور پھر اب تو تم ڈریم سینٹر کے کمانڈر ہو...... چنانچہ تم بھی ان کے نشانے پر ہو گے۔'' کمال کامران نے طنزیہ انداز میں کہا اور عالیہ نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔

''ایک منٹ میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی پھر کچھ ہی دیر بعد واپس آئی تھی اور اس نے ایک ڈبہ سمیر کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔

''یہ تمہارے لیے میرے ڈیڈی کی ہدایت تھی کہ میں یہ تمہارے سپرد کر دوں۔'' عالیہ نے کہا اور سمیر نے اس چھوٹے سے چوکور ڈبے کو کھول کر دیکھا اس میں خلیل کامران کے وہ تمغے جگ مگا رہے تھے جو اس کی بہترین کارکردگی پر ایک کمانڈر کی حیثیت سے اسے حکومت کی جانب سے دیئے گئے تھے۔ کمال کامران کے چہرے پر افسردگی اور ناگواری کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ لیکن اس نے کوئی لفظ نہیں کہا تھا پھر سمیر عالیہ کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھا تھا اور کمال کامران نے اس کی تقلید میں اس کے پیچھے قدم بڑھائے تھے۔

آخری رسومات نہایت سادگی سے ادا کی گئی تھیں اس کے دوران زیادہ وقت عالیہ روتی رہی تھی اور سمیر اسے تسلی دیتا رہا تھا۔ سیکورٹی کا سخت انتظام تھا۔ کوئی ناخوش گوار واقعہ وقوع پزیر نہیں ہوا تھا اور وہ لوگ رسومات ختم ہونے کے بعد واپس عالیہ کی رہائش گاہ پر آ گئے تھے جہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد سمیر نے واپسی کی اجازت مانگی تھی تو عالیہ اسے گیٹ تک رخصت کرنے آئی تھی۔

''تم نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے میں اس پر تمہاری شکرگزار ہوں۔'' عالیہ نے کہا۔

''میں نے جو بھی کیا وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے میرا فرض تھا اور خلیل کامران کا حق تھا۔''

''کیا تم کل کچھ دیر کے لیے آ سکتے ہو؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''کیوں؟''

''میں کل ایک بار پھر اپنے والدین کی قبر پر جانا چاہتی ہوں۔'' عالیہ نے کہا۔

''پھر شاید چند دنوں بعد میں واپس چلی جاؤں کیونکہ میرے کالج کی چھٹیاں ختم ہو جائیں گی۔'' عالیہ نے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے...... میں دوپہر میں آ جاؤں گا۔'' سمیر نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر عالیہ کے پاس پہنچ گیا تھا وہ پہلے سے تیار تھی اور اس کی منتظر تھی دونوں فوراً ہی قبرستان کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ لیکن آج کوئی بھی سیکورٹی کا انتظام نہیں تھا کیونکہ سمیر کا خیال تھا کہ اب کوئی

حادثہ پیش بھی آیا تو وہ اپنی حفاظت تنہا بھی کر سکتا ہے۔
قبرستان میں عالیہ کافی دیر تک اپنے والد کی قبر کے پاس بیٹھی روتی رہی تھی وہ ان کے ساتھ گزارے تمام لمحات یاد کر کے رو رہی تھی اور سمیر اسے تسلیاں دیتا رہا تھا پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ قبرستان سے باہر آ گئے تھے اور اپنی کار کے قریب ہی ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے تھے۔
''میں تمہاری شکر گزار ہوں سمیر کہ اتنا خطرہ ہونے کے باوجود تم میرے کہنے پر یہاں لائے۔'' عالیہ نے کہا۔
''کوئی بات نہیں عالیہ خطروں سے کیا ڈرنا ان سے تو ہر وقت ہی واسطہ رہتا ہے۔''
''مجھے ڈیڈی نے بتایا تھا کہ تم بہت بہادر ہو۔'' عالیہ نے تعریفی انداز میں کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''جب خطروں کا سامنا ہوتا ہے تو انسان کو بہادر بننا پڑتا ہے۔'' سمیر نے وہ سچ بولا جو اس نے پرکھا تھا اسے وہ لمحات یاد آئے جب وہ اپنے والدین سے بچھڑا تھا۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا اور خوف زدہ بھی پھر وہ خلیل کامران سے ملا۔ جنہوں نے اس کی تربیت کی اور آج وہ اپنی آرگنائزیشن میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا ہے ایسا کہ خلیل کامران نے اپنی بیٹی کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے بھائی کو دینے کے بجائے اس کے سپرد کی ہے۔ اس نے ایک نظر عالیہ پر ڈالی۔
''تمہیں پتہ ہے میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔'' عالیہ نے کہا۔
''ہاں! میں ان سے سارے راز کہہ لیتی تھی میرا اور کوئی دوست نہیں تھا۔'' عالیہ نے گہری سانس لی۔
''چلو واپس چلیں دیر ہو رہی ہے۔'' سمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔'' عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور سمیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔
''میرا کام مجھے بہت مصروف رکھتا ہے میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میری زندگی صرف اور صرف ڈریم سینٹر کے لیے وقف ہے۔'' سمیر نے آہستہ سے کہا اور عالیہ نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ جیسے اس کے خیال سے متفق ہو۔ سمیر اس کی طرف دیکھنے کے لیے مڑا تھا اور پھر اپنا زخمی بازو تھام لیا تھا۔
''اوہ! کیا ابھی یہ ٹھیک نہیں ہوا؟'' عالیہ نے پوچھا۔
''چند دن تو لگیں گے۔'' سمیر نے کہا۔
''کیا اس سے پہلے بھی کبھی تمہیں گولی لگی ہے؟''
''ہاں..... کئی بار۔'' سمیر نے مسکرا کر کہا پھر اس نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ ان لاک کیا تھا اور اسی وقت اس کی نظر اپنے سامنے آتے ہوئے پانچ لوگوں پر پڑی ان میں سے ایک کو وہ پہچانتا تھا وہ جیکی کے گروپ کا اہم فرد تھا۔
''ساجد! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' سمیر نے کہا۔
''میرا خیال ہے تم جانتے ہو کمانڈر۔'' ساجد نے کہا۔
''کیا یہ ذمہ داری تمہیں جیکی نے دی ہے یا تم خود ہی.....؟'' سمیر نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔ وہ جانتا تھا ساجد بہت سفاک تھا وہ لڑنے کے بجائے سامنے والے کو فوراً قتل کر دینا پسند کرتا تھا۔
''جیکی کا خیال ہے کہ اب جب کہ خلیل کامران مر چکا ہے تمہیں بھی راستے سے ہٹانے کا مناسب وقت ہے۔''
ساجد کی زبان پر اپنے والد کا نام سن کر عالیہ غصے میں آگے بڑھی تھی لیکن سمیر نے فوراً ہی ہاتھ سے اسے روک دیا تھا۔
''تم گاڑی میں بیٹھو۔''
''میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''
''میں نے کہا تم گاڑی میں بیٹھو۔'' سمیر نے سختی سے کہا اور ساتھ ہی ساجد آگے بڑھا تھا۔ عالیہ نے سمیر کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی سمیر جانتا تھا کہ وہاں محفوظ رہے گی کیونکہ گاڑی بلٹ پروف تھی سمیر کا ہاتھ اپنی گن پر تھا اور ساجد اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔
''میں نے سنا ہے جیکی نے گولی چلا کر تمہیں زخمی کر دیا ہے تمہاری حالت بہتر نہیں لگ رہی ہے کمانڈر۔'' ساجد نے کہا اور سمیر کو تب پتہ چلا کہ اسے گولی مارنے والا جیکی تھا۔ ساجد نہیں جانتا تھا کہ اس نے کیا غلطی کی ہے اچانک ہی ساجد کے ساتھ آنے والوں نے سمیر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔
سمیر نے تیزی سے اپنی گن سے فائر کر کے ایک کے گھٹنے کو ناکارہ بنا دیا تھا اور وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب ساجد کے تین ساتھی رہ گئے تھے۔ اور وہ بے پروائی

سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سمیر کار کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ دو افراد نے اسے پکڑ لیا ان میں سے ایک اس کے زخمی بازو پر مکے برسا رہا تھا۔ سمیر درد سے کراہ رہا تھا اس کی گن اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی پھر اس نے اپنی ساری قوت مجتمع کر کے اپنے اوپر حملہ آور ہونے والوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور ان پر مکے برسانے لگا تھا۔ لیکن باقی دو نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس پر مکے برسانے لگے تھے سمیر اپنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تھا اور اپنا دفاع کر رہا تھا پھر سامنے والے شخص نے اس کے منہ پر مارنے کے لیے مکہ لہرایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ مکا سمیر کے چہرے پر پڑتا وہ شخص لہرا کر گر گیا تھا۔ سمیر نے چونک کر اوپر دیکھا تھا اس کے سامنے عالیہ کھڑی تھی وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا وہ آنکھوں میں غصہ لیے اپنے ہاتھوں سے مکے بنا کر فضا میں لہرا رہی تھی۔

انداز بہت ہی پروفیشنل تھا سمیر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نازک اندام سی لڑکی ان صحت مند اور جری مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی وہ حیران تھا کہ عالیہ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ کا مکہ اس شخص کے منہ پر دوبارہ مارا تھا۔ ساتھ ہی اپنے سیدھے پاؤں سے اس کی ٹانگوں کے درمیان ایک زوردار کک ماری تھی اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا وہ بڑی مہارت سے پلٹ پلٹ کر ان پر حملے کر رہی تھی۔ ان میں سے ایک بے بس ہو کر زمین پر گر گیا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرے کو مکا مارا تھا اور پھر فضا میں اچھل کر 90 ڈگری کا زاویہ بناتی ہوئی گھومی تھی اور ایک زوردار کک قریب کھڑے ساجد کے منہ پر ماری تھی۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا سمیر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ غصہ عالیہ کی آنکھوں میں عیاں تھا زمین پر حملہ آور گرے ہوئے تھے اور وہ ہوا میں اچھل اچھل کر انہیں مکے دکھا رہی تھی۔

چلو...... یہاں سے چلو۔'' سمیر نے اٹھتے ہوئے کہا لیکن جیسے عالیہ نے سنا ہی نہیں تھا وہ غصے سے ساجد کو گھور رہی تھی۔

''چلو...... جلدی کرو۔'' سمیر نے پھر کہا اور وہ چونک کر اس کی طرف مڑی پھر دونوں تیزی سے کار میں بیٹھے تھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے تھے اور ساجد اپنے ساتھیوں سمیت پڑا کراہتا رہ گیا تھا۔

''میں نے تم سے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا تھا؟'' سمیر نے کچھ دیر بعد عالیہ سے کہا وہ کار چلاتے ہوئے سڑک پر توجہ رکھے ہوئے تھا اسے اپنے بازو سے خون بہتا محسوس ہو رہا تھا جو قمیض کی آستین میں جذب ہو رہا تھا۔

''اگر میں کار میں بیٹھی رہتی تو اب تک تم ختم ہو چکے ہوتے۔'' عالیہ نے کہا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟''

''تم زخمی ہو اور تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے تم کیسے ان کا مقابلہ کرتے وہ تمہارے زخم پر ہی ضرب لگا رہے تھے۔''

''لیکن تم نے مداخلت کر کے اچھا نہیں کیا اس طرح تم ان دہشت گردوں کی نظر میں آ گئی ہو۔'' سمیر نے کہا۔

''میں ڈرتی نہیں ہوں۔'' عالیہ نے کہا اور سمیر نے ایک بار پھر اس کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے لیے بند تھا عالیہ نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

''بے کار ہے سمیر! تم اتنی آسانی سے مجھ تک نہیں پہنچ سکتے میرے ڈیڈی نے میری تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے۔''

''لیکن پھر بھی تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے تم نے دیکھا کہ انہوں نے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کیا کیا؟'' سمیر نے کہا اس کی اس بات پر عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکوں گا اگر تم میری ہدایات پر عمل نہیں کرو گی۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے سمیر۔ تم نے دیکھا میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔''

''لیکن تم اتنی ماہر نہیں ہو جتنا کہ سمجھتی ہو۔'' سمیر نے کہا۔

''کیا؟'' عالیہ نے غصے اور حیرت سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' سمیر نے مختصراً کہا وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

''نہیں کہو...... تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' عالیہ نے اصرار کیا۔

''اچھا سنو! لڑائی کے دوران تمہاری چالیں پختہ نہیں تھیں تم اپنے جذبات کے زیر اثر لڑ رہی تھیں۔ حملہ کرتے ہوئے تمہاری کوئی خاص تکنیک نہیں تھی اور تم زیادہ طاقت ور بھی نہیں ہو۔ کسی توانا فائٹر کی کک برداشت نہیں کر سکو گی۔ اس وقت تمہاری کامیابی محض تمہاری خوش قسمتی ہے۔'' سمیر کے اس کمنٹ کے بعد عالیہ خاموش ہو گئی تھی پھر جب کار سمیر نے اس کے گھر کے سامنے روکی تھی اور سیکورٹی گارڈ کو اشارہ کیا تھا تو عالیہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''میں اس کام کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔'' اس نے اچانک کہا تھا۔

''کس کام کا حصہ؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ڈریم سینٹر میں دہشت گردوں سے مقابلہ کرنے کے کام کا حصہ۔''

''ہرگز نہیں۔''

''تم مجھ سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ مجھ میں صلاحیت ہے۔'' عالیہ نے کہا۔

''نہیں۔''

''تم اس کے خلاف کیوں ہو؟ آخر میں یہ کام کیوں نہیں کر سکتی؟''

''یہ تمہارے کرنے کا کام نہیں ہے۔'' سمیر نے اس سے نظر ہٹا کر کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟''

''مجھ پر تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہے یہ مت بھولو۔ ڈریم سینٹر جوائن کرنے کے بعد تم ایک پرسکون زندگی گزارنے کا موقع کھو دو گی۔ تمہاری زندگی محفوظ نہیں رہے گی...... کیا تم سمجھتی ہو کہ جیکی گروپ سے انتقام لے کر تمہارا دکھ کم ہو جائے گا تم پرسکون ہو جاؤ گی؟...... سنو! ایسا نہیں ہوگا اس راستے پر قدم رکھنا تمہارے لیے خطرناک ہوگا تم خود اپنی ذات سے اتنی دور نکل جاؤ گی کہ پھر تمہارا واپس لوٹنا ناممکن ہوگا۔'' سمیر نے اسے سمجھایا۔

عالیہ بڑی بڑی پرکشش آنکھیں کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کوئی جواب دیئے بغیر غصے سے کار کا دروازہ کھولا تھا۔

''چھوڑو تم رہنے دو۔'' اس نے اترتے ہوئے کہا پھر وہ تیزی سے کار کا دروازہ زور سے بند کرتی ہوئی گھر کی طرف چلی گئی تھی۔ سمیر نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سیکورٹی گارڈز نے اس کے لیے گھر کا دروازہ کھولا تھا اور وہ گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

''شٹ۔'' سمیر نے غصے سے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ)